

پاکستان کے سب سے بڑے
آن لائن اردو سوسائٹی

زیر پوائنٹ 4

جاوید چودھری



WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY



کسی گناہ گار نے اللہ تعالیٰ سے جنت اور دوزخ دیکھنے کی درخواست کی اور فرشتوں کے ہاتھوں سے فرشتوں کے ہاتھوں سے اسے دوزخ میں لے گئے وہ دوزخ ایک بہت بڑا اونگھ ہال تھا جس میں شاندار کرسیاں تھیں اور ان کرسیوں پر انتہائی لاکھڑے اور ہونڈ توڑ لوگ بیٹھے تھے ان لوگوں کے سامنے سوپ کے بڑے بڑے پیالے رکھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے چمچ تھے گناہ گار نے دیکھا ان لوگوں کی کہلیاں نہیں ہیں اور یہ لوگ اپنے بازو تھمیں کر سکتے چنچے یہ لوگ پیالے سے چمچ بھرتے ہیں چمچ کو دست تک لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سوپ بیٹوں تک پہنچنے سے پہلے ان کے گریبان پر گر جاتا ہے وہ صدمہ ہوا اس سوپ پینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن چمچ ان کے ہونٹوں تک نہیں پہنچا پارہے تھے فرشتے اسے وہاں سے جنت میں لے گئے یہ بھی ایک بہت بڑا اونگھ ہال تھا اس ہال میں بھی لوگ بیٹھے تھے اور ان کے سامنے بھی سوپ کے پیالے پڑے تھے لیکن یہ لوگ انتہائی صحت مند خوبصورت اور مطمئن تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہنس مکھیل رہے تھے گناہ گار نے فرشتوں سے جنت اور دوزخ کا فرق پوچھا تو فرشتے بولے ان لوگوں کے بازوؤں میں بھی کہلیاں نہیں ہیں لیکن انہوں نے اس کا بڑا دلچسپ حل نکال لیا ہے یہ پیالے سے چمچ بھرتے ہیں اور یہ چمچ اپنے ہمسائے کے منہ میں ڈال دیتے ہیں اور ہنس مکھیاں اپنا چمچ ان کے منہ میں چھینا چھوڑ دیتے ہیں کی جھوٹ مٹ جاتی ہے۔

وہ گناہ گار وہاں آیا اور اس نے افسانہ کو یاد دہانت اور دوزخ میں صرف مکمل کا فرق ہوتا ہے دوزخ کے لوگ اپنا چمچ اپنے منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ جنتی اپنے پیالے سے چمچ بھرتے ہیں اور دوسرے کے منہ میں ڈال دیتے ہیں انہوں نے گناہ گار کی بات سنی تو جیسے اسے معلوم ہوا وہ جنت میں آسائوں میں حاشا کرتے رہے ہیں وہ جنت زدگی بھر ہماری ڈانٹنگ نیکل پر پڑی رہتی ہے ہم نے اس ایک چمچ بھرنے کی اپنی عقل میں بیٹھے شخص کے منہ میں ڈالنا ہے اور اللہ کا قرب پا جانا ہے اس اتنی ہی بات ہے لیکن ہم اتنی ہی بات کیلئے کرب بھر مارے مارے پھرتے ہیں ہم عقل کے نیچے کوچہ بڑا روانہ نہیں لیے سٹیل میں حاشا کرتے رہتے ہیں۔

ہم کتنے بے وقوف ہیں۔

Kashif Azad



کی
وگرتے

Rs. 500/-

Design by
FAZEE NIANI

محمد مارکیٹ، 40-ارو بازار، لاہور۔
فون: 7223584، 7232336، 7352332



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

زیر پوائنٹ 4

زیر پوائنٹ 4

جاوید چودھری

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور
فون: 7352332-7232336

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ذریعہ پبلیکیشن 4	نام کتاب
جاوید چودھری	مصنف
گل فرناز احمد	ناشر
علم و عرفان پبلشرز، لاہور	مطبع
زاہد و نوید پریسنگز، لاہور	پروف ریڈنگ
محمد نواز صابر	کمپوزنگ
عقرا اقبال	اشاعت اول
ستمبر 2007ء	اشاعت دوم
اپریل 2010ء	تعداد
1100	قیمت
500/- روپے	

پہلی کتاب چھپانے کے لیے رابطہ کریں۔ 0300-9450911

Kashif Azad @ OneUrdu.com

..... ملنے کے لیے

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40-آرڈو بازار، لاہور

فون: 7352332-7232336

اشرف بک اینجی

اقبال روڈ، کینٹی چوک، راولپنڈی

ویکم بک پورٹ

آرڈو بازار، کراچی

کتاب گھر

اقبال روڈ، کینٹی چوک، راولپنڈی

عزیزہ علم و ادب

انکریم مارکیٹ، آرڈو بازار، لاہور

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متعلق ہونے والے کٹھن و کرم، انسانی طاقت اور ہر ماٹک کے مطابق کچھ کتب اشاعت بھی اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری نظام سے آکر کوئی غلطی یا اصلاح درست نہ ہوں تو ان ماہ کرم مطلق فرما دیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں اصلاح کیا جائے گا۔ (ناشر)

افتساب!

اپنے بیٹے

فائز جاوید

اور

شما عیال جاوید کے نام

کاشف آزاد

ترتیب

11	سارے طالبان دہشت گرد نہیں ہیں	1
14	ورنہ یہ لوگ ہم پر نہیں گے	2
17	یہ 29 لاکھ لوگ	3
20	یس وی کین	4
23	آٹھ بچے	5
26	پچاس چینی کا سکہ	6
29	قدرت کا ہاتھ	7
32	دس ڈالر کا نوٹ	8
35	ایک بڑی خورس	9
38	تین وجوہات	10
41	حشر کو ابھی بہت دن باقی ہیں	11
44	کیا ہم ڈاکٹر عبدالقادر کیلئے اتنا بھی نہیں کر سکتے	12
47	خودکش	13
50	ہم ایک بے وقوف قوم ہیں	14
53	شاید کوئی نہیں	15
56	خدا کیلئے کچھ کریں	16
58	پستول کی عدالت	17
61	بے عزت	18
64	مر جانا اور ماروینا	19
67	ہوٹل اور مسجد	20
70	ہم دنیا کی طرح کب سوچیں گے	21
73	ہم ایڈیشن	22
76	پاؤں سے گلے لگ	23
79	ہم بدو عاؤں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے	24

82	خوف الہی کی نعمت	25
85	اپنی چنگاریاں اپنا دامن	26
88	کوئی برے ہوتے ہیں کوئی نہیں	27
91	یہ جنگ کیسے شروع ہوئی	28
94	اس کے بعد کیا ہوا	29
97	اب کس کی باری ہے	30
100	دوسرا راستہ بھی ہے	31
103	پسپائی کے پچاس سال	32
106	بادشاہوں کی غلطیاں	33
109	67 لاکھ شتر مرغ	34
112	سکھ فوج	35
116	دفاع	36
119	بھارت صرف 653 عہدوں کی قربانی دے دے	37
122	جاپان اب ترقی کر کے دکھائے	38
125	مرٹھے کا مقام	39
128	عشق کا مقام	40
131	ڈائلاگ کی گنجائش موجود ہے	41
134	زوال کی تین وجوہات	42
137	زوال کی چوتھی وجہ	43
140	نورسے کی ماں	44
143	بھائی لوگوں کی خدمت	45
146	چادوگر	46
148	نمک کی چٹان پر گنا	47
151	خواہشوں کا دن	48
154	تم کافر لوگ	49
157	نمک کی کان	50
160	بیٹھے منہ	51
163	پاکستان ٹیل سٹیٹ نہیں	52
166	قبر تک	53

169	بد قسمتی کا اونٹ	54
172	فیلگ	55
175	چودھری شجاعت بھگت دار ہیں	56
178	یہ کتاب ثابت کرتی ہے	57
181	پانچ چھ سالوں کی گیم	58
185	کونے	59
188	اصل مشاہد حسین کون ہے	60
192	بزنس میٹروں کیلئے بھی وقت نکالئے	61
195	خارجہ پالیسی	62
198	پاکستان کا سوشلزم لینڈ	63
201	سرحد حکومت سے درخواست	64
204	بلوچ قیادت بھی قصور وار ہے	65
207	بس آنکھیں بند کریں	66
210	بلوچوں کے ساتھ زیادتی ہوتی رہی	67
213	پنجابی قصور وار ہیں	68
216	کام چور	69
219	کرپٹ	70
222	ایماندار	71
225	شاید ہم کبھی	72
28	سواتین دن میں	73
231	علیحدگی کی وجہ	74
234	کیا پوری اسلامی دنیا میں	75
237	دل کے ارب پتی	76
240	ریڈ زون	77
243	مہنگائی	78
246	سات سوالوں کے بہت جواب	79
249	ذمہ داری	80
252	اللہ کے سفیر	81
	حج ۱۰۳ھ	۸۲

258	میں جانتا ہوں یہ پاگل ہے	83
261	شاید ہمیں	84
264	لوڈ شیڈنگ	85
267	مرافقت	86
270	کیونیکیشن ایج	87
273	پروفیکول	88
275	رن لا ہورن	89
278	ترجیحات	90
280	سنگول	91
283	ہم سب ممکن ہو جائیں	92
286	غلاموں کے غلام	93
289	کاش ہم تلبیاں ہوتے	94
292	صرف حاضری لگوانے کیلئے	95
295	ہمارے پاس بنیاد ہی نہیں	96
298	دس لوگ	97
301	جہاں زیادہ محنت وہاں زیادہ ٹیلنٹ	98
304	ایک زبان دوکان	99
306	سیلف ریٹائرمنٹ	100
309	استقامت کے دس دن	101
312	قربانی فنڈ	102
315	اللہ کے نام پر	103
318	عصر کی جسم	104
321	گھانٹے کے سوداگر	105
324	Do Not Wish For Less Problems	106
326	وائے می	107



سارے طالبانِ دہشت گرد نہیں ہیں

ہم لوگ ریاض سے مدینہ شریف جا رہے تھے انیق احمد اور میری سہیلیں ساتھ ساتھ تھیں انیق احمد پاکستان کے ان چند بے نگر پرسنز میں شمار ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے علمِ عاجزی اور اخلاق سے نوازہ ہے انیق صاحب جہاں علامہ اقبال کے حافظ ہیں وہاں وہ دنیا کے تمام قدیم اور جدید دانشوروں، مفکروں اور علماء کرام کے بھی نباض ہیں ان کا تعلق ایک دینی گھرانے کے ساتھ تھا ان کے والد ایک معروف عالم دین تھے اور انیق صاحب نے قرآن مجید، فقہ اور احادیث کی بحثوں کے درمیان آنکھ کھولی تھی لہذا اس دینی اور علمی فضا کی جھلکت انیق صاحب کی گفتگو میں دکھائی دیتی ہے 'علمِ دولت' شہرت اور اقتدار کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ 99 فیصد لوگوں کا دماغ خراب کر دیتا ہے یہ چند دنوں کا اقتدار کاغذ کی بنی عارضی دولت، معنوی روشنیوں سے ادھار لی ہوئی شہرت اور چند کتابوں اور چند گریوں کا علم بھی عجیب چیز ہے یہ عموماً باہشت بھر کے انسان کو فرعون بنا دیتا ہے اور 99 فیصد لوگوں کا یہی المیہ ہے لیکن وہ ایک فیصد لوگ جو اقتدار، دولت، شہرت اور علم کے باوجود انسان رہتے ہیں جن کی گردن اور کندھے جھکے رہتے ہیں اور جو تعریف کے ہر لفظ کے بعد ممنونیت کے اظہار کے لیے آسمان کی طرف دیکھتے وہ جینوزن لوگ اللہ کے کرم کے اصل حق دار ہوتے ہیں اور انیق احمدؒ شمار ان ایک فیصد لوگوں میں ہوتا ہے انیق احمد کو اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عاجزی دی ہے انیق احمد کی زندگی کا زیادہ تر حصہ اردو زبان کے مشہور شاعر اور دانشور جون ایلیا کے ساتھ گزرا یہ جون ایلیا کے شاگرد بھی تھے اور دوست بھی، جون ایلیا ایک درویش صفت بلکہ فقیر منش شاعر تھے، جون صاحب ساری رات جاگتے تھے شعر سننے اور شعر کہتے تھے اور مشروب مغرب سے لطف اندوز ہوتے تھے صبح کے وقت سو جاتے تھے اور پھر دن کے ایک بجے جاگتے تھے انیق احمد رات اس وقت تک ان کے ساتھ رہتے تھے جب تک جون ایلیا انہیں پہچانتے تھے مجھے انیق صاحب اور جون ایلیا کے تعلق کا علم تھا چنانچہ میں نے دوران سفر ان سے جون ایلیا کی زندگی کے دلچسپ واقعات سنانے کی درخواست کی انیق احمد نے بے شمار واقعات سنائے لیکن ان میں ایک واقعہ انتہائی دلچسپ تھا انیق احمد کا کہنا تھا جون ایلیا دن ایک بجے تک سوتے تھے لیکن مجھے یہ سہولت حاصل تھی میں انہیں ایمر جنسی میں کسی بھی وقت جگا سکتا تھا میں نے ایک دن ٹیلی ویژن آن کیا

ان دنوں پاکستان میں ایک ہی غیر ملکی چینل دکھایا جاتا تھا اور وہ سی این این تھا جس نے سی این این پر سوویت یونین کو ٹوٹے ہوئے دیکھا یہ مظہر میرے لئے حیران کن تھا کیونکہ جون ایلیا بائیس بازو کے دانشور تھے اور ان کا دعویٰ تھا اشتراکیت کسی نہ کسی دن پوری دنیا پر غلبہ پائے گی یہ دن کے گیارہ بجے تھے جس نے ٹیلی فون کر کے انہیں جگا دیا وہ نیند کے عالم میں ٹیلی فون پر آگئے میں نے انہیں بتایا "جون صاحب سوویت یونین ٹوٹ گیا" انہوں نے غنودگی کے عالم میں جواب دیا "یہ مذاق کا وقت نہیں" میں نے عرض کیا "جون صاحب میں ٹیلی ویژن پر دیکھ رہا ہوں لوگ لینن کا مجسمہ گرا رہے ہیں ماسکو میں فوجی ٹینک بھر رہے ہیں اور فوج رائفلس اور توپوں لے کر شہر میں گھوم رہی ہے" جون ایلیا یہ سن کر تھوڑی دیر خاموش رہے اور اس کے بعد خود کلامی کے انداز میں بولے "کیا فوج رائفلس لے کر ماسکو میں گھوم رہی ہے" میں نے کہا "ہاں" وہ بولے "کیا فوج ماسکو میں توپوں اور ٹینکوں کے ساتھ بھر رہی ہے" میں نے کہا "ہاں" جون ایلیا نے قہقہہ لگایا اور بولے "پھر ایک بات طے ہوگئی" میں نے پوچھا "وہ کیا جون صاحب" جون ایلیا بولے "پھر فوج کسی بھی ملک کی ہو وہ ہوتی پنجابی فوج ہی ہے۔"

میں نے اور انٹیل صاحب نے قہقہہ لگایا انٹیل صاحب اس کے بعد خاموش ہو گئے اور میں جون ایلیا کے فقرے کی لذت لینے لگا ہم میں بحیثیت پاکستانی ایک بڑا دلچسپ فالٹ ہے ہم لوگوں کو اداروں اور چیزوں کو ان کی کارکردگی ان کی خوبیوں اور ان کی خامیوں کی بنیاد پر الگ الگ نہیں کرتے ہم سب کو ایک ہی پلڑے میں تولتے ہیں مثلاً ہم ہر امریکی کو اپنا دشمن کہتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے بھول جاتے ہیں امریکہ کے 55 فیصد لوگ وہمیٹ ہاؤس کی "وار آف ٹیرر پالیسی" کے خلاف ہیں اور یہ لوگ دانشمن میں عراق افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقوں کے عوام پر امریکی حملوں کے خلاف جلوس نکالتے ہیں اور رش کو ہزاروں معصوم لوگوں کا قاتل قرار دیتے ہیں ہم ہر یہودی اور ہر اسرائیلی کو عالم اسلام کا دشمن کہتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے بھول جاتے ہیں تیسری دنیا کو حاشائی ٹیکوں کی دیکسین بھی مختلف یہودی فراہم کر رہے ہیں اور ایگزومپلائنس ٹی بی اور کاگولڈر جیسی مہلک بیماریوں کا علاج بھی یہودی ہی دریافت کر رہے ہیں اور یہ لوگ یہ علاج انسانیت کو مفت دیں گے ہم بھارت کو بھی گالی دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی بھول جاتے ہیں بھارت میں 20 کروڑ مسلمان اور 40 کروڑ دلت بھی آباد ہیں اور بھارتی پالیسیوں میں ان بے چاروں کا کوئی تصور نہیں اور یہ لوگ بھی بھارتی حکومت اور بھارتی شدت پسندوں کے ہاتھوں استے ہی ٹھک ہیں جتنا ہم لوگ اسی طرح ہمارے بلوچی سندھی اور پشتون بھائی بھی پنجاب کو اپنے تمام مسائل کی وجہ قرار دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں پنجاب کا عام شہری عام کسان عام مزدور اور عام ہاری سندھیوں بلوچیوں اور پشتونوں سے کہیں زیادہ خوفناک اور قابل رحم زندگی گزار رہا ہے یہ بھول جاتے ہیں پنجاب میں پورے ملک کے مقابلے میں سب سے زیادہ بے روزگاری ہے پنجاب میں سب سے زیادہ جرائم ہوتے ہیں پنجاب میں تعلیم کا معیار دوسرے صوبوں کے مقابلے میں کہیں پست ہے پنجاب کی زیادہ آبادی خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہے اور پنجاب میں دوسرے صوبوں کے مقابلے میں صحت کے زیادہ مسائل ہیں لیکن ہمارے بلوچی سندھی اور

پشتون بھائیوں نے پنجاب کے ہر شہری ہر ہاسی کو مہیا نواز شریف، مہیاں شہباز شریف اور جنرل کیانی سمجھ لیا ہے اور یہ لوگ پورے پنجاب کو ماڈل ٹاؤن رائے ونڈ یا ڈیفنس سمجھ رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے آپ لاہور کی مال روڈ سے پانچ کلومیٹر نیچے اتر جائیں تو بلوچستان، سندھ، سرحد اور پنجاب میں کوئی فرق نہیں رہتا، ہم نے اسی طرح ایوب خان، یحییٰ خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف کو پاک فوج سمجھ لیا ہے، ہم جنرل محمود جنرل فضل حق، جنرل پیرزادہ اور جنرل ملک کو فوج سمجھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں پاکستان کی اصل فوج میجر عزیز، بمبئی شہید، حوالدار لاکھ جان شہید، کیپٹن کرنل شیر خان شہید، لانس ٹائیک محمد محفوظ شہید، سوار محمد حسین شہید، میجر شہید، میجر محمد اکرم شہید، میجر محمد طفیل شہید، کیپٹن محمد سردر شہید اور پائلٹ آفیسر راشد منہاس شہید ہے، پاکستان کی اصل فوج وہ ہے جو چمن، طورخم، چولستان اور نیلم و بیلی میں ملک کی حفاظت کر رہی ہے اور اس میں لاڈکانہ سے لے کر ڈیرہ گنڈی اور جہلم سے لے کر جنوبی وزیرستان تک پاکستان کے ہر علاقے اور ہر خطے کے جوان موجود ہیں۔

یہ حقیقت ہے ہم چیزوں کو بلیک و دیکھتے ہیں یا دامیٹ، ہم ان کے درمیان موجود گرے ایریا کو ہمیشہ فراموش کر دیتے ہیں آپ طالبان کو لے لیجئے، ہم نے آج کل ہر داڑھی والے کو طالبان کہنا شروع کر دیا ہے، ہم علم حاصل کرنے، نماز روزے کی پابندی کرنے اور شریعت کا علم پھیلانے والے طالبان اور پاکستانی فوج، پاکستانی حکومت اور پاکستانی معاشرے سے لڑنے والے طالبان میں فرق ہی نہیں کرتے، ہماری نظر میں ہر داڑھی والا شخص طالبان ہے اور ہم اس کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں، ہماری یہ اپروچ سو فیصد غلط ہے، ہم مسلمان ہیں، پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور ہم پر بحیثیت مسلمان شریعت کی پابندی کرنے والے ہر مسلمان کا احترام فرض ہے، ہمیں قطعاً یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم شریعت کی پابندی کرنے والوں کے خلاف نفرت کا اظہار کریں، ہم اگر شدت پسندوں کے خلاف ہیں اور اپنی مخصوص شریعت کو رانگل کی نوک پر نافذ کرنے والوں کو ملک دشمن قرار دیتے ہیں تو ہمیں امن پسند طالبان سے نفرت کا بھی کوئی حق حاصل نہیں چنانچہ جس طرح سازی فوج پنجابی، سارے سیاستدان شوکت عزیز، سارے پنجابی قاصب، ساری حکومت امریکہ، نواز اور ساری پیور و کرسی کرپٹ نہیں ہوتی بالکل اسی طرح سارے داڑھی والے لوگ طالبان نہیں ہوتے اور سارے طالبان دہشت گرد نہیں ہوتے لہذا ہمیں دونوں کے درمیان ایک لکیر ضرور کھینچنا ہوگی۔



ورنہ یہ لوگ ہم پر ہنسیں گے

”کیا تمہاری چیف جسٹس افتخار محمد چودھری صاحب سے ملاقات ہوئی“ میرے دوست کے سوال میں یقین تھا، میں نے انکار میں سر ہلا دیا، اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا، میں نے عرض کیا ”میں مبارک باد دینے کے لیے ان کے گھر گیا تھا لیکن وہاں رش تھا چنانچہ میں واپس آ گیا“ دوست نے مجھے بے یقینی کے عالم میں دیکھا اور دوبارہ بولا ”کیا بحال ہونے والے دوسرے بچوں کے ساتھ بھی تمہارا رابطہ نہیں ہوا“ میں نے جواب دیا ”صرف دو کے ساتھ ہوا“ جسٹس خواجہ شریف میرے پرانے کرم فرما ہیں، میں نے انہیں مبارک باد کے لیے فون کیا تھا جبکہ جسٹس جاوید اقبال نے مجھے فون کر کے مبارک باد دی، جسٹس جاوید اقبال کا خیال تھا میڈیا نے عدلیہ کی بحالی میں بنیادی کردار ادا کیا جبکہ میں نے عرض کیا ”تجز اور وکلاء اگر استقامت نہ دکھاتے تو میڈیا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا“ یہ معزول بچوں کی استقامت تھی، جس کی وجہ سے ہم ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گئے۔“ میرے دوست نے فوراً پوچھا ”کیا تم ان بچوں کو مبارک باد کے فون نہیں کرو گے“ کیا تم ان سے ملاقات کے لیے بھی نہیں جاؤ گے“ میں نے عرض کیا ”مجھے اور میرے دوسرے صحافی دوستوں کو ایسا نہیں کرنا چاہئے بلکہ میرا خیال ہے بار کونسلو کے اراکین، چودھری اعتراف احسن علی احمد کر، منیر اے ملک اور اطہر من اللہ سمیت تمام سینئر وکلاء، سول سوسائٹی کے نمائندوں اور سیاسی جماعتوں کی قیادت کو بھی اب بچوں سے ملاقاتیں بند کر دینی چاہئیں اور آج کے بعد ان تمام لوگوں کو بچوں سے الگ ہو جانا چاہئے جنہوں نے عدلیہ کی بحالی میں کوئی کردار ادا کیا تھا تاکہ یہ بیج آج سے اپنا کام شروع کر سکیں“ میرے دوست کے چہرے پر حیرت گہری ہو گئی اور اس نے سنسناتی آواز میں پوچھا ”مگر کیوں؟“ میں نے عرض کیا ”ہم نے اگر معزول بچوں کی بحالی کی تحریک اخلاص کے ساتھ چلائی تھی اور ہم لوگ اگر واقعی عدلیہ کی آزادی کے خواب کو شرمندہ تعبیر دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں اب خود کو بچوں سے ”ڈی لنک“ کرنا ہوگا۔ میں اگر بھی افتخار محمد چودھری صاحب کے ساتھیوں اور دشمنوں کو مشورہ دینے کی پوزیشن میں ہوتا تو میں چودھری اعتراف احسن سمیت چیف جسٹس تمام مہربانوں کو مشورہ دیتا یہ اب سپریم کورٹ کی وکالت سے تائب ہو جائیں۔ اسی طرح شریف الدین جیرزادہ، عبدالحفیظ جیرزادہ، فاروق ایچ ٹانیک، لطیف کھوسہ اور بابر اعوان سے بھی عرض کرتا کہ آپ لوگ کیونکہ معزول بچوں کی بحالی کے خلاف تھے چنانچہ آپ کو بھی اب پریکٹس چھوڑ دینی چاہئے تاکہ انصاف کے

دائن پر کوئی دھبہ نہ لگے کیونکہ یہ حقیقت ہے جب میر سٹراہتر از احسن علی احمد کرد یا منیر اے ملک پریم کورٹ میں پیش ہوں گے اور دوسری طرف سے نسیم بخاری یا براہمان اللطیف کھوسہ یا میر زادہ صاحب عدالت میں آئیں گے تو ججوں پر بڑی آسانی سے جانبداری کا الزام لگایا جاسکے گا اور اس سے وہ سارا کاروبار بد ہو جائے گا جس کے لیے پوری قوم نے دو سال تک سڑکوں پر دھکے کھائے تھے اور ان دھکوں کے نتیجے میں تاریخ میں پہلی بار ججز عدالتوں سے فارغ ہونے کے بعد دوبارہ اپنے عہدوں پر فائز ہوئے تھے میڈیا کے ان تمام لوگوں کو بھی اب پریم کورٹ اور ہائی کورٹ کا رخ نہیں کرنا چاہئے جنہوں نے دو سال تک سول سوسائٹی اور دکلاء کے کندھے سے کندھا جوڑے رکھا کیونکہ اب ہم سب کو مل کر انصاف کے لیے کام کرنا چاہئے اور انصاف کے لیے ہمیں آج سے وہی کروا دیا کرنا چاہئے جو ہم نے صدر پرویز مشرف اور صدر آصف علی زرداری کے خلاف ادا کیا تھا" میں خاموش ہو گیا۔

میرے دوست کی آنکھوں میں حیرت گہری ہو گئی۔ میں نے عرض کیا "ہم لوگ جب عدلیہ کی آزادی کے لئے سڑکوں پر تھے تو محض دل ججوں کے مخالف ہم پر الزام لگاتے تھے ہم انصاف کے لیے نہیں بلکہ فرد واحد کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ہم اس کے جواب میں کہتے تھے انصاف کا عمل اسی فرد واحد سے شروع ہوگا" ہمیں اب یہ دعویٰ صحیح ثابت کرنا ہے ہم نے ثابت کرنا ہے ہم نے صرف 60 ججوں اور افتخار محمد چودھری کی ملازمت کے لیے یہ تحریک نہیں چلائی تھی بلکہ ہم اس ملک کے ان تمام مظلوموں کو انصاف فراہم کرنے کے لیے سڑکوں پر آئے تھے جن کے حقوق محاشرے کے کسی نہ کسی زور آور نے اپنے جوتے تہہ دبا رکھے ہیں۔ ہم ان لوگوں کے لیے لڑتے رہے ہیں جن کا انصاف یا جوج ماجوج کی دیوار کے پیچھے چھپا ہے اور یہ لوگ عمر بھر یہ دیوار چانتے رہتے ہیں لیکن دیوار میں اتنی درز پیدا نہیں ہوتی کہ ان کی آواز ہی انصاف کے کانوں تک پہنچ سکے۔ محضر عدالت سے پریم کورٹ کے دو دیوار تک ہمارا انصاف کا سارا نظام بے انصافی لوٹ کھسوٹ سیاسی دباؤ سمجھوتوں تاخیر اور کرپشن میں لتھڑا ہے اور اس میں انصاف صرف اسی شخص کو ملتا ہے جو انصاف خرید سکتا ہو انصاف کو دیا سکتا ہو یا بھر قانون اور آئین کی دجیاں بکھیر سکتا ہو۔ اس ملک میں عام شہری کیلئے سزا جبکہ بڑے لوگوں کے لیے امین آرا ہوتے ہیں چنانچہ ہم نے ثابت کرنا ہے ہم نے یہ تحریک عام شہری کو انصاف کی دیلیز تک پہنچانے یا انصاف کو عام شہری کی چوکھٹ تک لانے کے لیے شروع کی تھی چنانچہ آج سے ہمیں ججوں کا احتساب شروع کرنا چاہئے۔ ہمیں اس ملک کے ہر اس مظلوم کی آواز عدلیہ کے ایوانوں تک پہنچانی چاہئے جس کے حقوق پر کسی نہ کسی زور آور کا گھنٹا رکھا ہے اور سول جج سے لے کر مسز جسٹس تک جوج یہ آواز نہ سنے اس کے خلاف بھی ہمیں اتنی ہی بڑی تحریک چلانی چاہئے جتنی ہم نے صدر پرویز مشرف اور صدر آصف علی زرداری کے خلاف چلائی تھی"۔ میرے دوست نے حیرت سے پوچھا "کیا تم ملک میں بغاوت پھیلاتا چاہتے ہو" میں نے انکار میں سر ہلایا اور عرض کیا "ہمیں انصاف۔ یہ ظلم ہوگا ہم صدر پرویز مشرف اور صدر آصف علی زرداری کی آمریت اور ان کا قلعہ توڑ کر ملک کے اندر جوڑ بٹل ڈیکٹیشن کا ایک نیا قلعہ کھڑا کر دیں یہ ظلم بھی ہوگا اور زیادتی بھی۔ قدرت نے ہمیں نرم انقلاب کا ایک موقع فراہم کیا ہے تو ہمیں

اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ہمیں ان تمام ججوں کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں جو انصاف قائم کرنے کی کوشش کریں اور ان تمام ججوں کا راستہ روکنا چاہئے جو جوڈیشل ڈیکلیئریشن کی کوشش کریں اور وہ جج خواہ کوئی بھی ہو ہمیں چاہئے ہم حکومت پر ججوں کے درست فیصلوں پر عملدرآمد کے لیے دباؤ ڈالیں اور ججوں کے غلط فیصلوں کی حوصلہ افزائی نہ کریں کیونکہ اسی سے ملک آگے بڑھ سکے گا۔“

میرے دوست نے بے چینی سے کرسی پر کروٹ بدلی اور جلدی سے بولا "لیکن یہ فیصلہ کون کرے گا کہ کون سا فیصلہ درست ہے اور کون سا غلط۔" میں نے فوراً جواب دیا "درست اور غلط فیصلے کا فیصلہ قانون آئین یا دلائل نہیں کرتے انسانی ضمیر کرتا ہے پاکستان کے تمام قانون دان کہتے تھے آئین اور قانون کی روشنی میں معزول جج بحال نہیں ہو سکتے لیکن عوامی ضمیر کی عدالت نے آئین اور قانون کے خلاف فیصلہ دے دیا اور حکومت کو اس فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا چنانچہ آج کے بعد ججوں کے فیصلوں کی درست اور غلطی کا فیصلہ عوام کا ضمیر کیا کرے گا عوام چند سیکنڈ میں ججوں کے فیصلوں کا فیصلہ کر دیا کریں گے اور جس دن کسی جج نے کسی سمجھوتے دیا یا ترقیب میں آ کر فیصلہ دیا اسی دن اس کا ڈی ڈے بھی شروع ہو جائے گا۔ عوام ہاشور ہو چکے ہیں اور یہ لوگ اب کسی قیمت پر یہ شعور سرینڈر نہیں کریں گے چنانچہ انفار محمد چودھری کو چاہئے وہ آج سے سول کورٹس سے لے کر سپریم کورٹ تک انصاف کے سارے نظام کو شفاف 'فوری اور سستا بنا دیں' تمام مقدموں کے فیصلوں کی مدت طے کر دیں کوئی کیس چھ ماہ سے اوپر نہ جائے عدالتیں غریب اور بے بس لوگوں کے مقدمے مفت پنڈل کریں ڈسٹرکٹ سے لے کر صوبے تک اور صوبے سے لے کر سپریم کورٹ تک جوڈیشل کونسلیں بنا دی جائیں جن میں کوئی بھی شخص کرپٹ ججوں کے خلاف درخواست دے سکے یہ کونسلیں ججوں کے خلاف انکوائری کریں اور جس جج کے خلاف کرپشن، اقربا پروری، لمبورت ازم یا قانون سے تجاوز کا الزام ثابت ہو جائے اسے اسی وقت فارغ کر دیا جائے۔ جھوٹے مقدمے قائم کرنے والوں کو سنگین سزائیں دی جائیں صدر سے لے کر عام شہری تک سب لوگ عدالت کے سامنے جواب دہ ہوں حکومت کے ساتھ مل کر ججوں کی تحواہوں اور مراعات میں پانچ سو فیصد اضافہ کر دیا جائے تا کہ جج کرپشن سے بچ سکیں اور جیلوں میں خصوصی ٹریبونل بھجوا کر معمولی جرائم میں قید مجرموں، قابل ضمانت جرائم کے شکار مظمان اور وہ لوگ جو سزا پوری کر چکے ہیں ان کی رہائی کا بندوبست کرادیں اور مظلوم کی صرف ایک درخواست زنجیر عدل کا کام کرے تاکہ ہم اپنی کوشش اپنی سڑگل پر فخر کر سکیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ تمام لوگ جو ہماری جدوجہد کو فرد واحد کے لیے کوشش قرار دے رہے تھے وہ ہم پر نہیں گئے وہ ہمارا مذاق اڑائیں گے۔"



یہ 29 لاکھ لوگ

ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان پالیٹیشن و پیغیر کی وفاقی وزیر ہیں ڈاکٹر صاحبہ سیالکوٹ سے تعلق رکھتی ہیں اور سابق پیپلر چودھری امیر حسین کوٹلیکٹ دے کر قومی اسمبلی پہنچی تھیں ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان گزشتہ ہفتے امدادی سامان لے کر متاثرین کے کیپوں میں گئیں یہ سامان وزارت کے ملازمین کی ایک دن کی تنخواہ سے خرید لیا گیا تھا اور یہ سامان اس لحاظ سے مختلف تھا کہ ڈاکٹر صاحبہ پہلی بار زنانہ استعمال کی مخصوص اشیاء ساتھ لے کر گئی تھیں۔ متاثرین کے کیپوں میں سات لاکھ خواتین ہیں ان میں 70 ہزار خواتین حاملہ ہیں یہ تمام خواتین فطری عوامل سے بھی گزرتی ہیں چنانچہ کیپوں میں بڑے پیمانے پر ایسے سامان کی ضرورت ہے جو صرف خواتین کے لیے مخصوص ہے لیکن بد قسمتی سے امداد فراہم کرنے والے اداروں میں ایسی جی اوز اور انفرادی لوگوں کو یہ "ضرورت" یاد نہیں رہی چنانچہ کیپوں میں پچھلے ایک ماہ سے بحرانی صورتحال تھی۔ ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان خاتون ہیں چنانچہ انہوں نے اس ضرورت کو "انڈر سٹینڈ" کیا انہوں نے ایک ڈونر ایجنسی کی مدد سے خواتین کے لیے پچاس ہزار بیگ بنوائے اور یہ بیگ مختلف کیپوں میں تقسیم کر دیئے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا کہنا تھا یہ بیگ خواتین کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھے چنانچہ انہوں نے ان سب کی آنکھوں میں ممنونیت کے گہرے جذبات دیکھے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا کہنا تھا یہ پچاس ہزار بیگ بہت کم ہیں چنانچہ امدادی سامان بھجوانے والے اداروں اور افراد کو خواتین کی اس ضرورت کا احساس کرنا چاہیے اور کیپوں میں ایسے زیادہ سے زیادہ بیگ بھجوانے چاہئیں جن میں خواتین کی ضرورت کا سامان موجود ہو۔

ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان جب دورے کے لیے روانہ ہونے لگیں تو انہیں سیکورٹی کے نام پر ڈرانے کی کوشش بھی کی گئی لیکن وہ اس کے باوجود کیپوں کے دورے پر نکل گئیں پاکستان کے چند ادارے جان بوجھ کر ایسی اطلاعات پھیلا رہے ہیں جن کے نتیجے میں وفاقی وزیر اہل جی اوز کے سربراہ "غیر ملکی ڈونر ایجنسیوں کے پاس اور ملک کے بڑے تاجر اور صنعت کار کیپوں میں جانے سے پرہیز کر رہے ہیں اس سے جہاں متاثرین کے دل میں دُفق کے خلاف نفرت پیدا ہو رہی ہے وہاں کیپوں کے اندر بھی کرپشن کا دور دورہ ہے۔ وفاقی حکومت اگر ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کو مثال بنا کر دوسرے وزراء کو بھی کیپوں کے دورے کا حکم دے اور یہ لوگ بھی روز کسی نہ

کسی کیسپ کا دورہ کریں تو حکومت کو کیسپوں میں موجود لوگوں کی حالت زار کا اندازہ بھی ہو جائے گا اور سترہین کی ڈھارس بھی بندھے گی یہ کیسپ حقیقتاً کسی بڑے انسانی ایسے سے کم نہیں ہیں۔ ڈاکٹر فردوس عاشق اہوان کو وہاں ایک اور تجربہ بھی ہوا وہ جلالہ کیسپ کے سترہین میں امدادی سامان تقسیم کر رہی تھیں ان کے سامنے قطار لگی تھی اور اس قطار میں بے شمار لوگ کھڑے تھے ان لوگوں میں ایک بزرگ خاتون بھی شامل تھی اتنے میں وہاں ایک بزرگ آئے انہوں نے اس خاتون کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹنا شروع کر دیا وہ بزرگ اس خاتون کو پشتوں میں گالیاں دے رہے تھے۔ ڈاکٹر فردوس عاشق نے اپنے عملے سے پوچھا "یہ باباجی اس خاتون کو کیا کہہ رہے ہیں" ڈاکٹر صاحبہ کے عملے نے بتایا باباجی اس خاتون کے شوہر ہیں وہ اسے قطار میں کھڑا دیکھ کر ناراض ہو رہے ہیں اور اسے گھسیٹ کر واپس لے جا رہے ہیں امدادی سامان تقسیم کرنے کے بعد ڈاکٹر فردوس عاشق اہوان اس بوڑھے بوڑھے کے ٹینٹ میں چلی گئیں اور ان سے اس نفرت کی وجہ پوچھی وہ بزرگ ڈاکٹر صاحبہ پر برس پڑے ان کا کہنا تھا وہ جب سوات میں تھے تو طالبان انہیں امریکیوں کا ایجنٹ قرار دے کر مارتے تھے جب فوج آئی تو انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا یہ لوگ وہاں سے نقل مکانی کر کے کیسپ میں آ گئے لیکن ان کے خاندان کے دوسرے افراد علاقے میں رہ گئے ان کے بارہ جوان بیٹے بچتے اور بھانجے پک اپ میں سوار ہوئے اور علاقے سے نکلنے لگے اس دوران ایک مارٹر گولا اس پک اپ پر آگرا اور ان کے خاندان کے بارہ جوان اسی جگہ شہید ہو گئے۔ اس بزرگ کا کہنا تھا ہماری نظر میں طالبان اور سیکورٹی فورسز میں کوئی فرق نہیں وہ بھی ہم کو مارتے تھے اور یہ بھی ہمیں ہی نشانہ بنا رہے ہیں چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا ہم بھوکے مر جائیں گے لیکن حکومت کی طرف سے بھجوا یا ہوا سامان نہیں لیں گے۔ ڈاکٹر فردوس عاشق اہوان کو وہاں جا کر معلوم ہوا دونوں میاں بیوی نے آج تک کوئی امدادی سامان نہیں لیا تھا ڈاکٹر صاحبہ نے جب سامان تقسیم کرنا شروع کیا تو خاتون بھوک سے مجبور ہو کر قطار میں کھڑی ہو گئی لیکن اس کا خاندان سے گھسیٹ کر واپس لے آیا ڈاکٹر فردوس عاشق نے ان کے ساتھ ان کے بیٹوں بچتوں اور بھانجوں کی تعزیت کی اور حکومت کی طرف سے ان سے معافی مانگی۔ ڈاکٹر صاحبہ نے بزرگ جوڑے سے کہا "میں آپ کی بیٹی ہوں اور بہنوں اپنی بیٹیوں سے ناراض نہیں ہوتے" اس بات پر دونوں میاں بیوی قائل ہو گئے چنانچہ ڈاکٹر صاحبہ ان دونوں کو اپنے کیسپ میں لے کر آئیں انہیں کھانا کھلایا ان کا طبی معائنہ کرایا اور انہیں امدادی سامان دیا اس سلوک پر وہ خاتون وقافی وزیر کے گلے لگ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

یہ صرف ایک کہانی نہیں بلکہ کیسپوں میں موجود ہر خاندان کے پاس ایک ایسی ہی خوفناک کہانی موجود ہے یہ سب لوگ اپنے اپنے دل میں اپنے کسی عزیز رشتے دار کی نعش چھپا کر بیٹھے ہیں یہ سب لوگ اپنے بھرے بھرائے گھر چھوڑ کر آئے ہیں ان لوگوں کے اپنے گھر تھے ان کی اپنی دکانیں تھیں ان کی اپنی گازیاں تھیں ان کے اپنے کھیت تھے اور ان کے اپنے باغ تھے ان لوگوں کی فصلیں تک تیار تھیں سوات سے ہر سال ایک ارب روپے کا فروٹ پنجاب اور سندھ آتا تھا ان کے باغ پک چکے ہیں اور پھل درختوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں لیکن یہ

لوگ اپنے باغوں اپنی زمینوں سے سینکڑوں میل دور دوسروں کے ٹکڑوں پر پڑے ہیں۔ آپ ان لوگوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اندازہ لگائیے، نقل مکانی موت سے بدتر عذاب ہوتا ہے کیونکہ موت کے بعد انسان پرسکون ہو جاتا ہے لیکن نقل مکانی ایک ایسی موت ہوتی ہے جس کا ذائقہ انسان ہر سانس کے ساتھ جھیلتا ہے یہ حقیقت ہے انسان جب اپنے گھر سے نکل کر دور بدر ہوتا ہے تو اس کی ساری نفسیات بدل جاتی ہے اور وہ اگر واپس بھی آ جائے تو بھی اس کے جذبات کو اپنی جگہ پر واپس آنے میں کمی رہائیاں لگ جاتی ہیں یہ لوگ بھی اس وقت اسی قسم کی کیفیت سے گزر رہے ہیں اور ہم نے اگر اس وقت ان لوگوں کو محبت نہ دی ہم نے ان کے زخموں پر مرہم نہ رکھا ہم نے ڈاکٹر فرانس عاشق اعوان کی طرح ان لوگوں کو سینے سے لگا کر ان کے درد کو باہر نکالنے کا راستہ نہ دیا ہماری حکومت نے انہیں پیارا اور کیترنہ دی اور پورے ملک نے اپنا سینہ ان کے لیے نہ کھولا تو یہ لوگ ان طالبان کو اپنا لیڈر مان کر واپس جائیں گے جن سے نفرت کی وجہ سے ان لوگوں نے سیمٹل ایریا یاز کا رخ کیا تھا لہذا ہم سب لوگوں کو فوری طور پر ان پر شک بند کر دینا چاہیے یہ سب لوگ ہمارے بہن اور بھائی ہیں اور ان کے ساتھ بہنوں اور بھائیوں جیسا سلوک ہونا چاہیے۔ حکومت کو چاہیے یہ اپنے 92 وزراء کے مختلف گروپ بنائے اور یہ وزراء آٹھ آٹھ کے گروپ میں کمیٹیوں میں جائیں اور تین تین چار چار دن کمیٹیوں میں گزار کر آئیں۔ صدر روزیرا عظیم چیئر مین سینٹ اور سپیکر صلابہ بھی ہر ہفتے کمیٹیوں کا دورہ کریں اور لوگوں سے فردا فردا دل کر ان کے مسائل سنیں۔ یہ لوگ اگر سندھ پنجاب اور بلوچستان میں اپنے عزیزوں کے پاس جانا چاہتے ہیں تو ان کی رجسٹریشن کریں اور انہیں ریل کا مفت ٹکٹ دے کر وہاں پہنچادیں تاکہ یہ لوگ عزت کے ساتھ یہ گرمیاں گزار سکیں اور فوج نے جو علاقے کلیئر کر دیئے ہیں وہاں کی زمین اور باغ مالکان کے حوالے کر دیئے جائیں تاکہ یہ لوگ اپنا پھل اور فصلیں سمیٹ سکیں اور ان کی فروخت سے اپنے نان نفلے کا بندوبست کر سکیں۔ حکومت فضائی بمباری اور ہیلنک بھی روک دے اور زمینی دستوں کو آگے بڑھانے اس سے اجتماعی نقصان بھی کم سے کم ہوگا لوگوں کی اہلک بھی محفوظ رہیں گی اور یہ لوگ کل کلاں اپنے گھروں میں دوبارہ آباد بھی ہو سکیں گے۔

یہ ایک نازک گھڑی ہے اگر ہم نے اس گھڑی میں احتیاط سے کام نہ لیا تو ان 29 لاکھ مہمانوں کو طالبان بننے دینے نہیں لگے گی یہ لوگ دلوں میں دشمنی کا بیج لے کر واپس جائیں گے اور یہ اس ملک کی جہاد کے لیے انتہائی خطرناک ہوگا۔



یس وی کین

لائگ مارچ سے دو دن پہلے ایک سینئر سیاستدان میرے ساتھ شرط لگانے کے لیے تیار تھے ان کا کہنا تھا "یہ لائگ مارچ کامیاب نہیں ہوگا" میں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا "اگر یہ لائگ مارچ کامیاب ہو گیا تو عوام کو اپنی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ملک میں مارشل لا لگانا ممکن نہیں رہے گا" میں نے حرمت سے پوچھا "لائگ مارچ کا مارشل لا کے ساتھ کیا تعلق ہے؟" سینئر سیاستدان نے قبضہ لگایا اور جواب دیا "تم اگر تاریخ کا مطالعہ کرو تو تمہیں معلوم ہوگا جس ملک کے عوام کو اپنی طاقت کا اندازہ ہو جاتا ہے، جنہیں لائگ مارچ کا ڈھنگ آ جاتا ہے اور جو اپنے حقوق کے لیے سڑکوں پر آ جاتے ہیں اس ملک میں مارشل لا نہیں لگ سکتا" میں خاموشی سے سنتا رہا وہ بولے "عوام پاکستان کی تاریخ میں 9 مارچ 2007ء کے بعد پہلی بار چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے لیے سڑکوں پر آنے اور اس وقت تک سڑکوں سے واپس نہیں گئے جب تک جنرل پرویز مشرف جیسا آمر پسپا نہیں ہوا"۔ میں ان کی بات سنتا رہا وہ بولے "یہ لائگ مارچ نظام کے خلاف عوام کی تیسری بغاوت ہے پہلی بغاوت مارچ 2007ء کو شروع ہوئی تھی جس کے نتیجے میں سپریم کورٹ کے 17 ججز افتخار محمد چودھری کو 20 جولائی 2007ء کو بحال کرنے پر مجبور ہوئے جنرل پرویز مشرف نے یو پی فارم اتاری محترمہ بے نظیر بھنڈو اور میاں نواز شریف کو پاکستان آنے کی اجازت دی انکیشن کرائے اور اقتدار پاکستان پیپلز پارٹی کے حوالے کیا۔ دوسری بغاوت 13 جون 2008ء کے لائگ مارچ کی صورت میں سامنے آئی اور وہ بغاوت صدر پرویز مشرف کو تاریخ کے ریلے میں بہا لے گئی اور اب یہ عوام کی تیسری بغاوت ہے۔ اگر یہ بغاوت بھی کامیاب ہوگی اگر اس لائگ مارچ کے نتیجے میں افتخار محمد چودھری بحال ہو گئے تو عوام کو یقین ہو جائے گا وہ اکیلے بڑے بڑے بتوں کو پاش پاش کر سکتے ہیں چنانچہ اس کے بعد فوج اقتدار پر قبضہ کر سکے گی اور نہ ہی حکومت کا کوئی عہدیدار عوامی وعدوں سے پھر سکے گا اور یہ وہ روایت ہے جس کی اجازت اسٹیبلشمنٹ کبھی نہیں دے گی کیونکہ اس کے بعد جب بھی فوج ہارکوں سے باہر آئے گی عوام سینہ کھول کر اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے اور فوج کو صدر پرویز مشرف کی طرح پسپائی اختیار کرنا پڑے گی"۔

میرے سینئر سیاستدان دوست خاموش ہوئے تو میں پوری طرح قائل ہو گیا چنانچہ میرا خیال تھا یہ لاگت مارچ کامیاب نہیں ہوگا عوام سڑکوں پر نکلیں گے اور گورنر پنجاب سلمان تاثیر پولیس کے ذریعے ان کے سارے خواب کچل دیں گے اور اگر کسی نہ کسی طرح لاگت مارچ کے پانچ دن ہزار شہداء اسلام آباد پختونپختے میں کامیاب بھی ہو گئے تو رحمان ملک ان کی خواہشوں پر کوئی کنیشنز گرا دیں گے یوں یہ تحریک ہمیشہ ہمیش کے لیے ختم ہو جائے گی لیکن 15 مارچ کا سورج ایک نئی تاریخ لے کر طلوع ہوا میں نے سب سے پہلے مال روڈ لاہور سے پولیس کو پہنچا ہوتے دیکھا عوام نے پولیس کی ساری رکاوٹیں اٹھا کر دور پھینک دیں اور مال روڈ پر عوام کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے بعد میاں نواز شریف کا قافلہ چلا تو رکاوٹیں ہٹی چلی گئیں اور پولیس انتظامیہ اور کنیشنز پہنچا ہوتے چلے گئے جس کے بعد ٹیلی ویژن سکرینوں پر عوام کا سیلاب سیلاب دکھائی دینے لگا یہ سیلاب اسلام آباد کی طرف بڑھا تو میں نے پہلی بار اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھ پر پینٹ دیکھا حکومت کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس نے اس سیلاب کو روکنے کے لیے وہ تمام جھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے جو اس ملک میں پچھلے 60 سال سے استعمال ہو رہے ہیں پولیس بھی استعمال ہوئی میڈیا کو بانے کی کوشش بھی کی گئی لٹافوں اور بریف کیسوں کا بندوبست بھی کیا گیا اور سیاسی جمہدوں کی آفرز بھی کی گئیں لیکن یہ تمام جھکنڈے ناکام ہو گئے اور حکومت اپنے اپنے "کنیشنز" میں سستی چلی گئی اور یہ وہ مرحلہ تھا جب طاقت کے سارے ستون ایک جگہ جمع ہوئے اور انہوں نے رات گئے معطل چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو نکالا تحریک کے راہنما چودھری اعجاز احسن میاں شہباز شریف اور میاں نواز شریف کو بھی "لوپ" میں لیا اور یوں اس مسئلے کا ایک پرامن حل تلاش کر لیا گیا۔ وزیراعظم صاحب نے تجہ کے وقت چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی کا اعلان کر دیا۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری بحال ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک خدشات موجود ہیں کیونکہ آپ اگر آصف علی زرداری کے ماضی کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا وہ زیادہ دیر تک دوسروں کے دباؤ میں نہیں رہتے اور یہ حقیقت ہے یہ فیصلہ ان سے زبردستی کرایا گیا تھا لہذا سوال یہ ہے کیا یہ کوئی نیا راستہ نہیں نکال لیں؟ صدر آصف علی زرداری نے ابھی تک عوام کے سامنے آ کر اس فیصلے کی تصدیق نہیں کی صدر نے اس فیصلے کو دل سے تسلیم نہیں کیا چنانچہ آنے والے دنوں میں ایوان صدر اور سپریم کورٹ ایک بار دو بارہ ایک دوسرے کے سامنے ضرور آئیں گے۔

آپ اب دوسری صورت حال بھی ملاحظہ کیجئے پاکستان میں عوام کو پہلی بار اپنی طاقت کا اندازہ ہونا ماؤزے تک نے 1934ء میں کہا تھا "جب تک کمزور لوگ اپنی کمزوری کو طاقت نہیں بناتے اس وقت تک انقلاب نہیں آتا"۔ یہ لاگت مارچ دیکھ کر محسوس ہوتا ہے عوام نے اپنی کمزوری کو اپنی طاقت بنا لیا ہے چنانچہ پہلی بار اسٹیبلشمنٹ کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اگر عوام کے یہ جذبات یہ اتحاد اور اپنے طاقتور ہونے کا یہ احساس اسی طرح آگے بڑھتا رہتا تو مجھے یقین ہے کوئی طاقت پاکستان کو ترقی سے نہیں روک سکے گی۔ اگر لاگت مارچ کی یہ سپرٹ اسی طرح قائم رہی تو آج کے بعد پاکستان میں کوئی حکومت عوامی وعدوں سے مکر نہیں سکے گی کوئی سیاستدان لوٹا نہیں سکے گا کوئی

سیاسی جماعت ہارس ٹریڈنگ نہیں کر سکتے گی، کوئی مسلمان تاشیر اور کوئی رحمان ملک پولیس کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کر سکتے گا، کوئی شوکت عزیز کراچی سٹیل ملز کا سودا نہیں کر سکتے گا، کوئی حکمران امریکہ کو ڈرگز حملوں کی اجازت نہیں دے سکتے گا اور کوئی دزیر سرکاری خزانہ نہیں لوٹ سکتے گا۔ عوام نے اسٹیبلشمنٹ کا ایک بت توڑ دیا ہے اگر عوام نے اپنے اس جذبے کو قائم رکھا تو ملک سے امریکی اثر و رسوخ بھی ختم ہو جائے گا، عوام دہشت گردی کا خاتمہ بھی کر سکیں گے اور یہ لوگ لائیک مارچ کی سپرٹ سے ملک سے بے انصافی، غربت، بد امنی، بے روزگاری اور بیماری بھی ختم کر سکیں گے۔ امریکہ کے موجودہ صدر باراک حسین اوباما نے اپنی اینکشن مہم کے دوران چیچنگ یعنی تبدیلی کا نعرہ لگایا تھا وہ اپنی ہر تقریر کے آخر میں کہتے تھے "یس وی کین" یعنی ہم لوگ ملک کے موجودہ حالات تبدیل کر سکتے ہیں۔ اوباما کا نعرہ سچ ثابت ہوا اور امریکہ کی تاریخ میں بھی پہلی بار سیاہ فام شخص طاقت کے سفید عمل میں داخل ہو گیا۔ 9 مارچ 2007ء کو پاکستان کے عوام نے بھی افتخار محمد چودھری کا ساتھ دے کر "یس وی کین" کا نعرہ لگایا تھا اس نعرے پر اس وقت پاکستان کے ہر طاقتور شخص نے تہقہ لگایا تھا، یہ لوگ 15 مارچ 2009ء کی شام تک قہقہے لگاتے رہے تھے لیکن پھر رات ڈھلتے ہی پاکستانی عوام نے ثابت کر دیا "یس وی کین"۔ جس کے بعد طاقتور لوگوں کے کمر وہ قہقہے بھر مندہ ہو گئے۔ میری دعا ہے "یس وی کین" کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہے اور طاقتور لوگوں کو عوام کی کمزوری پر دوبارہ قہقہے لگانے کی جرأت نہ ہو کیونکہ اب صرف کمزور لوگ ہی اس ملک کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ یہ ہم جیونیاں ہیں جنہوں نے حالات اور نظام کے ہاتھیوں کو شکست دینی ہے چنانچہ اس ملک کے کمزور لوگو! خدا کے لیے اب "یس وی کین" کا علم نیچے نہ ہونے دینا آگے بڑھو، منزل اب دور نہیں۔



آٹھ بجے

”میں بتاتا ہوں سچی محبت کیا ہوتی ہے“ ڈاکٹر نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا اور کافی کے گم سے پھینکے لگا، ہم غور سے اس کی بات سننے لگے وہ گویا ہوا ”میں ایک دن کلینک میں بیٹھا تھا، صبح کے ساڑھے سات بجے تھے ایک بوڑھا مریض بھاگتا ہوا کلینک میں داخل ہوا، اس کے ہاتھ پر پینہ تھا، سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور وہ بار بار دل پر ہاتھ رکھتا تھا، میرا سانس تیزی سے اس کی طرف بڑھا، بوڑھے کی عمر اسی برس سے زائد تھی لیکن وہ اس کے باوجود چلنے پھرنے کی پوزیشن میں تھا، وہ نرس اور وارڈ بوائے سے بحث کرنے لگا، میں دفتر کے شیشے سے انہیں الجھتے ہوئے دیکھنے لگا، ڈاکٹر بعد وارڈ بوائے میرے پاس آیا، میں اس وقت اخبار پڑھ رہا تھا، میں نے اخبار ایک طرف رکھا اور استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا، وارڈ بوائے نے بتایا باباجی کے انگوٹھے پر چوٹ لگی تھی، ہم نے تین ہفتے پہلے ان کے ٹانگے لگا دیے تھے، وہ ٹانگے کھلوانے آئے ہیں، میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور وارڈ بوائے سے کہا، باباجی سے کہو، میں آٹھ بجے کام شروع کروں گا، وہ آدھ گھنٹہ انتظار کر لیں، میں سب سے پہلے ان کے ٹانگے کھولوں گا، وارڈ بوائے گیا اور فوراً واپس آ گیا، میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا، وہ گھبرا کر بولا، باباجی کو بہت جلدی ہے، انہوں نے آٹھ بجے کہیں پہنچنا ہے، وہ ہماری منت کر رہے ہیں، مجھے باباجی اور وارڈ بوائے دونوں پر غصہ آ گیا، میں نے اخبار میز پر بچھا اور شیشے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا، باباجی دروازے کے بالکل سامنے کھڑے تھے ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے، میں نے انہیں ڈانسنے کی کوشش کی لیکن پھر ان کی حالت دیکھ کر ضبط کر گیا، میں نے انہیں بتایا کلینک کا وقت آٹھ بجے شروع ہوتا ہے، میں صرف اخبار پڑھنے کیلئے آدھ گھنٹہ پہلے آ جاتا ہوں، آپ امینا سے بیٹھ جائیں جو ہی آٹھ بجیں گے، میں سب سے پہلے آپ کو دیکھوں گا، باباجی نے گھڑی کی طرف دیکھا اور لجاجت بھری آواز میں بولے، بیٹا جی میں نے آٹھ بجے دوسرے ہسپتال پہنچنا ہے، میں لیٹ ہو رہا ہوں، اگر میں پانچ منٹ میں یہاں سے نہ نکلا تو میں وقت پر وہاں نہیں پہنچ سکوں گا اور اس سے میرا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا، پلیز میرے اوپر مہربانی کریں، باباجی نے اس کے ساتھ ہی میری ٹھوڑی پکڑ لی، میرا غصہ چست کو چھوٹنے لگا، میں باباجی کی عمر دیکھ کر چپ ہو گیا، میں انہیں کلینک

میں لے آیا، مزے سنگوائی اور احتیاط سے ان کے ٹانگے کھولنے لگا، باباجی اس سارے عمل کے دوران بار بار گھڑی دیکھتے رہے۔

ڈاکٹر کا اس نے لمبا سانس بھر اور دوبارہ بولا "میں نے ٹانگے کھولتے ہوئے باباجی سے پوچھا آپ نے کہاں جانا ہے باباجی نے بتایا 'فلاس ہسپتال میں ان کی بیوی داخل ہے اور وہ ہر صورت آٹھ بجے اس کے پاس پہنچنا چاہتے ہیں' میں نے پوچھا خدا نخواستہ آپ کی بیگم کا آپریشن تو نہیں، باباجی نے جواب دیا 'نہیں میں روز صبح آٹھ بجے ہسپتال پہنچ کر اسے ناشتہ کراتا ہوں' مجھے ان کے جواب نے حیران کر دیا، میں نے پوچھا 'کیوں باباجی بولے وہ پانچ سال سے ہسپتال میں ہے اور میں پچھلے پانچ سال سے روز آٹھ بجے اس کے ہسپتال پہنچتا ہوں اور اسے اپنے ہاتھ سے ناشتہ کراتا ہوں' میں نے حیرت سے پوچھا 'پانچ سال میں آپ کبھی لیٹ نہیں ہوئے باباجی نے انکار میں سر ہلا کر جواب دیا 'جی نہیں آندھی ہو طوفان ہو سیلاب ہو بارش ہو سردی ہو یا گرمی میں کبھی لیٹ نہیں ہوا' میں نے پوچھا لیکن کیوں؟ باباجی مسکرائے 'میں اس کا قرض ادا کر رہا ہوں' ہم نے پچاس برس اکٹھے گزارے ہیں ان پچاس برسوں میں اس نے مجھے روزانہ آٹھ بجے ناشتہ کرایا تھا، ہمارے گھر میں نوکروں اور خادموں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن سردی ہو، گرمی ہو، بارش ہو، سیلاب ہو طوفان ہو یا آندھی وہ ہمیشہ ساڑھے چھ بجے جاگتی تھی، اپنے ہاتھوں سے ناشتہ بناتی تھی اور ٹھیک آٹھ بجے جب میں اوپر سے نیچے آتا تھا تو وہ میز پر ناشتہ لگا کر میرا انتظار کرتی تھی، ہم دونوں ہمیشہ اکٹھے ناشتہ کرتے تھے اس نے پچاس برسوں میں کبھی اس معمول میں تغیر نہیں آنے دیا، وہ میرے ناشتے کی وجہ سے کبھی میسے نہیں گئی، پانچ برس پہلے وہ ہسپتال میں داخل ہوئی تو یہ ڈیوٹی میں نے سنبھال لی، اب میں روزانہ ساڑھے چھ بجے جاگتا ہوں اور آٹھ بجے سے پہلے اس کے کمرے میں پہنچ جاتا ہوں، میں ناشتہ بناتا ہوں اور پھر دم دوں اکٹھے ناشتہ کرتے ہیں، میری حیرت پریشانی میں داخل ہو گئی اور میں نے باباجی سے پوچھا 'آپ کی بیگم کو کیا بیماری ہے باباجی نے حسرت سے میری طرف دیکھا اور سسکی لے کر بولے 'ان کی یادداشت ختم ہو گئی ہے وہ اپنا نام ہی حال اور مستقبل بھول گئی ہیں، انہیں اپنا نام تک یاد نہیں، وہ دنیا کے کسی شخص کو نہیں پہچانتی، وہ بولنا تک چھوڑ چکی ہیں، انہیں پچھلے ایک سال سے کسی زبان کا کوئی لفظ یاد نہیں، ڈاکٹر انہیں جیلی پرسن کہتے ہیں۔"

ڈاکٹر کا اس نے لمبی سانس لی اور دوبارہ گویا ہوا "میں نے باباجی سے کہا اس کا مطلب ہے آپ کی بیگم کو الٹا ماٹیر ہے! باباجی نے سر ہلا کر تصدیق کر دی، میں نے باباجی سے پوچھا "کیا وہ آپ کو پہچانتی ہیں؟ باباجی نے فوراً انکار میں سر ہلایا اور کھی آہ از میں بولے "وہ پانچ سال سے مجھے نہیں پہچان رہی، وہ یہ جانتی ہی نہیں، میں کون ہوں اور روز صبح آٹھ بجے اس کے پاس کیوں آ جاتا ہوں؟ ڈاکٹر نے رک کر ہماری طرف دیکھا اور اس نے کہانی کے سرے جوڑتے ہوئے بتایا "باباجی کے ٹانگے اتر چکے تھے، میں نے سپرٹ سے ان کا زخم صاف کیا، اس پر پاؤ ڈر چمڑکا اور ان سے عرض کیا 'آپ ہماری طرف سے فارغ ہیں، آپ جا سکتے ہیں، بابا جی نے اپنی چھڑی اٹھائی اور ماہر کی طرف چلے گئے، میں ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا جب وہ ماہر کے

دروازے کے پاس پہنچے تو میں نے ان سے آخری سوال پوچھا، میں نے ان سے پوچھا جب آپ کی بیگم آپ کو پہچانتی ہی نہیں، جب ان کی نظر میں وارڈ بوائے اور آپ میں کوئی فرق نہیں تو آپ روز آٹھ بجے یہ تکلیف کیوں کرتے ہیں، باباجی نے مزہ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے، لیکن میں تو اسے پہچانتا ہوں، میں تو یہ جانتا ہوں وہ کون ہے اور میری زندگی میں اس کی کیا اہمیت، اس کی کیا حیثیت ہے، وہ ر کے اور دو بارہ بولے یادداشت اس کی ختم ہوئی ہے میری نہیں لہذا وہ آخری سانس تک میری بیوی ہے اور میں اسی طرح اس کی خدمت کرتا رہوں گا، باباجی ر کے اور دو بارہ بولے محبت کا تعلق یادداشت سے نہیں ہوتا، اس کا جسم اور دماغ سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا، یہ دل میں پیدا ہوتی ہے اور دل کی آخری دھڑکن تک قائم رہتی ہے لہذا اگر آپ کا ساتھی آپ کو نہیں پہچانتا تو آپ کے دل میں اس کی محبت کم نہیں ہوتی چاہیے وہ ر کے انہوں نے سانس لیا اور دو بارہ بولے، میں کبھی کبھی سوچتا ہوں اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو کیا وہ مجھے فراموش کر دیتی؟ نہیں وہ مجھے کبھی فراموش نہ کرتی، وہ ٹھیک آٹھ بجے ناشتے کی ٹرے لے کر روز میرے سرہانے کھڑی ہو جاتی لہذا میں سوچتا ہوں اگر میری یادداشت جانے سے اس کی محبت کم نہیں ہو سکتی تو میری محبت کیسے کم ہو سکتی ہے، باباجی کلینک کی سیزرھیاں اترے، باہر ٹیکسی کھڑی تھی، وہ ٹیکسی کی اگلی سیٹ پر بیٹھے، انہوں نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر مجھے "دش" کیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے لیکن میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور مجھے اس لمحے محسوس ہوا جی محبت کیا ہوتی ہے!"

ڈاکٹر کا، اس نے آنسو پونچھے اور ہماری طرف دیکھ کر بولا "اس کے بعد وہ باباجی مجھے کبھی نہیں ملے لیکن جوں ہی آٹھ بجتے ہیں تو وہ مجھے فوراً یاد آ جاتے ہیں اور میں محبت کے تصور میں گم ہو جاتا ہوں، میری زندگی میں آٹھ بجے کا لمحہ ہمیشہ محبت لے کر آتا ہے اور میں اپنے ساتھ عہد کرتا ہوں میری بیوی مجھ سے جتنی محبت کرتی ہے، میں اس محبت کا قرض چکائے بغیر اس دنیا سے نہیں جاؤں گا" ڈاکٹر خاموش ہوا تو ہم سب کی آنکھیں بولنے لگیں اور ہم انہیں خاموش کرنے کیلئے نشوونما تلاش کرنے لگے۔



پچاس پینی کا سکہ

میں نے سکہ ہوا میں اچھا دیا سکہ اوپر اٹھا چند سیکنڈ ہوا میں قلابازیاں کھائیں اور پھر بڑی تیزی سے نیچے آنے لگا میں نے اپنی آہٹیلی آگے کر دی اندازہ درسا غلط ثابت ہوا سکہ میرے انگوٹھے سے نکل آیا اور فٹ پاتھ پر گر گیا میں سکہ اٹھانے کیلئے جھکا لیکن سکہ نے میرے آگے آگے دوڑ لگا دی وہ فٹ پاتھ سے سڑک پر گرا اور دوڑتا ہوا سڑک کے درمیان میں پہنچ گیا میں اس وقت وہاں سے جیسی گزری سکہ جیسی کے پیسے سے نکل آیا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہنری غور سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا میں سکہ سے مایوس ہو کر آگے چل پڑا میں نے چند قدموں کے بعد واپس مڑ کر دیکھا تو ہنری سڑک کے درمیان کھڑا تھا اور گاڑیاں پوری رفتار سے اس کے دائیں بائیں سے گز رہی تھیں میں واپس آ گیا ہنری سڑک پر جھک کر سکہ تلاش کر رہا تھا وہ اس وقت بہت مشکل خیر لگ رہا تھا ہوا تیزی ہنری نے ایک ہاتھ سے دگ تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ کوٹ کے بجز بھڑاتے دامن پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ شتر مرغ کی طرح جھک کر سکہ تلاش کر رہا تھا اور میں لندن کی سردی میں فٹ پاتھ پر کھڑا سے دیکھ رہا تھا اور پریشان ہو رہا تھا وہ سڑک کے عین درمیان بیٹھ گیا اس نے ٹائی کی پین ٹکالی اور سڑک کی درز میں کھرنے لگا وہ چند منٹوں تک اس کام میں مصروف رہا اور بالآخر سکہ نکالنے میں کامیاب ہو گیا اس نے فخر سے مجھے سکہ دکھایا اور گاڑیوں سے بچتا بچتا واپس فٹ پاتھ پر آ گیا اس کی آہٹیلی پر پچاس پینی کا سکہ تھا۔

دنیا میں ہر شخص کی کوئی نہ کوئی کمزوری کوئی نہ کوئی شوق ہوتا ہے میرا شوق اور میری کمزوری "کامیابی" ہے مجھے کامیاب لوگوں سے ملنے کا بے انتہا شوق ہے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں وہ کون سا ہنر وہ کون سا فارمولہ ہے جو ایک عام سادہ سے شخص کو زمین سے اٹھا کر کامیابی کے آسمان پر پہنچا دیتا ہے میں اس شوق کی تکمیل کیلئے آدمی دنیا پھر چکا ہوں اور اب تک آئی کیا کوکا سے لے کر ایل ٹیس تک درجنوں کامیاب لوگوں سے مل چکا ہوں لیکن مجھے ابھی تک کامیابی کی اصل وجہ معلوم نہیں ہو سکی میں کامیابی کا کوئی کپسول فارمولہ دریافت نہیں کر سکا ہنری بھی ان کامیاب لوگوں میں سے ایک تھا ہنری کا شمار لندن کے سوامیر ترین لوگوں میں ہوتا تھا وہ "کیش اینڈ کیری" کے

برنس سے وابستہ تھا اور لوگ حقیقتاً اس کی کامیابی پر حیران تھے اس نے یہ تمام تر کامیابی صرف پانچ برسوں میں حاصل کی تھی میرا ایک دوست ہنری کا پارنٹر تھا اس نے مجھے ہنری کی کہانی سنائی تو میں "موٹی ویٹ" ہو گیا میرے دوست نے ہنری کے ساتھ میری ملاقات طے کر دی میں لندن گیا ہنری سے ملا اس کے ساتھ کامیابی پر گپ شپ کی لیکن مجھے اس میں کوئی خاص بات محسوس نہ ہوئی ہنری ایک عام درمیانے درجے کا گورا تھا جس کی کوئی لمبی چوڑی فلاسفی نہیں تھی اس کا کہنا تھا بس انسان کو دن رات محنت کرنی چاہیے اور وہ کبھی نہ کبھی ضرور کامیاب ہو جائے گا اس کی بات میرے بنیادی خیال سے مختلف تھی میرا خیال ہے محنت دنیا کا ہر شخص کرتا ہے لیکن کامیاب صرف چند لوگ ہوتے ہیں ان چند لوگوں اور باقی لوگوں کی محنت میں کیا فرق ہے؟ یہ فرق بنیادی طور پر کامیابی کا فارمولا ہے لیکن ہنری یہ فرق واضح کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا بات چیت کے دوران اس نے مجھے لہجے کی دعوت دی میں نے اس کی دعوت قبول کر لی وہ مجھے آکسفورڈ سٹریٹ کے ایک اطالوی ریسٹوران میں لے گیا ہم نے کھانا کھایا اور پیدل اس کے دفتر کی طرف چل پڑے میری جیب میں پچاس پینی کا سکے تھا میں نے یہ سکے نکالا اور ہوا میں اچھالنا شروع کر دیا سکے ہوا میں اچھالنے آتا اور میں اسے کچھ کر لیتا سکے کی اسی اچھال کو وہ دوران کہانی کا دوسرا حصہ شروع ہو گیا۔

ہنری کی اچھالی پر پچاس پینی کا سکے تھا اس نے مجھے سکے دکھایا اور مسکرا کر بولا "میری کامیابی کا آغاز پچاس پینی کے سکے سے ہوا تھا لہذا میں دھات کے اس معمولی سکے کی قدر و قیمت سے واقف ہوں" میں غور سے اس کی بات سننے لگا "وہ بولا" مجھے جوئے کی لت تھی میرے دن کا آغاز کسی نہ کسی کسبے سے ہوتا تھا اور جب تک اس کسبے کی ساری تیریاں اور سارے دروازے بند نہیں ہو جاتے تھے میں جوا کھیلتا رہتا تھا ایک رات میں اپنا سب کچھ ہار گیا میرا مکان 'میری گاڑی' میرا کوٹ 'میری گھڑی' حتیٰ کہ میری عینک تک جوئے میں چلی گئی میں مایوس ہو کر جوئے کی میز سے اٹھنے لگا تو جیتے ہوئے جواری نے جیب سے پچاس پینی کا سکے نکالا اور میری طرف اچھال کر بولا "میری طرف سے پہلی خیرات قبول کرو میں نے ہوا میں اچھالا ہوا سکے دبوچ لیا اور چپ چاپ کسبے سے باہر آ گیا میں بھکاری بن چکا تھا میں آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنے لگا "ہنری رکا" اس نے لمبا سانس لیا اور اس لہجے میں بولا "دنیا میں بے شمار قسم کی ناکامیاں ٹھکتیں اور محرومیاں ہوتی ہیں ہر ناکامی کا اپنا ایک دکھ ہوتا ہے لیکن تم ہمارے ہوئے جواری کی ناکامی اور اس ناکامی کے دکھ کی گہرائی کا اندازہ نہیں لگا سکتے یہ دکھ انسان کی آخری نس آخری سر سے تک جاتا ہے میں اس وقت اسی دکھ میں مبتلا تھا اور فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا راستے میں مجھے پیشاب آ گیا میں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن جب بے بس ہو گیا تو میں نے ٹوائلٹ کی تلاش شروع کر دی سڑک کے کونے میں ایک موبائل ٹوائلٹ تھا یہ سکوں سے کھلنے والے ٹوائلٹ ہوتے ہیں آپ ان میں سکے ڈالنے ہیں تو ان کا دروازہ کھل جاتا ہے میری جیب میں پچاس پینی کا وہ سکے تھا جو مجھے میرے جواری دوست نے بھیک میں دیا تھا میں نے سکے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور ٹوائلٹ کے سامنے کھڑا ہو گیا اتنے میں ٹوائلٹ کا دروازہ کھلا اندر سے ایک ایشیائی ماشدہ نکلا وہ دروازہ کھڑکڑا کر کھلا اور مسکرا کر بولا "میں نے یہ سکے کھڑکڑا کر کھلائے تھے۔"

داخل ہو جاؤ اس سے تمہارا سکہ بیچ جائے گا میں نے قہقہہ لگایا سکہ واپس جیب میں ڈالا اور شکر یہ ادا کر کے اندر داخل ہو گیا میرا سکہ بیچ گیا مجھے آدھے گھنٹے میں دوسری بار خیرات ملی تھی میں نوائلٹ سے نکلا تو سامنے ایک چھوٹی سے دکان تھی اس دکان میں جوئے کی مشین لگی تھی میں اس مشین کے سامنے رکا جیب سے سکہ نکالا اور یہ سکہ مشین میں ڈال دیا پھر وہاں ایک معجزہ ہوا اور مشین سے دھڑا دھڑا سکہ نکلنے لگے میں نے پچاس پینی سے ایک ہزار پاؤنڈ جیت لئے میں نے وہ ہزار پاؤنڈ لئے اور بھاگ کر واپس کھینچ لیا یہاں سے مجھ پر خوش قسمتی کے دروازے کھلتے ہیں میں نے اس رات پانچ لاکھ پاؤنڈ جیت لئے میں نے پانچ لاکھ پاؤنڈ کا چیک جیب میں ڈالا اور جوئے کو ہمیشہ ہمیشہ خیر باد کہہ دیا مجھے یقین ہو گیا میں خوش قسمتی کے اس دور میں داخل ہو چکا ہوں جس میں مٹی سونا بن جاتی ہے میں نے اگلے دن اس ایشیائی باشندے کی تلاش شروع کر دی جس نے نوائلٹ کا دروازہ پکڑ کر میرا پچاس پینی کا سکہ بچایا تھا وہ مجھے دو ہفتے کی تلاش کے بعد ملا وہ کیپ ڈرائیو تھا میں نے اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا ہم نے کتنی بنائی اور کیش ایجنڈ کیری کا بزنس شروع کر دیا ہمارا کام چل نکلا آج صرف پانچ سال بعد میرا شمار لندن کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔“

وہ سانس لینے کیلئے رکا اس کی کہانی حقیقتاً حیران کن تھی اس نے لمبا سانس بھرا اور مسکرا کر بولا ”آپ کو زندگی میں بے شمار سکے بے شمار نوٹ ملے ہیں ان نوٹوں ان سکوں میں آپ کے مقدر کا وہ سکہ بھی ہوتا ہے جو آپ کیلئے کامیابی کے سارے دروازے کھول دیتا ہے لیکن ہم لوگ اپنی بے وقوفی اور اپنے غرور کے باعث اپنے مقدر کا وہ سکہ کسی فنٹ پاتھ پر پھینک دیتے ہیں کسی جواری کی جیب میں ڈال دیتے ہیں یا پھر اپنے بیڈروم کے کسی کونے میں اچھال دیتے ہیں اور اس کے بعد اپنی محرومیوں اور اپنی ناکامیوں کا شکوہ کرتے ہوئے پوری زندگی گزار دیتے ہیں یہ سکہ یہ چند نوٹ وہ چاہیاں ہوتے ہیں جن سے مقدر کے دروازے کھلتے ہیں لیکن ہم ان چاہیوں سے واقف نہیں ہوتے تم بل ٹینس سے وارن ہنٹ تک کسی کامیاب شخص کا پروفائل نکال کر دیکھ لو تمہیں اس کی ہتھیلی پر اسی قسم کا کوئی سکہ کوئی نوٹ ملے گا“ وہ رکا اور بس کر بولا ”تمہیں معلوم ہے وہ شخص کون تھا جس نے نوائلٹ کا دروازہ پکڑ کر میرا پچاس پینی کا سکہ بچایا تھا“ میں خاموشی سے اس کی شکل دیکھتا رہا وہ مسکرایا ”وہ تمہارا ہی پاکستانی دوست ہے جو تمہیں میرے پاس چھوڑ کر گیا ہے“ حیرت سے میرا منہ کھل گیا ہنری نے قہقہہ لگایا ”میرا ہاتھ کھولا پچاس پینی کا سکہ میری ہتھیلی پر رکھا“ شفقت سے میرا گال تھپتھپایا اور مجھے فنٹ پاتھ پر چھوڑ کر اپنے دفتر میں داخل ہو گیا میں نے سکہ کو فور سے دیکھا اس میں ہنری کی ہتھیلی کی گرہائش ابھی تک موجود تھی میں مسکرایا اور سکہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔



کیلئے ہسپتال گیا، مجھے مریضہ کا کردہ معلوم نہیں تھا لہذا میں پرائیویٹ وارڈ کے مختلف کمروں کا جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، میں نے ایک کمرے کے دروازے پر دستک دی اندر سے کسی خاتون کی آواز آئی، کم این میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا، اندر بیڈ پر ایک بزرگ لیٹے تھے ان کی ناک پر آکسیجن کا ماسک چڑھا تھا وہ ناف تک برہنہ تھے اور ان کی چھاتی پر بے شمار تاریں پائپ اور نوٹیاں لگی تھی ان کے بیڈ کے گرد مختلف قسم کی سکرینیں تھیں اور ان سکرینوں پر لہریں ہی چل رہی تھیں باباجی کے سر ہانے درمیانی عمر کی ایک نرس کھڑی تھی، میں جونہی اندر داخل ہوا وہ تیزی سے میری طرف مڑی اور تلخ آواز میں بولی آپ اب آئے ہیں ہم لوگ دو دن سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں شرم آتی چاہیے آپ کو نہیں گھبرا گیا، وہ واپس باباجی کی طرف مڑی ان کے کان پر جھکی اور آہستہ آواز میں بولی باباجی جی آپ کا بیٹا آگیا، باباجی نے آہستہ آہستہ پلکیں اٹھائیں دھندلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں موندھ لیں۔ مجھے محسوس ہوا وہ نیند کی دواؤں کے زیر اثر ہیں، میں نے کچھ بولنا چاہا لیکن نرس نے مجھے گھور کر دیکھا اور اسی تلخ آواز میں بولی ”اب آپ وہاں کیوں کھڑے ہیں آگے آئیں“ میں آگے آگیا، اس نے میرا ہاتھ باباجی کے ہاتھ میں دیا اور ان کے کان پر جھک کر بولی باباجی انہیں پکڑ لیں اب انہیں جانے نہ دیجئے گا، باباجی نے میرا ہاتھ گرفت میں لے لیا، ان کے کمرے سے ہاتھ میں بڑی حدت تھی نرس نے گھڑی کی طرف دیکھا ہاتھ ہلایا اور باہر چلی گئی۔

میں باباجی کے قریب مشغول پر بیٹھ گیا، باباجی بڑے پیار سے میرا ہاتھ سہلانے لگے وہ کبھی میری انگلیاں پکڑتے، کبھی انگوٹھے کو گرفت میں لیتے اور کبھی کلائی پکڑ لیتے، میں نے محسوس کیا وہ میرے ہاتھ کو اپنے حافضے میں محفوظ کر رہے ہیں، میں نے یہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن باباجی میرا ہاتھ چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھے چنانچہ میں وہاں تک کر بیٹھ گیا اور ساری رات ان کے قریب بیٹھا رہا، میری پشت پر کھڑکی تھی اس کھڑکی کی کسی درز سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی یہ ہوا سیدھی میری پشت سے گزرتی تھی جس کے نتیجے میں میری ریڑھ کی ہڈی برف ہو گئی، میں نے آدھی رات کے قریب سوچا، میں اٹھ کر کھڑکی بند کر دیتا ہوں، میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن باباجی نے میرے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر دی لہذا میں دوبارہ بیٹھ گیا، اسی عالم میں بیٹھے بیٹھے صبح ہو گئی صبح کے وقت باباجی کا ہاتھ ٹھنڈا ہونے لگا، مشینوں کی ٹیکروں کی فارمیشن بدلنے لگی اور وہ مشکل مشکل سانس لینے لگے، میں ہسپتال کے عملے کو بلانے کیلئے اٹھنے لگا تو انہوں نے میرا ہاتھ دایا، میں دوبارہ بیٹھ گیا، میں عجیب کشش کا شکار تھا، میں ڈاکٹروں کو بلانا چاہتا تھا لیکن باباجی میرا ہاتھ چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھے، اسی کشش کے دوران باباجی کی سانسیں بند ہو گئیں، مشینوں کی ٹیکریں سیدھی ہوئیں اور آکسیجن کے پمپ نے سکتا پھیلنا بند کر دیا۔ میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ نکالا اور ڈاکٹر کو بلانے کیلئے جھاگ کھڑا، دوا ڈاکٹر آئے، انہوں نے انہیں شاک دینے لیکن باباجی دنیا سے گزر چکے تھے۔ وہ سب دکھی سے ہو کر میری طرف پلٹے، انہوں نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے، باباجی کے منہ پر چادر ڈالی اور باہر نکل گئے، میں بھی ان کے پیچھے چلتا ہوا ڈاکٹر کے دفتر آ گیا۔ میں نے بڑے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا، یہ بزرگ کون تھے

انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور دیکھی آواز میں بولے کیا یہ آپ کے والد صاحب نہیں تھے؟ میں نے شرمندہ سا ہو کر جواب دیا "نہیں سر میں نے تو انہیں زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے" ڈاکٹر صاحب مزید حیران ہو گئے یہ کیسے ہو سکتا ہے! ہم تو آپ کو ان کا بیٹا سمجھ رہے تھے۔ میں نے اس کے بعد انہیں ساری کہانی سنا دی جس کے بعد انہوں نے مجھے باباجی کی کہانی سنائی ان کا کہنا تھا باباجی کراچی کے رہنے والے تھے کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد آئے تھے لیکن انہیں ہارٹ ایک ہو گیا دنیا میں ان کا صرف ایک بیٹا تھا بیٹا لندن میں تھا انہوں نے ہمیں اس کا نمبر دیا ہم نے جینے سے رابطہ کیا اس کا موبائل بند تھا ہم نے اس کے موبائل میں پیغام ریکارڈ کر دیا ہم بار بار فون کرتے رہے پیغام ریکارڈ کرتے رہے مگر اس سے رابطہ نہ ہو سکا اسی دوران آپ آگئے تو زس آپ کو ان کا بیٹا سمجھ کر ان کے پاس بٹھا کر چلی گئی ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد مجھ سے پوچھا "لیکن آپ نے اس وقت کیوں نہ بتایا" میں نے جواب دیا ڈاکٹر صاحب جب انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا تو مجھے محسوس ہوا میرا ہاتھ ان کی آخری امید ہے مجھ میں یہ امید توڑنے کا حوصلہ نہیں تھا چنانچہ میں ساری رات چپ چاپ ان کے پاس بیٹھا رہا ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنسو آگئے میری پلکیں بھی گیلی ہو گئیں اور میں روندھے ہوئے گلے کے ساتھ ہا ہرا گیا اور اس کے بعد کبھی اس ہسپتال کی طرف نہیں گیا۔

وہ خاموش ہو گیا اس کی پلکوں پر موتی چمک رہے تھے کمرے میں بڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی میں نے توقف کے بعد پوچھا "لیکن اس واقعے کا آپ کی کامیابی کے ساتھ کیا تعلق" وہ مسکرایا "پتہ نہیں سر لیکن میرا خیال ہے میری کامیابی اور یہ واقعہ کسی نہ کسی سطح پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں" میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا وہ گویا ہوا "سردہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں نے سنی کو ہاتھ لگایا تو وہ سونا ہو گئی" میں نے جب سے ایک روپیہ نکالا تو وہ ایک کروڑ بن کر وہاں آ گیا آپ میری قسمت کا اندازہ لگائیے میں نے ستمبر میں مظفر آباد میں ایک پلازہ خریدا تھا 8 اکتوبر 2005ء کو زلزلہ آیا اس پلازے کے آگے پیچھے دائیں بائیں تمام عمارتیں گر گئی تھیں لیکن اس عمارت کو خراش تک نہ آئی۔ جس جس بینک میں اکاؤنٹ کھول دیتا ہوں یقین کریں اس بینک کے ریونیو میں اضافہ ہو جاتا ہے اور میں جس کاغذ پر دستخط کر دیتا ہوں یقین کریں کاغذ کا وہ ٹکڑا دو چار کروڑ روپے کا ہو جاتا ہے چنانچہ مجھے محسوس ہوتا ہے میں نے جب اس باباجی کو اپنا ہاتھ پکڑا یا تھا تو قدرت نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا "وہ خاموش ہو گیا" میں نے اس سے پوچھا "وہ کون سا ہاتھ تھا" اس نے اپنا دائیں ہاتھ آگے بڑھا دیا میں اپنی کرسی سے اٹھا میں نے وہ ہاتھ پکڑا اور اپنی گلی آنکھیں اس کی ہتھیلی پر رکھ دیں یہ میری زندگی کا پہلا حسی ہاتھ تھا۔



دس ڈالر کا نوٹ

میں نے پچھلے دنوں ایک بزنس میگزین میں "لی آئی اے کوکا" کا ایک انٹرویو دیکھا تو میں چونک اٹھا، میں 1984ء سے "لی آئی اے کوکا" کا فین ہوں، میں اس وقت آنٹاریو میں کلاس کا طالب علم تھا جب میں نے اخبار میں پڑھا امریکہ کی ایک کارساز کمپنی کریسلر دیوالیہ ہو گئی ہے اور صدر ریگن نے اسے بچانے کیلئے نہ صرف اپنا جاپان کا دورہ منسوخ کر دیا ہے بلکہ صدر نے اپنا دفتر بھی کریسلر کمپنی کے ہیڈ کوارٹر میں منتقل کر دیا ہے، انہی دنوں میں نے اخبار میں صدر ریگن کی ایک تصویر دیکھی جس میں وہ ایک سفید قام شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھے مسکرا رہے تھے، تصویر کے نیچے کپشن تھا "امریکی صدر کریسلر کے نئے چیف ایگزیکٹو لی آئی اے کوکا کے ساتھ" میرے لئے یہ نام بہت دلچسپ اور انوکھا تھا لہذا یہ نام میرے دماغ سے چپک گیا، انہی دنوں میں نے خبر پڑھی "لی آئی اے کوکا" نے امریکہ کی تاریخ میں پہلی بار کانگریس سے بینک گارنٹی لی لی، بہر حال ان دنوں میں عمر کے جس حصے میں تھا اس میں ان تمام باتوں کا ادراک نہیں ہوتا۔ مجھے بھی یہ ساری باتیں سمجھ نہ آئیں۔ بس لی آئی اے کوکا اپنے نام کی انفرادیت کی وجہ سے میرے ذہن میں رہ گیا، 1991ء میں میں یونیورسٹی میں تھا تو میں پہلی بار تفصیل کے ساتھ "لی آئی اے کوکا" سے متعارف ہوا، ہمارے ایک استاد تازہ تازہ امریکہ سے لوٹے تھے اور وہاں سے لی آئی اے کوکا کی آٹو بائی گرائی "لی آئی اے کوکا"..... این آٹو بائی گرائی" لائے تھے، یہ کتاب ولیم نوواک اور لی آئی اے کوکا نے مل کر لکھی تھی، میں نے یہ کتاب ان سے لی اور پڑھنا شروع کر دی، میں جوں جوں یہ کتاب پڑھتا گیا میں توں توں لی آئی اے کوکا کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہوتا چلا گیا اور میرے اوپر حیرتوں کے نئے باب کھلتے چلے گئے۔

لی آئی اے کوکا 15 اکتوبر 1924ء کو ڈیٹرویت کے ایک چھوٹے سے قصبے ایلین میں پیدا ہوا، اس کے والدین اٹلی سے نقل مکانی کر کے امریکہ پہنچے تھے، اس کے والدین نے اس کا نام ایڈوینٹو لی آئی اے کوکا رکھا تھا، والدین غریب تھے لی آئی اے کوکا کو پڑھنے کا شوق تھا لہذا اس نے جوں توں یونیورسٹی سے انٹرنیٹل انجینئرنگ میں بیچلر ڈیگری کی اور کارساز کمپنی فورڈ میں انجینئر بھرتی ہو گیا، اس نے دو سال یہ کام کیا پھر اسے محسوس ہوا وہ اس کام کیلئے نہیں بنا، وہ فیلٹری کے جنرل منجبر سے ملا اور موجودہ محلو سے آدھے معاوضے پر سیلز ڈیپارٹمنٹ میں چلا گیا، وہاں جا کر اس کی ترقی کو پر لگ گئے، اسے گاؤں کے چہرے پڑھنے کا ملکہ حاصل تھا اور وہ بہت جلد مارکیٹ

کارخ بھانپ لیتا تھا چنانچہ اس نے سٹیز کے ساتھ ساتھ کہنی کو گاڑیوں کے نئے ڈیزائن بنا کر دینے شروع کر دیئے فورڈ کی مشہور گاڑی MUSTANG بھی لی آئی تاکہ اس کی تخلیق تھی اس کے بنائے ماڈلوں نے کہنی کے کاروبار میں کئی گنا اضافہ کر دیا اور لی آئی کو کا تری کرنا چلا گیا یہاں تک کہ وہ فورڈ کہنی کا صدر بن گیا 1975ء میں جب اس کی عمر تھیں پچاس برس تھی تو لوگ اسے آٹوموبائل کا آئین سٹائن کہتے تھے 1978ء میں اس نے فورڈ کو دہنے ڈیزائن دیئے ایک چھوٹی کار تھی اور دوسری منی وین یا فیملی کار اس وقت تک امریکہ میں اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا امریکی لوگ بڑی اور مضبوط گاڑیوں کے عادی تھے یہ ڈیزائن جب بورڈ آف گورنرز کے سامنے پیش ہوئے تو کہنی کے چیف ایگزیکٹو ہنری فورڈ نے دونوں ڈیزائن مسترد کر دیئے لی آئی کو کا اور فورڈ میں اختلافات پیدا ہوئے اور اس نے استعفیٰ دے دیا۔ ان دنوں کریسلر کہنی دم توڑ رہی تھی کریسلر کہنی امریکہ کی سب سے بڑی آٹوموبائل کارپوریشن ہوتی تھی لیکن پورے نقصانات کے باعث وہ دیوالیہ ہو رہی تھی۔ اس وقت کہنی کے ڈائریکٹروں نے سوچا اگر کسی طرح لی آئی کو کا کریسلر کے ساتھ وابستہ ہو جائے تو کہنی ایک بار پھر اپنے قدموں پر کھڑی ہو جائے گی لی آئی کو کا نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ اس نے ہڈ حرام ملازم فارغ کئے کہنی کی یورپی ڈویژن فروخت کر دی اور فورڈ کے بعض اہم ورکرز کو کریسلر میں لے آیا لیکن کہنی میں جان پیدا نہ ہوئی اسے محسوس ہوا اگر کہنی کو کہیں سے دو ملین ڈالر مل جائیں تو کہنی دوبارہ زندہ ہو سکتی ہے مگر کوئی بینک کریسلر کو قرضہ دینے کیلئے تیار نہیں تھا اس نے یورپ کے ایک بینک سے مذاکرات کئے بینک قرضہ دینے کیلئے تیار ہو گیا لیکن اس نے ایک عجیب و غریب شرط رکھ دی بینک نے کہا اگر امریکی حکومت گاڑی دے تو ہم کہنی کو ڈیڑھ ملین ڈالر دینے کیلئے تیار ہیں یہ ایک ناقابل عمل شرط تھی لیکن لی آئی کو کا نے کوشش کا فیصلہ کیا اس نے ریگن سے بات کی اور ریگن نے اس کا کس کا ٹھہریس کے سامنے رکھ دیا کا ٹھہریس نے اسے طلب کر لیا لی آئی کو کا نے کا ٹھہریس میں جس خوبصورتی سے اپنا موقف پیش کیا وہ بذات خود ایک تاریخ ہے اس نے کہا اگر کریسلر بند ہو گئی تو یہ امریکہ جیسی سپر پاور کی شکست ہوگی دنیا یہ کہے گی جو امریکہ ایک کار ساز کہنی نہیں چلا سکتا وہ دنیا پر خاک حکمرانی کرے گا اس نے بتایا اگر کریسلر بند ہو گئی تو 2 لاکھ امریکی بے روزگار ہو جائیں گے امریکی کاریں دنیا میں اپنی حیثیت کھو بیٹھیں گی اور ہم لوگ شرمندگی سے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے وغیرہ۔ تھ مختصر لی آئی کو کا نے کا ٹھہریس کو قائل کر لیا کا ٹھہریس نے بینک کو گاڑی دے دی کریسلر کو ڈیڑھ ملین ڈالر مل گئے۔

لی آئی کو کا نے فوری طور پر وہ دونوں ماڈل بنوائے جن کی وجہ سے اسے فورڈ چھوڑنا پڑی تھی ”کے کار“ کریسلر کی ایک چھوٹی کار تھی جس وقت یہ گاڑی مارکیٹ میں آئی اس وقت امریکہ میں تیل کا بحران پیدا ہو چکا تھا یہ ایک ہلکی پھلکی گاڑی تھی جو کم پٹرول استعمال کرتی تھی یہ امریکہ کی پہلی چھوٹی کار تھی لہذا دیکھتے ہی دیکھتے ”کے کار“ پوری امریکی مارکیٹ پر چھا گئی منی وین کریسلر کی دوسری بڑی پراڈکٹ تھی یہ گاڑی بے شمار مقاصد پورے کرتی تھی اس میں پورا خاندان آ سکتا تھا اسے لوگ ٹرانسپورٹیشن کے لئے بھی استعمال کر سکتے تھے یہ گمر ٹیکٹری دکان اور مارکیٹ ہر جگہ استعمال ہو سکتی تھی اس گاڑی نے بھی کمال کر دیا کریسلر کہنی نے اپنی صرف ان دو

پراڈکٹس کے ذریعے وقت سے کہیں پہلے سارا قرضہ ادا کر دیا 80 ویں دہائی کے آخر میں لی آئیہ کوکانے اے ایم سی اور جیپ کے نام سے مزید دو گاڑیاں ستعارف کرائیں ان گاڑیوں نے بھی اچھا بزنس کیا لیکن لی آئیہ کوکانے کے بہت بڑے نقص تھے وہ کہا کرتے تھے "لی آئیہ کوکانے کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو مستثنیٰ کرنے کی بے پناہ صلاحیتیں دے رکھی ہیں" شاید یہی وجہ تھی صدر ریگن نے 1982ء میں لی آئیہ کوکانے کو بحسب آزادی فاؤنڈیشن کا سربراہ بنا دیا لی آئیہ کوکانے عوام سے اپیل کی ہم بحسب آزادی کی ترقی و ترقی کرنا چاہتے ہیں یہ بحسب پوری امریکی قوم کا مشرک اثاثہ ہے میری خواہش ہے تمام امریکی اس قومی خدمت میں ہمارا ساتھ دیں اس کے الفاظ نے جادو کر دیا اور چند ہی دنوں میں 540 ملین ڈالر جمع ہو گئے۔

میں 2002ء میں امریکہ گیا تو میں اس کے دفتر چلا گیا میں نے اس کے سیکرٹری سے 10 منٹ کا وقت لیا تھا ٹھیک دس منٹ بعد یہ ملاقات ختم ہو گئی لیکن ایک بڑے انسان کی صحبت میں گزارے یہ دس منٹ میری زندگی کا اثاثہ تھے اس ملاقات کے دوران میں نے اس سے صرف ایک سوال پوچھا میں نے پوچھا "آپ کی کامیابی کا کیا راز ہے؟" اس نے تہہ لگا لگا "میرا والد"۔ میں حیران ہو گیا۔ اس نے بتایا "میرا والد بیٹے میں ایک دن مجھے ڈنر کیلئے کسی اچھے ریستورنٹ میں لے کر جاتا تھا وہ کرسی پر بیٹھے ہی میرے کے ہاتھ پر دس ڈالر رکھ دیتا تھا اور اس سے کہتا تھا "یہ تمہاری شپ ہے ہم ڈنر کے لئے آئے ہیں اور اب ہمارا ڈنر خراب نہیں ہونا چاہئے اس کے بعد وہ دوطرفہ تمام گاڑیوں کو چھوڑ کر ہماری خدمت میں جت جاتا تھا میں نے والد کی اس عادت سے سیکھا اگر آپ کسی سے کام لینا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اسے اس کا حصہ دے دیں میں نے اسے اپنی زندگی کا اصول بنا لیا پوری دنیا میں لوگ اپنے ورکروں کو سال کے آخر میں بونس دیتے ہیں لیکن میں ہمیشہ سال کے شروع میں اپنے ورکروں کو اکٹھا کرتا ہوں ان سے کہتا ہوں تم لوگ تخمینہ لگاؤ ہم سال کے آخر میں کتنا منافع کمائیں گے وہ تخمینہ لگاتے ہیں میں اس تخمینے کے مطابق انہیں سال کے شروع میں بونس دے دیتا ہوں اور اس کے بعد ان سے کہتا ہوں اب مجھے نارگٹ کے مطابق پیسہ کما کر دو اور اس کے بعد ورکر کمال کر دیتے ہیں میرے اس فارمولے کے باعث مجھے آج تک کوئی نقصان نہیں پہنچا رہی کارپوریٹ لائف کی بات تو اس کیلئے چار اصول ہیں۔ سب سے پہلے آپ یہ فیصلہ کریں آپ نے کرنا کیا ہے دوسرا اس کام کیلئے دنیا کے بہترین لوگ منتخب کریں تیسرا اپنی ترجیحات طے کریں اور چوتھا چاہے ایک ایچ جی سی اپنے نارگٹ کی طرف روزانہ تھوڑی تھوڑی پیش رفت کریں آپ کبھی ناکام نہیں ہوں گے" سینگ ختم ہو گئی میں باہر آ گیا لفٹ سے نیچے اترتے ہوئے میں نے سوچا اگر انسان چاہے تو وہ دس ڈالر کے نوٹ سے بھی زندگی کا سب سے بڑا اصول وضع کر سکتا ہے اور وہ دس ڈالر کے نوٹ سے بھی دنیا کا بہت بڑا بزنس من بن سکتا ہے۔



ایک بڑی فورس

یہ آج سے پانچ برس پرانی بات ہے۔ ہم چار دوست اکٹھے رہتے تھے، ہمارے گھر قریب قریب تھے، ہم صبح، دوپہر اور شام کو ایک دوسرے سے ملتے تھے، ہم سب ایک جیسے حالات سے دوچار تھے، ہم سب کی زندگیوں میں بے ترتیبی، بے سکونی اور بے چینی تھی۔ ہم ایک مشکل سے نکلنے تھے تو دوسری میں پھنس جاتے تھے، ہماری ایک پریشانی ختم ہوتی تھی تو دوسری کندھوں پر آ بیٹھتی تھی، ہم میں سے تین عام دنیا دار قسم کے لوگ تھے لیکن ہمارا چوتھا ساتھی دین دار، تہجد گزار اور صوتی منش شخص تھا، وہ جو نہیں گھنٹے با وضو رہتا تھا، اس کے ہونٹوں پر ہر وقت ذکر چلتا رہتا تھا مگر اس عبادت اور ریاضت کے باوجود اس کی زندگی بھی ہماری طرح بے سکونی اور عدم استحکام کا شکار تھی۔ وہ بھی ہماری طرح ہر وقت پریشان اور بے چین رہتا تھا۔ ایک دن ہم چاروں ایک درویش کے پاس حاضر ہو گئے۔ وہ درویش ایک دلچسپ شخص تھا، وہ بیک وقت ایک کامیاب تاجر، ایک با عمل عالم، ایک تارک الدنیا صوتی اور ایک سخت مزاج منتظم تھا۔ وہ ہم سب کا شہزادہ دوست تھا، ہم سب اس کے محل میں اس کے سامنے بیٹھ گئے، وہ اذہائی ایکڑ کے ایک بڑے محل میں رہتا تھا لیکن اس کا کمرہ بہت سادہ بلکہ بہت غریبانہ تھا، پورے کمرے کی واحد قیمتی چیز گھومندزی کی دس بائی آٹھ فٹ کی بوسیدہ سی دری تھی، درویش کے پاس کپڑوں کے صرف دو جوڑے تھے، وہ جو نہیں گھنٹے میں صرف ایک بار کھانا کھاتا تھا اور بیٹھے میں پانچ دن روزے رکھتا تھا۔ اس نے ہماری پریشانیاں سن کر قبیلہ لگایا اور ہتے ہتے بولا "تم لوگ غلط انداز سے زندگی گزار رہے ہو، تمہاری زندگی کی ترتیب غلط ہے لہذا تمہاری زندگیوں میں سکون اور آرام کیسے آسکتا ہے، تمہاری پریشانیاں کیسے کم ہو سکتی ہیں!" ہم نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا، اس نے مسکرا کر چائے کے کپ ہمارے ہاتھوں میں تھما دیے۔ "دیکھو اگر تم زندگی کا سلیقہ جاننا چاہتے تو تمہیں وہ سیرت نبویؐ میں ملے گا، سکون اور اطمینان تک پہنچنے کے سارے فارمولے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں پوشیدہ ہیں۔" وہ رکا، اس نے خور سے ہمارے چہرے دیکھے اور پھر گویا ہوا "اسلامی ریاست کے چار ستون تھے، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان اور حضرت علیؓ، ان چاروں حضرات نے اسلام کی کامیابی میں بڑا مرکزی کردار ادا کیا یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اللہ کا پیغام دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دیا، تم

لوگ میری اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے اس نے رک کر ہم سے پوچھا، ہم نے ہاں میں گردن ہلا دی، وہ اپنے مخصوص انداز سے مسکرایا اور آہستہ اور میٹھے لہجے میں بولا "یہ اصحاب کون تھے، کیا تم لوگوں نے کبھی سوچا، یقیناً تم لوگوں نے انہیں اس نزاع سے کبھی نہیں دیکھا ہوگا، یہ اصحاب، یہ حضرات ایک مخصوص طرز زندگی تھے۔ حضرت ابو بکرؓ اور خاندانِ نبویؐ اور خاندانِ اہل بیتؑ کے ساتھ آپؐ کی محبت رسول ﷺ میں سب کچھ لٹا دیتے تھے۔ حضرت عثمانؓ ایک مکمل اور مضبوط معیشت کی علامت تھے، ان کا شمار عرب کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب حضرت عثمانؓ کا آخری اونٹ شام سے نکلتا تھا تو پہلا مدینہ پہنچ چکا ہوتا تھا۔ عرب میں کہا جاتا تھا تجارت سیکھی ہو تو عثمانؓ سے سیکھو، وہ کبھی گھانے میں نہیں رہتے، حضرت عمرؓ نے انہیں مکمل روٹیں، ایک شاندار ایڈمنسٹریشن کا نام تھے، وہ قوتِ ارادی اور اہلِ پن کی علامت تھے، تم لوگ خود سوچو جس شخص کے ایمان کا آغاز ہی اس فعل سے ہو کہ وہ گھروں میں چھپے مسلمانوں کو ساتھ لے، انہیں خانہ کعبہ لانے اور پھر کہے تم لوگ سب کے سامنے نماز پڑھو، عمرؓ کی تلوار تمہاری حفاظت کرے گی۔ اس شخص کی قوتِ ارادی کی کیا سطح ہوگی، وہ کس قدر مضبوط فیصلے کا مالک ہوگا اور آخر میں حضرت علیؓ، درویش رکھا، اس نے لمبی سانس لی اور اسی رواں لہجے میں بولا "حضرت علیؓ اس دور کے سب سے بڑے عالم تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا، میں علم کا شہر ہوں تو علیؓ اس کا دروازہ ہیں، یہ چار حضرات رسول اللہ ﷺ کے اولین ساتھی تھے۔ ان حضرات کا ساتھ ثابت کرتا ہے اسلام جیسے مذہب کو کبھی اپنے اظہار کیلئے فقر، معیشت، انتظامی مہارت اور علم کی ضرورت ہوتی ہے"

وہ رکاوٹیں نے بے چین ہو کر پوچھا "یار درویش تمہارے اس فلسفے کا ہمارے مسئلے سے کیا تعلق، ہم اپنی بات کر رہے اور تم ہمارے گرد اسلام کا دائرہ گھنچ رہے ہو"۔ درویش نے قہقہہ لگایا "بیوقوفو! میں تمہیں تمہارے مسئلے کا حل بتا رہا ہوں، یہ چاروں حضرات ثابت کرتے ہیں اسلام جیسے آفاقی نظریے کو کبھی عملی تفسیر کیلئے ایک فقیر، ایک منتظم، ایک معیشت دان اور ایک عالم کی ضرورت ہوتی ہے لہذا معاشرہ ہو یا فرد جس بندے کے پاس علم نہیں، جس کے پاس ضروریاتِ زندگی کیلئے مناسب رقم نہیں، جس کی زندگی میں انکم و ضبط نہیں اور جس کی ذات میں حضرت ابو بکرؓ جیسا فقر نہیں، وہ ایک اچھی اور پرسکون زندگی نہیں گزار سکتا، تم لوگوں کا یہی مسئلہ ہے" درویش رکاوٹوں نے ہم میں سے ایک کے چہرے پر نظریں گاڑیں اور بولا "مثلاً تم، تمہارے پاس روپیہ، پیسہ تو ہے، تم کروڑ پتی ہو لیکن تمہارے اندر کا فقیر مر چکا ہے، تمہارا علم اخبارِ نبویؐ تک محدود ہے اور تمہاری انتظامی صلاحیتیں ختم ہو چکی ہیں لہذا تم بے سکون ہو اور تم" وہ مولوی صاحب کی طرف مڑا "تم نے پوری زندگی رکوع و سجود میں لگا دی، تمہارے بچے روز بھوکے پیٹ سکول جاتے ہیں، خود تم اپنی بھوک کو روزے کی شکل دینے کی کوشش کرتے رہتے ہو اور تم" وہ میری طرف مڑا "تم کتابوں کے پہاڑ سے کوڑ کر خوشی کر رہے ہو اور تم" وہ ہمارے چوتھے ساتھی کی طرف مڑا "تم اپنے گھر والوں کی ساری ضرورتوں، ساری خرابیوں کو پلن تیلے کچل رہے ہو، تم اپنی ایڈمنسٹریشن کے ذریعے زندگی کو سیدھا اور ہموار بنانا چاہتے ہو لیکن یاد رکھو، انتظام اچھی چیز ہوتا ہے لیکن وہ ایک روپے کو پچاس روپے نہیں بنا سکتا"

درویش نے ٹانگیں سیدھی کیں اور ہنس کر بولا "بے وقوف! صرف عام شخص نہیں دنیا میں صرف وہ ملک ترقی کی معراج تک پہنچتے ہیں جن کے پاس یہ چاروں چیزیں اکٹھی موجود ہوتی ہیں اور وہ تمام ملک پیچھے رہ جاتے ہیں جو ایک ستون پر پوری عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بے وقوف! اگر صرف نقد سے ملک چل سکتے تو طالبان کا افغانستان اس وقت دنیا کا ترقی یافتہ ترین ملک ہوتا، اگر ایٹم سٹیشن ہی سب کچھ ہوتی تو سوویت یونین کبھی نہ ٹوٹتا، اگر تعلیم سے ملک ترقی کر سکتے تو سری لنکا جنوبی ایشیا کا سب سے بڑا ملک ہوتا اور اگر دولت ہی کافی ہوتی تو سعودی عرب اس وقت دنیا کی سپر پاور ہوتا" وہ رکا اور ہنس کر بولا "لیکن ایسا نہیں ہوا، دنیا کی کوئی عمارت صرف ایک ستون پر کھڑی نہیں رہ سکتی، اسے استحکام کیلئے بیک وقت چار ستون درکار ہوتے ہیں، تم لوگ بھی اپنی زندگی میں ایسی ترتیب پیدا کر لو تو تمہیں یہ دنیا جنت لگنے لگے گی اور حکومت کو بھی تازہ و وہ صرف معیشت پر توجہ نہ دے، وہ معیشت کے ساتھ ساتھ ملک میں درویشوں، عالموں اور تنظیمیں کی ایک بڑی فورس بھی پیدا کرے، تب کہیں جا کر ملک ترقی کرے گا"



Kashif Azad @ OneUrdu.com

تین وجوہات

لی کوآن یو کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ تھی، انہوں نے حاضرین کو غور سے دیکھا اور سر جھکا لیا، یہ منظر ہمیشہ کیلئے میرے ذہن میں ریکارڈ ہو گیا اور جب بھی میں کسی شخص سے عالم اسلام کے زوال اور پاکستان کی پسماندگی کے بارے میں سنتا ہوں تو میرے دماغ میں وہ سارا منظر روشن ہو جاتا ہے لی کوآن یو اس وقت سنگاپور کے وزیر اعظم ہاؤس کے ایک پرٹکلف ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے، ان کے صوفے کے پیچھے کھڑکی تھی اور کھڑکی کے شیشے پر تیل چڑھی تھی لی کوآن یو کے ساتھ اس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ہاویوں اختر بیٹھے تھے، ان سے ذرا قافلے پر سنگاپور میں پاکستان کے سفیر براجمان تھے اور سامنے کرسیوں پر دوسرے احباب تشریف رکھتے تھے یہ ایک غیر رسمی ملاقات تھی جس میں ایک جونیئر وزیر اعظم ایک سینئر وزیر اعظم سے حکمت اور دانائی حاصل کرنے آیا تھا۔ لی کوآن یو اس وقت تک ریٹائرمنٹ لے چکے تھے لیکن اس کے باوجود سنگاپور کے لوگ انہیں اقتدار میں دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ وہ سینئر وزیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے تھے ان کے پاس کوئی باقاعدہ وزارت نہیں تھی ان کا رول بڑی حد تک مانیٹر اور اسٹاڈ کا تھا، وہ کابینہ کے اجلاس میں بیٹھے تھے، جونیئر وزراء کو مختلف معاملات میں مشورے دیتے تھے اور مختلف وزارتوں کی کارکردگی کا جائزہ لیتے تھے، انہیں جہاں کسی غلطی کا احساس ہوتا تھا وہ فوراً غلطی کی نشاندہی کرتے تھے اور متعلقہ افسر اور سیاستدان کو ازالے کے بارے میں سمجھاتے تھے، پورا سنگاپور لی کوآن یو کا احترام کرتا تھا، وہ 30 برس تک سنگاپور کے وزیر اعظم رہے تھے اور انہوں نے ان 30 برسوں میں اس بدبودار دلدلی جزیرے کو دنیا کی نویں بڑی معیشت بنا دیا تھا، سنگاپور ایک معجزہ تھا اور اس معجزے کے تخلیق کار لی کوآن یو تھے۔

سنگاپور کی کہانی انتہائی دلچسپ تھی، یہ 640 مربع کلومیٹر کا ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا اس جزیرے پر انیسویں صدی تک ہولناک جنگل تھی اور ان جنگلوں میں خونخوار درندوں، شیروں اور گرگچوں کا راج تھا اس جزیرے میں غلطی کی سب سے بڑی دلدل بھی تھی بعد ازاں بحری قزاقوں نے اسے اپنا مسکن بنا لیا تھا چنانچہ دنیا کا کوئی شخص اس کی طرف رخ نہیں کرتا تھا۔ انیسویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ جزیرہ خرید لیا، پہلی جنگ عظیم

میں برطانیہ نے اسے بحری اڈہ بنایا جبکہ دوسری جنگ عظیم میں اس پر جاپان نے قبضہ کر لیا۔ سنگاپور 1963ء میں ملائیشیا کو واپس مل گیا لیکن 1965ء میں ملائیشیا نے اسے بوجھ سمجھ کر اپنے سر سے اتار دیا۔ سنگاپور کو آزادی دے دی گئی۔ اس وقت لی کوآن یو سنگاپور کے وزیر اعظم تھے، وہ 1959ء میں پہلی بار سنگاپور کے وزیر اعظم منتخب ہوئے تھے، کوآن یو نے اس بدبودار جریرے کو دنیا کا شاندار ملک بنانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے پورے ملک سے ایماندار لوگوں کو جن کرچ بنایا اور ان جنوں کو مکمل خود مختاری دی۔ یہ جج صدر اور وزیر اعظم سے لے کر چڑا ہی تک تمام سرکاری اہلکاروں کو کسی بھی وقت عدالت میں طلب کر سکتے تھے اور ان کی کھلے عام گوشمالی کر سکتے تھے، عدل کے بعد انہوں نے سنگاپور کے خوشحال طبقے سے انتہائی پڑھے لکھے، مہذب اور ایماندار لوگ چنے اور انہیں اپنی کابینہ میں بھرتی کر لیا، انہوں نے کابینہ کیلئے احتساب کا ایک کڑا نظام بھی تشکیل دیا اور اس نظام سے کوئی شخص مبرا نہیں تھا، اس کے بعد انہوں نے پوری دنیا میں کھرے سنگاپور کے پڑھے لکھے اور ہنرمند لو جو انوں سے رابطہ کیا اور انہیں بھاری سعادتی پر سرکاری ملازمتوں کی پیش کش کی، آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی سنگاپور دنیا کا واحد ملک تھا اور ہے جس میں سرکاری ملازمتوں کی تنخواہیں کارپوریٹ سیکٹر کے برابر ہیں، سنگاپور میں اگر ایک ایم بی اے لوجوان پرائیویٹ بینک سے دو لاکھ روپے تنخواہ لیتا ہے تو حکومت بھی اس کو ایک لاکھ روپے تنخواہ دیتی ہے لی کوآن یو نے سنگاپور کے قانون کو دنیا کا سخت ترین قانون بنا دیا تھا مثلاً سنگاپور میں جیو علم چپا کر سڑک یا گلی میں پھینکنے کا جرمانہ دو ہزار ڈالر تھا، کسی دیوار یا عوامی جگہ پر گالی لکھنے کی سزا موت تھی اور سنگاپور میں اگر کوئی وزیر یا مشیر کرپشن میں ملوث پایا جاتا تھا تو لی کوآن یو اسے خودکشی یا احتساب میں سے کسی ایک آپشن کے انتخاب کا موقع دیتا تھا، وزراء عموماً اس لئے خودکشی کو ترجیح دیتے تھے چنانچہ لی کوآن یو کی ان اصطلاحات کے نتیجے میں صرف تین برسوں میں سنگاپور دنیا کا نواں امیر ترین ملک بن گیا، لی کوآن یو تیس برس بعد 1990ء میں مستعفی ہو گئے اور انہوں نے اپنے لیے نگران کا کردار منتخب کر لیا۔

میاں نواز شریف 1999ء میں سنگاپور کے دورے پر گئے، میں بھی وزیر اعظم کے وفد میں شامل تھا، نواز شریف نے سرکاری مصروفیات کے بعد لی کوآن یو سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی وہ لی کوآن یو سے لیڈر شپ اور ترقی کی "ٹیم" لینا چاہتے تھے۔ سنگاپور کے وزیر اعظم نے لی کوآن یو کے ساتھ ان کی ملاقات طے کر دی۔ نواز شریف نے چند لوگوں کا انتخاب کیا اور اس شام لی کوآن یو کے پاس حاضر ہو گئے۔ یہ ملاقات وزیر اعظم ہاؤس میں وقوع پذیر ہوئی۔ گفتگو کے آغاز میں لی کوآن یو نے انکشاف کیا وہ مختلف جمیٹوں سے 8 مرتبہ پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں، ہندوہ پاکستان کے جغرافیہ، رسم و رواج اور لوگوں سے پوری طرح آگاہ ہیں، نواز شریف نے بڑے ادب سے ان سے پوچھا "کیا آپ اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ سمجھتے ہیں پاکستان کبھی سنگاپور جتنی ترقی کرے گا" لی کوآن یو نے ذرا دیر سوچا اور انکار میں سر ہلا دیا، ان کا رد عمل انتہائی سفاک، کھر اور غیر سفارتی تھا، حاضرین پریشان ہو گئے، لی کوآن یو ذرا دیر بعد بولے "اس کی تین بڑی وجوہات ہیں، پہلی وجہ آئیڈیالوجی ہے، آپ اور ہم میں ایک بنیادی

فرق ہے آپ اس دنیا کو عارضی سمجھتے ہیں اور آپ کا خیال ہے آپ کی اصل زندگی مرنے کے بعد شروع ہوگی چنانچہ آپ لوگ اس عارضی دنیا پر توجہ نہیں دیتے، آپ سڑک، عمارت، ہیڈ سٹیم، ٹریفک اور قانون کو سمجھ نہیں لیتے جبکہ ہم لوگ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں لہذا ہم اس دنیا کو خوبصورت سے خوبصورت تر بنا رہے ہیں وہ دور کے اور ڈراما دیر بعد بولے "خود سوچئے جو لوگ اس دنیا پر یقین نہیں رکھتے وہ اسے خوبصورت کیوں بنا نہیں گے، دوسری وجہ آپ لوگوں کی اپرویج ہے، میں چپے کے لحاظ سے وکیل ہوں، ہندوستان کی تقسیم سے پہلے میں اس علاقے میں پریکٹس کرتا تھا، کلکتہ سے کراچی تک میرے موکل پھیلے تھے میں نے ان دنوں ہندو اور مسلمان کی نفسیات میں بڑا فرق دیکھا، میرے پاس جب کوئی ہندو کلائنٹ آتا تھا اور میں اس کے کیس کے جائزے کے بعد اسے بتاتا تھا تمہارے کیس میں جان نہیں، اگر تم عدالت میں گئے تو تم یہ کیس ہار جاؤ گے تو وہ میرا شکر یہ ادا کرتا تھا اور مجھ سے کہتا تھا "آپ مہربانی فرما کر میری دوسری پارٹی سے صلح کرادیں" میں اس کی صلح کر دیتا تھا اور یوں مسئلہ ختم ہو جاتا تھا جبکہ اس کے برعکس جب کوئی مسلمان کلائنٹ میرے پاس آتا تھا اور میں اسے صلح کا مشورہ دیتا تھا تو اس کا جواب بڑا دلچسپ ہوتا تھا "وہ کہتا تھا وکیل صاحب آپ کیس دائر کریں میں پوری زندگی مقدمہ لڑوں گا۔ میرے بعد میرے بچے لڑیں گے اور اس کے بعد ان کے بچے لڑیں گے" لی کو آن یور کے اور مسکرا کر بولے "میرا تجربہ ہے جو تو میں اپنے خاندانوں اور اپنی نسلوں کو ورثے میں مقدمے اور مسئلے دیتی ہوں وہ ترقی نہیں کرتیں اور تیسری اور بڑی وجہ فوج ہے آپ کے ملک میں فوج سیاست کا حصہ بن چکی ہے اور مجھے پوری دنیا میں آج تک کوئی ایسا ملک نہیں ملا جس نے فوجی اثر میں رہ کر ترقی کی ہو"

وہ رے کے اور دوبارہ بولے "فوجی اور سیاستدان کی سوچ اور ٹریننگ میں بڑا فرق ہوتا ہے فوجی ہمیشہ مسئلہ پیدا کرتا ہے جبکہ سیاستدان مسئلے حل کرتے ہیں، فوجی کی زندگی کا صرف ایک اصول ہوتا ہے 'میں خود جیوں گا اور نہ کسی کو جینے دوں گا جبکہ سیاستدان جیو اور جینے دو کے فلسفے پر کاربند ہوتے ہیں، فوجی کو زندگی میں مر جاؤ یا مار دو کی ٹریننگ دی جاتی ہے جبکہ سیاستدان کو صلح، مذاکرات اور نرمی کی تربیت دی جاتی ہے چنانچہ میرا تجربہ ہے جس ملک میں حکومت اور سیاست فوج کے پاس ہوتی ہے وہ ملک کبھی ترقی نہیں کرتا" لی کو آن یو نے مسکرا کر سب کی طرف دیکھا، گھڑی پر نظر ڈالی اور ہاتھ رگڑ کر بولا "میں نے واک کیلئے جانا ہے، اگر آپ لوگ میرا ساتھ دے سکتے ہیں تو چلیے واک کرتے ہیں" وہاں موجود تمام لوگوں نے اپنے پاؤں دیکھے اور اس کے بعد لی کو آن یو کے قدموں کی طرف دیکھا اور چہرے پر معذرت سجا کر ان کی طرف دیکھنے لگی لی کو آن یو نے سب کے ساتھ ہاتھ ملایا اور باہر نکل گئے۔



حشر کو ابھی بہت دن باقی ہیں

میں ضیاء شاہد صاحب کا بچپن سے "فین تھا" وہ میں سال پہلے میگزین میں "جمعہ بخیر" کے نام سے ایک طویل کالم لکھا کرتے تھے یہ ایک سوشل کالم ہوتا تھا جس کی تحریر میں صوفیانہ کشش اور ادبی مناس ہوتی تھی، ضیاء صاحب کے ساتھ ساتھ یہ کالم مختلف اخبارات کا سفر کرتا رہا، میں بھی بطور قاری ان کے ساتھ اخبارات تبدیل کرتا رہا، قارئین اور "فینز" کی ایک عجیب سا بکالونی ہوتی ہے یہ لوگ اپنے پسندیدہ لکھاری، مصور، اداکار اور کھلاڑی سے متعلق تمام معلومات جمع کرنے لگتے ہیں، میں بھی اس شوق میں مبتلا ہو گیا چنانچہ میں ضیاء شاہد صاحب کے پس منظر ان کے خاندان اور بچوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا، ان دنوں مجھے معلوم ہوا ضیاء صاحب کے بڑے بیٹے کا نام عدنان ہے اور وہ میرا ہم عمر ہے، ضیاء صاحب اپنے کالموں اور تحریروں میں اس کا ذکر کرتے رہے تھے، میں نے 1992ء میں لاہور سے صحافت شروع کی، میں اس شبیہ کا ایک نالائق کارکن تھا چنانچہ میں "روزنامہ سنون" بن گیا اور مختلف اخباروں میں دھکے کھاتا ہوا روزنامہ خبریں تک جا پہنچا، میں نے 1997ء میں محترم ظہیر ملک کی سفارش پر خبریں میں کالم لکھنا شروع کیا، مجھے خوشنود علی خان نے خبریں سے وابستہ کیا تھا لیکن میرے تیسرے کالم کے بعد ضیاء صاحب کے ساتھ میرا تعلق قائم ہو گیا اور 1998ء کے آخر میں عدنان شاہد کے ساتھ میری ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ 1998ء ہی وہ سال تھا جب ایک چھوٹی سی غلط فہمی کی وجہ سے ضیاء شاہد صاحب نے مجھے ایک خط لکھا اور خبریں کے ساتھ میرا تعلق ختم ہو گیا، میں روزنامہ جنگ سے منسلک ہو گیا، ضیاء شاہد صاحب مجھ سے دور ہو گئے لیکن عدنان شاہد قریب آ گیا، وہ مجھ سے مسلسل ملا بھی رہا اور اس کے ساتھ میری ٹیلی فون پر گفتگو بھی جاری رہی لیکن میں نے اصل عدنان شاہد کو 2001ء میں "ڈسکورڈ" کیا۔

2001ء میں پاکستانی صحافیوں کا ایک گروپ انٹرنیشنل ویزٹرز پروگرام پر امریکہ گیا، اس گروپ میں عدنان شاہد، رحیم اللہ یوسفوی، سلیم صافی اور میں بھی شامل تھا، ہم لوگ امریکہ میں 21 دن اکٹھے رہے، ان 21 دنوں نے ہمارے درمیان بے تکلفی، دوستی اور تعلق کا ایک ایسا رشتہ قائم کر دیا جو عدنان شاہد کے انتقال تک جاری رہا، میں نے امریکہ میں ایک ایسا عدنان شاہد ڈسکورڈ کیا جو نہ صرف زندگی کے رنگوں سے بھر پور تھا بلکہ وہ انسانیت

خدمت اور محبت سے بھی لبریز تھا، وہ اس وقت بھی خبریں کا ایڈیٹر تھا اور ہم سب لوگ اخبارات میں معمولی کارکن تھے لیکن وہ ہمارے بیگ نیک اٹھا لیتا تھا، اگر ہمیں کسی وجہ سے ہوٹل کے ایک کمرے میں اٹھارہ بنا پڑ گیا تو عدنان شاہد دوسروں کو بیڈ پر سلاتا تھا اور خود فرش پر سوتا تھا، ہم لوگ اکٹھے کھانا کھاتے تھے، کھانا کھانے کی یہ روایت "امریکن سٹم" کہلاتی ہے، اس سٹم میں دو یا دو سے زائد لوگ اکٹھا کھانا منگواتے ہیں اور آخر میں مل آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں، ہم لوگ امریکہ میں تھے لہذا ہم لوگ امریکن سٹم کے تحت مل دیتے تھے لیکن کھانے کے آخر میں "ٹپ" ہمیشہ عدنان شاہد دیتا تھا، عدنان نے پورے امریکہ کی ٹپ اپنے ذمے لے لی تھی، بس کاڈرائیور ہو یا کنڈیکٹر، ہوٹل کے دربان ہوں، ویٹروں یا تیل یونائٹ ریستورانوں کی ویٹریس ہوں یا پھر امریکی بھکاری، ان کی ٹرے ہیٹ اور ہاتھ پر ہمیشہ عدنان شاہد ٹپ رکھتا تھا، وہ کہتا تھا "امریکہ 55 برس سے پاکستان کو ٹپ دے رہا ہے آج میں اس ٹپ کا بدلہ لے رہا ہوں" ہمارے ساتھ ہفت روزہ بکبیر کے ایڈیٹر فاروق عادل بھی تھے، فاروق عادل نے ایک مرتبہ قلعی سے پانچ ڈالر زائد دے دیئے، ویٹریس پیسے لے کر واپس آئی تو فاروق عادل نے وہ پانچ ڈالر اسے بخش دیئے اور ہماری طرف دیکھ کر بولا "لو آج سے میں بھی عدنان شاہد ہو گیا ہوں" اس دورے کے دوران ہم نے ایک دلچسپ "کوڈ" بھی تخلیق کیا، یہ "کوڈ" مصنف تھا، ہم لوگ مختلف لکھاریوں کی نفسیات پر گپ شپ کر رہے تھے، میں نے اسے بتایا بعض لکھاری مصنف کھلانے کے خیال میں جتا ہوتے ہیں، یہ لوگ اپنے سفرناموں یا سوانح عمریوں میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں "جب مصنف ٹوپ بیک سگھ میں داخل ہوا تو بارش شروع ہو چکی تھی، یہ لوگ اپنی تصویروں کے نیچے ہمیشہ مصنف صدر ایوب خان کے ساتھ یا مصنف ماسکوس مشالن کے مقبرے کے سامنے یا مصنف جنرل ضیاء الحق کو اس کی مجلس شوریٰ کی خامیاں بتاتے ہوئے قسم کے کیشن لکھتے ہیں، اس نے توبہ لگایا، میں نے اسے بتایا، مجھے پچھلے دنوں کسی صاحب نے اپنا سفرنامہ بھجوا دیا تھا۔ اس سفرنامے میں مصنف کی بیشار تصویریں چھپی تھیں، ایک تصویر میں انہوں نے پانچ برس کے ایک بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا اور اس تصویر کے نیچے لکھا تھا "مصنف آسٹریا کے سفر پر روانہ ہونے سے دو دن قبل اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ" عدنان شاہد نے ایک طویل توبہ لگایا اور اس کے بعد ہم جب بھی تصویر بھجوانے لگتے تو عدنان شاہد کہتا "دو مصنف ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی چیمٹ پر کھڑے ہیں" اور ہم سب توبہ لگاتے، ایک روز ہم میکڈونلڈ سے نکلے تو اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا "میں یہاں تصویر کھینچنا چاہتا ہوں، میں یہ تصویر اپنی سوانح عمری میں شائع کرواؤں گا اور اس کے نیچے یہ کیشن لکھواؤں گا، مصنف دوش برگر کھانے کے بعد میکڈونلڈ کے سامنے ہشاش بشاش کھڑا ہے" اس کے بعد "مصنف" ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہمارا کوڈ ورڈ ہو گیا، میں جب بھی اسے فون کرتا، وہ نون اٹھاتا تو میں اس سے پوچھتا "مصنف کیا کر رہا ہے" اس کا جواب عموماً اس قسم کا ہوتا "مصنف اپنے بیٹے کو قلعی کھلا رہا ہے یا مصنف اپنی بیوی کے سینڈل تبدیل کرانے لبرنی جا رہا ہے یا مصنف اس وقت ریگی سینما کے سامنے کھڑا ہے وغیرہ" اسی طرح وہ جب بھی مجھ سے فون کرتا تو اس کا سلاخوہ کچھ لاں ہوتا تھا "کما ایک مصنف دوسرے مصنف سے گفتگو کر سکتا ہے"

اور میں مغل بادشاہوں کی طرح جواب دیتا تھا ”ہاں اجازت ہے“ ایک بار اس کا فون آیا ”کیا مصنف ایک بھوکے کو کھانا کھلا سکتا ہے“ مصنف نے فوراً حامی بھری، وہ شام اس نے میرے ساتھ گزاری، وہ ان دنوں ”دی پوسٹ“ شروع کر رہا تھا۔ وہ ضیاء شاہ صاحب سے ہٹ کر اپنی الگ پہچان بنانا چاہتا تھا، اس کی خواہش تھی وہ کوئی چھوٹا سا پراجیکٹ شروع کرے اور اپنی محنت سے اس بیج کو درخت بنائے۔ وہ ایک ایسا اخبار نکالنا چاہتا تھا جو صرف عدنان شاہد کا اخبار ہو وہ دی پوسٹ کو عدنان شاہد کا پراجیکٹ سمجھتا تھا، اس نے مجھ سے پوچھا ”کیا مصنف انگریزی میں کالم لکھے گا“ میں نے انکار میں سر ہلا کر جواب دیا ”مصنف نے آج تک انگریزی میں خط نہیں لکھا“ وہ مسکرا کر بولا ”اگر ہم مصنف کا اردو کالم انگریزی میں ترجمہ کر لیں تو مصنف کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا“ میں نے مسکرا کر جواب دیا ”مصنف کو تو نہیں ہوگا لیکن مصنف کے اخبار کو ضرور ہوگا“ میں جب ”ایکسپریس“ میں آیا تو ”خبریں“ میں ہمارے خلاف مضامین شائع ہونے لگے، اس نے مجھے فون کیا، میں نے اس سے پوچھا ”تم لوگوں نے مصنف کے خلاف جہاد شروع کر دیا ہے۔“ اس نے قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے بولا ”لیکن میں مصنف کے ساتھ ہوں“ اس نے مجھ سے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تو میں نے دیگر وجوہات کے علاوہ اسے بتایا ”اگر خدا خواستہ تمہیں کچھ ہو جائے تو میں جنگ اخبار میں تمہارے لئے کالم نہیں لکھ سکتا تھا، میں اپنے دوستوں کے تعزیتی کالم لکھنے کیلئے ایکسپریس آیا ہوں“ اس نے قہقہہ لگایا۔

مجھے 10 فروری 2007ء کو عدنان شاہد کے انتقال کی خبر ملی اور 12 فروری کو میں نے اس پر خصوصی ایڈیشن دیکھا، اس خصوصی ایڈیشن میں اس کی تصویریں چھپی تھیں۔ وہ ہر اس تصویر میں مسکرا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے اس کی تصویروں سے کہا ”عدنان تمہارے لیے مصنف ادا ہے، تم واپس آ جاؤ“ لیکن عدنان شاہد واپس نہیں آیا، وہ کبھی واپس نہیں آئے گا، زندگی کی ہر سڑک ہر راستے میں ایک یوٹرن ضرور ہوتا ہے لیکن موت ایک ایسا راستہ ہے جس پر کوئی یوٹرن نہیں اور بد قسمتی سے عدنان شاہد اس موڑوے پر چڑھ گیا ہے میں جب یہ کالم لکھ رہا تھا تو میں نے لکھتے لکھتے بے اختیار اس کے موبائل پر فون کر دیا، دوسری طرف سے آواز آئی ”آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے آپ تھوڑی دیر بعد کوشش کیجئے گا“ میں نے سوچا یہ ”تھوڑی دیر“ کتنی ہوگی؟ معلوم ہوا یہ تھوڑی دیر سینکڑوں، ہزاروں سال پر محیط ہے کیونکہ دنیا میں چھڑنے والے لوگ صرف حشر کے دن مل سکتے ہیں اور حشر کو ابھی بہت دن باقی ہیں۔



کیا ہم ڈاکٹر عبدالقدیر کیلئے اتنا نہیں کر سکتے

نوجوان کا سوال بہت دلچسپ تھا، اس کا کہنا تھا "ہم کیا کر سکتے ہیں" میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا، وہ بولا "میں ایک طالب علم ہوں، میرے والد صاحب مڈل سکول کے استاد ہیں، میری چھ بہنیں اور ایک بھائی ہے، میں ٹیوشن پڑھاتا ہوں اور اس سے اپنی تعلیم کے اخراجات پورے کرتا ہوں، اگر میں آپ کی باتوں پر عمل شروع کر دوں تو میں یونیورسٹی سے فارغ ہو جاؤں، میں مارا جاؤں، غائب کر دیا جاؤں یا پھر جیل میں پھینک دیا جاؤں اور اس کے بعد میرا پورا خاندان در بدر ہو جائے، میری بہنیں جیلوں میں خوار ہو جائیں، ماں صدمے سے پاگل ہو جائے اور باپ کو ہارٹ اٹیک ہو جائے، ہم سب مارے جائیں، وہ رکا، اس نے خود سے میری طرف دیکھا اور جذبات سے جھتی آواز میں بولا "ڈاکٹر عبدالقدیر ہمارے محسن ہیں، وہ ہمارے ہیرو بھی ہیں، اگر وہ نہ ہوتے، اگر وہ پاکستان نہ آتے، تو آج ہم یوں سینہ تان کرتے کھڑے ہوتے، آپ کی بات درست ہے، ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، حکومت کو انہیں گرفتار نہیں کرنا چاہئے تھا، ان سے ٹیلی ویژن پر معافی نہیں منگوانا چاہئے تھی اور انہیں ہاؤس اریسٹ نہیں کرنا چاہئے تھا، یہ محسن کشی اور ظلم ہے، وہ رکا، اس نے دم لیا اور دوبارہ گویا ہوا "مجھے اپوزیشن کی باتوں میں بھی صداقت محسوس ہوتی ہے، میں نے آج اخبارات میں پڑھا، ڈاکٹر عبدالقدیر کو سلو پائزنگ دی جا رہی ہے، انہیں آہستہ آہستہ زہر دیا جا رہا ہے تاکہ وہ چپ چاپ انتقال کر جائیں اور ان کے انتقال سے بے شمار لوگوں کو زندگی مل جائے، وہ لوگ جو ٹیوٹیکس پر پروگرام کی خرید و فروخت میں ملوث تھے ان کے ناموں اور کارناموں پر پردہ پڑ جائے، کل ہماری یونیورسٹی میں کوئی صاحب بات کر رہے تھے، اگر ڈاکٹر عبدالقدیر زندہ رہتے ہیں تو انہیں امریکی حکومت لے جائے گی یا پھر انہیں وعدہ معاف گواہ بنا کر جنرل مرزا اسلم بیک سے لے کر جنرل جہانگیر کرامت اور جنرل کرامت سے جنرل ذوالفقار تک بے شمار ریٹائرڈ فوجی افسروں کو عالمی عدالت میں ٹھیسٹ لیا جائے گا اور ڈاکٹر صاحب سے جھوٹے بیچ بیان منسوب کر کے ہمارے جوہری پروگرام، ہمارے سیاستدانوں اور ہماری فوج کو بدنام کیا جائے گا، وہ صاحب بتا رہے تھے، ڈاکٹر عبدالقدیر کی زندگی بے شمار لوگوں کیلئے موت ثابت ہوگی لہذا ڈاکٹر صاحب اس وقت وسیع تر قومی مفاد کیلئے انتہائی خطرناک شخص ہیں، وہ بڑی تیزی سے نظریہ ضرورت کی زد

لدا، رہے ہیں اور ملک و قوم کو ان کی قربانی کی اشد ضرورت ہے" وہ رکا، اس کی آنکھوں سے پانی کی کبیریں نکل رہی تھیں، اس نے آنکھوں پر نشو پھیر رکھا اور کھانس کر بولا "میں ڈاکٹر صاحب سے شدید محبت کرتا ہوں، میں پانچویں جماعت میں تھا جب میرے والد نے ڈاکٹر صاحب کی تصویر میرے کمرے میں لگا لی تھی، میں اس وقت سے انہیں اپنا آئیڈیل مانتا آ رہا ہوں، میں پچھلے 18 برسوں سے ہر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے گزارش کرتا ہوں وہ مجھے ڈاکٹر صاحب کی طرح ملک و قوم کی خدمت کرنے کی توفیق دے، وہ مجھے ڈاکٹر عبدالقدیر بنا دے" وہ رکا دم لیا اور زہریلے انداز سے بولا "میرے میں نہیں اس ملک کا ہر نوجوان ڈاکٹر عبدالقدیر کو اپنا آئیڈیل سمجھتا اور مانتا ہے وہ ڈاکٹر عبدالقدیر بننا چاہتا ہے، ڈاکٹر صاحب کے انجام کا سوچ کر ہر نوجوان کا دل دھڑکتا بند ہو جاتا ہے اس کے جسم پر عرش طاری ہو جاتا ہے لیکن سر ہم بے بس لوگ ہیں اور ہم مجبور لاجپار اور بے بس لوگ دعا کے سوا کیا کر سکتے ہیں ہم اگر سڑکوں پر آگئے ہم لوگوں نے اگر آپ جیسے دانشوروں کی باتیں مان لیں تو ہم بے بسی کی موت مارے جائیں گے اور ہمارے خاندان بکھر جائیں گے" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور عرض کیا "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ایک اکیلی ابا تیل کچھ نہیں کر سکتی لیکن اگر دس ہزار ابا تیلیں اکٹھی ہو جائیں وہ سب کسی ایک ہاتھی کو مار گت کر لیں اور ایک زاویے پر ایک ہی وقت میں ایک ایک کنکری پھینک دیں تو کیا ہوگا؟" وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا "میں نے کہا" ہاتھی مر جائے گا یا پسپائی پر مجبور ہو جائے گا" وہ مسکرایا اور آگے جھک کر بولا "لیکن سر ہم ابا تیلیں نہیں ہیں ہم انسان ہیں اور انسان بھی ایسے جو غیر منظم، غیر متفق اور اپنے اپنے مفاد کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں، سر ہم لوگ ہاتھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔" میں مسکرایا "لیکن ہم اس کے باوجود ڈاکٹر عبدالقدیر کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں ہم اپنی عاجزی اپنے افسار، اپنی کمزوری اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اپنی محبت کو ایک نئی شکل دے سکتے ہیں، ہم دنیا میں احتجاج کا ایک نیا طریقہ متعارف کر سکتے ہیں، ہم پوری دنیا کی توجہ حاصل کر سکتے ہیں" وہ میری طرف دیکھتا رہا "میں نے عرض کیا" ہم میں سے ہر شخص ایک گلدستے لے، ایک چھوٹا سا کارڈ خریدے، اس کارڈ پر سرخ سیاہی سے "دی آر پراؤڈ آف یو ڈاکٹر صاحب" لکھیں، یہ کارڈ گلدستے کے ساتھ لگائے، چپ چاپ ڈاکٹر صاحب کے گھر کے سامنے جائے اور یہ گلدستہ ان کے گیٹ پر چھوڑ کر آ جائے" آپ ذرا سوچو اگر صرف دس لاکھ لوگ روزانہ ایک ایک گلدستہ ڈاکٹر صاحب کے گیٹ پر رکھ دیں تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ مجھے خیال ہے ڈاکٹر صاحب کے گھر جانے والی ساری سڑک بھر جائے گی پوری سڑک پر پھول ہی پھول، گلدستے ہی گلدستے ہوں گے اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ پوری دنیا کا بیڑا یا انوکھا احتجاج کور کرے گا یوں پاکستان کے کمزور لوگوں کی محبت انٹرنیشنل میڈیا کی ہیڈ لائن بن جائے گی اور شاید یہ ہیڈ لائنیں ہماری محبت اور عقیدت کے یہ گلدستے ڈاکٹر صاحب کو صحت اور سلامتی دے دیں، شاید ہماری یہ محبت ان کی آخری ساتھیوں کو خوشخبرہ کر دے ان کے دل کا ملال دھل جائے" وہ ہمارے ساتھ راضی ہو جائیں! ان کی جان بچ جائے" میں ایک لمحے کے لئے رکا اور اس کے بعد عرض کیا "کیا ہم لوگ اپنے اس محسن کو ایک گلدستہ

نہیں دے سکتے جس نے ہمارے لئے اپنی جان داؤ پر لگا دی تھی، کیا ہم اپنے آئیڈیل اپنے ہیرو کے لئے ایک کارڈ 'ایک گلہ دستے کی قربانی نہیں دے سکتے' اس ملک میں چار ہزار سیاسی جماعتیں ہیں اس ملک میں عمران خان اور قاضی حسین احمد ہیں اس ملک میں تحریک انصاف، جماعت اسلامی، مسلم لیگ ن اور پیپلز پارٹی ہے، کیا ان جماعتوں ان رہنماؤں میں سے کوئی شخص اس گلہ دستے تحریک کی قیادت نہیں کر سکتا، کیا طالب علموں کی کوئی یونین، کیا کوئی تعلیمی ادارہ، کوئی یونیورسٹی یہ تحریک شروع نہیں کر سکتی؟ کیا ہم اپنے ہیرو کے لئے اتنا نہیں کر سکتے؟" نوجوان اٹھا اس نے میری میز پر بڑا گلہ دستہ اٹھایا اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

خودکش

شاہد خاندان کا پہلا فرد تھا جو کرکٹ کھیلنے کیلئے گراؤنڈ میں اترا یہ ایک نیم ویسی خاندان تھا ان کے والد ملک محمد اختر گوجر خان کے ایک پسماندہ گاؤں جلیاری معظم شاہ کے رہنے والے تھے وہ بڑھے لکھے تھے لہذا انہیں ریلوے میں جو نیر افسر کی ملازمت مل گئی اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ راولپنڈی شفٹ ہو گئے ملک محمد اختر کو اللہ تعالیٰ نے چار بیٹے دیئے لیکن بد قسمتی سے ان کے تین بیٹے بڑیوں کی ایک مہلک بیماری کا شکار نکلے اس بیماری کو طبی زبان میں "ہائپر ایکسٹینسو جوائنٹس" کہا جاتا ہے اس بیماری میں مریض کے جوڑے پھیل جاتے ہیں اور اس کے جسمانی اعضاء بے ڈھنگے ہو جاتے ہیں بڑے بیٹے شاہد کو اس بیماری کے باوجود سپورٹس کا شوق ہوا اور اس نے مورگاہ کے گراؤنڈ میں فٹ بال اور کرکٹ کھیلنا شروع کر دی وہ بہت اچھا کھلاڑی تھا اس نے اچھی ٹیم بھی بنالی لیکن وہ رہنمائی کی کمی کے باعث آگے نہ بڑھ سکا طاہر اختر خاندان کا دوسرا لڑکا تھا جس نے بڑے بھائی کی پیروی میں میدان میں قدم رکھا لیکن وہ بھی کھیل میں زیادہ دیر نہ جم سکا اس نے ملازمت اختیار کرنی تیسرا بھائی عبید اختر بھی کرکٹ کی طرف آیا لیکن وہ پڑھائی میں اچھا تھا چنانچہ اس نے کرکٹ کو پڑھائی پر قربان کر دیا چھپے رہ گیا شعیب تو شعیب سب سے چھوٹا بھائی تھا۔

شعیب اختر کھلاڑی نہیں بن سکا تھا اس کے جسم میں چار بڑے نقص تھے اس کے پاؤں ہموار تھے ہموار پاؤں کے لوگوں کو انگریزی میں "قلیت فنڈ" کہا جاتا ہے یہ لوگ بھاگنے دوڑنے دیوار پر چڑھنے اور پھلانگنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں لہذا آج تک دنیا میں کوئی "قلیت فنڈ" شخص کھلاڑی نہیں بن سکا شعیب کا دوسرا نقص "ہائپر ایکسٹینسو جوائنٹس" تھے وہ اس بیماری کا انتہائی مریض تھا لہذا اس کے بازو اور اس کی ٹانگیں لٹک جاتی تھیں اس نے پانچ سال کی عمر میں چلنا شروع کیا تھا اس کا تیسرا نقص دم تھا اسے چھپن میں کالی کھانسی ہوتی اور یہ کھانسی اس کے پیچھروں پر اثر چھوڑ گئی تھی اور اس کا چوتھا نقص اس کا مزاج تھا وہ اپنے رویوں میں نارمل نہیں تھا وہ انتہا پر جا کر سوچتا تھا لہذا اس کے والدین اس کے بہن بھائیوں اور اس کے دوست احباب اس کے مستقبل کے بارے میں زیادہ پر امید نہیں تھے وہ پڑھائی میں بھی اچھا نہیں تھا لیکن پھر ایک عجیب معجزہ ہوا اس بچے نے ایک دن

بیٹ پکڑ اور ساری ٹیم کو حیران کر دیا، وہ قدرتی طور پر کرکٹر نکلا، اس میں باؤننگ، بیٹنگ اور فیلڈنگ تینوں خوبیاں موجود تھیں چنانچہ اس نے ایک برس میں ٹیم میں اپنا مقام پیدا کر لیا، وہ سب سے پہلے ایک آئل کمپنی آئی فیر ٹیم کا حصہ بنا، وہاں سے وہ جی ایچ کیو کی ٹیم میں گیا اور وہاں سے وہ راولپنڈی ڈویژنل کرکٹ ایسوسی ایشن تک جا پہنچا، 1994-95ء میں کرکٹ کے لیجنڈ کھلاڑی ماجد خان نے اسے اٹھایا اور اسے قومی سطح تک متعارف کرایا۔ 1995-96ء میں نیوزی لینڈ کی ٹیم راولپنڈی آئی، شعیب اختر راولپنڈی کی طرف سے میدان میں اتر اور اس نے نیوزی لینڈ کے دس کھلاڑی آؤٹ کر دیئے، وہ گولی کی طرح تیز بال کراتا تھا، نیوزی لینڈ ٹیم کا ٹیجر جان رائٹ تھا، جان نے اس نوجوان کو دیکھا تو پیش گوئی کی ”یہ لڑکا بہت جلد پوری دنیا میں مشہور ہو جائے گا“ جان رائٹ کی اس پیش گوئی نے شعیب کے خلاف سازشوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا، یہاں سے شعیب اختر کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا سلسلہ بیک وقت شروع ہوتا ہے۔

شعیب اختر کا کھلاڑی بننا اور پھر کرکٹ کی دنیا میں سب سے تیز بال پھینکنے کا اعزاز حاصل کرنا معجزہ تھا، یہ کھیلوں کی تاریخ کا پہلا کھلاڑی تھا جس کے پاؤں بھی، موار تھے اور جو ”ہائپر ایکشن جو اسٹنس“ کا مریض بھی تھا لیکن اس معذوری کے باوجود اس نے پوری دنیا کو حیران کر دیا، یہ معجزہ کیسے ہوا؟ یہ بات بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھی اس معجزے کی بنیاد اس کا رویہ تھا، شعیب اختر بنیادی طور پر احتجاج پسند شخص ہے، اس کے مزاج میں خود کشی کی حد تک ایڈ ونچر پایا جاتا ہے، وہ چیخ بول کر رہتا ہے اور اس چیخ کو بعد ازاں زندگی اور موت کا مسئلہ بنا لیتا ہے، اس نے آٹھ نو سال کی عمر میں موٹر سائیکل چلانا سیکھی اور راولپنڈی میں موٹر سائیکل کے کرب شروع کر دیئے، وہ کئی بار اس کھیل میں مرتے مرتے بچا لیکن وہ باز نہ آیا، ڈاکٹروں نے اسے بھاگنے سے منع کیا تھا لیکن اس نے کاسٹ بار بننے کا اعلان کر دیا، ڈاکٹروں نے اسے جوڑوں پر دباؤ ڈالنے سے روکا لیکن اس نے دنیا کی تیز ترین بال پھینکنے کا فیصلہ کر لیا، میڈیکل سائنس شعیب کی اس شدت کو حماقت سمجھتی ہے لیکن وقت نے ثابت کیا اس کی یہی شدت پسندی اس کی کامیابی کی واحد وجہ بنی اس نے اپنی شدت پسندی کے ذریعے اپنی بیدار نشی معذوری اور اپنی بیماری کو شکست دے دی اور وہ کھلاڑیوں کی صفیں چیرتا ہوا وہاں جا پہنچا جہاں عزت اور شہرت اس کے پاؤں میں پڑی تھی۔

مجھ سے شعیب اختر کا تعارف ہمارے ایک سینئر صحافی نے کرایا تھا، اس سینئر صحافی کو لوگ ”استاد بول“ کہتے ہیں، استاد: بھلا ہر ایک مذہبی شخصیت ہیں، ان کی تحریروں میں بھی ایمان اور اسلام کا تذکرہ ملتا ہے لیکن بد قسمتی سے ان کی ذاتی زندگی ان کی تحریروں سے بیکسر مختلف ہے، وہ قول اور فعل کے شدید بے عریان کا شکار ہیں، وہ جو ہمیں گھننے کے حامد ہیں اور حسد میں وہ بعض اوقات کفر تک چلے جاتے ہیں، ہمارے ایک دوست نے استاد بول کے بارے میں بد اتاریجی فقرہ کہا تھا، اس نے کہا تھا ”اگر استاد بول کے منہ سے الکل و لہو کی بوند آتی تو وہ کیسے ولی ہوتے“ بہر حال شعیب اختر سے میرا تعارف استاد بول نے کرایا تھا، میں نے استاد کے کہنے پر شعیب کا کھیل دیکھنا شروع کیا اور میں اس کے عمر میں گرفتار ہونا چلا گیا، شعیب کے دو بھائی میرے دوست ہیں جبکہ اس کی والدہ میں مجھے اپنی ماں کی

جھٹک نظر آتی ہے وہ محبت و شفقت اور رواداری کی چلتی پھرتی تصویر ہیں، میرا خیال ہے یہ شعیب کی ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے وہ طبعی لحاظ سے ان فٹ ہونے کے باوجود دنیا کا تیز ترین باؤلر بھی بنا اور اس نے میڈیکل سائنس اور سپورٹس کی دنیا کو بھی حیران کر دیا۔ شعیب اختر 1997ء میں قومی ٹیم میں منتخب ہوا، اس وقت کے ایک چرچیلاں کپتان اسے ٹیم میں نہیں لینا چاہتے تھے، اس کی وجہ شعیب کا رویہ تھا، شعیب فاسلے پر رہنے والا اکٹرا مزاج نوجوان تھا جبکہ کپتان پاکستانی مزاج کا شخص تھا وہ کھلاڑیوں سے جی حضوری اور تابعداری کا خواہاں تھا لہذا شعیب اختر اس کے کرائی ٹیم پر پورا ٹیکس اترا تھا لیکن ماجد خان اور سلیم العلاف کی مہربانی سے شعیب اختر کو سلیکٹ کر لیا گیا، اس نے ویسٹ انڈیز کے خلاف میچ کھیلا اور اس میچ میں اس نے دو کھلاڑی آؤٹ کر دیئے۔ یہاں سے شعیب کا انٹرنیشنل کیریئر شروع ہو گیا۔

شعیب اختر کا مزاج اور جسم دو بڑے مسائل کا شکار ہیں۔ شعیب مزاج کے لحاظ سے خود کش ہے، اس نے نیوزی لینڈ میں دس ہزار میٹر کی بلندی سے چھلانگ لگا دی تھی اور وہ نیا گرافال سے تیز ہوا نیچے آیا اور یہ حرکت کوئی ٹارنٹل شخص نہیں کر سکتا، وہ ایڈوٹور کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا، یہ شدت بنیادی طور پر اس کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ اگر آپ اسے بھاگتے ہوئے اور بال پھینکتے ہوئے دیکھیں آپ کو اس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی وحشت، غصہ اور تفرخ دکھائی دے گا، اس وقت آپ کو اس کے انگ انگ میں ایک ”ابنا رٹلی“ نظر آئے گی، یہ وہ ابنا رٹلی ہے، یہ وہ وحشت اور یہ وہ غصہ ہے جس کی وجہ سے وہ سوئیل کی رفتار سے بال پھینکتا ہے، اگر شعیب میں یہ غصہ اور یہ شدت نہ ہوتی تو وہ کبھی اپنے ہموار پاؤں اور ”ہائپر ایکسیٹینسو جوائنٹس“ کے ساتھ دنیا کا صف اول کا کھلاڑی نہ بن پاتا، وہ کبھی اس مقام تک نہ پہنچتا، شعیب کو ہر میچ میں اپنے حوصلے، فیصلے اور جرأت کا تادان ادا کرنا پڑتا ہے، ہر میچ میں اس کا جسم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ ان فٹ ہو جاتا ہے۔ یہ ”ان فٹ نس“ اس کی شدت میں اضافہ کر دیتی ہے اور وہ اپنے قرب و جوار سے الجھنا شروع کر دیتا ہے اور یہ الجھن اس کے کیریئر کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ یہ رکاوٹ بھی دور کر لیتا تھا لیکن پھر استاد بوتل جیسے لوگ آئے آگئے شعیب کی زندگی کی سب سے بڑی بد قسمتی استاد بوتل جیسے لوگ ہیں، ان لوگوں نے آج تک اسے اور اس کے مسئلوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، شعیب نے آج تک پاکستان کو بہت کچھ دیا لیکن ہم پاکستانیوں نے اسے انوس اور تکلیف کے سوا کچھ نہیں دیا۔

شعیب اختر ان حالات تک کیسے پہنچا اور کن کن لوگوں نے اس کے خلاف کیا کچھ کیا یہ میں آپ کو کل بتاؤں گا۔



ہم ایک بے وقوم ہیں

شعیب اختر کے کیریئر میں تین چیزیں نمایاں ہیں، ایک اس کی جسمانی ساخت وہ فلیٹ لفظ اور ہاتھ ایکسٹریمنس جو آتش کا شکار ہے، دوسری اس کی عجزاتی کامیابیاں اور تیسری اس کے خلاف سازشیں، میں نے کل عرض کیا تھا شعیب نے اپنی شدت اور حوصلے سے اپنی جسمانی خامیوں پر قابو پا لیا اور وہ دنوں میں کرکٹ کی دنیا میں اس مقام پر جا پہنچا جس کی ہزاروں لاکھوں کرکٹرز زندگی بھر خواہش کرتے رہتے ہیں۔ شعیب اختر نے اپنی ہمت سے نہ صرف اپنا وجود منوایا بلکہ وہ پاکستانی ٹیم کی کامیابی کا بنیادی عنصر بھی بن گیا اور دنیا بھر کے کرکٹرز زور ماہرین نے کہنا شروع کر دیا "جس ٹیم میں شعیب اختر نہ ہو وہ ٹیم ہیج نہیں جیت سکتی" پاکستانی عوام کی بھی یہی رائے تھی۔ عوام کی یہ رائے اور ماہرین کے خیالات پاکستان کرکٹ بورڈ کی قیادت کے دل میں شعیب اختر کے خلاف بغض پیدا کرتے رہے اور اس کے حامدین کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا، شعیب اختر پبلک ریلیشنگ کا بندہ نہیں تھا وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا، وہ لوگوں سے فاصلے پر رہتا تھا لہذا وہ پاکستان کرکٹ بورڈ ریٹائر کھلاڑیوں اور کرکٹ کے ماہرین سے پبلک ریلیشنگ نہ کر سکا چنانچہ اس کے خلاف حسد اور نفرت کا لاوا جمع ہوتا چلا گیا یہ لاوا 15 اکتوبر 2006ء کو پھنا اور پاکستان کرکٹ کی شہری روایات کو جڑوں سے ہلا گیا اور پاکستان اور پاکستان کے کھلاڑی پوری دنیا میں بدنام ہو گئے۔

15 اکتوبر 2006ء کا چانک طلوع نہیں ہوا یہ سازشوں کا ایک تسلسل ہے جو پچھلے دس برس سے شعیب کے خلاف جاری تھا، شعیب اختر اپنی ٹیسی خامیوں کے باعث اکثر جسمانی ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہتا تھا وہ 1999ء سے 2006ء تک 8 مرتبہ شدید جسمانی عارضوں کا شکار ہوا، 1999ء میں اس کا پایاں کندھا زخمی ہو گیا، 2000ء میں اس کے گھٹنے کے پیچھے 4 انچ لمبا زخم آ گیا، اسی سال اس کی گیارہویں اور بارہویں ہتلی ٹوٹ گئی، 2001ء میں اس کے کندھے کا جوڑ ٹھل گیا، 2002ء میں اسے شدید زخم آئے، 2005ء میں اس کا بازو فریکچر ہو گیا، 2006ء کے شروع میں اس کے ہاتھ کے مسلز پھٹ گئے اور 2006ء کے درمیان اس کی کمر کے نچلے حصے میں درد رہنے لگا اس کی ہر بیماری اس کے خلاف سازشوں اور افواہوں کا طوفان لے کر طلوع ہوتی تھی اور کرکٹ بورڈ کی قیادت اس کے خلاف میڈیا ٹرائل شروع کر دیتی تھی لیکن اللہ کے کرم سے وہ اس بحران سے بچا نکلا تھا، شعیب کے موجودہ بحران کا آغاز نومبر 2005ء میں ہوا تھا 12 نومبر 2005ء کو برطانیہ کی ٹیم پاکستان کے دورے پر آئی اور اس نے 21 دسمبر 2005ء تک پاکستان میں بیچ کھیلے شعیب اختر نے تین ٹیسٹ میچوں میں

17 دکن میں حاصل کیے اور وہ پاکستان کی کامیابی کا باعث بنا اس سیریز کے دوران وہ زخمی ہو گیا، شعیب اختر کے کیریئر کا دوسرا بحران جنوری 2006ء میں شروع ہوا، ان دنوں بھارت کے ساتھ پاکستان کا نیا نیا سفارتی روابط شروع ہوا تھا، پاکستان نے بھارت کے ساتھ بس ٹرک اور ٹرین ڈپلومیسی کے ساتھ کرکٹ ڈپلومیسی کا بھی فیصلہ کیا تھا، بھارت کی ٹیم پاکستان کے دورے پر آئی اور پاکستان نے بھارت کو خوش کرنے کیلئے فلیٹ پیچر بنا میں، شعیب کو زخمی حالت میں کھیلنے پر مجبور کیا گیا، شعیب نے کوشش کی لیکن اس کوشش کے دوران اس کے زخموں میں اضافہ ہو گیا اور وہ مکمل طور پر ان فٹ ہو گیا، اس کی انجری اس کے کھیلنے تک چلی گئی اور وہ پتلے تک سے معذور ہو گیا، اس دوران ایک بار پھر اس کے خلاف میڈیا فرائل شروع ہو گیا اور پاکستان کرکٹ بورڈ کے بعض سینئر لوگوں نے شعیب کے کیریئر کے خاتمے کی خبریں اڑانا شروع کر دیں۔ شعیب 28 فروری 2006ء کو کھیلنے کے علاج کیلئے آسٹریلیا چلا گیا، آسٹریلیا کے سرجن ڈیوڈ بیگ نے شعیب اختر کے کھیلنے کی آرتھوسکوپک سرجری کی، یہ سرجری کامیاب ہو گئی اور شعیب بڑی تیزی سے رو بہ صحت ہونے لگا، شعیب اختر جب ڈاکٹر ڈیوڈ بیگ کے پاس زیر علاج تھا تو اس کی جلد صحت مندی کے لیے اسے "ہائی پریسی" دوائیں دی گئی تھیں، یہ دوائیں کیا تھیں، شعیب ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، اگست 2006ء میں پاکستان کی ٹیم برطانیہ کے دورے پر گئی، اس وقت پاکستان کے تینوں باؤلر شعیب اختر، محمد آصف اور رانا لوید اسمن ان فٹ تھے یہ تینوں کھلاڑی پاکستانی ٹیم کی بیک بون تھے۔ ان تینوں کی غیر موجودگی کے باعث پاکستان ٹیسٹ بیچ ہار گیا، یہ پاکستان کرکٹ بورڈ کے لیے انتہائی خطرناک صورت حال تھی، حکام کو محسوس ہوا اگر ان کے تینوں باؤلر جلد تندرست نہ ہوئے تو وہ 2006ء کے تمام بیچ بھی ہار جائیں گے اور 2007ء کا ورلڈ کپ بھی کھٹائی میں پڑ جائے گا چنانچہ اعلیٰ حکام نے ڈاکٹروں کو حکم دیا "ان کھلاڑیوں کو ہر قیمت پر جلد سے جلد فٹ کیا جائے" اس حکم کے تحت ڈاکٹروں نے شعیب اختر اور محمد آصف کو طاقت کے ٹیکے لگا کر شروع کر دیئے اور ان ٹیکوں کی "برکت" سے دونوں کھلاڑی تیسرے شروع میں اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے، محمد آصف نے اپنی ڈوپنگ کمیشن کے سامنے اپنے بیان میں ان ٹیکوں کا ذکر بھی کیا تھا اس کا کہنا تھا اسے برطانیہ کے دورے کے دوران تین ٹیکے دیئے گئے تھے جبکہ شعیب اختر کو ایک خفیہ سرجری ڈریل نے ایسا بیان دینے سے روک دیا۔

اکتوبر 2006ء میں پاکستان نے بیچ کھیلنے کیلئے بھارت جانا تھا، پاکستان کرکٹ بورڈ کے ارباب بست و کشاد محمد آصف اور شعیب اختر کو لگائے جانے والے ٹیکوں سے واقف تھے لہذا 25 ستمبر سے 12 اکتوبر 2006ء تک تمام کھلاڑیوں کے خون کے نمونے لیے گئے اور یہ نمونے ڈوپنگ ٹیسٹ کے لیے ملائیشیا بھجوا دیئے گئے۔ 12 اکتوبر 2006ء کو ٹیسٹوں کی رپورٹ آگئی اس رپورٹ میں محمد آصف اور شعیب اختر کے خون میں ممنوعہ عنصر "نینڈرولون" نکل آیا۔ اس وقت پاکستان کی ٹیم بھارت پہنچ چکی تھی، خون کی یہ رپورٹ خطرناک تھی، اگر ہم فرض کر لیں اس معاملے میں محمد آصف اور شعیب اختر قصور وار ہیں اور کرکٹ بورڈ ممنوع ادویات کے استعمال سے واقف نہیں تھا تو بھی عقل کا تقاضا تھا پاکستان کرکٹ بورڈ یہ رپورٹ تصدیق کے لیے روک لیتا اور محمد آصف اور شعیب اختر کو کسی بہانے والہاں پاکستان بلا لیتا اس سے پاکستان اور پاکستان کرکٹ بورڈ کی عزت بھی بچ جاتی اور ہمارے قومی ہیروز کا کیریئر بھی محفوظ رہتا لیکن بورڈ نے خاموشی کے بجائے اس خبر کو عالمی شکل دے دی، دونوں

کھلاڑیوں کو معطل کیا اور انہیں بے عزت کر کے پاکستان واپس بلا لیا، حکومت نے اس کے بعد انٹرنی ڈوپنگ کمیشن بنایا، شاہد حامد، انتخاب عالم اور ڈاکٹر وقار احمد کو اس کا ممبر بنایا، کمیشن نے 27، 28 اکتوبر اور یکم نومبر کو "مطمان" کے بیانات سنے اور ان دونوں کھلاڑیوں کے خلاف فیصلہ دے دیا، شعیب اختر پر دو سال اور محمد آصف پر ایک سال کے لیے انٹرنیشنل کرکٹ کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی جس کے بعد پورے ملک اور پوری دنیا میں "کرکٹ لوورز" کے دل ٹوٹ گئے۔ ہم اب آتے ہیں اس فیصلے کے پس منظر کی طرف، جب کمیشن کی کارروائی چل رہی تھی تو شعیب کو باقاعدہ ٹریپ کیا گیا، اس سے کہا گیا وہ یہ بیان دے کہ وہ ٹیکسوں کی دوائیں استعمال کرتا رہا تھا اسے کہا گیا دنیا میں یونانی ادویات کی پڑتال کا کوئی نظام موجود نہیں لہذا اسے شک کی بنیاد پر معاف کر دیا جائے گا، شعیب اس ٹریپ میں آ گیا اور اس نے یونانی ادویات کے استعمال کا اعتراف کر لیا، اس کے بعد اسے گرین سٹنل دے دیا گیا اور اس نے باقاعدہ پریکٹس بھی شروع کر دی لیکن بعد ازاں اس کے خلاف فیصلہ دے دیا گیا، اس فیصلے کے بارے میں تین قسم کی افواہیں پائی جاتی ہیں پہلی افواہ کے مطابق جن دنوں کمیشن کی کارروائی چل رہی تھی ان دنوں باجوڑ کا واقعہ پیش آ گیا، اس واقعے میں باجوڑ کے 83 طالب علم جاں بحق ہو گئے، حکومت نے اس واقعے کی ذمہ داری قبول کر لی جس کے نتیجے میں حکومت کے خلاف عوامی احتجاج شروع ہو گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے حکومت کو باجوڑ کے واقعے سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے کسی بڑے ایٹمیکی ضرورت تھی لہذا اس وقت محمد آصف اور شعیب اختر کی قربانی دینے کا فیصلہ ہوا، ان دونوں کی خبر شائع ہوئی اور لوگوں کی توجہ باجوڑ سے ہٹ گئی، دوسری افواہ پاکستان کرکٹ بورڈ کے نئے چیئرمین ڈاکٹر نسیم اشرف تھے، ڈاکٹر نسیم اشرف 18 اکتوبر 2006ء کو بورڈ کے چیئرمین بنے تھے اور انہیں عالمی میڈیا میں جگہ پانے اور بڑے بڑے انٹرویوز دینے کے لیے کسی ایٹمیکی ضرورت تھی لہذا شعیب اختر اور محمد آصف کو ڈاکٹر صاحب کی "انٹری" بنا دیا گیا، انٹرنی ڈوپنگ کمیشن کا فیصلہ آیا اور ڈاکٹر نسیم اشرف پوری دنیا میں مشہور ہو گئے، تیسری افواہ جو اب ہے کرکٹ کے بعض جنخداروں کی ماہرین کا کہنا ہے اس معاملے میں جوئے کے عنصر کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، مارچ 2007ء میں ورلڈ کپ شروع ہو رہا ہے اور دنیا جانتی ہے ہماری ٹیم سردست ان دونوں کھلاڑیوں کے بغیر ورلڈ کپ نہیں جیت سکتی لہذا دونوں کھلاڑیوں پر جواہ شروع ہو گیا اور اس جوئے کے نتیجے میں دونوں کھلاڑی سیاست کی وکٹ پر آڈٹ ہو گئے، سرے دست یہ تینوں افواہیں محض سرگوشیاں اور خدشات ہیں اور ان میں کون سی بات درست ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا اس سازش کے جولا ہے لیکن ایک بات سچ ہے وہ شعیب اختر جس نے ان تھک محنت اور اپنے اہل ارادے سے اپنی معذوری کو ٹھکست دے دی تھی، وہ شعیب اختر اور اس کا ٹیلنٹ سازش کے ہاتھوں کلین بولڈ ہو گیا۔

میں جب بھی شعیب اختر کی تصویر دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے ہم ایک بے وفا اور احسان فراموش قوم بنتے جا رہے ہیں، ہمارے پاس ڈاکٹر عبدالقادر ہوں یا پھر شعیب اختر ہم اپنے ہر ہیرہ کو بے وقور اور رسوا کر دیتے ہیں، ہم اپنے ملک میں پیدا ہونے والے ہر قد آور شخص کے پاؤں کاٹ دیتے ہیں، ہم اپنے ہر محسن کو حسد اور انا کی صلیب پر چڑھا دیتے ہیں۔



شاید کوئی نہیں

یہ دو انتہائیں ہیں ایک انتہا پر دیور لوزر کی سیکنڈ کٹری ہے اور دوسری انتہا پر ہمارے محبوب وزیر اعظم جناب شوکت عزیز مسکرا رہے ہیں اور ہم سب لوگ ان دو انتہاؤں کے درمیان کٹڑے ہیں اور کبھی سیکنڈ کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی جناب شوکت عزیز کی زیارت کرتے ہیں اور پھر سوچتے ہیں ہم سیکنڈ ہیں یا پھر شوکت عزیز کے خوشحال اور ترقی یافتہ پاکستان کے باشندے!

سیکنڈ لوزر دیر کے ایک زخمی اور کئے پھٹے گاؤں "اچ" کی باسی ہے۔ اس کے سات بیچے ہیں، سیکنڈ کا خاوند محنت مزدوری کرتا ہے اگر اسے مزدوری مل جائے تو گھر کے آدمی افراد کی روزی کا بندوبست ہو جاتا ہے بصورت دیگر سب لوگ مل کر "روزہ" رکھ لیتے ہیں آج سے دو سال پہلے سیکنڈ کے بیٹے عمر کو برکان ہوا اس کا پورا جسم پیلا پڑ گیا، سیکنڈ نے شروع میں ویسی ٹوکوں کا سہارا لیا لیکن عمر کو افاقہ نہ ہوا، سیکنڈ اسے دیر لے گئی وہاں جا کر پتہ چلا عمر کو "ہپاٹائٹس سی" ہے اور اگر وہ بیٹے کی زندگی چاہتی ہے تو اسے پچاس ساٹھ ہزار روپے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ سیکنڈ کے پلو میں صرف دو سو روپے بندھے تھے اس نے پلو کھولا، یہ دو سو روپے ڈاکٹر کے سامنے رکھے اور بیٹے کو لے کر چپ چاپ واپس آ گئی، گھر پہنچی تو پتہ چلا اس کی تیرہ سالہ بیٹی روزینہ کا چہرہ بھی پیلا ہو چکا ہے، وہ دوسرے دن روزینہ کو بھی شہر لے گئی ڈاکٹر نے بتایا روزینہ بھی عمر کی طرح ہپاٹائٹس کی مریض ہے، وہ اسے بھی لے کر واپس آ گئی دوسرے ہفتے عابدہ کا چہرہ پیلا ہوا، تیسرے ہفتے رابعہ کی آنکھیں چڑھنا شروع ہوئیں اور اس سے اگلے مہینے مسلمان کو بھی ہپاٹائٹس سی ہو گیا، اب سیکنڈ کے گھر میں تین چار پائیاں اور پانچ مریض تھے، اس نے ایک ایک چار پائی پر دو دوسری لٹائے اور خود ان کے سر ہانے بیٹھ کر روتی رہتی لیکن اگر رونے سے مسائل حل ہوتے تو دنیا میں کوئی شخص دکھی نہ رہتا، سیکنڈ کے مسائل بھی بڑھتے چلے گئے، پورے گاؤں نے اس کی تھوڑی تھوڑی مدد کرنا شروع کر دی، لوگ اپنا پیٹ کاٹ کر اسے ادھار دینے لگے، سیکنڈ نے جیسے تیسے کر کے اپنے بچوں کو پچاس ہزار روپے کی دو سئیں لادیں لیکن مریض چار پائیوں سے نہ اٹھ سکے، اسی دوران کسی نے بتایا اگر وہ ایک لاکھ روپے کا بندوبست کر لے تو اس کے بچوں کا علاج ہو سکتا ہے، سیکنڈ کو حوصلہ ہوا لیکن اس نے زندگی میں کبھی اتنی بڑی رقم نہیں

دیکھی تھی وہ سوچنے لگی اس کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، کہا جاتا ہے جب انسان کسی مشکل میں پھنستا ہے تو وہ اپنی قیمتی چیزیں بیچنے لگتا ہے سیکنڈ ہینڈ کے مسئلے کا بھی یہی حل تھا، سیکنڈ ہینڈ کے پیچھے دیکھا اس کے گھر میں صرف ایک ہی قیمتی چیز تھی اور یہ قیمتی چیز اس کی سولہ برس کی جوان بیٹی روبینہ تھی، سیکنڈ ہینڈ کو بیچنے کا فیصلہ کر لیا، اس نے جوہری بلوائے، جوہریوں نے لڑکی دیکھی اور اس کی ایک لاکھ روپے قیمت لگا دی، سیکنڈ ہینڈ نے بیعانہ لے لیا لیکن اس شام روبینہ کا چہرہ بھی پیلا ہو گیا، جب جوہریوں کو پتہ چلا روبینہ بھی پھانسی کی مرلیض ہے تو وہ آئے اور بیعانہ لے کر واپس چلے گئے، اس دن سے سیکنڈ ہینڈ اس ملک کے حکمرانوں سے ایک درخواست کر رہی ہے، وہ ان سے کہہ رہی ہے، "آپ لوگ صرف روبینہ کا علاج کرا دیں میں اسے بچ کر باقی بچوں کا علاج کرا لوں گی۔" یہ ایک انتہا ہے۔

دوسری انتہا ہمارے وزیراعظم جناب شوکت عزیز ہیں، حکومت نے 5 جون 2006ء کو قومی اسمبلی میں بجٹ کی جو دستاویزات دی تھیں ان دستاویزات سے انکشاف ہوا، حکومت نے 2005-06ء کے دوران قومی اسمبلی کے 342 ارکان اور ایک سینیٹروں کو تنخواہوں اور الاؤنسز کی مدد میں 662 ملین روپے ادا کئے تھے جبکہ وزیراعظم جناب شوکت عزیز نے ایک سال میں غیر ملکی دوروں پر 750 ملین روپے خرچ کئے، اگر ہم اس رقم کو کروڑوں میں دیکھیں تو یہ 75 کروڑ روپے بنتے ہیں، حکومتی دستاویزات کے مطابق 2005-06ء میں قومی اسمبلی کے سپیکر، ڈپٹی سپیکر، چیئرمین سینیٹ، دونوں ایوانوں کی سینیڈز، جج کیشیوں کے چیئرمینوں، پارلیمانی سیکرٹریوں، وفاقی وزراء، وزراء مملکت اور تمام ارکان اسمبلی اور سینیٹروں پر ایک ارب روپے خرچ ہوئے جبکہ وزیراعظم نے صرف ججی ہاں صرف غیر ملکی دوروں پر 75 کروڑ روپے خرچ کر دیئے، اگر ہم وزیراعظم کے دوروں میں صدر جنرل پرویز مشرف کے دورے بھی شامل کر لیں تو سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ان دوروں پر ایک ارب روپے خرچ ہوئے تھے گویا پوری پارلیمنٹ اور کابینہ کے اخراجات ایک طرف اور وزیراعظم اور صدر کے غیر ملکی دورے دوسری طرف۔

ہم ان دوروں کے خلاف نہیں ہیں، یہ دورے غیر ملکی اور خارجہ تعلقات کے لئے ضروری ہوتے ہیں، ان دوروں کے دوران تو ہم Give اور Take کرتی ہیں اور ان دوروں کے دوران سربراہان اپنے عالمی مسائل حل کرتے ہیں لیکن بد قسمتی سے ایک ارب کے ان دوروں سے پاکستان کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا، وزیراعظم کے شاہانہ دوروں کے باوجود امریکہ اور پاکستان کا باہمی فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے، افغانستان اور بھارت اپنے جوتے ہمارے سر پر رکھ رہے ہیں، ایران کی نظر میں پاکستان اور امریکہ دونوں ایک ہیں، یورپ ہمیں دہشت گرد اور بنیاد پرست سمجھتا ہے، سعودی عرب نے ہمارے لئے عمرے کی شرائط سخت کر دی ہیں، مل ایل ایٹ میں پاکستانیوں کو مزدوری نہیں مل رہی، تیل پیدا کرنے والے تمام ممالک ہمیں پوری دنیا سے مہنگا پٹرول دے رہے ہیں اور ہمارے وزراء تک جوتے اتار کر امریکہ میں داخل ہوتے ہیں لہذا اس صورتحال میں ہمارے غیر ملکی دورے سیاحت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود ہمارے وزیراعظم دورے پر دورہ فرماتے جا رہے ہیں اور ان کے ہر

دورے میں کم از کم دو اڑھائی سو لوگ ہوتے ہیں، یہ انتہا ہے اور لوگ اس انتہا کو دیکھ کر یہ سوچتے پر مجبور ہیں اگر ہمارے محبوب وزیر اعظم صرف ایک دورہ منسوخ کر دیں اور اس دورے کے پیسے سیکینڈ جیسے لوگوں کو دے دیں تو کتنی سکیناؤں کی بیٹیاں بکنے سے بچ جائیں، کتنی روپیہناؤں کی عزت ناموس اور ایمان بچ جائے اور پھانٹائش اور کینسر کے شکار کتنے مرلیضوں کو زندگی مل جائے لیکن شاید اس فیصلے کے لئے دل میں درد اور سینے میں خمیر ہونا ضروری ہے اور یہ وہ قسمتی اثاثے ہیں جن سے ہماری حکومتیں اور ہمارے حکمران محروم ہیں، یہ لوگ ایسی مشینیں ہیں جن کے سینے میں دل ہوتا ہے اور نہ ہی درد، جنہوں نے اپنے اپنے خمیر کا بائی پاس کر رکھا ہے اور جنہیں سکیناؤں اور روپیہناؤں کی تکلیف سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی توقع نہیں لہذا میں سیکینڈ اور روپیہنا کا کیس عوام کی عدالت میں رکھتا ہوں اور عوام سے درخواست کرتا ہوں کیا اس ملک میں کوئی ایک ایسا شخص موجود ہے جو پھانٹائش کے شکار پانچ بچوں کا علاج کرا سکے، جو اللہ کے لئے چل کر ان بچوں کے گھر جا سکے، جو اللہ کی رضا کیلئے 16 سال کی ایک بچی کو بکنے سے بچا سکے، کوئی ہے..... میرا خیال ہے کوئی نہیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

خدا کیلئے کچھ کریں

ہم نے بائیو ایریا سے تلاش شروع کی۔ ایوان صدر سے ہمس (پی آئی ایم ایس) تک ادویات کی تیرہ دکانیں ہیں۔ ہم جس دکان پر گئے ہمیں انکار ہوا ہم وہاں سے سپر مارکیٹ آگئے یہاں دواؤں کے چار بڑے سٹور ہیں وہاں سے بھی ہمیں نفی میں جواب ملا۔ ہم راولپنڈی مری روڈ پر آگئے۔ ایک سرے سے کوشش شروع کی اور دوسرے سرے تک پہنچ گئے لیکن کسی کیمسٹ میڈیکل سٹور کے کسی ملازم اور کسی دکان کے کسی کپوڈرنے ہمیں مثبت جواب نہ دیا۔ شیخ صاحب کی طبیعت خراب ہو رہی تھی ان کی کپٹیاں سو جھپکی تھیں سانس چڑھ گیا تھا اور ان کے ہاتھ کا پینے لگے تھے۔ میں انہیں لے کر واپس آ گیا انہیں گھر چھوڑا اور ایک بار پھر تلاش میں نکل کھڑا ہوا اس بار میں نے درمیانے اور چھوٹے سٹوروں کا رخ کیا میں عام گلی خلوں میں گھس گیا یہ ترکیب کامیاب رہی اور مجھے وارث خان کے ایک چھوٹے سے سٹور سے دس گولیوں کا ایک پیٹل گیا۔ میں گھر واپس آیا تو شیخ صاحب باہر گلی میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے خوش دیکھ کر ان کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

شیخ صاحب ہمارے بزرگ ہیں وسطی پنجاب کے رہنے والے ہیں کبھی کبھار سال چھ مہینے میں ایک آدھ دن کیلئے میرے پاس اسلام آباد آ جاتے ہیں۔ ڈپریشن کے مریض ہیں۔ رات رات بھر جاگتے رہتے ہیں۔ وہ کھانے کے بغیر رہ سکتے ہیں لیکن سکون آور گولیوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے۔ وہ چند روز پہلے میرے پاس آئے تو ان کی گولیاں ختم ہو گئیں۔ ہم دونوں گولیوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ہم دو گھنٹے پھرتے رہے اسلام آباد کے زیادہ تر سٹور کھنگال لئے راولپنڈی پھر کر دیکھ لیا لیکن شیخ صاحب کی گولیاں نہیں ملیں۔ میرا خیال تھا شاید ہنگی ہونے کے باعث دکاندار یہ گولیاں نہیں رکھتے ہوں گے لیکن جب ملیں تو معلوم ہوا دس گولیوں کی قیمت صرف نو روپے تھی مجھے حیرت ہوئی دوسرے دن میں نے اپنے ایک دوست سے تذکرہ کیا تو اس نے بتایا صرف ڈپریشن نہیں پاکستان میں ٹینشن، اعصابی درروں، بلڈ پریشر اور امراض قلب کی دوائیں تک تاجید ہو چکی ہیں۔ یہ میرے لئے انکشاف تھا میں نے اپنے دوست سے پوچھا "کیا یہ دوائیں ذخیرہ ہو جاتی ہیں" اس نے مسکرا کر جواب دیا "نہیں تم غلط سوچ رہے ہو یہ دوائیں کم نہیں ہوئیں ذخیرہ اندوزی والا معاملہ بھی نہیں سپلائی میں بھی کوئی تعطل نہیں آیا" ملک میں دراصل ڈپریشن، افسردگی اور بالٹو لیا کے مریض بڑھ چکے ہیں ان کی تعداد میں چار گنا

اضافہ ہو چکا ہے اور ہر آنے والے دن ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ میں نے انکار میں سر ہلا دیا لیکن میرے دوست نے کہا 'ابھی چند سال پہلے کی بات ہے ملک میں وٹنی امراض کے ماہر نہ ہونے کے برابر تھے۔ پاگل خانوں تک میں عام میڈیکل پریکٹیشنر سے کام چلایا جاتا تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف سرکاری ہسپتالوں میں نفسیاتی امراض کے شعبے کھل گئے بلکہ جگہ جگہ ماہر نفسیات، ماہر وٹنی امراض، سائیکالوجسٹ اور سائیکیاٹرسٹ کے پورے دکھائی دینے لگے اور اب یہ عالم ہے تمام بڑے سرکاری ہسپتالوں میں ایسے سینکڑوں لوگ آتے ہیں جو کسی نہ کسی دائمی عارضے کا شکار ہیں جبکہ بڑے سائیکیاٹرسٹ، سائیکالوجسٹوں اور نورو لوجسٹوں سے دس دس پندرہ پندرہ دن پہلے سے وقت لینا پڑتا ہے۔ یہ ہے ایک صورتحال! اس کے علاوہ بھی ایک صورتحال ہے جو بہت الارمنگ "ہے" میں خاموشی سے منتہا رہا وہ بولا "یہ تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی شدید عارضے کے باعث ڈاکٹر کے پاس پہنچ جاتے ہیں جبکہ ملک میں ایسے مریضوں کی تعداد بھی کسی طرح دس ہارہ کروڑ سے کم نہیں جو دائمی امراض کی ابتدائی سٹیج پر ہیں۔ آپ کسی سڑک پر کھڑے ہو جائیں اور اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں آپ کو ہرگز روتے چہرے پر ایک وحشت نظر آئے گی۔ آپ دیکھیں گے لوگ خود اپنے آپ سے ہاتھ کرتے جا رہے ہیں، سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں غلٹاں ہیں ڈراما ٹیور اشارے پر رک کر چلنا بھول گیا، موٹر سائیکل سوار اشارہ توڑ کر نکل گیا، مسافر مسافر کے چھت پر پتھر مار رہے، گاؤں گاؤں سے الجھ رہے، دوکاندار سیکڑمین سے لڑ رہے، افسر ماتحت کو ڈانٹ رہا ہے ماتحت افسر کو گالیاں دے رہا ہے، سٹی ٹائی لگانے سے دوسو حاسدین پیدا ہو جاتے ہیں، امتحان میں نمبر کم آنے پر طالب علم زہری رہے ہیں، مرضی کی شادی نہ ہونے پر نوجوان دریا میں کود رہے ہیں، بچوں کی معمولی لڑائی پر پورے کا پورا محلہ پلاسی کا میدان بن جاتا ہے، اذانیں دینے، استیجا خانے استعمال کرنے اور نعشیں پڑھنے پر مسجدوں میں لڑائیاں ہورہی ہیں، رکشہ گزرنے، جہاز اڑنے، ٹرین آنے یا ریڈیو ٹی وی کی ڈراما سٹیج اور شہادت کے سوا کوئی لفظ کوئی حرف نہیں ہوتا اور سوسائٹی سے شکر، مہربانی اور فضل جیسے لفظ اڑ چکے ہیں"

وہ خاموش ہو گیا، میرا دوست بولا "تم مہربانی کر کے حکومت سے کہو لوگ مایوس ہو چکے ہیں خدا کیلئے کہیں سے ان لوگوں کیلئے امید کا کوئی چراغ لائیں، کوئی ایک آدھ ایسا سورج کاشت کریں جس کی روشنی چند لمحوں کیلئے ہی کسی ان لوگوں کے ذہنوں میں نور بھردے، کہیں سے ہوا کا کوئی جھونکا ادھار لے آئیں، کچھ تو کریں ان لوگوں کیلئے کچھ تو کریں ایسا نہ ہو آپ ایک جیتے جاگتے ملک کے حکمران کی بجائے پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ بن کر رہ جائیں اور آپ کو انسانوں کی جگہ مریضوں پر حکومت کرنا پڑ جائے، ان سے کہو کچھ کریں، خدا کیلئے کچھ کریں"



پستول کی عدالت

ڈاکٹر طارق مسعود اولینڈی میڈیکل کالج میں سینئر لیکچرار تھے انہوں نے گلشن آباد ہاؤسنگ سوسائٹی میں گھر خریدا مکان کے بیس منٹ میں پانی جمع ہو جاتا تھا ڈاکٹر صاحب نے سوسائٹی کی انتظامیہ سے تدارک کی درخواست کی انتظامیہ سستی کا مظاہرہ کرنے لگی اسی دوران میڈیکل کالج سے ان کا تبادلہ ہو گیا وہ تبادلے کی وجہ سے پریشان تھے وہ 23 دسمبر کی صبح اٹھے تو بیس منٹ پانی سے بھر چکا تھا ڈاکٹر صاحب طیش میں آ گئے انہوں نے پستول لیا اور سوسائٹی کے دفتر چلے گئے دفتر میں سوسائٹی کے سیکرٹری طارق محمود اطہر اور ممبر تنویر عالم بیٹھے تھے ڈاکٹر صاحب کی ان دونوں کے ساتھ تو تکار ہو گئی ڈاکٹر صاحب نے پستول نکالا اور فائر کھول دیا طارق محمود اطہر موقع پر جاں بحق اور تنویر عالم شدید زخمی ہو گئے ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد پستول اپنی کپٹی پر رکھا اور گولی چلا دی چوتھا دھماکا ہوا اور ڈاکٹر صاحب بھی وہیں ڈبیر ہو گئے آدھ گھنٹے میں سوسائٹی کے دفتر میں دو نعشیں اور ایک زخمی پڑا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو بیس منٹ میں پانی بھرنا یا تبادلہ ہو جانا اتنا سنگین مسئلہ نہیں جس سے مجبور ہو کر ایک استاد ڈاکٹر دوزندہ انسانوں پر گولیاں برسا دے اور آخر میں خودکشی کرنے دینا کے نوے فیصد بیس منٹس میں سہم آتی ہے اور دنیا کے تمام سرکاری ملازمین کے تبادلے ہوتے ہیں لیکن کہہ ارض کے کسی کوئی شخص خودکشی کرتا ہے اور نہ ہی دوسرے کو گولی مارتا ہے لہذا پھر سوال پیدا ہوتا ہے وہ کون سے عوامل تھے جن کے باعث ایک سینئر میڈیکل آفیسر انتہائی اقدام پر مجبور ہو گیا۔ یہ آج کا بنیادی سوال ہے آپ ذرا دائیں بائیں اور آگے پیچھے جھانک کر دیکھیں آپ کو محسوس ہوگا ہمارے زیادہ تر لوگ ڈاکٹر طارق مسعود کی کیفیت سے گزر رہے ہیں ہم لوگوں میں برداشت اور تحمل ختم ہو چکا ہے لوگ اب نہایت معمولی اختلاف پر پستول نکال لیتے ہیں آپ اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑا کر دیکھ لیں آپ کو پاکستان کا ہر شخص دوسرے سے الجھتا ہوا نظر آئے گا آپ کو ہر شخص کے چہرے پر ناراضی، نفرت اور شکوے کے تاثرات ملیں گے آپ کو کوئی مسکراتا ہوا شخص نظر نہیں آئے گا بچے بچے کے ساتھ دست و گریبان ہوگا بیٹا باپ سے الجھ رہا ہوگا بیوی خاوند اور خاوند بیوی سے تو تکار کر رہا ہوگا ذرا تھوڑے کئیٹر کو گالی دے رہا ہوگا اور کئیٹر مسافروں کے ساتھ بدتمیزی کر رہا ہوگا گا بک دکاندار کو گھور رہا ہوگا اور دکاندار گا بک کو نفرت

سے دیکھ رہا ہوگا، طالب علم کا سینہ استاد کے خلاف اٹل رہا ہوگا اور استاد شاگردوں کے خلاف سازش کر رہا ہوگا، آپ فوراً کیجئے ان تمام لوگوں کا اختلاف محض اختلاف نہیں یہ دشمنی ہے، اس معاشرے کا ہر شخص دوسرے شخص کی جان لینا چاہتا ہے۔ پاکستان کا شمار دنیا کے ان پانچ ممالک میں ہوتا ہے جن میں جرائم کی شرح انتہا کو چھو رہی ہے، آپ کسی دن اخباراتھا کر دیکھ لیں آپ کو اس میں آبروریزی، ڈاکے اور قتل کی پانچ چھ لاکھ خبریں ملیں گی، دنیا میں اس وقت قتل کے سب سے زیادہ مجرم پاکستان میں ہیں ہماری جیلوں میں اس وقت 55 ہزار قاتل بند ہیں جبکہ اس سے کہیں زیادہ تعداد باہر بھج رہی ہے، ہم میں سے ہر شخص روزانہ کسی کو قتل کرنے کی دھمکی دیتا ہے یا پھر خودکشی کا ارادہ کرتا ہے، ہم لوگ گیس، بجلی اور ٹیلی فون کا کنکشن تک حاصل کرنے کے لئے خودسوزی یا خودکشی حملے کی دھمکی دے دیتے ہیں، ہمارے لوگ تیل کی بوتل لے کر عدالت اور پارلیمنٹ ہاؤس پہنچ جاتے ہیں، لوگ جس منٹ میں پانی بھر جانے یا کھڑکی پر گیند لگنے کے "جرم" میں پانچ پانچ لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں اور ہمارے ملک میں لوگ ماہ جس نہ ملنے یا امتحان میں نمبر کم آنے پر خودکشی کر لیتے ہیں، آپ فوراً کریں تو اس وقت اس معاشرے میں غصے، شور، توڑ پھوڑ، نفرت، شکوے اور اختلاف کے سوا کچھ نہیں بچا، اس وقت دنیا میں پاکستان کے سوا شاید ہی کوئی دوسرا ملک ہو جس میں موت کی اتنی خواہش، ذکر یا کوشش کی جاتی ہو، ایک اندازے کے مطابق ہمارے ملک میں ہر شخص روزانہ دس مرتبہ موت کا ذکر کرتا ہے اور اس میں سات مرتبہ قتل اور خودکشی کے لفظ استعمال ہوتے ہیں۔

ہمارے دانشور، براء اور پالیسی ساز اس کی مختلف توجیہات بیان کرتے ہیں، یہ لوگ مہنگائی، بے روزگاری، ڈپریشن، ماحولیاتی آلودگی، شہر اور مارشل لاء کو اس کی وجہ قرار دیتے ہیں لیکن میرا خیال ہے اس کی ذمہ داری صرف اور صرف ہمارے عدالتی نظام پر استوار ہوتی ہے، ہم میں سے ہر شخص انصاف سے مایوس ہو چکا ہے لہذا اس نے اپنا انصاف اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص سمجھتا ہے پولیس اس کی بات سننے کی اور نہ ہی عدالت لہذا اسے دو ہزار روپے کا پستول خریدنا چاہئے، ظالم کو ڈبلز پر ڈھیر کر دینا چاہئے اور اپنی کینٹی پر پھول رکھ کر دنیا کے دکھوں سے آزاد ہو جانا چاہئے، ہم لوگوں نے پستول کو ہر ظلم، ہرزادی کی حامل تسلیم کر لیا ہے لہذا آج اس معاشرے میں جس کو دوا چاہئے وہ پستول لے کر گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہے، جس کو روزگار درکار ہے وہ جیب میں پستول ڈال کر سڑک پر آ جاتا ہے، جسے انصاف اور عزت چاہئے وہ بھی ایک آدھرا نقل بردار کا بندوبست کرتا ہے اور عزت اور انصاف لے کر گھر چلا جاتا ہے۔ یہ سب ہمارے عدالتی نظام کی کمزوری اور خامیوں کا نتیجہ ہے، میرا خیال ہے اگر ڈاکٹر طارق مسعود کو یقین ہوتا کہ وہ عدالت جائے گا اور عدالت اگلے ہی دن ہاؤسنگ سوسائٹی اور میڈیکل کالج کی انتظامیہ کو طلب کر لے گی اور اس کے ساتھ سو فیصد انصاف ہوگا تو ڈاکٹر طارق مسعود پستول لے کر سوسائٹی کے دفتر جانے کی بجائے سیدھا عدالت جاتا، وہ دو لوگوں کو گولی مارنے اور خودکشی کرنے کی بجائے وکیل کا بندوبست کرتا لیکن کیونکہ وہ جانتا تھا وہ پوری عمر کھپا کر بھی عدالت سے انصاف نہیں لے سکے گا لہذا اس نے اپنا فیصلہ خود کرنے کا فیصلہ کیا، اس نے پستول کی عدالت سجائی، اس نے اسے مجرم کو گولی ماری اور خود بھی زندہ گا، کے خدا... سے آزاد...

گیا۔ اس وقت پاکستان کے زیادہ تر لوگ ڈاکٹر طارق مسعود کی کیفیت اور صورتحال سے گزر رہے ہیں؟ یہ لوگ اسی طرح سوچ رہے ہیں۔ ہم لوگ اگر عدالتی نظام کی خامیوں پر غور کریں تو اس کی بڑی وجہ ہماری غیر قانونی حکومتیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے دنیا کی غیر قانونی حکومتیں ہمیشہ عدالت اور قانون کے گلوں میں پروان چڑھتی ہیں اور انہیں اپنے دوام کیلئے جوں کی ضرورت پڑتی ہے ہم لوگ پچھلے 40 برسوں سے غیر قانونی اور کرپٹ حکومتیں کاشت کر رہے ہیں چنانچہ یہ حکومتیں اس ملک کے عدالتی نظام کو ٹھیک نہیں ہونے دیتیں، یہ حکومتیں جانتی ہیں جس دن عدالتی نظام طاقتور ہو جائے گا اس دن گریڈ 22 کا کوئی جرنیل صدر نہیں بن سکے گا، اس وقت ملک میں کوئی باوردی جمہوریت جنم نہیں لے گی چنانچہ یہ لوگ اپنے مفادات کیلئے انصاف اور قانون کو اپنی ٹٹھی سے باہر نہیں نکلنے دے رہے، ہماری حکومتوں کی اس سفاکی کا نتیجہ ڈاکٹر طارق مسعود جیسے لوگ بھگت رہے، اس کی سزا پورے معاشرے کو مل رہی ہے، اس کے رد عمل میں ہمارے پورے معاشرے کی قوت برداشت جواب دے گئی ہے۔

اگر ہم اپنی پالیسی میں تھوڑی سی ترمیم کر لیں تو میرا دعویٰ ہے ہمارے حکمران بھی محفوظ رہ سکتے ہیں اور پورا معاشرہ بھی، ہم آج اپنے تین بڑے عہدیداروں صدر، وزیر اعظم اور چیف آف آرمی سٹاف کو ہر قسم کی عدالتی کارروائیوں سے پاک قرار دے دیں، ہم یہ قانون بنالیں آج کے بعد ان تینوں شخصیات کے کسی ذاتی فعل کو عدالت میں پیش نہیں کیا جاسکے گا لیکن ان کے علاوہ پاکستان کا ہر عہدیدار اور ہر ادارہ قابل احتساب ہوگا، ہماری عدالتیں ہر شخص کو طلب کریں گی اور صرف 24 گھنٹوں میں ان کے خلاف فیصلہ دے دیں گی تو میرا خیال ہے ہم لوگ قتل اور خودکشی سے بچ جائیں گے، ہماری عدالتیں فیصلہ کر لیں پاکستان میں کوئی کیس ایک ہفتے سے آگے نہیں جائے گا اور بیس منٹ میں پانی بھرنے سے لے کر تباہی تک ہر کیس کا فیصلہ میرٹ پر اور فوری ہوگا تو مجھے یقین ہے پاکستان میں پستول کی کوئی عدالت لگے گی اور نہ ہی کوئی شخص اپنا فیصلہ خود کرے گا، اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یقین کیجئے یہ آگ کسی نہ کسی دن ابوان صدر تک پہنچ جائے گی اور اس کے بعد ملک میں کوئی عہدیدار بچے گا اور نہ ہی عہدیدار۔



بے عزت

شیخ صاحب فرزندہ تھے ان کی آواز میں تھر تھراہٹ اور آنکھوں میں آنسو تھے وہ بار بار آنسو سے گردن ہلاتے تھے اور ان کے منہ سے سرد آہیں نکلتی تھیں ان کا خیال تھا امریکہ نے عید کے دن صدام حسین کو پھانسی دے کر پودے عالم اسلام کی بے عزتی کی ان کا کہنا تھا یہ پھانسی محض پھانسی نہیں یہ مسلمانوں کی غیرت پر حملہ ہے اور ہمیں اس حملے کا بھرپور جواب دینا چاہئے میں نے ان سے عرض کیا "صدام حسین سلطان صلاح الدین ابوہنی محمد بن قاسم یا محمود غزنوی نہیں تھا وہ ایک آمر تھا اور اس نے 25 برس تک عراق میں امریکی مفادات کی کاشتکاری کی تھی اس نے اپنے ہاتھوں سے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے حقوق کا گلہ گھونٹا تھا اور اس نے ملک میں بیسیوں اجتماعی قبریں بنائی تھیں" شیخ صاحب کو مجھ سے اختلاف تھا ان کا فرمانا تھا "صدام حسین کتنا ہی ظالم اور جاہل بھی ہو مگر وہ عالم اسلام کا ہیرو تھا صدام حسین سے 158 اسلامی ممالک کے کروڑوں لوگوں کی ہمدردیاں وابستہ تھیں لہذا امریکہ کو اس سے رعایت برتنی چاہئے تھی" اگر یہ ممکن نہیں تھا تو بھی صدام حسین کو کم از کم اس دن پھانسی نہ دی جاتی جس دن پچاس لاکھ مسلمان حج ادا کر رہے تھے اور ایک ارب 48 کروڑ مسلمان عید الاضحیٰ منا رہے تھے

میں نے ان سے پوچھا "امریکہ ہماری توہین کر چکا ہے لہذا ہمیں اب کیا کرنا چاہئے" شیخ صاحب نے میز پر مکہ مارا اور اونچی آواز میں بولے "ہمیں اس اقدام کے خلاف پوری دنیا میں احتجاج کرنا چاہئے" ہمیں امریکہ مردہ ہاد کے نعرے لگانے چاہئیں اور ہمیں جلوس نکالنے چاہئیں" میں نے ان کی اس معصومانہ خواہش پر قبضہ لگایا انہوں نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا میں نے فائل میں سے اخبار کا ایک صفحہ نکالا اور وہ صفحہ ان کے سامنے پھیلا دیا اخبار کے چین درمیان میں پانچ چھ تصاویر چھپی تھیں ایک تصویر میں پولیس کا ٹینبل کے سامنے پانچ چھ سال کی ایک بچی ہاتھ جوڑ کر کھڑی تھی بچی کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر بے جا رنگ تھی دوسری تصویر میں سات آٹھ پولیس کا ٹینبل پندرہ سولہ سال کے ایک بچے پر ڈنڈے برسا رہے تھے بچے کی شوارا اتر کر اس کے جوتوں پر پڑی تھی اس کی قمیص پھٹ چکی تھی اور وہ سر سے عام الف ننگا کھڑا تھا تیسری تصویر میں لیڈی کا ٹینبلو بے شمار خواتین کو ہانک کر لے جا رہی تھیں اور چوتھی تصویر میں پولیس بے شمار بچوں خواتین اور مردوں کو سڑک پر گھسیٹ رہی تھی میں نے ان تصویروں پر انگلی رکھی اور شیخ صاحب سے پوچھا "آپ جانتے ہیں یہ کس ملک کے منظر ہیں"

انہوں نے انکار میں سر ہلادیا، میں نے عرض کیا ”یہ پاکستان کی راولپنڈی کا مال روڈ ہے، یہ 28 دسمبر 2006ء کا دن تھا اور یہ جج اکبر سے صرف ایک دن پہلے کے منظر ہیں“ شیخ صاحب حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے، میں نے عرض کیا ”کیا آپ جانتے ہیں، یہ کون لوگ ہیں“ شیخ صاحب نے دوبارہ انکار میں سر ہلادیا، میں نے عرض کیا ”یہ پاکستان کے انتہائی مظلوم لوگ ہیں یہ وہ 106 خاندان ہیں جن کے مرد بچھلے تین چار برسوں سے غائب ہیں، یہ بچی جو ہاتھ باندھ کر پولیس کانسٹیبل کے سامنے کھڑی ہے اس کا والد تین برس سے غائب ہے، یہ بچہ جس کی شلوار اس کے جوتوں پر پڑی ہے اس کا والد مسعود خوبہ اڑھائی سال سے غائب ہے اور یہ خاتون جسے لیڈی کانسٹیبل ہانک کر لے جا رہی ہیں اس کا خاندان بچھلے تین سال سے گھر نہیں آیا“

شیخ صاحب خاموشی سے سنتے رہے، میں نے عرض کیا ”سر ان 106 خاندانوں کا خیال ہے ان کے خاندان بھائی اور والدہ ماجدہ کی بحیثیتوں کی حراست میں ہیں، انہیں خفیہ والوں نے اٹھایا اور کسی سیف ہاؤس میں پھینک دیا، یہ لوگ بچھلے تین چار برسوں سے اپنے پیاروں کی راہ دیکھ رہے ہیں، ان لوگوں نے پولیس سے لے کر عدالت تک ہر دروازے پر دستک دی لیکن انہیں کسی دروازے سے انصاف نہیں ملا، پاکستان کے کسی ادارے اور کسی شخصیت نے ان کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا، کسی نے ان کے آنسو نہیں پونچھے، لہذا ان لوگوں نے جمعرات 28 دسمبر کو می ایچ کیو کے سامنے مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا، یہ لوگ مری روڈ پر لیلیٹ میں ہوٹل کے چوک پر پہنچے تو پولیس نے ان کا راستہ روک لیا، انہوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور پولیس نے ان پر لاشمی چارج شروع کر دیا، اس لاشمی چارج کے دوران محمد بن مسعود کی شلوار اتر گئی جبکہ لاشمی چارج اور حکم پیل میں ایک بچی اور ایک خاتون بے ہوش ہو گئی، خواہن کے مردوں سے سر عام چادریں گریں اور ان کی بے پردگی ہوئی“ شیخ صاحب خاموش رہے، میں نے عرض کیا ”آپ جانتے ہیں گھروں سے غائب ہونے والے یہ لوگ کون ہیں اور ان کا جرم کیا تھا“ وہ چپ چاپ سنتے رہے، میں نے عرض کیا ”یہ لوگ باریش اور صوم و صلوة کے پابند تھے اور صدر بٹش کو ان کے ارادوں سے خطرے کی بو آتی تھی لہذا یہ لوگ گھروں سے غائب ہوئے اور اس کے بعد کسی کو ان کی خبر نہ ملی، ان کے گھر والے ان کی یاد میں روز جیتے اور روز مرتے ہیں۔ یہ لوگ جب عدالتوں کے دروازے بجا بجا کر تھک گئے تو انہوں نے پراسن احتجاج کا راستہ چنا اور آپ اس راستے کا انجام ان تصویروں سے دیکھ لیجئے“ شیخ صاحب نے ہاں میں گردن ہلائی اور شرمندہ شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے ”لیکن ان کا صدام حسین کی پھانسی کے ساتھ کیا تعلق“ میں نے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور سیدھا ہو کر جواب دیا ”ان لوگوں کا صدام حسین کی پھانسی کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے، امریکہ عالم اسلام کا دشمن ہے، ہم صدام حسین کی غیر اخلاقی پھانسی پر امریکہ کے سامنے احتجاج کرنا چاہتے ہیں، ہم کہتے ہیں امریکہ کو عید کے دن صدام حسین کو پھانسی نہیں دینی چاہیے تھی۔ درست، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے، ہم غیر مسلم امریکہ کے غیر اخلاقی اقدام کی مذمت کرنا چاہتے ہیں مگر ہمارے اپنے اسلامی ملک کی اخلاقی اقدار کی کیا حالت ہے؟ ہمارے اسلامی ملک سے 106 لوگ داڑھی رکھنے، نماز پڑھنے اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کے خواب دیکھنے کے جرم

میں اٹھالے گئے اور ہم تین چار برس بعد بھی ان کے اہل خانہ کو احتجاج کا حق نہیں دے رہے۔ ہم سڑک پر ان کے بچوں کی شلواریں اتار رہے ہیں، ان کی ٹانگوں، ان کی بیٹھوں پر ڈھڑے برسا رہے ہیں اور پورے ملک میں خاموشی ہے۔

وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ میں نے عرض کیا ”جس ملک میں 106 لوگ چپ چاپ اٹھالے گئے ہوں اور ان لوگوں کے لواحقین کو کسی عدالت، کسی ادارے سے انصاف نہ ملا ہو اس ملک کے لوگوں کو صدام حسین کی پھانسی پر احتجاج کا کوئی حق حاصل نہیں۔ جس ملک میں سرے عام مظلوموں کی شلواریں اترتی ہوں اور جس میں انصاف کے لیے سڑکوں پر نکلنے والے خاندانوں کو ڈھڑے اور گالیاں ملتی ہوں اس ملک کے لوگوں کو صدام حسین کی پھانسی پر احتجاج کا کوئی حق نہیں اور جس ملک میں آپ جیسے باخیر لوگ 106 خاندانوں پر ہونے والے ظلم پر خاموش ہوں اس ملک کے لوگوں کو سمندر پار پھانسی پانے والے صدام حسین کا غم منانے کا کوئی حق نہیں“ شیخ صاحب خاموش رہے۔ میں نے عرض کیا ”جناب صرف انصاف دینے والوں کو انصاف طلب کرنا چاہیے، مگر میں احتجاج کرنے والوں کو گھر سے باہر احتجاج کرنا چاہیے اور گھر میں زیادتی کے خلاف ہاتھ اٹھانے والوں کو باہر کی زیادتی پر آواز بلند کرنی چاہیے، ہمیں یہ تو نظر آ رہا ہے امریکہ نے عید الاضحیٰ کے دن صدام حسین کو پھانسی دے کر شہاز اسلام کی توہین کی لیکن ہمیں اپنی سڑکوں پر مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان عورتوں، بچوں اور بزرگوں کی توہین اور ذلت دکھائی نہیں دیتی، ہمیں صدام حسین تو نظر آتا ہے لیکن ہمیں محمد بن سعود، عائشہ سعود اور آمنہ سعود پر ہونے والا ظلم دکھائی نہیں دیتا، ہمیں عراق کے آنسو رات بھر سونے نہیں دیتے لیکن ہمیں وہ مسودہ جو نظر نہیں آتا جو دواڑھائی برس پہلے گھر سے نکلا تھا اور اس کے بعد وہاں نہیں آیا“ میں جذباتی ہو گیا، شیخ صاحب خاموشی سے سنتے رہے، میں نے عرض کیا ”یقین کیجئے جب تک ہم آمنہ سعود جیسی مظلوم عورتوں کو انصاف نہیں دیں گے ہم اس وقت تک عالمی سطح پر انصاف نہیں پائیں گے۔ ہم جب تک خود جج اور عید الاضحیٰ کا احترام نہیں کریں گے باہر کی دنیا اس وقت تک ہماری عیدوں اور ہمارے حقوں کی عزت نہیں کرے گی اور جب تک ہم محمد بن سعود کی عزت کو پھانسی گھاٹ سے نہیں اتاریں گے اس وقت تک ہمارے صدام حسین اسی طرح پھانسیوں پر نکلنے رہیں گے، ہم اسی طرح پوری دنیا میں بے عزت ہوتے رہیں گے۔“



مرجانا اور ماروینا

وحید ظفر کے والد اس کے بچپن میں فوت ہو گئے اس کی والدہ نے لوگوں کے کپڑے اور برتن دھو کر پانچ بچوں کی پرورش کی وحید ذہین بچہ تھا وہ سرکاری سکول سے میٹرک کر گیا وہ کالج میں داخلہ لینا چاہتا تھا لیکن وسائل کی کمی آڑے آئی لہذا اس نے والدہ کا ہاتھ بنانے کا فیصلہ کیا وہ نوکری کی تلاش میں نکلا آج 5 برس ہو چکے ہیں لیکن اسے کسی جگہ نوکری نہیں ملی اس دوران اس نے مزدوروں کے ساتھ مزدوری پینٹروں کے ساتھ پینٹ اور وٹروں کے ساتھ وٹری کی لیکن وہ کسی جگہ تک نہیں سکا کوئی نوکری اس کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی تھی کسی جگہ وہ جسمانی لحاظ سے کمزور تھا اور کسی کام میں اس کا ہاتھ نہیں بیٹھتا تھا چنانچہ وہ بے روزگار کا بے روزگار رہا۔ وہ چند روز قبل میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا "میں کیا کروں؟" میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں خاموش رہا ذرا دیر تک کہ بولا "میرا دل چاہتا ہے" میں ہم باندھ کر باہر نکلوں خود بھی مر جاؤں اور دوسروں کو بھی مار دوں" میرے ماتھے پر پسینا گیا میں نے اسے سمجھا بھلا کر سمجھا دیا لیکن میں سوچتا رہا "کیا وحید ظفر اکیلا ہے" مجھے محسوس ہوا نہیں وہ اس سوچ میں اکیلا نہیں اس وقت پاکستان کے بے شمار نوجوان اسی طرح سوچ رہے ہیں

پاکستان میں اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ نوجوان ہیں پاکستان کی 35 فیصد آبادی کی عمر 16 سے 22 سال ہے آپ اس کا تقابل چین امریکہ اور یورپ سے کیجئے چین کی 17 فیصد آبادی نوجوانوں پر مشتمل ہے امریکہ میں 15 فیصد لوگ نوجوان ہیں جبکہ یورپ میں صرف 21 فیصد نوجوان پائے جاتے ہیں لہذا پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس میں چھ کروڑ نوجوان ہیں اور ان میں زیادہ تر نوجوان وحید ظفر جیسے لوگ ہیں اور آج ان سب کی زبانوں پر یہی سوال ہے "میں کیا کروں" یہ نوجوان جذبے صلاحیت اور آگے بڑھنے کی امنگ سے لبریز ہیں لیکن بد قسمتی سے اس ملک میں ان کے لئے کوئی راستہ کوئی منزل نہیں یہ لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی ملک میں ان کے لئے جابز ہیں چنانچہ یہ لوگ گھروں میں چار پائیاں توڑتے ہیں گلیوں اور بازاروں میں آوارہ پھرتے ہیں یا بھڑکتے کی اس وادی میں نکل جاتے ہیں جس کے آخر میں موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ پاکستان میں اس وقت ایک کروڑ 45 لاکھ تعلیم یافتہ بے روزگار موجود ہیں اور عالمی اندازوں کے مطابق جس ملک

میں 50 لاکھ ڈین اعلیٰ تعلیم یافتہ اور متحرک نوجوان بے روزگار ہوں اس ملک کا لاء اینڈ آرڈر خطرے کا شکار ہو جاتا ہے۔ کمپیوٹر ماہرین کا کہنا ہے جب کسی کمپیوٹر ایکسپٹ کو نوکری نہیں ملتی تو وہ کمپیوٹر "ہیکر" بن جاتا ہے وہ ایسے وائرس ایجاد کرتا ہے جو پوری دنیا کے کمپیوٹرز تباہ کر سکتے ہیں امریکہ کی ایک سافٹ ویئر کمپنی صرف ہیکرز کو نوکری دیتی ہے اس کمپنی کا کہنا ہے ایک ہیکر سوسائٹ ویئر انجینئرز کے برابر ہوتا ہے نوجوانوں کو ہم ڈیٹا اینڈ سہیلٹی کے پیمانے سے بھی دیکھ سکتے ہیں پوری دنیا میں ڈیٹا اینڈ سہیلٹی کا خیال رکھا جاتا ہے امریکہ میں اگر مارکیٹ کو دو نوجوانوں کی ضرورت ہے تو وہ تیسرے نوجوان کو مارکیٹ میں نہیں آنے دیتے کیونکہ وہ جانتے ہیں تیسرا نوجوان پوری مارکیٹ کی نفسیات خراب کر دے گا 1960ء تک یورپ میں بھی پاکستان جیسا تعلیمی نظام تھا وہاں بھی سینکڑی بورڈز ہوتے تھے اور یہ بورڈز ہر سال لاکھوں بچوں کو میٹرک کی سند دے کر معاشرے میں پھینک دیتے تھے ان میں سے نصف نوجوان فیکٹریوں میں چلے جاتے تھے اور نصف کالجوں کا رخ کرتے تھے کالجوں سے فارغ ہونے والے بچوں میں سے چند یونیورسٹیوں میں بیچتے تھے اور باقی عملی زندگی شروع کر دیتے تھے لیکن پھر انہیں معاشرتی مسائل کا سامنا کرنا پڑا یورپ میں لاء اینڈ آرڈر اور بے روزگاری کا مسئلہ پیدا ہو گیا چنانچہ یورپ نے اپنا نظام بدل دیا یورپ نے سکول کی تعلیم کو کالج تک پھیلا دیا اور کالج کو یونیورسٹی میں ضم کر دیا انہوں نے یونیورسٹیوں کو حالات حاضرہ کے مطابق اپنا سلیبس تبدیل کرنے اور تعلیم کا دورانیہ طے کرنے کا اختیار بھی دے دیا انہوں نے عملی تربیت کو تعلیم کا حصہ بنا دیا اس کے دو نتائج نکلے یونیورسٹیاں مارکیٹ کی ڈیمانڈ دیکھ کر سلیبس میں تبدیلیاں کرنے لگیں اگر مارکیٹ میں گنجائش موجود ہے تو یورپ کی یونیورسٹیاں کورس کا دورانیہ کم کر دیتی ہیں اور اگر مارکیٹ میں گنجائش کم ہو رہی ہے تو وہ ڈگری کے عمل کو لمبا کر دیتی ہیں اور دوسرا وہاں کے طالب علم ریسرچ اور انٹرن شپ کے نام پر تعلیم کے دوران مختلف کمپنیوں اور اداروں کے ساتھ کام شروع کر دیتے ہیں یہ انٹرن شپ بعد ازاں ان کا تجربہ بھی جاتی ہے اس سسٹم سے طالب علموں کو اپنی صلاحیتوں اور کمپنیوں کو طالب علموں کے معیار کا پتہ چلتا رہتا ہے چنانچہ وہاں کوئی طالب علم یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد فارغ نہیں رہتا جبکہ پاکستان میں اس سے بالکل الٹ ہے ہمارا تعلیمی نظام تین حصوں میں تقسیم ہے سکول کالج اور یونیورسٹی ان تینوں حصوں کا نظام اس قدر تیز اور آسان ہے کہ اس میں ایک طرف سے بچہ ڈالا جاتا ہے اور دوسری سے ڈگری لے کر باہر آ جاتا ہے۔ جب وہ مارکیٹ میں آتا ہے تو اس کے پاس علم ہوتا ہے اور نہ ہی تجربہ لہذا کوئی کمپنی اسے نوکری دینے کے لئے تیار نہیں ہوتی آج سے دس برس پہلے تک گورنمنٹ سیکرٹری کے سب سے بڑا ذریعہ ہوتا تھا لیکن اب یہ سیکرٹری کھلا چلا جا رہا ہے سرکاری اداروں میں نوکریاں کم ہوتی چلی جارہی ہیں دس دس سال تک کسی ٹھکے میں کوئی آسامی نہیں نکلتی اور اگر نکلتی ہے تو ایک نشست کیلئے ایک ایک لاکھ درخواستیں آ جاتی ہیں، پچھلے سال پشاور شہر میں خاکروبیوں کی آسامیاں نکلی تھیں۔ اس کے لیے 42 ہزار درخواستیں جمع ہوئیں اور ان میں بی اے اور ایم اے نوجوان تک شامل تھے، موٹر وے پولیس کیلئے آسامیاں نکلیں تو ان کے لیے ایم اے، ایل ایل بی اور ایم بی اے نوجوانوں نے

درخواستیں دیں، اسی طرح سی ایس ایس اور بی سی ایس کے امتحانات میں ڈاکٹر اور انجینئر اپلائی کرتے ہیں اور یہ لوگ امتحان پاس کر کے غیر متعلقہ شعبوں میں نوکریاں کرتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے ہمارے ملک میں کالجوں، یونیورسٹیوں اور سرکاری ملازمتوں تک پہنچنے والے خوش نصیبوں کی تعداد کتنی ہوتی ہے؟ صرف پانچ فیصد اچھی ہاں ہماری آبادی کے صرف پانچ فیصد لوگ اعلیٰ تعلیم اور سرکاری نوکریوں تک پہنچ پاتے ہیں، اب سوال پیدا ہوتا ہے باقی 95 فیصد لوگ اور 30 فیصد نوجوان کیا کرتے ہیں؟ یہ وہ حقیقت ہے جس کے وطن سے ہمارے مسائل پیدا ہوتے ہیں، جس کی کوکھ سے لاکھوں حقیقتیں جنم لیتی ہیں۔ اس وقت اس ملک کی 35 فیصد آبادی وحید ظفر جیسے لوگوں پر مشتمل ہے جن کی زندگی کی مثل کے آخر میں کوئی روشنی نہیں، جن کی زندگی کا کوئی مقصد، کوئی نظریہ نہیں لہذا یہ لوگ خود کش حملہ آور بن رہے ہیں، نشے کی لت میں جکڑا ہو رہے ہیں، ماڈرن ازم کی سیرھیاں چڑھتے جا رہے ہیں، ڈاکٹریوں، انجمنوں، انجمنوں اور پوریوں میں ملوث ہو رہے ہیں یا پھر مذہب کی اس حد کو چھو رہے ہیں جس پر پہنچنے والے لوگ اپنے نظریے، اپنے خیال اور اپنے مکتبہ فکر کو لازوال سمجھتے ہیں جبکہ دوسروں کے مکتبہ فکر، دوسروں کے خیال اور دوسروں کے نظریات کو باطل عظیم سمجھتے ہیں، جس پر پہنچنے والوں کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے، مر جانا اور مار دینا۔ یہ حقیقت ہے ہم معاشرتی توازن کو بچکے ہیں، ہم لوگ انتہا پسندی میں جکڑا ہو چکے ہیں، ہم میں سے کچھ لوگ انتہا درجے کے لیبرل ہیں اور کچھ لوگ جنون کی حد تک فرقہ پرست لیکن دونوں میں برداشت نہیں ہمارے لیبرل لوگ مذہبی طبقے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور ہمارا مذہبی طبقہ لیبرل لوگوں کا وجود تسلیم کرنے پر راضی نہیں، اس انتہا پسندی کا یہ نتیجہ نکل رہا ہے آج پورا معاشرہ خوف کا شکار ہے، ہم میں سے ہر شخص خطرے کا شکار ہو چکا ہے، مجھے بعض اوقات محسوس ہوتا ہے ہم خود کش معاشرہ بن چکے ہیں۔

ہم اس بخار سے کیسے نکل سکتے ہیں، یہ میں آپ کو کل بتاؤں گا۔



”ہوٹل اور مسجد“

پاکستان میں اس وقت چھ کروڑ نو جوان ہیں یہ چھ کروڑ نو جوان پلتے پھرتے ہم ہیں، جوانی ایک توانائی کا نام ہوتا ہے اور توانائی ہمیشہ بے لگام ہوتی ہے اس کو رخ، منزل اور لگام نکلتیں، معاشرے اور لوگ دیا کرتے ہیں لیکن بد قسمتی سے ہم نے آج تک ان نو جوانوں کی توانائیوں کو کوئی رخ دینے یا ان سے کوئی اجتماعی کام لینے کی کوشش نہیں کی چنانچہ یہ توانائی اب اپنا راستہ خود تلاش کر رہی ہے ہمارے نو جوانوں میں سے کچھ سیدھا راستہ اختیار کر لیتے ہیں اور وہ ترقی، خوشحالی اور امن کی ہڈی پر آ جاتے ہیں جبکہ باقی نو جوان نشے کی دلدل میں ڈھنسن جاتے ہیں وہ جرائم کا راستہ منتخب کرتے ہیں یا پھر فرقہ واریت کو اپنا مذہب بنا لیتے ہیں۔

پوری دنیا کے ماہرین متفق ہیں انسان میں 16 سال کی عمر سے لے کر 25 سال تک موت کا خوف انتہائی کم ہوتا ہے اس عمر میں انسان نیچے پاؤں ماؤنٹ ایوریسٹ پر چڑھ جاتا ہے اور ہزاروں ہزار مشرکی بلندی سے سمندر میں چھلانگ لگا دیتا ہے لیکن جوں ہی انسان 25 سال کی حد عبور کرتا ہے تو موت کا خوف اس کے دروازے پر دستک دینے لگتا ہے اور وہ سر پر ٹوپی اور گلے پر مٹکر لپیٹے بغیر باہر نہیں نکلتا، شاید یہی وجہ ہے پوری دنیا میں صرف ان فوجیوں کو محاذ پر بھجوا یا جاتا ہے جن کی عمریں 25 سال سے کم ہوتی ہیں، فوج میں انسان جوں جوں سینئر ہوتا جاتا ہے وہ محاذ سے پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ جرنیل بن جاتا ہے، جرنیلوں کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ لوگ جگ لڑا سکتے ہیں لڑ نہیں سکتے، اسی طرح آپ مہلک نشوں کو لے لیجئے مہلک نشوں کے شکار 90 فیصد لوگوں کی عمریں 25 سال سے کم ہوتی ہیں، یہی موردِ تعالٰیٰ خود کش حملہ آوروں کی ہے، دنیا میں خود کش حملہ آوروں کا پہلا سکواڈ جاپان نے بنایا تھا، یہ لوگ ”کامی کا زمی“ کہلاتے تھے، یہ جسم پر بم باندھ کر امریکہ کے بحری جہازوں کی چینوں میں کود جاتے تھے، ان تمام لوگوں کی عمریں 17 سے 21 برس کے درمیان تھیں، اس تجربے کی بنا پر ثابت ہوا خود کش حملوں کیلئے آئیڈیل عمر 16 سے 22 سال ہوتی ہے، لہذا آج دنیا میں جہاں بھی خود کش حملہ ہوتا ہے اس میں استعمال ہونے والے 98 فیصد نو جوانوں کی عمریں 22 سال سے کم ہوتی ہیں۔ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس کی 35 فیصد آبادی خود کش عمراور خود کش دور سے گزر رہی ہے ہمارے ملک میں 6 کروڑ نو جوان ہیں اور یہ نو جوان

و حیدر ظفر کی طرح اندر سے اہل رہے ہیں یہ روز ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں ”میں کیا کروں“ اور انہیں اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا ان نوجوانوں میں سے نصف کو درغلنا تنہائی آسان ہے چنانچہ یہ لوگ کسی بھی وقت بہت بڑا بحران پیدا کر سکتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے ”کیا دنیا میں ہم پہلی قوم ہیں جو اس مسئلہ کا شکار ہوئی؟ اس کا جواب تقیاً نہیں ہوگا دوسرا سوال یہ ہے دنیا کے دیگر ممالک نے اپنے آپ کو اس صورتحال سے کیسے بچایا تھا؟ یہ ایک دلچسپ سنڈی ہے دنیا کی دس ہزار سالہ سماجی تاریخ کا مستفید فیصلہ ہے جو معاشرے اور جو ملک اپنے بچوں اپنے نوجوانوں کیلئے سرگرمیاں تخلیق نہیں کرتے وہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتے انسان کی دس ہزار سالہ تاریخ یہ فیصلہ بھی دے چکی ہے کہ انسان کو جسمانی، ذہنی اور روحانی تین قسم کی سرگرمیاں درکار ہوتی ہیں اور جن معاشروں میں ایک وقت ان تینوں سرگرمیوں پر توجہ نہیں دی جاتی وہ معاشرے بھی اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں یورپ امریکہ اور مشرق بعید کے تمام ترقی یافتہ ممالک نے انسانی تاریخ اور تجربے سے فائدہ اٹھایا اور انسانی سرگرمیوں کو تین شعبوں میں تقسیم کر دیا یہ سرگرمیاں سپورٹس، مطالعہ اور آرٹ تھیں ان لوگوں نے سپورٹس کو جسمانی، مطالعہ کو ذہنی اور موسیقی، آرٹ ڈرامہ، تھیٹر اور فلم کو روحانی سرگرمی قرار دیا اور ان تینوں شعبوں کو بچوں اور بالخصوص نوجوانوں کی زندگی کا حصہ بنا دیا یورپ اور امریکہ میں اس وقت کوئی ایسا تعلیمی ادارہ نہیں جس میں کھیل کا میدان، لائبریری اور آڈیو ٹیم نہ ہو یہ تینوں چیزیں یورپ، امریکہ اور مشرق بعید کے بچوں کے سلیبس کا باقاعدہ حصہ ہیں وہاں کا ہر بچہ کوئی نہ کوئی کھیل ضرور کھیلتا

ہے وہ روزانہ لائبریری ضرور جاتا ہے اور وہ آرٹ کی کسی نہ کسی صنف میں ضرور دلچسپی رکھتا ہے اسی طرح یورپ اور امریکہ کے کسی شہر یا قصبے کو اس وقت تک ناؤن کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی جب تک اس میں آبادی کے مطابق کھیل کے میدان، پارکس، لائبریریاں اور تھیٹر ہال نہ ہوں امریکہ میں پانچ لاکھ سے کم تعداد میں کتاب شائع نہیں ہوتی اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں چھوٹی بڑی پانچ لاکھ لائبریریاں ہیں اور امریکہ میں چھپنے والی تمام کتابیں ان تمام لائبریریوں تک ضرور پہنچتی ہیں امریکہ کے شہری اوسطاً چھ ہزار صفحات سالانہ پڑھتے ہیں اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ اخبارات اور رسائل امریکہ میں شائع ہوتے ہیں اور یہ تمام رسائل اور اخبارات خریدے اور پڑھے جاتے ہیں امریکہ اور یورپ کے تمام سکولوں میں لائبریری کا پیرڈ ہوتا ہے اس پیرڈ میں ہر طالب علم لائبریری جاتا ہے اور اپنی پسند کی کتاب پڑھتا ہے امریکہ میں طالب علموں کیلئے لائبریری سے کتاب ایٹو کرنا ضروری ہوتا ہے اگر کوئی طالب علم کتاب جاری نہ کرے تو اس کے نمبر کٹ جاتے ہیں امریکہ اور یورپ کے سکولوں اور یونیورسٹیوں میں سپورٹس بھی لازمی ہیں وہاں اس طالب علم کو ادھورا اور بیمار سمجھا جاتا ہے جس کے پاس ٹریک سوٹ اور جاگرنہ ہوں اور جس کی صبح یا شام کا آغاز کھیل سے نہ ہو امریکہ کی تمام چھوٹی بڑی کمپنیوں نے دفتروں میں جم بنا رکھے ہیں کمپنیوں کے ورکرز ان ”نچر“ میں روزانہ ورزش کرتے ہیں، تمام تعلیمی اداروں میں تھیٹر اور آڈیو ٹیم ہوتے ہیں اور ان میں ڈرامے، موسیقی کے پروگرام اور مہا جئے ہوتے ہیں اور وہاں معیاری

قلیس دکھائی جاتی ہیں، امریکہ اور یورپ کے تمام شہروں میں سینما گھر اور تھیٹر ہال بھی ہیں اور زیادہ تر لوگ وہاں ضرور جاتے ہیں، اگر ہم پاکستان کا تقابل امریکہ اور یورپ سے کریں تو خود بتائیے، ہمارے ملک میں کتنے تعلیمی ادارے ہیں جن میں یہ سہولتیں موجود ہیں؟ حقیقت یہ ہے ہماری نصف یونیورسٹیوں میں سپورٹس کلبس اور آڈیٹوریم نہیں ہیں، ہمارے 95 فیصد ہائی سکولوں میں کھیل کے میدان اور لائبریریاں نہیں ہیں جبکہ گورنمنٹ کالج کے سوا کسی تعلیمی ادارے میں ڈرائیونگ سوسائٹی یا آرٹ اینڈ کچھری کوئی باڈی نہیں، ہمارے 95 فیصد طالب علم سلیبس کے سوا کوئی کتاب نہیں پڑھتے اور ہمارے 98 فیصد بچے زندگی میں کوئی کھیل نہیں کھیلتے، پاکستان کے صرف 9 شہروں میں تھیٹر ہیں اور ان تھیٹروں میں بھی انتہائی اخلاق باختہ ڈرامے دکھائے جاتے ہیں، پاکستان کے کسی شہر میں آبادی کے مطابق کھیل کے میدان اور لائبریریاں نہیں ہیں، پاکستان کا شمار دنیا کے ان پانچ ملکوں میں ہوتا ہے جن میں اخبارات، رسائل اور کتابوں کا بزنس زوال کا شکار ہے اور جن میں سینماؤں کی جگہ پلازے اور ریستوران بن رہے ہیں اور اسلام آباد دنیا کا دوسرا دار الحکومت ہے جس میں کوئی سینما نہیں لہذا پھر سوال پیدا ہوتا ہے پاکستان کے یہ چھ کروڑ نو جوان کیا کریں؟ خود سوچنے اگر یہ لوگ خود کش حملہ آور نہیں بنیں گے تو ان کے جذبے ان کی انگلیں اور ان کی ذہانتیں کس کام آئیں گی، اس میں کوئی شک نہیں ہم ایک اسلامی ملک ہیں، ہم تعلیمی اداروں میں آرٹ اینڈ کچھری اور سینما کی اجازت نہیں دے سکتے لیکن کیا اسلام لائبریریوں، ورزش اور کھیل سے بھی منع کرتا ہے؟ کیا وہ آڈیٹوریم، مہائے اور تقریری مقابلوں سے بھی روکتا ہے۔ کیا ہمارے پاس اتنا بھی وقت نہیں کہ ہم سپورٹس اور مطالعے کو تعلیم کا لازمی جزو بنا سکیں، ہم پاکستان کے تمام شہروں میں کھیل کے میدان اور لائبریریاں بنا سکیں اور ہماری ضلعی حکومتیں جنگی بنیادوں پر کھیل اور مطالعے کی ترویج شروع کر سکیں کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ہم ہر تحصیل آفس میں ہال بنا سکیں اور اس ہال میں ہر ہفتے کوئی نہ کوئی معیاری پروگرام کیا جائے، اس میں سینما، نمائشیں اور کھیل دکھائے جائیں۔ کیا ہمارے پاس اس ملک کے چھ کروڑ نو جوانوں کیلئے اتنا وقت اور اتنے وسائل نہیں ہیں! میرا خیال ہے اگر ہم نے اس طرف توجہ نہ دی تو جلد وہ وقت آ جائے گا جب "میں کیا کروں" جیسے سوال پوچھنے والے تمام نو جوان اپنے جسم سے ہم باندھ لیں گے اور وہ ہر برس روزگار اور خوشحال شخص کو اپنا دشمن سمجھنے لگیں گے خواہ وہ خوشحال شخص اس کا بھائی یا والد ہی کیوں نہ ہو، اگر ہم نے وقت سے پہلے بند نہ بنا دیا تو اس ملک میں ایک ایسی جنگ شروع ہو جائے گی جس کے آخر میں کوئی مولانا بچے گا اور نہ ہی مسز، جس میں کوئی ہوگی سلامت رہے گا اور نہ ہی مسجد۔



ہم دنیا کی طرح کب سوچیں گے

وہ ٹاؤن شپ لاہور میں گارمنٹس کا کاروبار کرتا تھا، وہ سوموار کے دن اپنے بھائی احمد علی کے ساتھ موٹر سائیکل پر گھر سے نکلا، گھر سے تھوڑی دور پٹرول ختم ہو گیا، وہ غازی آباد کے ایک پٹرول پمپ پر رک گیا، اس نے پٹرول ڈلوایا، مل دینے کا وقت آیا تو "پٹرول بوائے" کے ساتھ اس کی تلخ کلامی ہو گئی، محمد علی کا خیال تھا وہ زیادہ پیسے طلب کر رہا ہے جبکہ پٹرول بوائے کا کہنا تھا رات کو پٹرول دو روپے لیٹر مہنگا ہو گیا ہے، ان دونوں کی توں ٹکارسن کر پٹرول پمپ کے دوسرے ملازمین بھی جمع ہو گئے یوں یہ معمولی جھگڑا تھا پائی اور لڑائی میں تبدیل ہو گیا، اس دوران پمپ کا گارڈ آگے بڑھا، اس نے محمد علی کو گریبان سے پکڑ لیا، معاملہ مزید بگڑ گیا، اس کا گاڑ کے دوران سکیورٹی گارڈ نے محمد علی کو گولی مار دی، 23 برس کا یہ خوبصورت نوجوان فرسز پر گرا اور اس نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

محمد علی مہنگائی کی تازہ ترین لہر کا پہلا شہید ہے، اس ملک میں پچھلے دس برسوں میں مہنگائی میں 4 گنا اضافہ ہوا جبکہ لوگوں کی قوت خرید میں آٹھ گنا کمی واقع ہوئی، اس ملک میں پندرہ سے سولہ کروڑ لوگ بستے ہیں، ان سولہ کروڑ لوگوں میں کوئی ایسا شخص نہیں جو مہنگائی سے براہ راست متاثر نہ ہوا ہو، اس ملک میں آنے سے دو اسک ضرورت کی ہر چیز حوام کے ہاتھ سے نکل چکی ہے، مرغی گوشت کا سستا ترین ذریعہ تھی لیکن بڑے قلو کی وجہ سے یہ سستا ترین ذریعہ بھی اب حوام کے پاس نہیں رہا، مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے حکومت مختصر پمپ پولٹری کی صنعت کو پھانسنے کے لئے شادی بیاہ پروڈکٹس کی اجازت دے دے گی، یعنی اس اجازت سے پولٹری کی دم توڑتی صنعت کو سہارا ملے گا لیکن صرف گوشت تو سب کچھ نہیں ہوتا، انسانی زندگی کے اور بھی سینکڑوں ہزاروں تقاضے ہوتے ہیں اور یہ سارے تقاضے بازار سے مول ملتے ہیں اور اس وقت بازار سے ملنے والی ہر چیز مہنگی ہو چکی ہے، مہنگائی کا یہ عالم ہے آج ہزار روپے کا نوٹ چھوٹا ہو گیا ہے اور حکومت پانچ ہزار کا نوٹ "لانچ" کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے، اگر یہ صورت حال اسی طرح جاری رہی تو شاید آنے والے والے برسوں میں حکومت کو ایک لاکھ روپے کا نوٹ بھی متعارف کرانا پڑ جائے، لوگ تھیلوں میں نوٹ بھر کر بازار جائیں اور اس کے بدلے لے لے ایک کلو آلو لے کر واپس آئیں۔

معیشت دانوں کا خیال ہے آج کے دور میں پٹرول مہنگائی کی ماں ہے، اگر کسی ملک میں پٹرول مہنگا ہو جائے تو اس ملک میں پانی کے ریش بھی بڑھ جاتے ہیں، ہماری آج کی زندگی کا 80 فیصد دارو دار پٹرول پر ہے،

پٹرول نہ ہوتو آٹے سے کپڑے تک ہر چیز شہریوں کی زندگی سے خارج ہو جاتی ہے یورپ اور امریکہ کو 1972ء میں اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا وہ جان گئے تھے آٹے والے وقت میں صرف وہی ملک سپر پاور ہیں گے جن کے قبضے میں تیل ہوگا جو تیل کی قیمتیں طے کرنے کے قابل ہوں گے مجھے پچھلے دنوں سوویت یونین کے زوال کے بارے میں ایک تحقیقی مقالہ پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا اس مضمون میں محقق نے انکشاف کیا تھا سوویت یونین دنیا کا واحد غلط تھا جس کے پاس پٹرول کی مارکیٹ نہیں تھی جبکہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے پاس آئل کمپنیاں بھی تھیں اور آئل کی سٹاک آپیکسچینج بھی لہذا روس کی اس کمی کے باعث سوویت یونین کھڑے کھڑے ہو گیا تیل کتنی بڑی اور حساس ضرورت ہے یہ جاننے کیلئے آپ امریکہ اور یورپ میں تیل کی قیمتوں کا تجزیہ کیجئے آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی یورپ اور امریکہ پٹرول کی قیمتیں کبھی عوام کی قوت خرید سے باہر نہیں ہونے دیتے کل میرے ایک ”سرکاری“ دوست نے فرمایا ”یورپ میں پٹرول کی قیمت ایک یورو سے زیادہ ہے پاکستان میں اس کے مقابلے میں سستا پٹرول مل رہا ہے“ میں نے اس سے عرض کیا ”یورپ میں پست ترین آمدنی ہزار یورو ماہانہ ہے چنانچہ وہاں ایک ہزار یورو لینے والا شخص بڑی آسانی سے ایک یورپی لیٹر پٹرول انفرڈ کر لیتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں پاکستان کے چالیس فیصد لوگ خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں اور 40 فیصد لوگ تین ہزار روپے ماہانہ سے کم کھاتے ہیں تم بتاؤ کیا تین ہزار روپے کمانے والا شخص 60 روپے لیٹر پٹرول انفرڈ کر سکتا ہے“ میرے سرکاری دوست کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

پٹرول آج کی ایک بڑی سچائی ہے پاکستان میں پٹرول عوام کی قوت خرید سے نکل چکا ہے، پٹرول کی قیمت میں مزید اضافہ ہوگا یہ دوسری بڑی سچائی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے دنیا کے دوسرے ممالک اس مسئلے سے کیسے نمٹ رہے ہیں پٹرول وہاں کے عام شہری کی زندگی پر اثر انداز کیوں نہیں ہوتا؟ اس سوال کا جواب بہت دلچسپ ہے دنیا نے پبلک ٹرانسپورٹ کے شعبے کو ترقی دے کر پٹرول کا مسئلہ حل کر لیا ہے اس وقت پوری ”فرسٹ ورلڈ“ میں ریل کا زیر زمین نظام موجود ہے شہروں کے درمیان ریل اور بسوں کا انتہائی شاندار سسٹم کام کر رہا ہے امریکہ یورپ، جاپان، مشرق وسطیٰ اور چین میں لوگ ذاتی کاری بجائے میٹرو ریل اور بس پر سزا کرتے ہیں وہاں ہر وقت پبلک ٹرانسپورٹ دستیاب ہوتی ہے یہ ٹرانسپورٹ ذاتی گاڑیوں سے کہیں زیادہ آرام دہ اور محفوظ ہوتی ہے برطانیہ میں ایسے بے شمار سیاستدان و وزراء موجود کرئس اور ارب پتی بزنس مین ہیں جنہوں نے پوری زندگی گاڑی نہیں خریدی یہ لوگ ہمیشہ ٹرین اور بس پر سزا کرتے ہیں اس سفر سے ان کا وقت بھی بچتا ہے اور یہ رش اور پارکنگ کی کوفت سے بھی محفوظ رہتے ہیں لہذا دنیا نے اس شعبے کو ترقی دے کر پٹرول کے مسئلے سے جان چھڑائی جس دن ہم نے پاکستان میں پٹرول کی قیمت میں اضافہ کیا تھا اس دن چین نے مینٹا پسٹی قوت سے چلنے والی ٹرین کا تجربہ کیا تھا یہ 18 میٹرک ٹن کی ٹرین تھی جو 160 کلومیٹر کی رفتار سے چل سکتی ہے اور اس میں 60 مسافر بیٹھ سکتے ہیں یہ ٹرین چنگ ڈو شہر میں 425 کلومیٹر لمبی ریلوے لائن پر چلائی گئی تھی اسی طرح میں نے کسی جگہ پڑھا تھا بھارتی حکومت نے کسی غیر ملکی فرم کو دہلی شہر میں زیر زمین ٹرین سسٹم بچھانے کا ٹھیکہ دے دیا ہے یہ کئی پورے شہر کے نیچے پڑی بچھائے گی اور اس پر میٹرو چلانے کی سڑک یہ ذریعہ سستا بھی ہوگا آرام دہ بھی اور اس سے پٹرول کی بچت بھی ہوگی

لہذا کہنے کا مطلب ہے اگر دنیا اس ذریعے سے اپنے پٹرول کا بجٹ کم کر سکتی ہے تو ہم کیوں نہیں کر سکتے؟ حکومت ہر سال نعرے لگاتی ہے اسے پٹرول کی سبسڈی کی مد میں 64 ارب کا نقصان ہو رہا ہے اور اس کا نقصان دو ارب ڈالر سے بڑھ چکا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن سوال یہ ہے اگر حکومت یہ رقم زیر زمین ریلوے سسٹم پر لگا دے تو کیا پاکستان کی پٹرول کی ضرورت میں پچاس فیصد کمی نہیں آ جائے گی اور حکومت کا خسارہ بھی کم نہیں ہو جائے گا اس کے بعد پٹرول خواہ دو سو روپے لیٹر ہو جائے عوام کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اسی طرح اگر حکومت ریلوے کا نظام بہتر بنا کر کارگو ٹرانسپورٹ اس پر شفٹ کر دے اگر حکومت کارگو ٹرینیں اور کارگو جہاز چلائے تو اس سے بھی پٹرول کی لاگت میں کمی آئے گی، کرائے بھی کم ہوں گے اور چیزیں بھی سستی ہو جائیں گی۔ اسی طرح اگر حکومت شہروں کے ارد گرد موجود زرعی زمینوں کی حفاظت کا قانون پاس کر دے اگر حکومت وہاں ہاؤسنگ سیکسٹین نہ بننے دے اگر وہ وہاں کے کسانوں کو قرضے اور سہولتیں دے تو انتظامیہ کو شہروں کے لئے خورد و نوش کی اشیاء دور سے نہیں منگوانی پڑیں گی جس کے نتیجے میں شہروں میں کھانے کی اشیاء سستی ہو جائیں گی یوں مہنگائی کنٹرول ہو جائے گی اس وقت لوگوں کو ہزار ہزار کلومیٹر کے فاصلے سے ترکاریاں منگوانا پڑتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی قیمت میں دس دس گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جناب شیخ رشید ریلوے کے وفاقی وزیر بن چکے ہیں وہ ایک ہنرمند اور ذہین شخص ہیں وہ جس وزارت میں جاتے ہیں وہاں اپنی گنجائش نکال لیتے ہیں شیخ صاحب اگر جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر ریلوے کے نظام کی اصلاح کریں وہ اگر چار بڑے شہروں میں زیر زمین میٹرو بچھادیں وہ اگر کارگو ٹرینوں میں اضافہ کر دیں اور لوگوں کو ٹرین استعمال کرنے کی ترغیب دیں تو بھی ملک کے زیادہ تر مسائل حل ہو جائیں۔ ہم پچھلے دنوں چین گئے تھے وہاں سکیا ٹنگ کے گورنر نے انکشاف کیا تھا چین نے شاہراہ رشیم کے ساتھ ساتھ کاشغر سے اسلام آباد تک ٹرین کی پٹری بچھانے کا فیصلہ کیا ہے انہوں نے بتایا تھا یہ پٹری چین کی مجبوری ہے اگر کوئی شخص کاشغر سے ارچی آتا ہے تو اسے 15 گھنٹے لگتے ہیں جبکہ وہ شخص دس گھنٹوں میں اسلام آباد پہنچ سکتا ہے انہوں نے بتایا چین کی قریب ترین بندرگاہ ارچی سے 4500 کلومیٹر دور ہے جبکہ گوادرنم سے محض 2500 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے لہذا اگر ہم سکیا ٹنگ کو ریل کے ذریعے پاکستان سے جوڑ دیں تو ہمیں اربوں ڈالر کا فائدہ ہوگا۔

دنیا اس وقت اس طرح سوچ رہی ہے لیکن ہم دنیا سے مخالف سمت میں بھاگ رہے ہیں ہم 21 ویں صدی میں ریل کو چھوڑ کر کاروں میں اضافہ کر رہے ہیں اس وقت اسلام آباد میں دو سو نئی گاڑیاں روزانہ رجسٹر ہوتی ہیں یہ دو سو گاڑیاں اس ملک میں پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ کر رہی ہیں لہذا اگر ہم پبلک ٹرانسپورٹ کو بہتر بنالیں تو لوگ گاڑیاں خریدنا بند کر دیں گے اور اس کے نتیجے میں پاکستان میں پٹرول کا مسئلہ حل ہو جائے گا اس وقت دنیا میں پبلک ٹرانسپورٹ ملکوں کی ترقی ماننے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لوگ ٹرین، بسوں اور ٹیکسیوں کے نظام سے ملکوں کی ترقی مانتے ہیں لیکن انہوں نے ہم لوگوں نے کاروں اور پٹرول کے زیاں کو اپنا معیار بنالیا ہے لہذا اس کا یہ نتیجہ نکل رہا ہے محمد علی جیسے نوجوان پٹرول کی قیمت میں اضافے کے بعد پٹرول پمپ کے فرش پر تڑپ تڑپ کر جان دے رہے ہیں چہ نہیں ہم ہمالیہ کو موسم تہی کے ساتھ پھلانے کا سلسلہ کب بند کریں گے ہم دنیا کی طرح کب سوچنا شروع کریں گے۔



بم ایڈیشن

شوکت علی کا تعلق میاں چنوں کے بولد ناؤن سے تھا، وہ ایک برس پہلے تک بیکری کا مالک تھا لیکن اس پر مشکل وقت آیا اور وہ پیسے کیلئے محتاج ہو گیا، اس نے اس محتاجی کا عجیب حل نکالا۔ اس نے 12 فروری 2007ء کو اپنے تین بچے فروخت کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس نے میاں چنوں بازار میں بچوں کی فروخت کا بورڈ لگوا دیا اور خود اس بورڈ کے نیچے بیٹھ گیا۔ یہ بورڈ دیکھ کر شہر کے لوگ جمع ہو گئے، میڈیا کو علم ہوا تو شوکت علی کو صحافیوں نے گھیر لیا۔ شوکت علی کی خبر اخبارات تک پہنچی، اخبارات سے ٹیلی ویژن چینلز پر آئی اور وہاں سے عالمی شکل اختیار کر گئی یوں شوکت علی ایک ہی رات میں بین الاقوامی شخصیت بن گیا۔ شوکت علی کے حالات کی خبر میڈیا سے ہوتی ہوئی ہماری حکومت تک پہنچی اور حکومت فوراً حرکت میں آ گئی۔ وزیراعظم شوکت عزیز نے شوکت علی کو میاں چنوں کے ایک بینک میں سکیورٹی گارڈ کی ملازمت کی پیش کش کر دی، ضلعی ناظم نے اسے مالی مدد سے دی، پولیس افسروں نے اسے سوبائل لے دیا اور مختصر شہریوں نے اس کا اکاؤنٹ کھلوادیا۔ اسلام آباد اور لاہور کے این جی اوڈ کا ضمیر بیدار ہوا۔ وہ اس کی مدد کے لیے میاں چنوں روانہ ہو گئے۔ ملک سے باہر موجود پاکستانیوں نے شوکت علی سے رابطہ کیا اور یوں شوکت علی کے مسائل حل ہونے لگے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اب تک شوکت علی کے پاس اتنی رقم جمع ہو چکی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے جیسے دس بیس لوگوں کی مدد کر سکتا ہے بلکہ اس نے دوسری شادی اور نوکری کی جگہ کاروبار کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا ہے۔ ہم سب پاکستانی شوکت علی کی اس کامیابی پر خوش ہیں مگر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے اگر شوکت علی میاں چنوں کے بازار میں اپنے بچوں کی فروخت کا بورڈ نہ لگاتا۔ اگر شہر کے لوگ اس بورڈ کے ارد گرد جمع نہ ہوتے، اگر یہ واقعہ مقامی صحافیوں کے نوٹس میں نہ آتا، اگر صحافی یہ خبر اخبارات کو نہ بھجواتے، اگر نیوز ایڈیٹر اس خبر کو اہمیت نہ دیتے، اگر یہ خبر اخبارات کے صفحہ اول پر شائع نہ ہوتی، اگر ٹیلی ویژن چینلز کو اس میں "کیسرہ بیوٹی" نظر نہ آتی، اگر شوکت علی کا مسئلہ ٹی وی سکرین تک نہ پہنچتا اور اگر اس دن وزیراعظم ملک میں نہ ہوتے، اگر وزیراعظم کا سٹاف انہیں اس خبر کی "کننگ" فراہم نہ کرتا، اگر وزیراعظم اس انٹرویو کو سنجیدہ نہ لیتے، اگر وزیراعظم اپنے عملے کو ہدایات جاری نہ کرتے اور اگر بورڈ کو ایسی فوری طور پر حرکت میں نہ آتا، تو شوکت

علی کا کیا بنتا؟ اس کے مسائل کیسے حل ہوتے؟ سوال پیدا ہوتا ہے اگر اس دن بارش ہو جاتی، اگر اس دن میاں چنوں میں کوئی سیاسی جلسہ ہوتا، اس دن ڈی آئی جی یا آئی جی صاحب شہر کے دورے پر ہوتے، اس دن شہر کے سارے لوگ اور سارے صحافی بڑے صاحب کی تقریر سننے میں مصروف ہوتے۔ اگر اس دن اخبارات کی چھٹی ہوتی، اگر اس دن کوئی بڑا حادثہ ہو جاتا، اگر اس دن کوئی بڑا "بم بلاسٹ" ہو جاتا، اگر اس دن ہماری حکومت صدر بٹش، وزیراعظم ٹوٹی بلینر یا شاہ عبداللہ کے استقبال میں مصروف ہوتی یا اس دن بسنت، ویلنگٹن ڈے یا نیو ایئر ٹائٹ ہوتی اور اس دن ہماری حکومت "ڈے اینڈ ٹائٹ" تقریبات میں مصروف ہوتی تو شوکت علی کا کیا بنتا؟ اس کے بچوں کو روٹی اور آسرا کون دیتا؟ سوال پیدا ہوتا ہے اگر شوکت علی کے ذہن میں توجہ حاصل کرنے کا یہ اچھوتا خیال نہ آتا، اگر شوکت علی میں موقع پر شرمناک ہوتا، اگر وہ بورڈ نہ لکھواتا، اگر اس کے عزیز، رشتے دار اور دوست اسے سمجھا بھالیے، اگر اس کی بیوی اور اس کے بچے اس "نیک کام" میں اس کی مدد نہ کرتے، اگر شہر کا کوئی شخص اس کا بورڈ لکھنے پر راضی نہ ہوتا، اگر لوگ اسے بورڈ لگانے کی اجازت نہ دیتے اور اگر شہر کے لوگ یہ بورڈ پڑھنے کے لیے وہاں کھڑے نہ ہوتے تو شوکت علی کا کیا بنتا؟

یہ سارے اگر، یہ سارے سوال بھی شوکت علی اور اس کی کہانی جتنے سفاک اور خوفناک ہیں اور یہ وہ "سوال" اور وہ "اگر" ہیں جن کے نیچے اس ملک کا مقدر ڈن ہے۔ جس کے پیچھے شوکت علی جیسے بے شمار لوگوں کا نصیب چھپا ہے لیکن ہم اس نصیب، اس مقدر پر گفتگو سے پہلے اگر چند مزید سوالوں پر غور کر لیں، اگر ہم چند مزید "اگروں" کی گردن چھڑائیں تو ہم اس مسئلے کی گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے اس ملک میں اس وقت ساڑھے چھ کروڑ شوکت علی ہیں، یہ شوکت علی فیر انسانی زندگی گزار رہے ہیں، ان کے پاس روزگار ہے، روٹی ہے اور نہ ہی سر چھپانے کا ٹھکانہ۔ اقوام متحدہ، حکومت پاکستان اور ہمارے ضمیر تینوں ان شوکت علیوں کا وجود تسلیم کر چکا ہے، اس ملک میں شوکت علی جیسے ایک کروڑ 45 لاکھ بڑھے کھسے بے روزگار بھی ہیں۔ یہ سارے بے روزگار شوکت علی بچھلے کئی برسوں سے لوکری کیلئے دھکے کھا رہے ہیں۔ یہ ملک شوکت علی جیسے انسانوں کے پیئیر پارٹس کی مارکیٹ بن چکا ہے، ہمارے سینکڑوں ہزاروں شوکت علی اپنا ایک ایک گروہ، ایک ایک آنکھ اور ایک ایک آنت بچ کر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس ملک کے سینکڑوں، ہزاروں شوکت علی عدالت میں جانے کی بجائے خودکشی کا راستہ منتخب کرتے ہیں اور اس ملک میں لوگ بجلی کا بل دینے کیلئے ڈاکے مارنے پر مجبور ہیں اور ضروریات زندگی تک پہنچنے کیلئے تاون کا طریقہ استعمال کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے ان لوگوں کا کیا قصور ہے؟ اور حکومت تک ان لوگوں کے مسائل، ان لوگوں کی تنخیاں اور ان لوگوں پر ہونے والے ظلم کب پہنچیں گے اور کیا حکومت ان لوگوں کی طرف سے بورڈ لگنے کا انتظار نہیں کر رہی؟ کیا حکومت ان لوگوں کے شوکت علی بننے کا انتظار نہیں کر رہی؟ اور کیا جب تک یہ لوگ اپنے اپنے بیچے پیلام کرنے کا اعلان نہیں کرتے اس وقت تک حکومت کے کانوں پر جوں نہیں رینگے گی، کیا اس وقت تک ان کی آواز جناب وزیراعظم شوکت عزیز اور صدر جنرل پرویز مشرف تک نہیں پہنچے گی؟ کیا ان لوگوں کا قصور ان کی شرم، ان کی حیا، ان کی سفید پوشی اور ان کا ضمیر ہے؟ کیا ان کی چپ اور ان کا صبر ان کا جرم ہے؟ اور

کیا اس ملک میں حکومت تک پہنچنے کیلئے خود سوزی، خود کشی، بچوں کی نیلامی اور میڈیا کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا؟ اور کیا لوگ اب تھانے، عدالت اور حکومت تک پہنچنے کیلئے صرف اخبارات اور ٹیلی ویژن کا راستہ استعمال کریں گے؟ کیا ہماری عدالتیں اور ہماری حکومتیں اخبارات اور ٹیلی ویژن دیکھ کر لوگوں کی مظلومیت اور ضروریات کا اندازہ کریں گی؟ سوال یہ ہے اگر نوکری شوکت علی کا حق تھا تو اسے یہ حق بچوں کی نیلامی کے بعد کیوں ملا؟ اور اگر شوکت علی اور اس کے مسائل حکومت اور اس ملک کی ذمہ داری نہیں تھی تو ہمارے وزیر اعظم نے شوکت علی کی داد دی کیوں کی؟ یہ سوال اور یہ اگر وہ بنیادی نقطے ہیں جن میں ہمارے آنے والے نکل کے تمام سورج چمپے ہیں، یقین کیجئے اگر ہم نے آج ان سوالوں کا جواب تلاش نہ کیا تو ہمارے لیے کل گزارنا مشکل ہو جائے گا۔

میں اس معاشرے کا ایک ادنیٰ شہری ہوں، میں چوبیس گھنٹے اپنے جیسے ادنیٰ شہریوں کے درمیان رہتا ہوں لہذا میں روز اس معاشرے میں آنے والی تبدیلیاں لوٹ کرتا ہوں، میں دیکھ رہا ہوں لوگ اب جائز حق کیلئے عدالت کی بجائے اخبار کے دفتر جاتے ہیں، لوگ جج کے بجائے صحافی کا دروازہ بجاتے ہیں اور لوگ حکومت تک رسائی کیلئے اخباروں اور ٹیلی ویژن چینلوں کا رخ کرتے ہیں، لوگوں کا یہ رویہ ثابت کرتا ہے ہماری سرکاری اور قانونی مشینری جواب دے چکی ہے، حکومت کے دل سے ضمیر اور ذمہ داری ختم ہو چکی ہے اور اب حکومت سے کام لینے کا صرف اور صرف ایک ہی طریقہ بچا ہے اور وہ طریقہ شوکت علی فارمولا ہے۔ یہ صورتحال انتہائی خطرناک ہے کیونکہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو شاید وہ وقت آتے دیر نہ لگے جب لوگ ڈاکٹر سے دوا لینے، دکاندار سے چینی خریدنے، بجلی کا میٹر لگوانے، تھانے دار سے رہت لکھوانے، جج صاحب سے انصاف لینے اور وزیر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے جسم پریم باندھیں۔ ان کے دفتر میں داخل ہوں، صاحب کو ہم کی پن دکھائیں، اپنی فائل پر دستخط کرائیں اور گھر واپس آ جائیں، یقین کیجئے اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو لوگ روزانہ تیل کی بوتلیں لیکر گھر سے نکلیں گے اور انہیں جہاں کوئی مشکل پیش آئے گی وہ اپنے جسم پر تیل چھڑکیں گے اور ماچس لہرا کر آگے بڑھ جائیں گے۔ آج شوکت علی جج جج کر اس معاشرے کو یہ پیغام دے رہا ہے جس ملک میں ضمیر مر جاتا ہے اس ملک کے فیصلے تیل کی بوتلیں اور ہم کرتے ہیں ہماری حکومت خود کش دھماکے کرنے والے نوجوانوں کے ہارے میں شکر ہے، ہمارے دروازہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں "یہ لوگ کون ہیں اور یہ کہاں سے آرہے ہیں" انہیں کون بتائے یہ لوگ ظلم کی کوکھ سے جنم لے رہے ہیں اور یہ سب شوکت علی جیسے لوگوں کا ہم ایڈیشن ہیں۔ انہیں کون بتائے اگر انہوں نے اپنی سمت درست نہ کی تو یہ سلسلہ بچوں کی فرشتہ سے بمباری تک وسیع ہو جائے گا اور ہمارا ہر شہریاں چنوں بن جائے گا۔



پاؤں سے گلے تک

یہ 27 مارچ 2007ء کا دن تھا اور لیاقت باغ راولپنڈی میں صدارتی جلسہ ہو رہا تھا، اچانک ایک خاتون جلسہ گاہ کی درمیانی صفوں سے اٹھی اور وہ سٹیج کی طرف بڑھنے لگی، سیکورٹی اہلکاروں میں سراسیمگی پھیل گئی، جلسہ گاہ کے مختلف کونوں میں کھڑے "سفید لباس" والے آگے بڑھے اور انہوں نے غیر محسوس طریقے سے خاتون کو گھیرنا شروع کر دیا لیکن خاتون ان کے گھیرے سے باہر نکل گئی، سفید لباس کے بعد پولیس کا سیکورٹی سرکل تھا، پولیس نے بھی خاتون کے راستے میں مزاحم ہونے کی کوشش کی لیکن خاتون پولیس اہلکاروں کو بھی دھکیل کر آگے بڑھ گئی اس کے بعد آرمی کاسٹرل تھا، خاتون نے آرمی کاسٹرل بھی توڑ دیا اور اس کے بعد صدر کی پیشکش سیکورٹی تھی یہ صدر کے ذاتی کمانڈوز ہیں اور صدر ان سب کے ناموں تک سے واقف ہیں، خاتون کمانڈوز کا حلقہ نہیں توڑ سکتی تھی کیونکہ ان لوگوں کو خصوصی اختیارات حاصل ہیں یہ لوگ وفاقی وزراء سے وزیراعظم تک کو روک سکتے ہیں اور جب تک ان کی تسلی نہیں ہوتی یہ کسی شخص کو صدر کے قریب نہیں پہنچنے دیتے، کمانڈوز نے خاتون کو گھیر لیا اور اسے سٹیج سے دور دھکیلنے لگے لیکن خاتون نے پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا، صدر تقریر کیلئے ڈائس پر پہنچ چکے تھے صدر نے یہ منظر دیکھا تو انہوں نے کمانڈوز کو آواز لگائی "باہر اس کو چھوڑ دو اس کو آنے دو اس سے کاغذ لے لو" لیکن صدر کے حکم کے باوجود باہر خاتون کو چھوڑنے پر رضامند نہ ہوا، صدر نے دوبارہ حکم دیا جس کے بعد باہر خاتون کو لے کر سٹیج پر پہنچ گیا، خاتون صدر کے پاس پہنچی اور ان کے قدموں میں گر گئی، صدر نے اسے اوپر اٹھایا، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس سے اس کا مسئلہ پوچھنے لگے، خاتون دو منٹ تک انہیں اپنا مسئلہ سمجھاتی رہی، وہ ساتھ ساتھ سنا اپنے آئسو بھی پوچھتی جاتی تھی۔

یہ خاتون کون تھی؟ یہ صدر کے پاؤں میں کیوں گری؟ اس نے صدر کے ساتھ کیا گفتگو کی اور صدر کے ساتھ ملاقات کے بعد یہ خاتون کہاں چلی گئی؟ 28 مارچ تک کسی شخص کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا، تاہم 28 مارچ کے تمام اخبارات میں اس منظر کی تصاویر ضرور شائع ہوئیں، ان تصاویر میں خاتون صدر کی طرف بڑھ رہی تھی، وہ صدر کے پاؤں میں بھی جھکی ہوئی تھی، صدر اسے اٹھا بھی رہے تھے اور اسے دلا سہ بھی دے رہے تھے، 28 مارچ کو یہ خاتون راولپنڈی پولیس کلب پہنچی، اور اس نے اپنا مسئلہ صحافیوں کے سامنے رکھ دیا، یہ خاتون فہمیدہ اعظم تھی، فہمیدہ کا بھائی اشرف محمود کابانی پولیس کی حراست میں نقل ہو گیا تھا، فہمیدہ اور اس کی بہن محمودہ نے انصاف کیلئے تمام

تین دروازوں پر دستک دی تھی لیکن ان کی سنوائی نہیں ہوئی تھی لہذا انہوں نے 27 مارچ کو لیاقت باغ کے جلسہ عام میں صدر تک پہنچنے کا فیصلہ کیا، فہمیدہ بیکورٹی کے سارے سرکل تو ذکر صدر تک پہنچ گئی، صدر نے اس کی بات غور سے سنی اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اسے یقین دہانی کرائی "میں ذاتی دلچسپی لے کر آپ کا مسئلہ حل کراؤں گا اور طرمان خواہ کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں، میں انہیں سزا کے عمل سے ضرور گزراؤں گا" صدر نے فہمیدہ کو یقین دلایا "وزیر اعلیٰ اور آئی جی پنجاب اس کیس پر خصوصی توجہ دیں گے اور میں اس سارے عمل کی براہ راست نگرانی کروں گا" فہمیدہ اظہر کا کہنا تھا وہ صدر کی یقین دہانی سے مطمئن ہیں۔

مجھے یقین ہے فہمیدہ اظہر کی یہ کوشش رنگ لائے گی اور صدر صاحب ذاتی دلچسپی لے کر قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچادیں گے لیکن سوچنے کا مقام ہے کیا کسی شخص کے قاتلوں کو گرفتار کرنا صدر کا کام ہے؟ اور اگر یہ صدر کا کام ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے اگر اس دن فہمیدہ اظہر بیکورٹی کے پانچ سرکل توڑنے میں کامیاب نہ ہوتی تو اشرف محمود کیانی کے قتل کا کیا بنتا؟ کیا اس کے باوجود قاتل پکڑے جاتے؟ اور کیا فہمیدہ کو اس زندگی میں انصاف مل جاتا؟ سوچنے کا مقام ہے کیا صدر معظم کے قدموں میں فہمیدہ کا جھکا ہوا سر یہ ثابت نہیں کرتا اس ملک میں انصاف کا کوئی نظام نہیں اور اس ملک میں جس شخص نے بھی انصاف لینا ہے اسے صدر تک پہنچانا پڑے گا" اسے صدر کے پاؤں میں گرتا پڑے گا اور اگر صدر اس کی بات غور سے نہیں سنتے تو اسے اس مملکت خدا داد میں انصاف نہیں مل سکتا" کیا یہ خاتون اور اس کا یہ عمل ثابت نہیں کرتا پاکستان کے ادارے اپنا وقار اپنی قوت اور تحریک کھو چکے ہیں اور اب لوگ تھانے یا عدالت کا رخ کرنے کی بجائے صدر کے پاؤں پڑنا مناسب سمجھتے ہیں اور کیا فہمیدہ اظہر اور اس کا جھکا ہوا سر پاکستان کو ایک "لیل سٹیٹ" ثابت نہیں کرتا، کل میرے ایک دوست نے کینیڈا سے فون کیا یہ صاحب اس قسم کے منظر دیکھ کر پانچ برس پہلے ملک چھوڑ گئے تھے انہوں نے مجھے فون کیا اور دیکھی لہجے میں بولے "کینیڈا میں چیف جسٹس سب سے محترم اور با اختیار شخص ہوتا ہے، کینیڈا کی پوری پارلیمنٹ، پوری کابینہ، صدر اور ساری سیاسی جماعتیں مل کر چیف جسٹس کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکتیں، چیف جسٹس کسی بھی وقت صدر کو عدالت میں طلب کر سکتا ہے اور صدر کو اس کے سامنے سرتابی کی جرأت نہیں ہو سکتی" میرے دوست کا کہنا تھا "دس مارچ کو کینیڈا میں پاکستان کے چیف جسٹس کی غیر فعالیت اور ہاؤس آریٹ کی خیر پہنچی تو کینیڈا کے لوگ حیران رہ گئے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا شروع کر دیا، کیا آپ کے ملک میں صدر چیف جسٹس سے زیادہ با اختیار ہے؟ اور کیا پاکستان میں صدر چیف جسٹس کو غیر فعال کر سکتا ہے؟" میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا، میرے دوست نے ذرا سے توقف کے بعد کہا "ترقی یافتہ قوموں نے عدالت کو جان بوجھ کر مقننہ بادشاہ، صدر، وزیر اعظم، کابینہ اور بیورو کیسی سے زیادہ اختیارات دے رکھے ہیں، یہ لوگ جانتے ہیں عدالت معاشرے کا وہ فورم ہوتا ہے جس تک تمام لوگ پہنچ سکتے ہیں لہذا اگر ان کی عدالت ملک کے تمام عہدوں سے بلند ہوگی تو عوام کا عدالت پر اعتماد قائم ہوگا" عدالت پر اعتماد نظام کو طاقتور بنائے گا اور ایک طاقتور نظام ملک کو ترقی دے گا" میرے دوست کا کہنا تھا "تم دنیا بھر کے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کا مطالعہ کر لو تمہیں اقوام عالم میں ہر وہ ملک ترقی یافتہ اور مضبوط ملے گا جس میں

عدالت آزاد اور عدالتی نظام طاقتور ہوگا اور تم ہر اس ملک کو پسامند پاؤ گے جس کا عدالتی نظام کمزور اور حکمران مضبوط ہوں گے۔ میرے دوست کا کہنا تھا ”حکومت کی رٹ عدالتوں سے شروع ہوتی ہے اور عدالتوں پر ختم ہوتی ہے“ مجھے اس کی بات میں بڑا وزن محسوس ہوا یہ حقیقت ہے پاکستان کا عدالتی نظام نہ صرف کمزور ہے بلکہ اس سے عوام کی توقعات تک ختم ہو چکی ہیں اب سوال پیدا ہوتا ہے اس نظام کو کس نے کمزور بنایا؟ پاکستان میں بد قسمتی سے 40 برس فوجی حکمران رہے ہیں لہذا اس بگاڑ کی زیادہ تر ذمہ داری فوجی حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے تاریخ بتاتی ہے دنیا میں جب بھی کوئی آمر غیر قانونی اور غیر آئینی طریقے سے اقتدار پر قابض ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے عدالت پر قبضہ کرتا ہے وہ قانون فہم انصاف پسند اور ایماندار ججوں کو قارغ کرتا ہے اور ان کی جگہ کمزور اور ”معاہدہ نام“ جج تعینات کر دیتا ہے اس کے بعد وہ ججوں اور عدالتی نظام کو کرپٹ کرتا ہے اس ساری ایکسٹرا کے نتیجے میں عدالتیں اس آمر کو ریلیف دیتی ہیں وہ اس حکمران کو آئینی شکل دیتی ہیں اور جوں ہی یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے عدالتیں حکمرانوں کا مفیلی ادارہ بن کر رہ جاتی ہیں اور حکمران ججوں اور چیف جسٹس حضرات سے بھی اسی لہجے میں بات کرتا ہے جس میں وہ اپنے ٹیلی فون آپریٹر سے مخاطب ہوتا ہے تاریخ ثابت کرتی ہے جب یہ صورت حال پیش آتی ہے تو عوام کا عدالت سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور وہ جج کی بجائے حکمرانوں کے پاؤں میں انصاف تلاش کرنے لگتے ہیں آپ پوری دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی جس جس ملک میں عدالتیں مضبوط تھیں اس ملک میں کبھی مارشل لاء لگا اور نہ ہی کسی شخص کو اقتدار پر قبضے کی جرأت ہوئی مزید آج تک جس ملک میں مارشل لاء لگتے رہے وہ ملک سماجی اور معاشی لحاظ سے دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ گئے آپ یورپ کو دیکھ لیجئے مشرقی یورپ مغربی یورپ سے معاشی اور سماجی لحاظ سے پیچھے ہے کیوں؟ اس کی واحد وجہ فوجی حکمران تھے مشرقی یورپ میں پچاس ساٹھ برس تک آمریت رہی جبکہ اس کے مقابلے میں فرانس، برطانیہ، جرمنی اور آسٹریا میں جمہوریت اور قانون کی حکمرانی تھی آپ یورپ میں چین اٹلی اور پرتگال کو دیکھ لیجئے یہ تینوں ملک بھی ترقی کی روڑ میں دوسرے یورپی ملکوں سے پیچھے ہیں اس کی وجہ بھی آمریت اور مارشل لاء تھی یہ ملک بھی آج سے تیس چالیس برس پہلے تک یو ایف ایم کا شکار تھے چنانچہ یہ یورپ کے دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ گئے آج سے تیس چالیس برس پہلے ان ملکوں کے حکمران عدالت کے زیر انتظام آگئے چنانچہ اب یہ ملک بھی ترقی کر رہے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں 2007ء میں صدر چیف جسٹس کو گھر بلا لیتے ہیں اور اسے غیر فعال کر کے گھر میں پھینک دیا جاتا ہے چنانچہ آج کا یہ نتیجہ ہے لوگوں کو انصاف کیلئے صدر کے پاؤں میں جھٹکا پڑ رہا ہے یا پھر جامعہ خضفہ کی طالبات انصاف کیلئے ڈنڈے لے کر سڑک پر نکلنے پر مجبور ہیں۔

اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ثابت ہوتا ہے یہ وہ حالات ہیں جو کامیاب ریاستوں کو ”فیل شیٹ“ بنا دیتے ہیں انصاف کے راستے میں حائل یہ وہ رکاوٹیں ہیں جو خونی انقلاب کو راستہ دیتی ہیں اور یہ فہمیدہ اظہر جمہی خواہن ہوتی ہیں جو حکمرانوں کے پاؤں سے اٹھ کر ان کے گلے تک پہنچ جاتی ہیں۔



کاشفِ آزاد

ہم بددعاؤں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے

محمد اصغر فاروقی کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے، اصغر فاروقی جلال پور پیراں والد کے گاؤں بیٹ کسر سے تعلق رکھتے ہیں ان کے بھائی صدیق اکبر کے ساتھ 2004ء میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا یہ 24 مارچ کا دن تھا، صدیق اکبر اپنے کھیتوں میں پانی لگا رہا تھا، سانسے سڑک پر تین ٹیکسیاں رکیں ان میں سے سادہ کپڑوں میں چند افراد نکلے انہوں نے صدیق اکبر کو بلایا اور خود کو زرمی آفیسرز ظاہر کرتے ہوئے گندم کے خوشے توڑنے اور زمین سے مٹی اٹھا کر شاہروں میں ڈالنے لگے۔ جب صدیق اکبر ان کے قریب گیا تو ان سب نے اسے گھبرے میں لے لیا اور اس سے رقبہ کے متعلق سوالات کرنے لگے، صدیق نے ان کو بتایا زمین کی پیداوار کے متعلق صحیح معلومات اس کے بچاؤ سے سکتے ہیں، میں ان کو جانتا ہوں۔ صدیق اکبر جانے لگا تو ان لوگوں نے اسے دبوچ لیا، اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی، اسے گاڑی میں بٹھایا اور اسے پندرہ کلومیٹر دور ملک مشتاق احمد لاگ کے ڈیرے پر لے گئے وہاں ایلٹ فورس کے چالیس افراد موجود تھے۔ یہ لوگ صدیق اکبر کو طلی پور سادات کے قریب ایک ہانچے میں لے گئے، اسے آم کے درخت سے باندھا اور اس کے جسم پر لٹھیاں برسانا شروع کر دیں، سڑک پر موجود بیسیوں آدمیوں نے صدیق اکبر کی چیخیں سنیں اور چیخیں سن کر رو پڑے، وہ لوگ صدیق اکبر کو چھڑانے کیلئے آگے بڑھنے لگے تو ایلٹ فورس نے ان لوگوں کو دھمکا کر پیچھے دھکیل دیا۔ بعد ازاں پولیس نے ان کے گھر پر دھاوا بول دیا اور گھر میں گھس کر اڑھائی گھنٹے تک تلاشی لیتے رہے۔ جب ان سے وجہ پوچھی گئی تو وہ کہنے لگے، قانون کو اپنا کام کرنے دیں۔ گھر کے کیمین بے بس اور خوفزدہ ہو کر اپنے گھر کی پامالی دیکھتے رہے۔ اس دوران چھوٹا بھائی صفدر علی سامنے آ گیا تو اس کو بھی اغواء کر لیا گیا۔ صدیق اکبر کے اغواء کے بعد پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ محمد اصغر فاروقی کے گھر والے سہم سے گئے ماں کی ممتاز پ گئی والد صاحب کا دل اجڑ گیا، صدیق اکبر کی اہلیہ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور ان کے چار بچے باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔

صدیق اکبر کے لواحقین نے مقامی تھانے سے رابطہ کیا تو انہوں نے لائسلی کا اظہار کیا، اسی شب ملتان پکھری روڈ پر واقع انوسٹی گیشن پر رابطہ کیا گیا تو انہوں نے بھی چپ سادھ لی ان لوگوں نے اونٹی سے لے کر مٹلی

افسران تک سے پوچھا لیکن کسی نے انہیں صدیق اکبر کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ سیاسی زعماء کے دروازے کھٹکھٹائے گئے۔ قاضی حسین احمد لیاقت بلوچ، مولانا عبدالغفور حیدری، مولانا فضل الرحمان وغیرہ سے بھی درخواست کی گئی مگر یہ سب کوششیں صدمہ بھرا اثاثہ ہوئیں۔ صرف عدالت کا دروازہ جین حزیں سے ناآشکارا ہوجہ غربت تھی یہ لوگ دکلاہ کی فیس ادا نہیں کر سکتے تھے دریاے چناب کے کنارے بیٹھا خاک بھانکنے والا بڑھا کسان سرد آہوں کے سوا دکلاہ کو کیا دے سکتا تھا؟ 26 مارچ 2004ء کی رات ان لوگوں کے فون کی گھنٹی بجی، ریسپورڈاٹھایا تو کوئی بولا "نانی امی! میں صدیق اکبر ہوں مجھے ابجنسی والے لے آئے ہیں" بس بات کٹ گئی صدیق اکبر کی آواز ہلکی ہلکی آ رہی تھی جیسے مریض کی آواز ہو۔ قریباً ڈیڑھ ماہ بعد چھوٹے بھائی صفدر کو روکا کر دیا گیا اور اسے پنڈی سے ملتان واپس پر بٹھا دیا گیا۔ اس نے بڑے بھائی صدیق اکبر کا بیٹا نام ان الفاظ میں سنایا "سب کو سلام کہنا امی اور ابو کو کہنا میں آپ کی خدمت نہیں کر سکا مجھے معاف کر دیں میرے لئے دعا کریں" یہ الفاظ زندگی سے مایوسی کا اظہار تھے اور ان الفاظ نے والدین اور عزیز و اقارب کو لرزادیا۔ مزید ڈیڑھ ماہ گزرا تو ایک بار پھر صدیق اکبر کی خاندان سے بات کرائی گئی۔ اس وقت صدیق اکبر نے کہا "سب نماز پڑھا کریں میں سانس کے پاس ہوں جب وہ چاہیں گے چھوڑ دیں گے۔"

اس کے بعد محمد اصغر فاروقی میرے ساتھ مخاطب ہوئے اور انہوں نے کہا "ہم لوگوں نے اس سال بھائی کے بغیر عید گزار دی تھی میں نے عید کے دن کچے کرے کے ایک کونے میں اپنی ماں کو پرانے مصلے پر بیٹھے دیکھا تھا وہ صدیق اکبر کی تصویر دونوں ہاتھوں میں تھا سے کہہ رہی تھیں۔ صدیق اکبر بیٹے! آج عید کا دن ہے آج تو منہ دکھا جاتے۔ وہ تصویر کو جھکتے جھکتے سسکیاں لینے لگتی تھیں اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں پھر بوتلیں: خدایا میرے بیٹے کی عید کا کیا ہوا؟ باپ سے دوڑ دوستوں سے محروم ہے قصور قیدی کے ساتھ کیا جیتی ہوگی؟ ربا! میرے بیٹے کی مدد کرو اور جو میرے بیٹے کی مدد کرے یا میرے پروردگار تو اس پر بھی آسانیاں پیدا کر دے عید گاہ سے واپسی پر میرے ابو نے جہر جہری سی لی اور بولے "صدیق بیٹا! تیرے بغیر ہماری عیدیں چھٹکی گزر رہی ہیں۔ تم واپس آ جاؤ" اصغر فاروقی کا کہنا تھا "میرے والد صاحب دو مرتبہ ہارٹ ایک کا شکار ہو چکے ہیں۔ صدیق اکبر کا بیٹا رحمان! عید کے لئے تیار ہو کر میرے ساتھ گھر سے باہر نکلا تو اس نے سامنے دیکھا اس کا دوست عثمان باپ کے کندھے پر بیٹھا عید گاہ جا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا "چاچو اگر آج میرے ابو گھر پر ہوتے تو کیا میں بھی ان کے کندھے پر بیٹھ کر عید گاہ جاتا" ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

اصغر فاروقی کا کہنا تھا "اس کا بھائی مجرم ہو گا لیکن کیا مجرم کو عدالت میں پیش نہ کرنا اس سے بڑا جرم نہیں" اس کا کہنا تھا "خدا کیلئے ہمیں ہمارے بھائی کی زندگی یا موت کی اطلاع تو دے دیں، اگر وہ مر چکا ہے تو ہمیں بتا دیں تاکہ ہم اپنے دل پر پتھر رکھ لیں، ہم اس کے بچوں کے نام کے سامنے یتیم لکھ دیں اور اگر وہ زندہ ہے تو ہمیں اتنا بتا دیں، کیا ہم زندگی میں دوبارہ اس کی شکل دیکھ سکیں گے"۔ میرے پاس اصغر فاروقی کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، میں اسے کیا بتاتا ہمارا اپنا ایک کو لیگ سٹیبل گلڈر دو ماہ کا غائب رہا تھا اور پورے ملک کے صحافی مل کر اسے

باز یاب نہیں کرا سکے تھے یہ تو انفرادی کاروں کی "مہربانی" تھی جس کی وجہ سے سہیل قلندر باہر آ گیا۔ میں اس کو کیا بتاتا 21 جنوری کو سہیل قلندر کے بیٹے کی سالگرہ تھی وہ سالگرہ کا ایک لینے گیا تھا اور راستے میں غائب ہو گیا تھا سہیل قلندر کے دوستوں نے اس کے بیٹے جبرک کی سالگرہ 22 فروری کو اس کی رہائی کے بعد سنا لی تھی ہم لوگ تو خود بے بس اور لاچار ہیں۔ میں اسے کیا بتاتا ہم جیسے لاچار لوگ صدیق اکبر جیسے لوگوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتے؟ ہم لوگ اب اس ملک کے حکمرانوں کیلئے صرف بددعا کر سکتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے صرف اتنا عرض کر سکتے ہیں یا باری تعالیٰ جو لوگ تمہارے بندوں کو تکلیف دیتے ہیں تو انہیں زندگی میں ایک بار ایسی اذیت سے ضرور گزار تو انہیں ایک بار اتنا ضرور بتا دے جب کوئی بیٹا شام کو گھر نہیں آتا تو ماں کے کلیجے کے کون کون سے حصے پر ہلینڈ چلتے ہیں اور باپ کے جگر کا کون کون سا حصہ کٹتا ہے۔ یا باری تعالیٰ زندگی میں کم از کم ایک بار ان کے بچے بھی ماں کا ہاتھ پکڑ کر اتنا ضرور پوچھیں "ماما یا باکب آئیں گے" یا باری تعالیٰ ان کے بچے بھی زندگی کی عیدیں اور شب براتیں ان کے کندھوں کی محرومی میں بسر کریں۔ میں اسے کیا بتاتا ہم جیسے بے زبان لوگ بددعاؤں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ میں اسے کیا بتاتا ہمارے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے صدیق اکبر جیسے لوگوں کیلئے کچھ کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کے نتیجے میں وہ آج خود انصاف تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں اسے کیسے بتاتا چیف جسٹس کے بعد اب کسی شخص کی زبان میں صدیق اکبر جیسے لوگوں کیلئے آواز بلند کرنے کی ہمت نہیں۔ میں اسے کیسے بتاتا اقتدار کے چہرے پر آنکھیں ہوتی ہیں اور ندھی سینے میں دل اور جس کے پاس دل ہوا اور نہ ہی آنکھیں ان کی کتاب میں رحم کے لفظ نہیں ہوتے۔"



خوف الہی کی نعمت

حاجی عبدالرؤف کا سفر 2004ء میں شروع ہوا، 16 فروری 2004ء کو ان کے ہاں دو جڑواں بچے پیدا ہوئے تھے، بچے نہایت کمزور تھے، لوگوں کا خیال تھا جڑواں بچے عام بچوں کے مقابلے میں کمزور ہوتے ہیں، یہ بچے بڑے ہو کر ٹھیک ہو جائیں گے لیکن دو ہفتے بعد بچوں کا رنگ پیلا ہو گیا، حاجی صاحب انہیں مقامی ڈاکٹر کے پاس لے گئے، ڈاکٹر نے بچوں کو خون لگوا دیا، بچے ٹھیک ہو گئے لیکن پندرہ دن بعد بچے دو بارہ پیلے پڑ گئے، حاجی صاحب نے ایک بار پھر خون لگوا دیا، اس دوران کسی نے مشورہ دیا، آپ بچوں کا میڈیکل چیک اپ کرائیں، حاجی صاحب بچوں کو راولپنڈی لے گئے، انہوں نے ”اے ایف آئی پی“ سے بچوں کا ٹیسٹ کرایا، پتہ چلا بچے مصلیٰ سیمیا کے موذی مرض میں مبتلا ہیں، حاجی صاحب کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا، اس ٹکڑے کے بعد ان کا سفر شروع ہو گیا، وہ سرائے عالمگیر کے ایک سابق ایم پی اے ملک حنیف اعوان کے پاس گئے، ملک صاحب انہیں گجرات کے ضلعی ناظم چوہدری شفاعت حسین کے پاس لے گئے، چوہدری صاحب نے انہیں راولپنڈی کے آرٹھوڈونٹس میڈیسنل کالج میں پلانٹ سٹریٹجی لگوا دیا، ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد فیصلہ دیا، اگر ہمیں لاکھ روپے کا بندوبست ہو جائے تو بچے ٹھیک ہو سکتے ہیں، حاجی صاحب واپس گجرات چلے گئے، چوہدری شفاعت حسین نے ان کے لئے بیس لاکھ روپے کا بندوبست کر دیا، وہ چیک اور سٹیج لے کر راولپنڈی آ گئے، ڈاکٹروں نے حاجی صاحب کے دوسرے بچوں کا بون مرڈ چیک کیا لیکن بد قسمتی سے بچوں کا بون مرڈ چیک نہ کر سکا، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا، حاجی صاحب چوہدری شفاعت حسین کا چیک اور سٹیج لے کر واپس کھاریاں چلے گئے، اس کے بعد ان کا ایک نیا سفر شروع ہو گیا۔

بریگیڈر ظہیر اللہ آرٹھوڈونٹس میڈیسنل کالج کے سینئر ڈاکٹر ہیں، بریگیڈر صاحب نے کمپیوٹر پر سرج کی پتہ چلا، اٹلی میں ان بچوں کا علاج ہو سکتا ہے، حاجی عبدالرؤف بریگیڈر صاحب کا خط لے کر چوہدری شفاعت کے پاس چلے گئے، چوہدری صاحب نے انہیں کہا ”تم اٹلی سے خرچ کا تخمینہ لگواؤ، ہم بیسوں کیلئے کوشش کریں گے“ حاجی صاحب نے بچوں کی رپورٹیں روم بھجوا دیں، وہاں سے جواب آیا تو اس جواب نے حاجی صاحب کو جڑوں سے ہلا دیا، روم کے انسٹی ٹیوٹ نے بتایا ”ہم بچوں کا علاج کر سکتے ہیں لیکن اس پر دو لاکھ 91 ہزار 5 سو 20 روپیہ خرچ آئے گا“ یہ رقم دو کروڑ روپے بنتی تھی، اس میں آمدورفت اور چار ماہ تک اٹلی میں رہائش کے

اخراجات شامل نہیں تھے اب حاجی عبدالرؤف کی مالی حالت یہ تھی کہ وہ اپنی جیب سے لاہور اور راولپنڈی نہیں جا سکتے تھے، چوہدری شفاعت صاحب نے حاجی صاحب کو بتایا، اتنی بڑی رقم کا بندوبست ممکن نہیں تاہم میں وفاقی وزیر محبت محمد نصیر خان کے نام رقعہ دے دیتا ہوں تم ان سے مل لو حاجی صاحب رقعہ لے کر اسلام آباد آ گئے انہیں نصیر خان جیسے مصروف وزیر تک پہنچنے میں کتنے دن لگ گئے اور اس ملاقات کے لئے انہیں کیا کیا پابندیوں پر پڑے یہ ایک الگ داستان ہے بہر حال پانچ چھ دنوں کی لگا تار کوششوں کے بعد ان کی نصیر خان سے ملاقات ہو گئی نصیر خان نے انہیں ہیز کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر فضل ہادی کے پاس بھجوادیا، حاجی عبدالرؤف تین دن فضل ہادی کے پیچھے بھاگتے رہے آخر میں ان کے ساتھ ملاقات ہوئی تو انہوں نے انہیں تھیلیسیما سنٹر بھجوادیا، وہ سنٹر چلے گئے وہاں وہ ڈاکٹر طاہرہ ظفر سے ملے، ڈاکٹر صاحبہ نے انکشاف کیا اس سنٹر میں تھیلیسیما کا علاج نہیں ہوتا، یہ لوگ مریضوں کو محض خون لگاتے ہیں، حاجی صاحب ایک بار پھر نصیر خان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے لیکن اب نصیر خان سے ملاقات مشکل ہو چکی تھی، وہ بچوں کو لے کر ”جیو“ ٹیلی ویژن چلے گئے، جیو نے ان پر ایک ”نیوز چینل“ بنا دیا، یہ چینل دو بار نشر ہوا لیکن بد قسمتی سے یہ چینل صدر ریاض ریاض عظیم دونوں کے فوس میں نہ آ سکا، جیو کے ایک رپورٹر نے انہیں کشمالہ طارق کا نمبر دے دیا، حاجی عبدالرؤف نے کشمالہ کو فون کیا، ٹیلی فون پر ان سے بات ہوئی، انہوں نے حاجی صاحب سے ”رنگ بیک“ کا وعدہ کیا لیکن بعد ازاں وہ بھی ان بے شمار اہم کاموں میں الجھ گئیں جن میں آج کل ہماری حکومت الجھی ہوئی ہے۔ وہاں سے مایوس ہو کر حاجی صاحب نے میڈیا سے رابطہ کیا، وہ بچوں کو لے کر تمام چھوٹے بڑے اخبارات کے دفاتر گئے، وہ تمام ٹیلی ویژن چینلوں کے سنڈیو پیچھے میڈیا پرنسپل مضمین اور تصویری رپورٹس جلیں لیکن کسی طرف سے کوئی خوشخبری نہ ملی، وہ مایوس ہو گئے، مایوسی کے اس عالم میں انہوں نے مجھے فون کیا، ان کا خیال تھا وہ اگر بچوں کے کسی کی فائل بنا سکیں، یہ فائل ساڑھے چار سو اربکان اسٹیبل اور سینئر ڈیپوٹو بھجوادیں اور میں ان تمام سینئروں اور اربکان اسٹیبل سے درخواست کروں اور وہ اپنی مراعات اور تنخواہوں میں سے صرف پچاس پچاس ہزار روپے ان بچوں کو دے دیں تو بچوں کی زندگی بچ سکتی ہے لیکن میں نے ان سے عرض کیا، آپ ابھی چند سیاتدانوں سے ملے ہیں آپ کو ان چند سیاتدانوں کے دروازے سے مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا لیکن جب آپ ایسے ساڑھے چار سو لوگوں کے دروازوں پر جائیں گے تو آپ کی مایوسی میں ساڑھے چار سو گنا اضافہ ہو جائے گا، وہ خاموش ہو گئے، اگلے دنوں انہوں نے مجھے اپنے دونوں بچوں کی تصویر بھجوادی۔

یہ تصویر اس وقت میری رائٹنگ ٹیبل پر پڑی ہے، میں جب بھی اس تصویر کو دیکھتا ہوں تو مجھے ان بچوں کی پہلی رحمت میں زندگی کی ہلکی ہلکی سرخی نظر آتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے ان بچوں کی آنکھوں میں امید کی چمک ابھی سلامت ہے، ان کے ہونٹ ابھی دعا کی طرح کھلے ہیں اور ان کے چہروں پر ابھی خواہشوں کے رنگ چپکے نہیں پڑے، میں یہ تصویر دیکھتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں ابھی چند دنوں کی بات ہے یہ دعائیں یہ چمک اور یہ سرخی کجھ جائے گی، یہ بچے ایک لاکھڑا اتا ہوا قدم اٹھائیں گے اور زندگی کی حد عبور کر جائیں گے، اس کے ساتھ ہی مجھے محسوس ہوتا

ہے یہ بچے جاتے جاتے اس سماج، اس نظام، اس ملک اور اس ملک کے سولہ کروڑ لوگوں کے دامن پر دھبہ چھوڑ جائیں گے یہ بچے ہمارے رزق، ہماری خوشیوں اور ہماری کامیابیوں پر ایک ایسا سیاہ دھبہ لگا جائیں گے جسے کروڑوں نیکیاں اور اربوں دعائیں نہیں دھو سکیں گی، بیمار بچے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاشروں کا استحسان ہوتے ہیں اور جو معاشرے اس امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں وہ اللہ کی رحمت کی فہرست سے خارج ہو جاتے ہیں اللہ ان سے اپنا رخ پھیر لیتا ہے اس وقت اس ملک میں ہزاروں ارب پتی ہیں ایسی سینکڑوں ہزاروں فرمیں ہیں جو ہر مہینے اربوں روپے کا کاروبار کرتی ہیں ان فرموں میں سے اگر سو بائبل فون کی کوئی ایک کمپنی ان بچوں کا علاج کرانے کوئی ایک ہاؤسنگ سکیم اپنے دو پلاٹ ان بچوں کے نام وقف کر دے، خالد اسحاق، ایس ایم ظفر اور ملک قیوم جیسا کوئی ایک وکیل اپنے دو سو مکھوں کی فیس ان بچوں کو دے دے، کوئی ایک انٹرن لائن، کوئی ایک جمپ سٹارٹ، ف کامرس، ریلوے واپڈ، دوائیں بنانے والی کوئی کمپنی یا پھر نیب جیسا کوئی ادارہ ان بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ دے، محکمہ ڈاک ان بچوں کے نام کا ایک لفافہ جاری کر دے اور عوام سے درخواست کرے وہ صرف ایک ایک لفافہ خرید لیں تو مجھے یقین ہے ایک دن میں دو کروڑ روپے جمع ہو جائیں گے، شاید آفریدی، شعیب، اختر یا انعام الحق ان بچوں کے لئے دو گھنٹے کرکٹ کھیل لیں، چار ادا کارائیں ان بچوں کے لئے شہر میں نکل آئیں، جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت اور جماعت المدعوہ ان بچوں کے علاج کی ذمہ داری لے لے اور مولانا طارق جمیل اپنے خطاب میں ان بچوں کو صرف ایک منٹ دے دیں تو ان بچوں کے چہرے کی پیلاہٹ سرفی میں بدل سکتی ہے، یہ بچے صحت مند ہو سکتے ہیں لیکن شاید ہمارے پاس دو بیمار بچوں کی زندگی کے لئے کوئی وقت نہیں، ہماری روزمرہ کی ترجیحات میں کسی غریب، کسی بے سہارا اور کسی محسوم بچے کیلئے کوئی گنجائش نہیں، میں سوچتا ہوں کل جب ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں گے اور ہمارے دامن پر ان دو بچوں کی موت کا دھبہ ہو گا تو ہم اپنے اللہ کا سامنا کیسے کریں گے، ہم اپنے رب کو اس غفلت کی کیا "جسٹی فکیشن" دیں گے۔ میرا خیال ہے ہم غفلت اور بے حسی کے اس دور میں داخل ہو چکے ہیں جس میں انسان اللہ کے خوف جیسی نعمت سے بھی محروم ہو جاتا ہے جس میں انسان اور پھر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔



اپنی چنگاریاں اپنا دامن

1990ء میں یونیورسٹی سے فارغ ہوا تھا اور اس کے بعد اس نے 2005ء تک طویل بے روزگاری کاٹی ان پندرہ برسوں میں اس نے نوکری کیلئے سینکڑوں ہزاروں درخواستیں دیں، میسجوں جگہ انٹرویو دیئے بے شمار چھوٹے موٹے کاروبار کئے وہ دو سال سعودی عرب بھی رہا اور اس نے سینئر مارکیٹ اور پراپرٹی کے کاروبار کو بھی اپنا ذریعہ بنایا لیکن اس کے مقدر کا ستارہ نہ چمکا اس کا ہر آنے والا دن پہلے سے بدتر ثابت ہوا، اس سے 1995ء سے جانتا تھا وہ ایک نہایت پڑھا لکھا ایماندار 'حساس' محنتی اور مثبت شخص تھا وہ لاہور کی چار لاکھ بریروں کا ممبر تھا اور اسے ہزاروں کی تعداد میں کتابیں انگریزی میں اور انگریزی اور انگریزی میں بھی تھی اور وہ میری زندگی کا واحد شخص تھا جو 15 سال تک جبر کی جگہ میں پسے کے باوجود حالات کے سامنے نہیں جھکا تھا جس نے نکستہ تسلیم نہیں کی اور جس نے امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا 2005ء جون میں اس کے ساتھ میری تواتر سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں وہ ہر پختے لاہور سے اسلام آباد آتا اور میرے ساتھ گپ شپ کر کے وہاں چلا جاتا تھا میں اس ملاقات کے دوران اس سے بہت کچھ سیکھتا تھا وہ مجھے بے شمار نئی کتابوں کے حوالے دیتا تھا وہ میرے لئے بے شمار نئے مضامین اور خبریں لے کر آتا تھا اور میں بعد ازاں ان خبروں ان مضامین کو بنیاد بنا کر کالم لکھتا تھا یہ سلسلہ چلتا رہا ایک بار وہ میرے پاس آیا تو وہ مجھے ذرا سا پریشان ذرا سا شکر لگا اس کی گفتگو میں راجح تھا اور وہ بے چینی سے بار بار پہلو بدلتا تھا میں نے وجہ پوچھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے رونمائی ہوئی آواز میں بتایا اب اس کا حوصلہ ٹوٹا شروع ہو گیا ہے وہ اب حریزہ زلت اور بے روزگاری برداشت نہیں کر سکتا میں اس کا دکھ سمجھتا تھا ذرا سوچنے جس شخص نے یونیورسٹی سے گولڈ میڈل لیا جو پندرہ سال تک بے روزگار رہا ہوا اور جس کی تنظیم تین بچے ماں باپ اور بہن بھائی بھی اس کے ساتھ چکی میں پس رہے ہوں اس کا دکھ کتنا بڑا ہو گا؟ میں نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی لیکن وہ میرے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا میں اسے تسلی دیتا رہا مجھے اس وقت معلوم ہوا تسلی ہر دکھ کا دوا نہیں ہوتی جب اس کے جذبات ذرا دیر کیلئے ٹھنڈے ہو گئے تو میں نے اس سے کہا "یا ظلیل تم اپنا کام شروع کیوں نہیں کرتے" اس سوال کے جواب میں اس نے وہ تمام کام گونا گونا شروع کر دیئے جو اس نے ماضی

میں کئے تھے اور ان میں اسے بری طرح گھاتا پڑا تھا، میں نے اس سے کہا تم ایک بار مزید کوشش کرو مجھے یقین ہے تم اس بار ضرور کامیاب ہو جاؤ گے، اس نے نفی میں سر ہلا دیا لیکن میں نے اصرار جاری رکھا، ہم مسلسل بحث کرتے رہے یہاں تک کہ وہ قائل ہو گیا، اس کے بعد دوسرا مرحلہ آیا، ہم نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کیا کام کر سکتا ہے، اس نے بتایا وہ ڈرائیونگ کا ماہر ہے، اس نے پندرہ سال کی عمر میں گاڑی چلانا سیکھی تھی اور وہ آنکھیں بند کر کے بھی ڈرائیونگ کر سکتا ہے، میرے ذہن میں آئیڈیا آیا، میں نے اسے مشورہ دیا، تم وین خرید لو ایک کنڈیکٹر رکھو خود گاڑی چلاؤ اللہ کرے گا، وہ شیم رضامند ہو گیا، اس کے بعد وین خریدنے کا مسئلہ تھا، وہ ایک مفلوک الحال شخص تھا، اس کا کل اثاثہ بیوی کے زیورات، والدین کے حج کے پیسے اور چند ہزاروں روپے کا فرنیچر تھا، اس نے کہا وہ چند لاکھ روپے جمع کر لے گا، میں نے اپنے اثاثوں کا تخمینہ لگایا، میری حالت بھی بہتر نہیں تھی لیکن اس کے باوجود میں نے دو لاکھ روپے کے بندوبست کا وعدہ کر لیا، وہ لاہور واپس چلا گیا۔

میں نے اسلام آباد میں ایک دوست سے بات کی، اس کے پاس ایک سیکنڈ ہینڈ وین کمڑی تھی، میں نے اس کے ساتھ وین کا سودا کیا، گیارہ لاکھ روپے میں سودا ہو گیا، اگلے ہفتے ظلیل اور میں نے اپنی اپنی "دولت" ایک جگہ جمع کی تو وہ بمشکل ساڑھے چھ لاکھ روپے بنے، ہمیں خریدنے کے لیے چار لاکھ روپے درکار تھے، ظلیل اور میں دوبارہ کوششوں میں لگ گئے لیکن ہمیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی، اس افراتفری اور کشمکش میں پندرہ دن گزر گئے، اس کے بعد ظلیل اچانک غائب ہو گیا، وہ ایک ہفتے بعد واپس آیا تو مجھے کمزور سا دکھائی دیا، اس کے ہاتھ میں چڑے کا ایک تھیلا تھا، اس نے تھیلے کی زپ کھولی اور تھیلا میری میز پر الٹ دیا، میری میز پر توٹوں کے پیکٹ آ گئے، میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا، وہ مسکرا کر بولا "میں بیویوں کا بندوبست کرنے گیا تھا، گن لو پورے ساڑھے چار لاکھ روپے ہیں" میں نے پریشانی کے عالم میں توٹوں کی طرف دیکھا اور اس کے بعد اس کی طرف دیکھ کر پوچھا "تم نے یہ ساری رقم کہاں سے حاصل کی؟" وہ زہریلے انداز میں بولا "میں نے اپنا گروہ بچ دیا" مجھے یوں محسوس ہوا میرے سر پر کمرے کی چھت آ گری ہو، اس رات میری آنکھوں کی نمی نے مجھے سونے نہیں دیا، مجھے محسوس ہوا میں نے وین کا مشورہ دے کر ظلیل کے ساتھ ظلم کیا ہے، میں اس کا قائل ہوں۔

میں واپس اصل کہانی کی طرف آتا ہوں، ظلیل نے دسمبر 2005ء میں وین خرید لی، وہ یہ وین لاہور لے گیا اور اس نے وین چلانا شروع کر دی، وہ اٹھارہ گھنٹے وین چلاتا تھا، اللہ نے کرم کیا، اس کے دن پھرنا شروع ہو گئے، اسے روزانہ پندرہ سو سے دو ہزار روپے بچتے گئے، میں ظلیل اور اس کا خاندان مطمئن ہو گئے، میرا خیال تھا ظلیل کا پندرہ سال کا بحران ختم ہو چکا ہے لیکن آنے والے دنوں میں میرا خیال غلط ثابت ہوا، فروری کے شروع میں ڈنمارک کے ایک اخبار یولاندہ پوسٹن نے نبی اکرم کی ذات اقدس کے بارے میں گستاخانہ خاکے شائع کر دیئے اور دنیا میں خاکوں کا مسئلہ کھڑا ہو گیا، اسلامی دنیا میں احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا، یہ احتجاج پاکستان پہنچا اور لوگ لاکھیاں اور تہل کی بوتلیں لے کر سڑکوں پر آ گئے، یہاں تک کہ 14 فروری کا دن طلوع ہو گیا، یہ ظلیل کی چھوٹی بیٹی کی سالگرہ کا

دن تھا، غلیل نے بیٹی اور اس کی ماں سے وعدہ کیا وہ صرف 2 بجے تک وین چلائے گا اور اس کے بعد سارا خاندان شایہ بار باغ میں پکنک منائے گا، غلیل گھر سے نکل گیا لیکن اس کے بعد وہاپس گھر نہیں آیا، چودہ فروری کی شام غلیل کی بیوی نے مجھے فون کیا وہ ادبھی آواز میں رورہی تھی اس کا کہنا تھا جب غلیل پنجاب اسمبلی کے سامنے پہنچا تھا تو ہجوم نے اس کی وین کو گھیر لیا تھا وہ لوگ امریکہ اور ڈنمارک کے خلاف نعرے لگا رہے تھے، غلیل نے راستہ لینے کیلئے ہارن بجایا تو چند جو شیلے نوجوانوں کو ہارن کی آواز ناگوار گزری وہ وین پر چڑھ گئے انہوں نے سب سے پہلے وین کے شیشے توڑنے اس کے بعد اس کے لیول ٹینک کا پائپ کھینچا اور اس کے بعد وین کو آگ لگا دی، غلیل بڑی دیر تک اپنی لمبٹھ سے یہ آگ بجھاتا رہا لیکن جب یہ آگ دو زخ کی شکل اختیار کر گئی تو اس نے اپنی لمبٹھیں جلتی ہوئی وین پر بھینگی اور چپ چاپ ہجوم میں گم ہو گیا اس کے بعد وہ واپس نہیں آیا۔

میرے سامنے 15، 16 اور 17 فروری کے اخبارات کھمے پڑے ہیں ان تمام اخبارات میں جلتی ہوئی گاڑیوں کی بے شمار تصویریں ہیں میں جب بھی یہ تصویریں دیکھتا ہوں تو میرے سامنے غلیل کا چہرہ آ جاتا ہے، غلیل کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ آتی ہے وہ اپنے پیٹ سے دامن اٹھاتا ہے، گروے کی جگہ پر انگلی پھیرتا ہے، اس کے بعد دھوکے کی گیس کی طرف اشارہ کرتا ہے اور پھر مسکرا کر کہتا ہے یہ پٹرول نہیں، یہ میرے گروے کا دھواں ہے اس آگ میں میرا پیٹ، میرا جسم، میرے بچوں کی جھوک، میرے خاندان کی خوشحالی اور میرے مستقبل کے خواب جل رہے ہیں یہ میری بیٹائی، میری سوچ کا دھواں ہے، وہ کہتا ہے گستاخی ڈنمارک نے کی تھی لیکن مرزا مجھے ملی، گروے میرے جملے، نقش میرے خوابوں، میرے آنسوؤں کی گری، برباد میں ہوا، وہ مجھ سے پوچھتا ہے، میرا کیا قصور تھا، میں بھی ان لوگوں کی طرح ایک مسلمان ہوں، میں بھی پاکستانی ہوں، میں بھی مظلوم ہوں اور میں بھی ایک سچا عاشق رسول ہوں لیکن ان لوگوں نے میری وین جلا دی، میرے پاس غلیل کے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں لہذا میں یہ سوال لاہور کے تمام زندہ ضمیر خواتین و حضرات کے سامنے رکھتا ہوں، میں ان سے پوچھتا ہوں ہم لوگ دشمنوں کی گستاخیوں کا بدلہ اپنے آپ سے کیوں لیتے ہیں، ہمارا غصہ صرف غلیل جیسے لوگوں پر کیوں نکلتا ہے، ہم اپنی چنگاریوں سے صرف اپنے دامن کیوں جلاتے ہیں؟“



کوئی برے ہوتے ہیں کو فہ نہیں

اس کا کہنا تھا "میرے اندر آگ لگی ہے اس آگ نے میرے اندر کی وفا، میری شفقت، میری محبت اور میری وفاداری کو جلا کر رکھ کر دیا ہے" میں جب بھی اس ملک، اس ملک کی رونگٹا ایلیٹ اور اس ملک کی سٹیبلشمنٹ کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا جسم بھارتی بن جاتا ہے اور میرے اندر آتش فشاں دکنے لگتا ہے "مبشر بٹ کے منہ سے جیٹا آگ نکل رہی تھی اس کا ہاتھ سینے سے شراہور تھا اور شدت جذبات سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے میں سکتے کے عالم میں اس کی گفتگو سن رہا تھا۔

اس نے کہا "میں نے پوری زندگی اپنے دادا، اپنی دادی، اپنے تایاجی اور اپنے والد کو جتنے نہیں دیکھا" میں اس بات پر ہمیشہ حیران ہوتا تھا "ایک دن میں نے اپنے تایاجی سے اس کی وجہ پوچھی تو جانتے ہوا ہوں نے کیا جواب دیا "وہ چند سیکنڈ کے لئے رکا" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے "میرے تایاجی نے بتایا ہم لوگ اپنی ہنسی 1947ء میں امرتسر چھوڑ آئے تھے اور اس کے بعد ہم نے جب بھی ہنسنے کی کوشش کی ہمارے منہ سے سسکی اور چیخ کے سوا کچھ نہ نکلا" میرے تایاجی نے بتایا "ہم لوگ 1947ء میں چھ سات سات سال کے بچے تھے ہماری ایک جمان بہن تھی جب امرتسر میں فسادات شروع ہوئے اور مسلمان لڑکیاں اغواء ہونے لگیں تو ہمارے دادا کو محسوس ہوا شاید ہم زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکیں ان کو خطرہ تھا ان کے بعد سکھ ان کی بیٹی کی بے حرمتی بھی کریں گے لہذا ایک دن وہ ہماری بڑی بہن کو کوشٹری میں لے گئے وہاں وہ دونوں باپ، بیٹی، دیریک گفتگو کرتے رہے جب وہ باہر آئے تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے ہمارے والد نے ہماری ماں اور ہم سب کو کمرے میں بند کیا اور ہماری بہن کو لے کر گھن میں چلے گئے" میں دروازے کی درز سے باہر جھانکنے لگا ہمارے والد نے ہماری بہن کو گھن میں لٹایا "اس کے کندھے پر گھنٹا رکھا اور چھری سے اس کا گلا کاٹ دیا ہماری بہن نے ایک دردناک چیخ ماری اور اس کے بعد فرش پر تڑپنے لگی ہمارا والد سجدے میں گر گیا اور جب تک بہن کی جان نہ نکلی وہ سجدے میں پڑے رہے وہ اللہ تعالیٰ سے پاکستان کے استحکام کی دعا مانگتے رہے اس کے بعد جب انہوں نے دروازہ کھولا تو ان کا منہ تک ہماری بہن کے لبوں سے رنگا ہوا تھا ہماری ماں نے بیٹی کی نعش دیکھی تو وہ بے ہوش ہو کر دلیر پر گر گئی اس کے بعد وہ دن ہے اور

آج کا دن ہے ہم جب بھی ہنسنے لگتے ہیں تو ہمیں اپنی بہن کی بیچ یاد آ جاتی ہے اور ہماری آنکھیں میلی ہو جاتی ہیں۔
 مشرٹ نے آنکھوں پر ہاتھ رکھے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کمرے کی فضاء سوگوار ہو گئی، مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے میرے سانس کی تالی پر پتھر رکھ دیا ہو، تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا "کیا تم لوگوں میں سے کسی نے اس ملک کے لئے اتنی قربانی دی تھی؟" ہم چپ رہے وہ چند لمبے خاموش رہا اور اس کے بعد بولا "میرے تایا جی کا کہنا تھا پاکستان ہماری بہن کی نعش پر بنا تھا، میں نے اپنے تایا جی کی بات پہلے باندھ لی اور اس کے بعد اس ملک کو حقیقتاً اپنا ملک سمجھنے لگے لیکن پھر 1977ء آ گیا، ایک دن ہمارے گھر پولیس آئی، ہمارے ڈرائیونگ روم میں بھٹو صاحب کی تصویر لگی تھی، انہوں نے یہ تصویر اتاری اور میرے والد کو گرفتار کر کے لے گئے، میرے والد پر مقدمہ چلا اور میرے والد نے بھٹو کے ساتھ عقیدت کا جرم تسلیم کر لیا، فوجی عدالت نے انہیں سرعام کوڑے مارنے کا حکم جاری کر دیا، مشرٹ ذرا دیر کے لئے رکا اور ایک لمبا ہوا کا بھر کر بولا "میں اس وقت سات برس کا بچہ تھا، ایک دن شہر میں اعلان ہوا، محمد اکرم کو شہر کے مرکزی چوک میں کوڑے مارے جائیں گے، ہمارے گھر میں صف ماتم بچھ گئی، میں گھر والوں سے چھپ کر چوک میں چلا گیا، چوک میں پورا شہر جمع تھا، میرے والد کو لایا گیا، ان کے کپڑے اتارے گئے، انہیں ننگی پر چڑھایا گیا اور میرے سامنے انہیں کوڑے مارے گئے، میرے والد کے منہ سے ہر کوڑے پر چیخ نکلتی تھی، میں نے اپنے کانوں، اپنی آنکھوں سے اپنے والد کو چھیننے دیکھا۔ یہ ساری چیزیں آج تک میرے اندر رہیں گے، لوگ میرے والد کو اٹھا کر گھرانے اور اسے چارپائی پر ڈال کر چلے گئے، میں اگلے دس دن اپنے ہاتھوں سے اپنے والد کے زخموں پر برف لگا تا رہا لہذا آپ لوگ مجھ سے پوچھو کوڑے کیا ہوتے ہیں، تم مجھ سے پوچھو زخم کیا ہوتے ہیں اور جب ان زخموں پر برف رکھی جاتی ہے تو زخمی کے منہ سے کس قسم کی سسکی نکلتی ہے؟" وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

مشرٹ نے نفرت سے ہماری طرف دیکھا اور کڑکتے لہجے میں بولا "مجھے بتاؤ ایک ایسا شخص جس نے اس ملک کی تشکیل کے لئے اپنی جوان بہن کی قربانی دی ہو کیا وہ اس ملک میں اس سلوک کا حق دار تھا؟ مجھے بتاؤ جس شخص کے والد نے غیرت اور بے حرمتی سے بچنے کے لئے اپنی جوان بیٹی ذبح کر دی تھی کیا اس کا بیٹا اس سلوک کا روادار تھا؟" ہم لوگ خاموش رہے وہ اسی کڑکتے لہجے میں بولا "میرے باپ کا کیا تصور تھا؟ کیا نظریات؟ کسی سیاسی پارٹی کا عہدیدار ہونا اور کسی جمہوری لیڈر کو پسند کرنا جرم ہے اور کیا ڈرائیونگ روم کی دیوار پر کسی لیڈر کی تصویر لگانا گناہ ہے؟ مجھے بتاؤ میرے خاندان، میرے والد اور مجھے اس ملک کا کیا فائدہ ہوا؟" ہم خاموش رہے اس نے کہا "حکومت نے 1979ء میں ہماری ساری جائیداد ضبط کر لی تھی، میرے والد کی نوکری اور کاروبار پر پابندی لگ گئی تھی اور مجھے خاندان چلانے کیلئے ہوٹل میں ویٹری کرنا پڑی تھی اور تم لوگ کہتے ہو میں حب الوطن شہری کی طرح اس ملک کی خدمت کروں، کیوں کروں؟ مجھے کوئی جواز بتاؤ؟" وہ خاموش ہو گیا، کمرے میں طویل عرصے تک خاموش رہی، وہ ذرا دیر بعد بولا "ایسے بنتے ہیں لوگ وہشت گرد، میرے اندر جھانک کر دیکھو، میرے اندر ایک

میر دست کنگ بیٹھا ہوا ہے، تم اس دہشت گرد کو مطمئن کر دو، میں اس ملک کا سب سے بڑا محب وطن بن جاؤں گا۔“
 میں نے اس سے عرض کیا ”یزید نے حضرت امام حسینؑ کو شہید کر دیا تھا، کیا اس میں اسلام کا کوئی قصور تھا؟“ اس
 نے تھوڑی دیر سوچا اور انکار میں سر ہلا دیا، میں نے اس سے پوچھا ”کیا اس میں مکہ مدینہ اور کوفہ کا کوئی قصور تھا، کیا
 اس میں ساری اسلامی ریاست کا کوئی قصور تھا، کیا اس قتل میں تمام مسلمان شریک تھے“ اس نے انکار میں سر ہلا دیا،
 میں نے اس سے عرض کیا ”بٹ صاحب ہماری اپروچ ٹھیک نہیں، ہم لوگ دوسرے لوگوں کے لگائے زخموں کا بدلہ
 ملک، نظریے اور اداروں سے لیتے ہیں، وہ گالی جو ہمیں لوگوں کو دینی چاہنے، ہم وہ گالی ملک اور نظریے کو دیتے ہیں،
 بٹ صاحب یقین کیجئے وقت کا یزید برا ہوتا ہے اس دور کا اسلام نہیں، کوفے والے برے ہوتے ہیں کوفہ نہیں اور
 ابو جہل ظالم ہوتے ہیں مکہ نہیں، یمن، ہم لوگ کئے والوں کے جرموں کی سزا مکہ کو دیتے ہیں اور ہم ابولہب کے
 جرموں کا بدلہ حضرت بلال جیسے لوگوں سے لیتے ہیں، بٹ صاحب مجھے بتائیے کیا یہ زیادتی نہیں، کیا یہ ظلم نہیں،“ مبشر
 بٹ نے لمبی سانس بھری، کرسی کے ساتھ ٹپک لگائی اور پیچھے کی طرف جھول گیا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

یہ جنگ کیسے شروع ہوئی

امریکہ اور مسلمانوں کی جنگ کا آغاز 1949ء میں ہوا تھا اور یہ جنگ دو استادوں سے شروع ہوئی تھی۔ 1906ء میں مصر کے صوبے اسیوط کے ایک گاؤں موشاش ایک بچہ پیدا ہوا، بچے کے والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین بنت عثمان تھا، والد کھیتی باڑی کرتے تھے جبکہ والدہ ایک دیندار اور پرہیزگار خاتون تھی، بچے نے دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، 1933ء میں قاہرہ سے بی اے کیا اور اس کے بعد وہ مصر کی وزارت تعلیم میں انسپکٹر آف سکولز بھرتی ہو گیا، 1949ء میں وزارت نے اسے امریکہ کا نظام تعلیم سمجھنے کے لئے کولورڈو، بھوادیا، وہ امریکہ میں دو سال رہے اور ان دو برسوں میں انہوں نے ولسن ٹیچرس کالج واشنگٹن، ٹیچرس کالج کولورڈو اور شین فورڈ یونیورسٹی کیلینفورنیا میں تعلیم حاصل کی، امریکہ میں قیام کے دوران انہیں امریکی معاشرے کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ امریکہ میں شدت پسندی کا دور تھا، اس دور میں ایک طرف "ہی ازم" کا آغاز ہو رہا تھا، امریکی معاشرہ بڑی تیزی سے ماڈرن اور امتدال پسند ہو رہا تھا، امریکہ میں عشیات، ڈسکو اور جنس پرستی عام ہو رہی تھی جبکہ دوسری طرف امریکہ میں ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو رہا تھا جو پوری دنیا میں عیسائیت کا غلبہ چاہتا تھا، اس طبقے کا کہنا تھا ہم نے ناگاساکی اور ہیروشیما کو ایٹم بم سے اڑا کر اپنی برتری ثابت کر دی لہذا اب ہمیں پوری دنیا کو عیسائی بنا دینا چاہئے، یہ طبقہ سودیت یونین اور مسلمانوں کو اپنا اگلا ٹارگٹ سمجھتا تھا، مصر کے اس انسپکٹر سکولز نے ان دونوں تحریکوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا۔ وہ 1951ء میں واپس مصر آئے تو وہ مکمل طور پر ایک انقلابی شخصیت بن چکے تھے وہ لیبرل ازم اور عیسائی پادریوں دونوں کے خلاف ہو چکے تھے، ان کا خیال تھا اگر عالم اسلام بیدار نہ ہوا تو اگلے تیس چالیس برسوں میں وہ شدید بحران کا شکار ہو جائے گا، انہوں نے "انخوان المسلمون" جوڑن کی اور مصری نوجوانوں میں انقلابی روح پھونکنا شروع کر دی۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے اس کہانی کو یہاں روکتے ہیں اور اب دوسرے استاد کی طرف آتے ہیں۔

1949ء میں یوٹرا اس نام کا ایک استاد شکا گو یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا، وہ پلٹیکل فلاسفر تھا، اس وقت شکا گو یونیورسٹی میں "پیوں" کا قبضہ تھا، یہ لوگ اسن اور عالمی بھائی چارے کو مذہب قرار دیتے تھے اور ان کا کہنا تھا دنیا کے تمام انسان برابر ہیں اور مذہب ان انسانوں کو تقسیم کرتا ہے لہذا دنیا سے مذہب ختم ہو جائے یا ہمیں، لیو ایک

کنوہی سائی اور قدامت پسند فلسفی تھا' اسے یہ تحریک پسند نہ آئی لہذا اس نے سوچا ہی ازم کے سامنے قدامت پسندی کا بند باندھنا چاہئے کیونکہ اگر ماڈرن ازم کا راستہ نہ روکا گیا تو عیسائی دنیا اس سے شدید نقصان اٹھائے گی' لیو کا خیال تھا آنے والے دنوں میں اشتراکیت اور مسلمان عیسائیت کے سب سے بڑے دشمن ہوں گے اور اسے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک "الٹرا" تیار کرنا چاہئے' لیو نے 1951ء میں شکاگو یونیورسٹی میں اپنا ایک گروپ بنایا اور اس گروپ نے محدود پیمانے پر کام شروع کر دیا' اس گروپ کے ایجنڈے کے چار نقاط تھے' عیسائی تعلیمات کو عام کرنا' ماڈرن ازم کو روکنا' اشتراکی نظریات کا مقابلہ کرنا اور امریکی معاشرے کے مسلمانوں سے خبردار کرنا۔ لیو نے 1951ء سے 1955ء تک شکاگو میں اپنا ایک اچھا خاصا حلقہ پیدا کر لیا' ہم اب تھوڑی دیر کے لئے اس کہانی کو بھی یہاں روکتے ہیں اور وہاں پہلے استاد کی طرف آتے ہیں۔

مصر کے اس استاد کا نام سید قطب تھا' سید قطب کو اللہ تعالیٰ نے تحریر اور گفتگو کے فن سے نوازا رکھا تھا' سید قطب نے ان دونوں فنون سے مصری نوجوانوں کی کردار سازی شروع کر دی' ان دنوں مصر میں شاہ فاروق کی حکومت تھی' شاہ فاروق ایک عیاش طبع بادشاہ تھے لہذا مصری معاشرہ خرابی کی انتہا تک پہنچا ہوا تھا' سید قطب نے لوگوں کو بادشاہ کے پٹخاف ابھارنا شروع کر دیا' سید قطب کی تبلیغ سے متاثر ہو کر جنرل محمد نجیب اور کرنل جمال عبدالناصر نے 1952ء میں شاہ فاروق کا تختہ الٹ دیا' سید قطب نے شروع میں فوجی بغاوت کی بھرپور حمایت کی لیکن جب فوجی قیادت نے بھی مصر کو لبرل' ماڈرن اور معتدل بنانا شروع کر دیا تو سید قطب حکومت کے خلاف ہو گئے' حکومت نے 1954ء میں انہیں گرفتار کر لیا اور انہیں شدید تشدد کا شکار بنایا گیا' اس وقت تک مصر میں سی آئی اے داخل ہو چکی تھی' سی آئی اے بھی قید خانے میں سید قطب پر تشدد کرتی رہی' حکومت نے سید قطب کو دس سال قید خانے میں رکھا' 1954ء میں عراقی حکومت کی مداخلت پر انہیں رہا کر دیا گیا لیکن ان کے معمولات اور ملاقاتیوں کی کڑی نگرانی ہوتی رہی' وہ شدید علامات کا شکار تھے' ایک سال بعد انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا' ان پر بند کمرے میں مقدمہ چلایا گیا اور 29 اگست 1968ء کو سید قطب کو ان کے دو ساتھیوں سمیت پھانسی دے دی گئی۔ سید قطب شہید ہو گئے لیکن وہ اپنے پیچھے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ چھوڑ گئے' ان شاگردوں میں ان کے عملی شاگرد بھی شامل تھے اور فکری بھی' سید قطب کے فکری شاگردوں میں سے تین حضرات نے آنے والے دنوں میں عالمی شہرت حاصل کی' ان میں سے ایک امام غنیمی تھے' غنیمی خود کو سید قطب کے نظریاتی اور روحانی شاگرد کہتے تھے۔ دوسرے مولانا مودودی تھے اور تیسرے شاگرد القاعدہ کے بانی اور ماسٹر مائنڈ ایمن الغلو ابھری تھے' ایمن الغلو ابھری کے بچپن کا زیادہ تر حصہ سید قطب کی صحبت اور محبت میں گزرا تھا اور سید قطب کی شہادت کے بعد ایمن الغلو ابھری نے ان کے نظریات کا علم اٹھایا تھا۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے اس کہانی کو بھی یہاں روکتے ہیں اور وہاں دوسرے استاد کی طرف آتے ہیں۔

لیوسٹراس اور اس کے شاگردوں کی شکاگو کے بیوں کے ساتھ لائی شروع ہو گئی' یہ لوگ جب یونیورسٹی سے فارغ ہوئے تو قدامت پسند خیالات کے باعث معاشرے نے انہیں مسترد کر دیا اور شکاگو میں ان پر عرصہ

حیات تک ہو گیا لہذا یہ لوگ شکا گو سے نقل مکانی کر کے واشنگٹن آ گئے، واشنگٹن میں انہوں نے سوچا جب تک ہم اقتدار کے حلقے میں داخل نہیں ہوتے ہم اپنے نظریات کو عملی شکل نہیں دے پائیں گے، انہوں نے ڈیموکریٹک اور ری پبلکن پارٹی کا جائزہ لیا، انہیں ری پبلکن پارٹی "سافٹ ٹارگٹ" محسوس ہوئی لہذا یہ لوگ ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے اوپر آ گئے، لیوسٹراس کو بھی اللہ تعالیٰ نے چارنا مور شاگرد "عمامت" کئے تھے، ان شاگردوں نے آنے والے دنوں میں عالمگیر شہرت پائی، ان میں ایک ڈاک چینی تھے دوسرے ڈونلڈ رمزفلڈ تھے، تیسرے پال وولف ڈنر تھے اور چوتھے ولیم کرسٹول تھے، پال وولف ڈنر اور ولیم کرسٹول اس کے شکا گو یونیورسٹی کے شاگرد تھے جبکہ رمزفلڈ اور ڈاک چینی اس کے نظریات سے متاثر تھے، لیوسٹراس 1973ء میں انتقال کر گیا جس کے بعد اس کے ان چار شاگردوں نے اس کا علم اٹھالیا۔ یہاں سے کہانی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور دونوں استادوں کے شاگرد میدان میں آتے ہیں اور تیزی سے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، اب ہم دونوں استادوں کے شاگردوں کو ایک ساتھ لے کر آگے بڑھتے ہیں۔

1972ء میں امریکہ میں ری پبلکن پارٹی کے رچرڈ نکسن کی حکومت آتی ہے، نکسن اور ان کے وزیر خارجہ ہنری کسنجر سوویت یونین اور چین کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کا فیصلہ کرتے ہیں لیکن لیوسٹراس کے شاگرد اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں، 1974ء میں نکسن کی حکومت ختم ہوتی ہے اور اس کی جگہ جیرالڈ فورد صدر بنتے ہیں تو ڈونلڈ رمزفلڈ ان کے وزیر دفاع اور ڈاک چینی صدر کے چیف آف سٹاف بن جاتے ہیں یوں لیوسٹراس کے شاگرد حکومت کا حصہ بن جاتے ہیں جبکہ سید قطب کے شاگردوں کو مصر میں باغیوں کا درجہ مل جاتا ہے اور حکومت ان کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیتی ہے اور یوں آنے والے دن اور واقعات بہت دلچسپ شکل اختیار کرتے ہیں، جیرالڈ فورد روس کا دورہ کرتے ہیں جس کے بعد سرد جنگ نئے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس دوران انور السادات مصر کے صدر بنتے ہیں، وہ 1977ء میں اسرائیل کا دورہ کرتے ہیں ٹیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ ہوتا ہے اور مصر سمیت پوری اسلامی دنیا میں سادات کے خلاف احتجاج شروع ہو جاتا ہے، 1980ء میں ایمن الظواہری اور ان کے ساتھی عملی جہاد کا اعلان کرتے ہیں، یہ لوگ فوج میں اپنا رسوخ قائم کرتے ہیں اور 16 اکتوبر 1981ء کو پریڈ کے دوران انور السادات کو گولی مار دی جاتی ہے جس کے بعد ایمن الظواہری، عبدالسلام فرج اور ان کے سارے ساتھی گرفتار ہو جاتے ہیں، ایک کہانی یہاں ختم ہوتی ہے جبکہ دوسری کہانی صدر ریگن کے دور میں شروع ہوتی ہے اور یہ کہانی میں آپ کو کل سناؤں گا۔



اس کے بعد کیا ہوا

لیوسٹراس کے شاگرد اس وقت تک "نیوکنزرویٹوز" کے نام سے مشہور ہو چکے تھے، رولڈ ریگن نے 20 جنوری 1981ء کو صدر کا حلف اٹھایا، ان کے ساتھ جارج ڈبلیو بوش (سینئر) نائب صدر منتخب ہوئے اور صدر ریگن کے دور میں رچرڈ پل امریکہ کا نائب سیکرٹری دفاع بن گیا، رچرڈ پل کا تعلق لیوسٹراس گروپ سے تھا اور اس نے افغانستان میں امریکہ کو روس سے لڑانے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا، 1984ء میں لیوسٹراس کے شاگردوں کو محسوس ہوا جارج بوش امریکہ کے اگلے صدر ہوں گے چنانچہ انہوں نے غیر محسوس طریقے سے جارج بوش کو گھیر لیا، وہ جارج بوش کے قریب ہوتے چلے گئے، آپ اس صورتحال کا ایک دلچسپ پہلو ملاحظہ کیجئے۔ 1984ء میں امریکہ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف برسر پیکار تھا، امریکہ کو اس وقت ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو اس جنگ کو مذہبی فریضہ سمجھ کر لڑیں اور دنیا میں اس وقت سید قطب کا داعی گروپ تھا جو اس جنگ کو جہاد کی شکل دے سکتا تھا چنانچہ "نیوکنزرویٹوز" نے مصری حکومت سے بات چیت کی اور حسی مبارک نے ایمن الظواہری اور ان کے ساتھیوں کو رہا کر دیا۔ یہ لوگ 1985ء میں مصر سے افغانستان چلے گئے یوں سید قطب اور لیوسٹراس کے شاگرد پہلی بار ایک جگہ جمع ہو گئے، 1985ء ہی وہ سال تھا جب ایمن الظواہری کی اسامہ بن لادن سے ملاقات ہوئی، اسامہ بن لادن کے پاس پیسہ اور جذبہ تھا جبکہ ایمن الظواہری منصوبہ بندی کے ماہر تھے چنانچہ ان دونوں نے مل کر کمال کر دیا، 1987ء میں افغانستان کی جنگ عملاً ختم ہو گئی اور امریکہ افغانستان سے واپس چلا گیا امریکہ کی دیکھا دیکھی ایمن الظواہری، اسامہ بن لادن اور عبدالسلام فرنج بھی واپس لوٹ گئے، یہ لوگ جب اپنے ملکوں میں پہنچے تو یہ اسلامی دنیا کے ہیرو بن چکے تھے جس کی وجہ سے مصر، الجزائر اور سعودی عرب کی حکومتیں ان لوگوں سے خائف رہنے لگیں، ان لوگوں نے بھی جلد ہی حکومتوں پر بکنے چینی شروع کر دی، جس کے نتیجے میں ان کا اپنی اپنی حکومتوں سے ٹکراؤ شروع ہو گیا، ہم ایک بار پھر اس کہانی کو اس جگہ روکتے ہیں اور لیوسٹراس کے شاگردوں کی طرف واپس آتے ہیں۔

20 جنوری 1989ء کو امریکہ میں جارج بوش سینئر نے حلف اٹھایا جس کے بعد لیوسٹراس کا براہ راست شاگرد پال دولف وٹزر بوش کی وزارت خارجہ کا انڈر سیکرٹری بن گیا، ولیم کرشول نائب صدر کا چیف آف سٹاف ہو گیا

جبکہ ڈک چیٹی کو امریکہ کا وزیر دفاع بنا دیا گیا اس دور میں عراق ان لوگوں کا فوکس تھا، ان لوگوں نے عراق میں موجود امریکی سفیر اپرل گلینس پنی کے ذریعے صدام حسین کو "ٹریپ" کیا، صدام سے کویت پر قبضہ کرایا اور اس کے بعد 17 جنوری 1991 کو عراق پر حملہ کر دیا اس وقت جنرل کولن پاول چیئر مین جو انٹنیشنل چیفس آف سٹاف تھا 26 فروری 1991ء کو جب صدام حسین نے کویت خالی کر دیا تو اس وقت نیو کزن روٹیوز اور کولن پاول میں اختلافات پیدا ہو گئے، نیو کزن روٹیوز کی خواہش تھی صدر بش عراق پر باقاعدہ قبضہ کر لیں جبکہ کولن پاول کا کہنا تھا ہم صدام حسین سے کویت خالی کرانے آئے ہیں کویت خالی ہو چکا ہے لہذا ہمیں اب واپس جانا چاہئے۔ صدر بش سینئر نے کولن پاول کی بات مان لی جس کے بعد ان کی کولن پاول سے ٹھن گئی۔ ہم ایک بار پھر اس کہانی کو یہاں روکتے ہیں اور سید قطب کے شاگردوں کی طرف واپس آتے ہیں

1991ء کی گلف وار کے دوران امریکہ نے سعودی عرب کو فوجی "حفاظت" کی پیش کش کی شاہ فہد نے یہ آفر قبول کر لی اس وقت اسامہ بن لادن شاہ سے ملے اور انہیں افغانستان اور عرب مجاہدین کے ذریعے سعودی عرب کی حفاظت کرنے کی پیش کش کی لیکن شاہ نے ان کی یہ آفر مسترد کر دی جس کے نتیجے میں اسامہ بن لادن نے حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اس کے رد عمل میں حکومت نے ان کی شہریت معطل کی اور انہیں ملک سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اسامہ سعودی عرب سے سوڈان چلے گئے ایمین القلو ابہری بھی اس دوران مصر سے نکلے اور ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور ان لوگوں نے سوڈان میں القاعدہ کو متحرک کر دیا اور القاعدہ نے 1993ء میں نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور صومالیہ میں اقوام متحدہ کے فوجیوں پر حملے کر دیئے۔ 26 جون 1995ء میں ان لوگوں نے مصری صدر حسنی مبارک پر بھی حملہ کر دیا حسنی مبارک اس وقت استنبول گیا کے دورے پر تھے ان حملوں کے رد عمل میں امریکہ نے سوڈان پر شدید دباؤ ڈالنا شروع کر دیا سوڈان امریکی دباؤ میں آ گیا اور اس نے ان لوگوں کو نکل جانے کا حکم دے دیا اسامہ بن لادن نے اپنے خاندان کے دوسرا افراد لئے اور وہ 1996ء میں جلال آباد آ گئے ساگلے سال کے شروع میں ایمین القلو ابہری بھی اپنے مجاہدین کے ساتھ افغانستان آ گئے ہم ایک بار پھر اس کہانی کو روکتے ہیں اور لیوسٹراس کے شاگردوں کی طرف واپس آتے ہیں۔

20 جنوری 1993ء کو ٹیل کنٹنن نے صدر کا حلف اٹھایا وہ ڈیموکریٹک پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور دل سے نیو کزن روٹیوز کو ناپسند کرتے تھے کنٹنن دور میں ان لوگوں کا ڈائمنٹ ہاؤس میں داخلہ بند ہو گیا لیکن یہ اس سارا عرصہ صدر کنٹنن کو مسلمانوں کے خلاف اکساتے رہے اس دوران یہ لوگ بش فیملی اور امریکہ کے پادریوں کے ساتھ بھی رابطے میں رہے ان لوگوں نے پادریوں کو بش کے بیٹے بش جو نیوزی کی حمایت پر تیار کر لیا اسی دوران نیو کزن روٹیوز نے جون 1997ء میں واشنگٹن میں پراجیکٹ آف نیو امریکن پٹری (پی این اے سی) کے نام سے ایک ٹھیک ٹھیک کی بنیاد رکھی، اس ٹھیک ٹھیک کا تین فاصلی ایجنڈا تھا، امریکہ کیلئے خلائی فوج تشکیل دینا، امریکہ کا دفاعی بجٹ بڑھانا اور امریکہ کی دفاعی پالیسی تبدیل کرنا ابتداء میں اس ٹھیک ٹھیک کے 25 ارکان تھے اور اس کا

چیمبر میں ولیم کرسٹول تھا، جارج بش کا بیٹا جیب بش، ڈک چینی، ڈونلڈ رمزفلڈ، پال وولف وینر اور زالے غلیل زادگی اس تھنک ٹینک میں شامل تھے، ہم یہاں ایک بار پھر کہتے ہیں اور واپس افغانستان جاتے ہیں۔ 1998ء میں اسامہ بن لادن اور ایمن النواہری نے قذافی سے فرانس کی اور اس پر فرانس کا نیشنل میں اس نے امریکہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے دو نتائج ظاہر ہوئے: نیوکمز روٹو کوئل کنٹینر پر دباؤ ڈالنے کا موقع مل گیا اور دوسرا صدام حسین کو القاعدہ میں روشنی کی کرن دکھائی دیے گئے۔ صدام حسین نے اسامہ بن لادن سے رابطہ کیا اور انہیں عراق میں منتقل ہونے کی پیشکش کر دی اسامہ نے افغانستان چھوڑنے سے انکار کر دیا تاہم ان کے صدام کے ساتھ رابطے استوار ہو گئے۔ 1998ء ہی میں القاعدہ نے ایران کے ساتھ تعلقات استوار کئے اور یوں یہ لوگ ایران اور عراق کی مدد سے حزب اللہ تک پہنچ گئے اور حزب اللہ نے لبنان میں القاعدہ کے مجاہدین کو ٹریننگ دینا شروع کر دی القاعدہ کے مجاہدین نے حزب اللہ سے ٹریننگ لینے کے بعد تیروبی اور دارالسلام میں امریکی سفارتخانے اڑا دیئے اس وقت تک ایران عراق اور حزب اللہ کا خیال تھا القاعدہ کی سرگرمیاں صرف یمن تک محدود ہیں لیکن القاعدہ نائن الیون کی منصوبہ بندی کر رہی تھی سید قطب کے مجاہد بڑی تیزی سے نائن الیون کی طرف بڑھ رہے تھے دوسری طرف ”نیوکمز روٹو“ کسی ایسے بہانے کی تلاش میں تھے جس کی مدد سے وہ امریکہ کو عالم اسلام کے سامنے کھڑا کر سکیں ان لوگوں کے تھنک ٹینک پی این اے سی نے 2000ء میں اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا انہوں نے اپنی میٹنگ میں اعلان کیا تھا ”ہمیں سب سے خطرات (مسلمانوں) سے بچنے کیلئے ایک نئی پرل ہاربر کی ضرورت ہے۔ اب صورتحال بہت دلچسپ ہو گئی سید قطب کے مجاہد افغانستان اور لبنان میں بیٹھ کر نائن الیون کا انتظار کر رہے تھے جبکہ لیوسٹراس کے شاگرد کسی ایسی پرل ہاربر کی تلاش میں مصروف تھے جس کی آڑ میں وہ اسلامی دنیا پر حملہ کر سکیں اسی دوران 2000ء کے الیکشن ہوئے جارج بش جو نیئر صدر منتخب ہوئے اور ان کے ساتھ ساتھ لیوسٹراس کا سارا گروپ اقتدار میں آ گیا، ڈک چینی نائب صدر بن گئے، رمزفلڈ وزیر دفاع ہو گئے اور پال وولف وینر کو نائب وزیر دفاع کا عہدہ مل گیا یوں سید قطب اور لیوسٹراس کے شاگرد آئے سامنے کھڑے گئے اور دونوں کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگے اس کے بعد کیا ہوا یہ میں آپ کو کل بتاؤں گا۔ (کالم کا باقی حصہ اگلے صفحات میں ملاحظہ کیجئے)



اب کس کی باری ہے

اور پھر نائن الیون کا دن آ گیا۔ امریکہ کے ہوائی اڈوں سے چار جہاز اڑنے دو نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکرانے ایک واشنگٹن میں بیٹھا گان پر گر اور ایک وائٹ ہاؤس کی طرف بڑھا لیکن اسے راستے ہی میں گرا دیا گیا۔ سید قطب کے مجاہدین نے امریکہ کو جڑوں سے ہلا دیا۔ یہ آپریشن حزب اللہ عراق اور ایران تک کیلئے غیر متوقع تھا چنانچہ یہ تینوں ممالک فوری طور پر القاعدہ سے الگ ہو گئے 14 ستمبر کو صدر بٹش نے اس حملے کو ’صلیبی جنگ‘ قرار دے دیا اس وقت چھ اسلامی ملک افغانستان عراق شام ایران پاکستان اور سعودی عرب امریکہ کے ٹارگٹ تھے نائن الیون کے بعد دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو گئی نیو کنزرویٹوز آگے بڑھے اور انہوں نے صدر بٹش سے اسلامی دنیا پر حملہ کرا دیا۔ امریکی فوج نے افغانستان پر حملہ کیا اور افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ افغانستان کے بعد یہ لوگ عراق کی طرف بڑھے اور انہوں نے عراق میں کوئی بچہ چھوڑا کوئی عورت چھوڑی اور نہ ہی کوئی بزرگ۔ بٹش انتظامیہ میں وزیر خارجہ کولن پاول واحد شخص تھا جو ان حملوں کے خلاف تھا۔ اس نے کابینہ کے اجلاس میں ’کنزرویٹوز‘ کی مخالفت کی۔ یہ لوگ بھی کولن پاول سے خائف تھے لہذا دونوں کے درمیان ایک بار پھر جنگ چھڑ گئی۔ ان دنوں کولن پاول نے طلح کی صورت حال پر چند ایسے بیانات جاری کر دیئے جو امریکی پالیسی سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے ان بیانات کو ہوا بنا دیا جس کے نتیجے میں کولن پاول نے اعلان کر دیا وہ بٹش کے اگلے دور میں کابینہ کا حصہ نہیں بنے گا۔ بٹش کو یہ بیان برا لگا لہذا صدر نے 15 نومبر 2004ء کو کولن پاول سے استعفیٰ لے لیا اور اس کی جگہ ’نیو کنزرویٹوز‘ کی رکن کونڈولیزا رائس کو وزیر خارجہ بنا دیا جس کے بعد امریکہ کا تمام تر اختیار نیو کنزرویٹوز کے ہاتھ میں چلا گیا۔

عراق کے بعد شام اور ایران کی باری تھی لیکن 2005ء میں صدر بٹش کیلئے تین بڑے مسائل پیدا ہو گئے ایک امریکہ افغانستان اور عراق میں بری طرح چھس گیا دو یورپ سمیت پوری دنیا میں صدر بٹش کا امیج خراب ہو گیا اور یورپ روس اور جاپان نیو کنزرویٹوز پر انگلی اٹھانے لگے۔ بٹش کا خیال تھا یورپ مسلمانوں کے خلاف اس جنگ میں امریکہ کا کھل کر ساتھ دے گا لیکن مینڈر ڈاؤن لندن کے ہم دھماکوں کے باوجود یورپ نے عالم اسلام کے

خلاف اعلان جنگ نہ کیا اور تین صد برس اور نیکوز روئوز باقی اسلامی ممالک پر حملے کیلئے دفاعی بجٹ میں 40 فیصد اضافہ کرنا چاہتے تھے لیکن کانگریس نے ان کی درخواست مسترد کر دی چنانچہ اس صورتحال میں "نیکوز روئوز" اپنی پالیسی کی تشکیل نو پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے جنگ کے نئے فیز کیلئے اسرائیل اور بھارت کو "فرنٹ لائن سٹینس" بنانے کا فیصلہ کیا۔ آپ کیلئے یہ اطلاع حیران کن ہوگی لیوسٹراس کی "نیکوز روئوز" کے بااثر ارکان کی تعداد پچاس ہے اور ان پچاس ارکان میں سے 25 یہودی ہیں۔ نیکوز روئوز نے جون 2006ء میں شطرنج کے مہرے تبدیل کئے اور اسرائیل سے حماس پر حملے شروع کر دیئے 12 جولائی کی صبح اسرائیل کے دو فوجی اغواء ہوئے اور اسی شام اسرائیل نے لبنان پر بھی حملہ کر دیا۔ میں پچھلے ایک ماہ سے لبنان پر اسرائیلی حملوں کا مطالعہ کر رہا ہوں اور مجھے محسوس ہو رہا ہے ان اسرائیلی فوجیوں کا اغواء "نیکوز روئوز" کی چال تھی اور اس کا مقصد اسرائیل کو لبنان پر حملے کا جواز فراہم کرنا تھا۔ آج لبنان پر اسرائیلی حملے دوسرے سینے میں داخل ہو چکے ہیں۔ گزشتہ ایک ماہ کے دوران اسرائیل نے لبنان پر اڑھائی ہزار حملے کئے ہیں جن کے نتیجے میں پورا لبنان تباہ ہو گیا ہے لیکن حزب اللہ کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا کیوں؟ آج یہ سوال پوری دنیا کے سوچنے والوں کو حیران کر رہا ہے۔ ہم خوش فہم مسلمان اسے حزب اللہ کی کامیابی سمجھ رہے ہیں لیکن میرا خیال اس سے قدرے مختلف ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے اسرائیل اور امریکہ حزب اللہ کی اس "فتح" کی آڑ میں ایک خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں۔ امریکہ کا یہودی میڈیا دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے شام اور ایران حزب اللہ کو مسکری مالی اور افرادی قوت فراہم کر رہے ہیں اور حزب اللہ کے مجاہدین جو میزائل داغ رہے ہیں وہ انہیں ایران اور شام نے دیئے تھے یوں محسوس ہوتا ہے اسرائیل اس پروپیگنڈے کی آڑ میں شام اور ایران پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور اگر یہ حملہ ہو گیا تو امریکہ سے بھرپور عسکری اور سفارتی سپورٹ دے گا نیکوز روئوز کا ماضی اور موجودہ حالات بتاتے ہیں اگر اسرائیل اور لبنان کی یہ جنگ بند ہوگئی تو بھی آنے والے چند برسوں میں یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوگا اور امریکہ اسرائیل کو سامنے رکھ کر کبھی نہ کبھی ان دونوں ممالک پر ضرور حملہ کرے گا۔ شام اور ایران کے بعد یا شام اور ایران کے ساتھ ساتھ پاکستان اور سعودی عرب پر بھی مشکل وقت آسکتا ہے۔ امریکہ پاکستان کیلئے بھارت کو استعمال کر سکتا ہے پچھلے دو ماہ میں اس کے ہلکے ہلکے آثار بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ آپ اگر مئی 2006ء سے اگست 2006ء کے دوران پاک بھارت تعلقات میں آنے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو صورتحال واضح ہوتی نظر آئے گی۔ مئی 2006ء میں بھارت نے اچانک واویلا شروع کر دیا تھا "پاکستان میں اب بھی دہشت گردوں کے 59 ٹریننگ کیمپ چل رہے ہیں" جولائی میں ممبئی میں بم دھماکے ہوئے اور بھارت نے سیکرٹری خارجہ سطح کے مذاکرات معطل کر دیئے۔ بھارتی وزیراعظم نے پاکستان کو "گرم تعاقب" کی دھمکی دی اور 7 اگست 2006ء کو امریکہ کے نائب وزیر خارجہ رچرڈ ہاؤجر نے نئی دہلی میں بھارتی سیکرٹری خارجہ شیام سرن سے تین گھنٹے مذاکرات کئے اور ان مذاکرات کے بعد اعلان کیا "امریکہ بھارت کے ساتھ مل کر دہشت گردی کا مقابلہ کرے گا" ہاؤجر کے اس بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے شاید بھارت

پاکستانی علاقوں میں مجاہدین کے فرضی کیہوں پر حملے کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے اور امریکہ ان حملوں میں بھارت کی مدد کرے گا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے اگر خدا نخواستہ کبھی بھارت نے پاکستانی علاقوں پر حملے شروع کئے تو شاید امریکہ پاکستان کے ساتھ وہی سلوک کرے جو اس نے 1971ء کی جنگ میں کیا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے ایک طرف بھارت ہم پر حملے کرے گا اور دوسری طرف امریکہ ہمیں یہ یقین دہانی کراتا رہے گا "یہ حملے صرف شدت پسندوں کے خلاف ہیں اور حکومت پاکستان کو ان سے پریشان نہیں ہونا چاہیے" اور جب کبھی ہم "پریشان" ہونے کی کوشش کریں گے تو امریکہ ہمیں دھمکی لگا کر بخدا دے گا۔ ہو سکتا ہے میرا خدشہ سو فیصد غلط ثابت ہو لیکن اس کے باوجود دل ڈرتا ہے حالات سے محسوس ہوتا ہے شاید پاکستان کے بعد سعودی عرب "نیوکنزرویوز" کا ٹارگٹ بن جائے۔ یہ لوگ کوشش کریں گے حرمین شریفین اور سعودی حکومت کو الگ الگ کر دیا جائے تاکہ اسلامی دنیا اس حملے کو دو ریاستوں کا باہمی جھگڑا سمجھ کر خاموش رہے اور امریکہ سعودی جنگ "صلیبی جنگ" نہ بن سکے۔

یہ لیوسٹراس کے بیروکاروں کا منصوبہ ہے جبکہ سید قطب کے مجاہدین کیا سوچ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی کیا پلاننگ ہے سردست اسکے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن ایک بات طے ہے دنیا اس وقت دو شدت پسند گروہوں میں بری طرح پھنس چکی ہے۔ لیوسٹراس کے بیروکاروں کے پاس فوج طاقت اور ٹیکنالوجی ہے جبکہ سید قطب کے مجاہدین کے پاس ذہانت اور جذبہ ہے اور یہ بھی طے ہے یہ دونوں غیر متوازن لوگ ہیں اور یہ لوگ کسی بھی وقت دنیا کو اس انتہا تک لے جاسکتے ہیں جس کے بارے میں آئین سائنس نے ٹائمن گونی کی تھی "تیسری عالمی جنگ ایسی ہوگی اور اس کے بعد جو لوگ بچیں گے وہ پتھروں اور ڈنڈوں سے لڑا کریں گے"۔

اب ہم نیوکنزرویوز اور مجاہدین کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیتے ہیں لیکن یہ جائزہ ہم کل لیں گے۔



دوسرا راستہ بھی تھا

نوکز روٹوز اور مسلم مجاہدین میں چند چیزیں مشترک ہیں مثلاً دونوں شدت پسند ہیں، دونوں ایک دوسرے کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں اور دونوں دنیا کو مذہب میں تقسیم کرتے ہیں لیکن اس اشتراک فکر کے باوجود دونوں کے طرز عمل میں زمین آسمان کا فرق ہے، ہم اگر دونوں گروہوں کی 55 سالہ جدوجہد کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو محسوس ہوتا ہے نوکز روٹوز انتہائی چالاک، مکار اور منظم لوگ ہیں جبکہ مسلم مجاہدین انتہائی جذباتی، جلد باز اور غیر منظم ہیں۔ نوکز روٹوز ایک ٹیم کی طرح مل کر کام کرتے ہیں جبکہ مسلم مجاہدین کی ساری کوششیں انفرادی ہوتی ہیں۔ یہ ایک واضح اور قابل توجہ فرق ہے اور اس فرق کی وجہ سے ہمارے مجاہدین وہ نتائج حاصل نہیں کر سکے جو پچھلے 55 برسوں میں نوکز روٹوز نے حاصل کئے۔ نوکز روٹوز نے 1952ء میں محسوس کر لیا تھا انہیں کامیابی کیلئے بڑی فوج، بڑے پیمانے پر گولہ بارود اور اربوں کھربوں ڈالر چاہئیں اور وہ خواہ صدیوں تک کوشش کر لیں وہ چھوٹے سے چھوٹے اسلامی ملک کے برابر فوج جمع نہیں کر سکیں گے، وہ کسی ملک کے بجٹ کے برابر پیسہ اور کسی ٹریڈ فوج کے اسلحے کے برابر گولہ بارود جمع نہیں کر سکیں گے چنانچہ انہوں نے اپنے مقصد کے لئے دنیا کی سب سے بڑی فوج، سب سے جدید اسلحہ اور دنیا کا سب سے بڑا بجٹ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا، انہوں نے 1952ء میں فیصلہ کیا وہ کبھی نہ کبھی ہاؤس پنچینس گے۔ وہ امریکہ کا سارا اختیار اپنے ہاتھوں میں لیں گے اور اس کے بعد امریکہ کی ساری طاقت اپنے دشمن کے خلاف استعمال کریں گے، یہ لوگ اس فیصلے کے بعد 1952ء میں امریکہ کے جمہوری نظام میں داخل ہوئے، انہوں نے ری پبلکن پارٹی میں اپنی جگہ بنائی اور 55 برس بعد اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے وہ پوری دنیا کے ساتھ کھیل سکتے ہیں، ان لوگوں نے 55 برسوں میں اپنی نفرت کو ادارے کی شکل دے دی جبکہ اس کے مقابلے میں مسلم مجاہدین نے غیر جمہوری، غیر سیاسی اور غیر منظم راستے منتخب کئے، یہ لوگ اپنی اپنی حکومتوں سے ٹکراتے رہے، قید ہوتے رہے، جلاوطن ہوتے رہے اور اس کے بعد پوری دنیا میں تہا اور بے گھر ہو کر رہ گئے، آج یہ لوگ اسلامی دنیا کے ہیرو ہیں لیکن اس کے باوجود بے گھر اور بے یار و مددگار ہیں اور آج دنیا میں کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں جو انہیں پناہ دینے کے لئے تیار ہو لہذا یہ لوگ جنگوں، قاروں اور صحراؤں میں پھلتے

پھر رہے ہیں، اگر یہ لوگ بھی ”نیکوز نیوز“ کی طرح جمہوری راستہ اختیار کرتے، اگر یہ لوگ بھی مختلف اسلامی ممالک میں ہم خیال سیاستدانوں، دانشوروں اور بیوروکریٹس کی کھیپ تیار کرتے اور اگر یہ بھی خاموش انقلاب کے راستے کا انتخاب کرتے تو آج یہ لوگ نہ صرف 8 بڑے اسلامی ممالک میں برسرِ اقتدار ہوتے بلکہ ان ملکوں کی فوجیں، اہلِ بیعت اور تیل بھی ان کے قبضے میں ہوتا اور یہ لوگ ”نیکوز نیوز“ کو بڑے پیمانے پر پلٹ ٹائم دینے کے قابل ہوتے لیکن افسوس مسلمان مجاہدین میں سے ہر شخص نے انفرادی طور پر جہاد کا کریڈٹ لینے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ خود بھی تباہ ہو گیا اور اس نے عالم اسلام کو بھی ایک ایسی بزدلی میں دھکیل دیا جس کا ایک سراہندہ ہے اور دوسرے سرے پر ”نیکوز نیوز“ انٹیم بم لے کر بیٹھے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں شہادت ہر مسلمان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے لیکن دشمن کو شکست دے کر مرنے والے شہید اور دشمن سے شکست کھا کر جاں بحق ہونے والے شہید کے درجے میں بڑا فرق ہے۔ میں اگر صرف اپنی شہادت پر توجہ دوں۔ میں اگر اکیلا دشمن کے پورے بریگیڈ سے ٹکرا جاؤں، میں اگر خود شہید ہو جاؤں، میں اگر خود جنت میں چلا جاؤں اور اپنے پیچھے رہ جانے والے مسلمانوں کو فراموش کر دوں تو یہ بھی بڑی زیادتی ہوگی بد قسمتی سے ہمارے مجاہدین نے صرف اپنی جنت اور اپنی شہادت پر توجہ دی اور وہ افغانستان، عراق، لبنان، کشمیر اور فلسطین کے ان مسلمانوں کو بھول گئے جو ان کی شہادت کا تاوان ادا کر رہے ہیں، جن پر اسرائیل اور امریکہ نے عرصہ حیات تک کر دیا ہے۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا سید قطب سے تمہیں لوگوں نے اثر لیا تھا، امام خمینی، مولانا مودودی اور ایمن الظواہری۔ ایمن الظواہری کی ابتدائی زندگی سید قطب کے ساتھ گزری تھی اور انہوں نے سید قطب پر ہونے والے ظلم اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے شاید یہ ان مظالم کا نتیجہ تھا ایمن الظواہری نے آنے والی زندگی میں مشکل راستے کا انتخاب کیا اور انہوں نے چھاپہ مار جہاد کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا جبکہ ان کے مقابلے میں امام خمینی اور مولانا مودودی کا طرزِ عمل مختلف تھا، امام خمینی نے جہادی گروپ بنانے کے بجائے خاموش اور فکری انقلاب کا راستہ اختیار کیا، انہوں نے ایران کے عوام کو امریکہ پرست شاہ کے خلاف کھڑا کر دیا۔ ایران میں انقلاب آیا اور امام خمینی اقتدار تک پہنچ گئے۔ امام خمینی کا انقلاب آج تک قائم ہے چنانچہ آپ ایران کے بارے میں امریکہ کی پالیسی دیکھ لیجئے۔ امریکہ پچھلے 27 برس سے ایران کو دھمکیاں دے رہا ہے لیکن اس نے آج تک اس سے براہِ راست ٹکرائے کی جرات نہیں کی۔ کیوں؟ کیونکہ وہ جانتا ہے ایران کے انقلابیوں کے پاس فوج بھی ہے، تیل بھی، پیسہ بھی، لوگ بھی اور کسی حد تک ایٹم بم بھی۔ دوسری شخصیت جو سید قطب کے انکار سے متاثر ہوئی وہ مولانا مودودی تھے۔ مولانا نے جماعت اسلامی کی شکل میں ایک نیم سیاسی اور نیم مذہبی جماعت کی بنیاد رکھی اس جماعت نے ”نیکوز نیوز“ کی طرح دانشمندانہ راستہ اختیار کیا۔ گو جماعت اسلامی نے پاکستان میں بے شمار دانشور، ادیب، پروفیسر، بیوروکریٹس اور بزنس مین پیدا کئے لیکن اس کے باوجود یہ جماعت ملک میں کوئی بڑا سیاسی انقلاب نہ لاسکی۔ گزشتہ 58 برسوں میں جماعت کے بے شمار کارکنوں کو ایوانِ اقتدار تک پہنچنے کا موقع ملا لیکن کسی ”جینیاتی خرابی“ کے باعث اس کے

کارکنوں نے اقتدار کے ایوانوں میں پہنچ کر پارٹی بدل لی۔ آپ جاوید ہاشمی سے لے کر محمد علی درانی تک ان تمام سیاستدانوں کا ماضی دیکھ لیجئے جنہوں نے جماعت اسلامی کی کوکھ سے جنم لیا لیکن جب یہ لوگ اقتدار تک پہنچے تو یہ میاں نواز شریف کی پارٹی میں شامل ہو گئے یا پھر مشرب بہ مشرب ہو گئے۔ شاید یہی وہ خامی ہے جس کی وجہ سے جماعت اسلامی نیکوزروینوز جتنی طاقت حاصل نہ کر سکی لہذا ہم اگر سید قطب کے ان تینوں ”شاگردوں“ کی کامیابیوں کا جائزہ لیں تو ہمیں امام مبینی قدرے بہتر پوزیشن میں نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے اگر یہ لوگ 1950ء میں اسلامی دنیا کے 8 ملکوں کو فوکس کر لیتے اور مہاتیر محمد سے لے کر شیخ محمد بن راشد الخنومت تک مسلمانوں کے تمام مستقل حکمرانوں پر کام کرتے ”اگر یہ لوگ“ نیکوزروینوز کی طرح غیر محسوس طریقے سے ان تمام لوگوں کو اقتدار میں لے آتے جو ان کی فکر سے متاثر ہیں اور جو امت کے اتحاد اور غلبے پر یقین رکھتے ہیں تو آج صورتحال یکسر مختلف ہوتی، میرا خیال ہے اگر یہ لوگ دوسرا راستہ اختیار کرتے تو آج عالم اسلام کی یہ پوزیشن نہ ہوتی اور ہم آج دنیا میں یوں مار نہ کھا رہے ہوتے لیکن بد قسمتی سے ایسا نہ ہو سکا لہذا آج عالم اسلام نیکوزروینوز اور مجاہدین دونوں کے ہاتھوں نقصان اٹھا رہا ہے اور آج پوری دنیا شدید خطرات میں گھر چکی ہے۔

ہم اب آتے ہیں اس مسئلے کے حل کی طرف اس مسئلے کے دو حل ہیں ہمیں آپ کو یہ حل بتاؤں گا۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com



پسپائی کے پچاس سال

مغرب اور عالم اسلام کے اس تصادم کے تین مل ہیں، دنیا کے سارے عیسائی، یہودی، بودھ، ہندو اور کیمونسٹ بیک جنبش قلم مسلمانوں کے تمام مطالبات مان لیں، تمام قاصب تو میں فلسطین، کشمیر، چین، سنگاپور، عراق اور افغانستان مسلمانوں کے حوالے کرویں، اپنی فوجیں نکالیں، عالم اسلام سے معافی مانگیں، دونوں فریق مل کر دنیا کی حد بندی کر دیں اور اس کے بعد مغرب کی حد میں مسلمان داخل نہ ہوں اور اسلامی حدود میں کوئی گورا قدم نہ رکھے مگر یہ حل ممکن نہیں، کیوں؟ کیونکہ مسلمانوں سے متصادم تمام تو میں کئی گنا طاقتور ہیں اور طاقتور کبھی اپنا قبضہ نہیں چھوڑتا، دوسرا حل جہاد ہے، دنیا کے 61 اسلامی ملک اہل مغرب کے خلاف اعلان جہاد کر دیں، دنیا کے ایک ارب 45 کروڑ مسلمان استعمار کے خلاف کھڑے ہو جائیں، جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہو وہ ڈنڈا لے کر نکل آئے، جس کے پاس چھری ہو وہ چھری لے کر باہر آ جائے اور جس کے پاس پستول، بندوق، توپ اور اسلحہ ہم ہے وہ اسلحہ ہم اور پستول لے کر میدان میں کود پڑے، ہم سب مل کر دشت اور دریاؤں سے بحرہ ظلمات تک گھوڑے دوڑا دیں، ہم سب اپنے اپنے کافر ہمسایوں سے دست و گریبان ہو جائیں اور اس جنگ میں خود بھی مر جائیں اور دشمنوں کو بھی مار دیں لیکن ظاہر ہے یہ حل بھی ممکن نہیں، کیوں؟ کیونکہ اسلامی دنیا اب "امت" نہیں رہی، یہ 61 آزاد اور خود مختار ملک ہیں اور ہر ملک کے اپنے اپنے مفادات ہیں اور کوئی اسلامی ملک کسی برادر اسلامی ملک کیلئے اپنے مفادات کی قربانی دینے کیلئے تیار نہیں، مفادات کی حالت یہ ہے اسرائیل اور لبنان کی موجودہ جنگ میں جب مصر سے مداخلت کی اپیل کی گئی تو مصری صدر حسنی مبارک نے جواب دیا "مصری فوج مصر کی حفاظت کے لئے بنائی گئی تھی لبنان کیلئے نہیں" اسرائیل کے ارد گرد 22 اسلامی ممالک ہیں، اسرائیل نے ان میں سے 9 ممالک کی زمین پر قبضہ کر رکھا ہے لیکن یہ ممالک آج تک اس قبضے کے خلاف اٹھنے نہیں ہو سکے، حالت یہ ہے جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تھا تو پورے عالم اسلام نے امریکہ کی حمایت کی تھی، پاکستان نے اس جنگ میں امریکہ کو ہوائی اڈے فراہم کئے تھے جبکہ عربوں نے امریکہ کی طیاروں کو پٹرول دیا تھا۔ اسی طرح جب عراق پر حملہ ہوا تو سعودی عرب سمیت سارے عرب ممالک نے امریکہ کی مدد فرمائی تھی، امریکہ کی فوج پہلے سعودی عرب، ترکی اور کویت میں اتری تھی اور پھر وہاں سے

مارچ کرتی ہوئی عراق میں داخل ہوئی تھی لہذا جب صورتحال یہ ہو تو اجتماعی جہاد کا تصور ممکن نہیں ہوتا اور اب رہ گیا تیسرا حل تو اس حل کو ہم جاپانی حل کہہ سکتے ہیں۔

جاپان دوسری جنگ عظیم سے پہلے دنیا کی دوسری بڑی عسکری قوت تھا 1937ء سے لے کر 1945ء تک جاپان میں چھ سو مصنوعات تیار ہوتی تھیں اور اس میں ایک ہزار چار سو بیس تھے جاپانی فوجیوں کے بارے میں کہا جاتا تھا ان کے صرف دو مقصد ہوتے ہیں ”مار دو یا مر جاؤ“ کہا جاتا تھا ہسپائی اور واپسی جیسے لفظ جاپانی ڈسٹری میں شامل نہیں لیکن پھر جاپانیوں کی زندگی میں 6 اور 9 اگست آیا چھ اگست 1945ء کو صبح آٹھ بج کر 15 منٹ پر امریکی جہاز بی 29 نے ہیرو شیمیا پر پہلا ایٹم بم گرایا اس بم کا نام ”لٹل بوائے“ تھا اس بم نے 30 سینٹ میں ایک لاکھ 40 ہزار لوگوں کو لقمہ اجل بنا دیا جبکہ 80 ہزار لوگ زندگی بھر کیلئے معذور ہو گئے امریکہ نے 9 اگست کو صبح 11 بج کر 2 منٹ پر ناگاساکی پر دوسرا ایٹم بم گرایا اس ایٹم بم کا نام ”فیٹ مین“ تھا اور یہ بم 74 ہزار جاپانیوں کو نکل گیا ہیرو شیمیا اور ناگاساکی اس وقت جاپان کی ”بیک بون“ تھے چنانچہ دو دن میں دو بڑے شہروں کی تباہی اور دو لاکھ 14 ہزار لوگوں کی موت نے جاپان کو برباد کر دیا جاپان نے امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جس کے بعد امریکی جنرل میک آر تھر نے جاپان کی عنان اقتدار سنبھال لی اس وقت جاپان کا شہنشاہ ہیرو شیتو تھا جاپانی اپنے شہنشاہ کی اوتار کی طرح عزت کرتے تھے جنرل میک آر تھر نے بادشاہ کو اپنے دفتر بلایا اور اسے کئی گھنٹے دفتر کے باہر بٹھائے رکھا جاپانی اس واقعے کو تاریخ کا انتہائی ذلت آمیز واقعہ قرار دیتے ہیں لیکن پھر کیا ہوا جاپانی قوم نے اپنی ذلت اپنی نفرت اور اپنی شکست کو علم فن سائنس اور معیشت میں تبدیل کر دیا اس نے توپ اور فوج کے بغیر جنگ لڑنے کا اعلان کیا اور اس جنگ میں امریکہ سے بدلے لینے کا فیصلہ کیا جاپانی شہنشاہ ہیرو شیتو نے جاپانی قوم کو اپنا اطحا امریکی فوج کے حوالے کرنے کا حکم دیا جاپانی قوم نے اسی وقت اپنے تمام ہتھیار امریکہ کے حوالے کر دیئے اور وہ دن ہے اور آج کا دن ہے جاپان کے کسی شہری نے بندوق اور پستول کو چھو کر نہیں دیکھا شہنشاہ نے جاپان میں فوج کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور یہ قانون پاس کر دیا جاپان اپنے دفاع پر پی این پی کا صرف ایک فیصد خرچ کرے گا۔ 1945ء میں جاپان میں فوجی گاڑیاں بنانے والی 11 اور فوج کے لئے برقی آلات بنانے والی 2 کمپنیاں تھیں ہونڈا انیسان اور ایسوز فوجی ٹرک بناتی تھیں جبکہ ہنایچی اور تو شیمیا بموں کے لیوز اور توپوں کے ٹرانسپائر تیار کرتی تھیں اس وقت نوکیو میں مشین گن اور رائفلیں بنانے کے 21 کارخانے تھے جاپانی قوم نے ان کو گاڑیاں سلائی مشینیں کیمرے دوربینیں ریڈیو ٹیلی ویژن اور گھڑیاں بنانے کی فیکٹریوں میں تبدیل کر دیا حکومت نے نوکیو شہر میں ایک سو بڑی یونیورسٹیوں اور ٹیکنیکی کالجوں کی بنیاد رکھی آج ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد ایک ہزار ہو چکی ہے جاپانی قوم نے بچت ایکسپورٹ اور ویلفیئر کو اپنی بنیاد بنایا جاپان کا ہر شہری اپنی آمدنی کا دس فیصد بینک میں جمع کراتا تھا بینک یہ رقم حکومت کو دیتے تھے حکومت اس سے فیکٹریاں لگاتی تھی ان فیکٹریوں کی 70 فیصد پیداوار برآمد کی جاتی تھی اور اس سے جو زر مبادلہ ملتا تھا اسے ہتھیار بنانے اور ہتھیار بنانے والی

تھا، جاپان نے قانون بنایا اگر اس کی کسی فرم میں سولما زمین کی گنجائش ہے تو اس فرم میں ہر وقت سولمازم پورے رہیں گے، جس فرم میں ایک آدھ پوسٹ خالی رہ جاتی حکومت اسے بھاری جرمانہ کر دیتی، جاپان نے جاپانی معاشرے کو دلفیئر سوسائٹی کی شکل دی، اس دلفیئر سوسائٹی میں عوام کی فلاح و بہبود حکومت کی بجائے لوگوں کا کام تھا، لوگوں نے یہ ذمہ داری خوب نبھائی لہذا 1980ء میں جاپان دنیا کی دوسری بڑی معیشت بن گیا، جاپان کی گھڑیوں، کیمروں، ریڈیو، ٹی وی، گاڑیوں اور کمپیوٹروں نے پورے امریکہ کو شکست دے دی، لوگ ہارورڈ کی بجائے ٹوکیو یونیورسٹی میں داخلہ لینے لگے اور امریکی صدر کے ٹائم چینسنگ کے نیچے میڈان جاپان کی مہر لگ گئی۔ یہ وہی جاپان تھا جس میں دوسری جنگ عظیم کے بعد 30 لاکھ شخصیں بڑی تھیں اور جس کے پاس ان نعشوں کے لئے کفن تک نہیں تھا۔ جاپان کی یہ ترقی صرف ایک فیصلے کی مرہون منت تھی، جاپان نے 1945ء میں فیصلہ کیا تھا امریکہ کے پاس ایٹم بم ہے لہذا اگر اس نے زندہ رہتا ہے تو اسے اپنے جذبے اپنی نفرت اور اپنے انتقام کی شکل بدلنا ہوگی اور اسے مغرب کے اس نازک حصے پر ضرب لگانا ہوگی جہاں سے وہ بچ نہ سکے اور اس وقت مغرب کا وہ نازک حصہ معیشت، ٹیکنسری اور تعلیم تھی، جاپان نے اپنے انتقام کو ٹوکیو یونیورسٹی، ہونڈا، ٹیوٹا، نیسان، مردا، سونی، تو شیا، ہیاچی اور نوکیو سٹاک ایکسچینج کی شکل دے دی لہذا آج جاپان فوج، گولی اور توپ کے بغیر دنیا کا سب سے بڑا قاتل ہے اور آج پوری دنیا جاپان کے سامنے سرنگوں ہے۔

مغرب اور عالم اسلام کی جنگ کا تیسرا حل جاپان کا یہ ماڈل ہے، اگر ہم پچاس برس کے لئے پسپائی اختیار کر لیں، اگر ہم پچاس سال کیلئے اپنے کشمیر، فلسطین اور چین یا کو بھول جائیں، اگر ہم پچاس سال کے لئے اہل مغرب کی طاقت کو تسلیم کر لیں اور اگر ہم اپنے دکھ اپنی شکست، اپنی تکلیف اور اپنی ذلت کو ظلم، ٹیکنالوجی اور ٹیکنسری کی شکل دے دیں، اگر ہم پچاس سال کے لئے گولہ بارود، بم اور فوج پر پابندی لگا دیں اور اگر ہم پچاس سال کیلئے اپنے جہاد کو ظلم اور درس گاہ کی شکل دے دیں، اگر آج ہمارے فدائی، ہمارے خود کش حملہ آور فیصلہ کر لیں انہوں نے کسی امریکی نینک سے ٹکرانے کی بجائے اپنی جان لیبارٹری اور لائبریری میں دینی ہے اور اگر ہم آج یہ فیصلہ کر لیں، ہم جو رقم جنگوں اور گولہ بارود پر خرچ کرتے ہیں ہم نے آج سے وہ رقم یونیورسٹیوں اور تجربہ گاہوں پر استعمال کرنی ہے اور ہم نے اس سے علم اور ٹیکنالوجی حاصل کرنی ہے تو یقین کیجئے ہماری پسپائی کے یہ پچاس سال ہمیں فتح کی اس انتہا تک لے جائیں گے جہاں ساری قومیں ہمارے منحنوں تک رہ جائیں گی، جاپانی قوم کے بارے میں میک آرتھر نے کہا تھا، "ان کے غصے نے انہیں 35 برس میں وہاں پہنچا دیا جہاں امریکہ دو سو سال میں پہنچا تھا" مجھے یقین ہے اگر ہم بھی اپنی نفرت کا رخ موڑ لیں تو ہم پچاس برسوں میں وہاں پہنچ جائیں گے جہاں مغرب پانچ سو سال میں پہنچا تھا۔

نوٹ: یہ پانچ کالموں کے سلسلے کا آخری کالم ہے، یہ سلسلہ 10 اگست کو "یہ جنگ کیسے شروع ہوئی" کے کالم سے شروع ہوا، اگر آپ ان پانچ کالموں کو اکٹھا پڑھیں تو آپ کو سلسلہ سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

بادشاہوں کی غلطیاں

تیمور لنگ کا تعلق سمرقند سے تھا، وہ سمرقند کے قریب ایک گاؤں کیش میں پیدا ہوا، اس کے والدین معمولی درجے کے زمیندار تھے، وہ جوان ہوا تو وہ سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو گیا، چند ماہ بعد اس نے سپہ سالار کو قتل کر دیا اور فوج کی عثمان سنبال لی، یہ ایک چھوٹے درجے کے امیر کی فوج تھی، بادشاہ تیمور کی خدا داد صلاحیتوں سے ڈر گیا اور اس نے تیمور سے جان چھڑانے کی کوششیں شروع کر دیں، تیمور کو امیر کی سازشوں کی بھنگ پڑ گئی لہذا اس نے امیر سے جان چھڑائی اور وہ بادشاہ بن گیا، یہ اس کی پہلی بادشاہت تھی اس کے بعد وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اور اس نے آدمی دنیا سوس میں روند دی۔ 1403ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو وہ فاتح عالم اور تیموردی گریٹ بن چکا تھا۔

تیمور تاریخ کا ایک انتہائی دلچسپ کردار تھا، وہ حافظ قرآن تھا، وہ قرآن مجید کو اناس سے الگ تک الٹ پڑھ سکتا تھا، وہ دونوں ہاتھوں سے یکساں طاقت سے لڑتا تھا، وہ انتہائی خونخوار تھا، وہ جو ملک فتح کرتا تھا اس کے تمام مردوں کو زندہ کر دیتا تھا، عورتوں کو لوٹ لیا اور بچوں کو غلام بنا لیتا تھا اور سارے شہر جلا کر رکھ دیتا تھا، وہ چنگیز خان کی طرح کھوپڑیوں کے مینار بھی بناتا تھا، اس ظلم و ستم کے ساتھ ساتھ وہ علم اور فن کا بھی بڑا شیدائی تھا، وہ فاتح کی حیثیت سے جس شہر میں داخل ہوتا تھا وہ اس کے تمام عالموں، فاضلوں اور ماہرین فن کو امان دے دیتا تھا، وہ جنگ کے بعد ان عالموں کے ساتھ مناظرہ کرتا تھا، ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتا تھا اور انہیں بھاری مراعات دے کر اپنے شہر ”سبز“ بھجواتا تھا جہاں انہیں تامل و شاعرانہ روٹینڈ دیا جاتا تھا، اس کی جنگ کا طریقہ بھی انتہائی دلچسپ تھا، وہ اپنے ہدف ملک کے بادشاہ کو اطاعت قبول کرنے کی پیش کش کرتا تھا، اگر بادشاہ یہ پیشکش مسترد کر دیتا تھا تو وہ اس ملک پر حملہ کر دیتا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا تھا، فتح کے بعد وہ اپنے سپاہیوں کو لوٹ مار اور قتل و غارت کی کھلی چھٹی دے دیتا تھا، سپاہی کئی دنوں تک قتل کرتے اور لوٹتے رہتے تھے، جب ان کا دل بھر جاتا تھا تو تیمور شہر کو آگ لگانے کا حکم دے دیتا تھا، سارا شہر اکھڑا، میر جانا تھا، تیمور نے اپنی زندگی میں 54 ملک فتح کئے، امیر تیمور نے اپنی آپ بیتی بھی لکھی تھی، اس کتاب کا شمار دنیا کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے، یہ کتاب ترکی زبان میں لکھی گئی لیکن یہ سب سے پہلے فرانسیسی میں شائع ہوئی اور اس کے بعد دنیا کی 70 سے زائد زبانوں میں

اس کا ترجمہ ہوا 'اردو میں یہ کتاب "میں ہوں تیمور" کے ٹائٹل سے شائع ہوئی یہ میری زندگی کی چند بڑی کتابوں میں شمار ہوتی ہے' میں نے جب پہلی بار یہ کتاب پڑھنا شروع کی تو میں تیموری شخصیت کا گرویدہ ہو گیا "دو مجھے عزم و ہمت اور جذبے کا ایک ایسا اہالیہ محسوس ہوا جس کے قدموں میں پہنچ کر دنیا کی ہر چیز چھوٹی ہو جاتی تھی لیکن جب میں نے یہ کتاب ختم کی تو میں نے محسوس کیا میرا تیمور اور اس کے مفتوحہ بادشاہوں کے درمیان اتنا بھادری اور کشور کشائی کی جنگ تھی 'دونوں بادشاہ ایک دوسرے کو مات دینا چاہتے تھے تیمور تاریخ میں فاتح عالم کہلاتا تھا بتاتھا جبکہ دوسرے بادشاہ اس کے ارادوں کی راہ میں رکاوٹ بن رہے تھے یوں دو بادشاہوں کی اتنا آپس میں ٹکرائی اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ہزاروں لاکھوں لوگ مارے گئے ہزاروں لاکھوں عورتیں عصمت سے محروم ہوئیں' لاکھوں بچے یتیم ہو کر غلام بنے اور سینکڑوں نابالغ روزگار شہر پیوند خاک ہو گئے' میں نے جب یہ کتاب پڑھی تو میں نے سوچا بادشاہوں کی اس لڑائی میں ان لوگوں کا کیا قصور تھا' ان بے گناہ لوگوں نے کیا جرم کیا تھا' مجھے آج تک اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا' اس سوال کے بعد میں نے تاریخ عالم کا نئے زاویے سے مطالعہ شروع کیا تو میں نے دیکھا محمود غزنوی بچے پال سے آ کر آیا لیکن اس کا نقصان ہندوستان کے ان ہزاروں بے گناہ شہریوں نے اٹھایا جنہوں نے یہ جنگ چھیڑی تھی اور نہ ہی وہ یہ جنگ روک سکتے تھے' ظہیر الدین بابر اور ابراہیم لودھی دونوں مسلمان تھے دونوں کی اتنا ٹکرائی اور لاکھوں معصوم لوگ مارے گئے' ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی لڑائی میں بھی ہزاروں لاکھوں بے گناہ کام آئے اور آج کی تاریخ میں صدر بٹش اور ملا امر کی جنگ کا نقصان بھی لاکھوں بے گناہ افغان اٹھارے ہیں' اسی طرح بٹش اور صدام حسین کی لڑائی کا نقصان بھی عراقی شہری اٹھارے ہیں' میں نے سوچا امریکہ اور عراق کی جنگ کے دوران صدام حسین نے عوام سے رائے لی تھی اور نہ ہی اسامہ بن لادن اور امریکی تہذیب کے ٹکراؤ میں کسی نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے بے گناہوں اور معصوم لوگوں سے ریفریٹم کرایا تھا' ہمارے صدر پرویز مشرف نے بھی رچرڈ آربٹج کے "مشورے" پر عمل کرتے ہوئے پاکستان کے پندرہ کروڑ لوگوں سے پوچھا تھا اور نہ ہی ملا عمر نے امریکی جہازوں کو بمباری کی دعوت دینے سے پہلے عوام کو اعتماد میں لیا تھا' مجھے محسوس ہوا دنیا کی تمام جنگیں دو طاقتور لوگوں کا فیصلہ ہوتی ہیں لیکن اس کا نقصان ہمیشہ عوام اٹھاتے ہیں' دوسری جنگ عظیم نظر اور چرچل کی لڑائی تھی لیکن اس کا نقصان دو کروڑ معصوم اور بے گناہ لوگوں نے اٹھایا' 1945ء میں ہیرو پینٹن نے امریکی دھمکی کو سنجیدگی سے نہیں لیا لیکن ان کی غیر سنجیدگی کے نتیجے میں ہیرو شیمان اور ناگاساکی کے وہ بے گناہ لوگ مارے گئے جنہوں نے یہ جنگ چھیڑی تھی اور نہ ہی وہ اسے روکنے کی قدرت رکھتے تھے' میں جوں جوں تاریخ کو اس زاویے سے پڑھتا گیا مجھے یہ قدرت کی حتم ظریفی بلکہ ظلم محسوس ہونے لگا لہذا میں نے ایک دن اپنے ایک دوست سے اس کا ذکر کیا تو اس نے سنجیدگی سے جواب دیا "قدرت عوام کو اس کی غفلت اور بے بسی کی سزا دیتی ہے" میں نے پوچھا "وہ کیسے" وہ یوں "قدرت ایسے مظالم کے ذریعے لوگوں سے پوچھتی ہے تمہارے اوپر نظر جیسے نیم پائل لوگ حکومت کر رہے تھے لیکن تم لوگ خاموش رہے اور نہ اسے روکا" "میں نے سوچا کہ...

اختلاف تھا لیکن میں نے بحث کسی اچھے وقت پر چھوڑ دی۔

میں نے گزشتہ روز طالبان کے ترجمان عبدالحمید مصلحین کا ایک بیان پڑھا اس بیان میں انہوں نے فرمایا ”پاکستان طالبان کا دشمن ہے پاکستان امریکہ کا اتحادی ہے لہذا وہ ہمارے لئے اتنا ہی برا ہے جتنی افغانستان کی کٹھ پتلی حکومت“ عبدالحمید مصلحین کا یہ بیان بھی تیمور سوچ کا تسلسل ہے پاکستان نے 1994ء میں جب طالبان کا ساتھ دیا تھا تو اس وقت کے حکمرانوں نے عوام سے مشورہ کرنا گوارا نہیں کیا تھا اور جب 2001ء میں حکومت پاکستان نے یوٹرن لیا تھا تو اس وقت بھی حکومت کے کسی کارندے نے لوگوں سے رائے نہیں لی تھی، پہلی مرتبہ یہ فیصلہ جنرل نصیر اللہ باہر نے کیا تھا اور دوسرا فیصلہ جنرل پرویز مشرف نے کیا تھا لیکن دونوں مرتبہ پاکستان کے بے گناہ اور معصوم لوگوں نے ان فیصلوں کا تادان ادا کیا، دونوں مرتبہ عام لوگ اس فیصلے کی زد میں آئے، اگر ہم ڈراما سکرینی میں جا کر دیکھیں تو 1979ء میں افغانستان میں جہاد کا فیصلہ بھی پاکستان کے عوام نے نہیں کیا تھا، یہ فیصلہ جنرل ضیاء الحق نے اپنے ناجائز اقتدار کو جائز بنانے کیلئے کیا تھا لیکن اس کا تادان پاکستان کے عوام کلاشکوف اور ہیردوین کی شکل میں آج تک دے رہے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کو اس فیصلے کے ذریعے مارگر شہنشاہت مل گئی لیکن ہزاروں پاکستانی عوام بم دھماکوں میں مارے گئے اور پاکستان شیعہ اور سنی میں تقسیم ہو گیا اور اس تقسیم کے نتیجے میں آج پاکستان میں مسجد محفوظ ہے اور نہ ہی امام بارگاہ جنرل ضیاء الحق کی سنت پر عملدرآمد کرتے ہوئے جنرل پرویز مشرف نے 2001ء میں اس فیصلے کو آگ لگا دی جو ہماری انجینئریوں نے 1994ء میں بوئی تھی اور 2001ء تک پہنچ کر جس نے پھل دینا شروع کر دیا تھا جنرل پرویز مشرف کے اس فیصلے سے انہیں امریکہ کے پہلو میں جیکل مٹی لیکن پاکستانی عوام خطرات کا شکار ہو گئے اور ان پر خودکش دھماکے ہونے لگے وہ مسجدوں، امام بارگاہوں اور بازاروں میں مرنے لگے یہاں تک کہ آج طالبان نے بھی پاکستان کو دشمن ڈیکلیر کر دیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے جس طرح افغانستان میں اتحادی فوجوں پر حملے ہو رہے ہیں چند ماہ بعد پاکستان میں بھی ایسی ہی صورتحال پیدا ہو جائے گی، اگر خدا نخواستہ پاکستان میں ایسی صورتحال پیدا ہوگی تو مجھے یقین ہے اس صورتحال کے سوجد تو آرام سے زندگی گزارتے رہیں گے لیکن ہم بے گناہ لوگ ایک بار پھر مرنا شروع ہو جائیں گے۔ کسی ستم ظریف نے کیا خوب کہا تھا ”بادشاہوں کی غلطیوں کا کفارہ عوام ادا کرتے ہیں“۔ ہمارے بادشاہ جو کچھ کر رہے ہیں مجھے خطرہ ہے ہماری آنے والی کئی نسلیں اس کا کفارہ ادا کریں گی۔



67 لاکھ شتر مرغ

حسن کا تعلق غزہ سے تھا، اس کے والد سرکہ مانتے تھے، اس کی والدہ اور بہنیں یہ سرکہ بوتلوں میں بھرتی تھیں، ان بوتلوں پر لیبل لگاتی تھیں اور یہ لوگ یہ بوتلیں شام بھجوادیتے تھے، شام میں سرکہ کی بہت مانگ تھی، اس کام میں انہیں بچت ہو جاتی تھی، یہ لوگ اسن پسند تھے، یہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے لیکن 1993ء میں ایک دن حسن کے والد غائب ہو گئے، وہ آخری بار غزہ کی اسرائیلی چیک پوسٹ پر دیکھے گئے تھے، حسن نے اسرائیلی فوج کے کرنل سے رابطہ کیا، اس نے تصویر دیکھی اور یہ تصویر رزی کی نوکری میں پھینک کر بولا ”میں اس شخص کو نہیں جانتا“ حسن نے کرنل کے رویے پر احتجاج کیا، کرنل نے گاڈ ز کو اشارہ کیا اور اسرائیلی فوجیوں نے حسن کو بار بار کراہہ مولا کر دیا، حسن ٹوٹا ہوا اور پھٹا سر لے کر واپس آیا تو اس کے گھر میں صف ماتم بچھ گئی، اس کے بعد حسن کے اندر جنگ شروع ہو گئی وہ اس تزیل کا بدلہ لینا چاہتا تھا، جس دن اس نے چار پانی سے نیچے قدم رکھا اس دن وہ ”دہشت گرد“ بن گیا، وہ غزہ سے بیروت گیا اور وہاں اس نے حزب اللہ جوائن کر لی، پچھلے تیرہ برسوں میں حسن نے یہودیوں کے خلاف بے شمار آپریشن کئے، ان آپریشنوں میں اس نے اسرائیل کو شدید نقصان پہنچایا، وہ اس وقت بھی بیروت میں ہے اور بیروت کے کسی خفیہ مقام سے اسرائیلی فوج پر چھوٹے سائز کے میزائل داغ رہا ہے۔

حزب اللہ حسن جیسے مجاہدین کی ایک چھوٹی سی جماعت ہے، اس کے 95 فیصد ارکان نے کسی فوجی اکیڈمی سے ٹریننگ حاصل نہیں کی، یہ لوگ حسن کی طرح نفرت اور ذلت کی آگ میں جلے، جل جل کر کھڑے رہنے اور انہوں نے اسرائیل اور اس کے حواریوں پر عرصہ حیات تک کر دیا، 1993ء میں امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے بین الاقوامی دہشت گرد تنظیموں کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی تھی، اس رپورٹ میں انکشاف ہوا کہ حزب اللہ کے کل مجاہدین کی تعداد پانچ سے دس ہزار ہے اور ان میں صرف 300 سے 400 لڑاکا مجاہدین ہیں۔ 2003ء میں دہشت گردوں کے بارے میں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے دوسری رپورٹ جاری کی تھی اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ حزب اللہ کے کل مجاہدین کی تعداد تین ہزار سے زائد نہیں، جنوبی لبنان میں یہ لوگ صرف ایک ہزار ہیں اور ان میں بھی کل قریباً 300 مجاہدین صرف 300 ہیں، رپورٹ میں انکشاف ہوا یہ لوگ کبھی کسی ریگولر آرمی کا حصہ

نہیں رہے اور ان کی اہلیت صرف ہلکے پھلکے ہتھیاروں تک محدود ہے، اب ہم ان دونوں روپوں کو سامنے رکھ کر لبنان، فلسطین اور اسرائیل کی موجودہ جنگ کا تجزیہ کرتے ہیں، ہم فرض کرتے ہیں حزب اللہ کے مجاہدین کی تعداد دس ہزار ہے اور یہ دس ہزار نوجوان کسی ریگولر آرمی کا حصہ نہیں ہیں، ان کے پاس ٹینک ہیں، مشین گنیں ہیں اور ندی اہٹم بم ہیں لیکن اس قلیل تعداد اور بے سرو سامان نوجوانوں نے پچھلے 20 برس سے اس اسرائیل کا ناخفہ بند کر رکھا ہے جس کے پاس ایک لاکھ 75 ہزار ریگولر آرمی اور 4 لاکھ 30 ہزار یزید فوج ہے اور جس کا دفاعی بجٹ 11 بلین ڈالر ہے اسرائیل کے پاس 3800 ٹینک دس ہزار تو ہیں اور 2105 لڑاکا طیارے بھی ہیں لیکن یہ غیر تربیت یافتہ نوجوان اسرائیل کی انتہائی تربیت یافتہ فوج کو لے کر بیٹھ گئے ہیں یہ غیر تربیت یافتہ نوجوان ایک حملے میں اسرائیل کے چھپوس چھپوس فوجی ہلاک کر دیتے ہیں اور اسرائیل ان دس ہزار نوجوانوں سے چھٹکارے کیلئے امریکہ سمیت دنیا کی دس بڑی طاقتوں سے مدد لینے پر مجبور ہے۔ یہ اس جنگ کا ایک پہلو ہے۔

آپ جنگ کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ کیجیے، اس وقت دنیا میں 161 اسلامی ممالک ہیں، ان 61 ممالک میں ایک ارب 47 کروڑ 62 لاکھ 33 ہزار 4 سو 70 مسلمان آباد ہیں اور ان 161 اسلامی ممالک میں سے 56 ملکوں کے پاس ریگولر فوجیں ہیں اگر ان 56 ممالک کی فوجوں کو ملایا جائے تو ان کی تعداد 66 لاکھ 76 ہزار 5 سو 60 فوجی ہو جاتی ہے، یہ 56 ممالک ہر سال اپنی فوجوں پر مجموعی طور پر 76 بلین 9 سو 50 ملین ڈالر خرچ کرتے ہیں، ان ممالک میں سعودی عرب کا دفاعی بجٹ 21 بلین 8 سو 76 ملین ڈالر ہے، ترکی کا عسکری بجٹ سواں بلین ڈالر، ایران کا پونے چھ بلین ڈالر، پاکستان کا ساڑھے تین بلین ڈالر، کویت کا سوا تین، انتھویا کا سوا تین، الجیریا کا تین، مصر کا پونے تین اور مراکش، عمان اور قطر کا دو، دو بلین ڈالر ہے لیکن آپ اتہاد کیسے حزب اللہ کے تین سو سے دس ہزار مجاہدین نے اسرائیل اور امریکہ سمیت دنیا کی دس بڑی فوجوں کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے جبکہ 66 لاکھ 76 ہزار 5 سو 60 فوجیوں اور دو سو اہٹم بلین ہزاروں میزائلوں، راکٹوں، ٹینکوں اور توپوں کے مالک 161 اسلامی ممالک اسرائیل کے سامنے دم سادھ کر بیٹھے ہیں، پورا یورپ اور امریکہ مکمل کر اسرائیل کی حمایت کر رہا ہے، امریکہ سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی قرارداد کو وٹو کر چکا ہے، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور روس اسرائیل کو حق بجانب قرار دے رہے ہیں، اسرائیل امریکی راکٹوں میں امریکی گولیاں بھر کر فلسطینی اور لبنانی مسلمانوں کو نشانہ بنا رہا ہے، پورے لبنان میں اس وقت فٹنسیں بکھری پڑی ہیں، لبنان کے پانچ شہروں کی 70 فیصد عمارتیں زمین بوس ہو چکی ہیں، بیروت میں پچھلے پانچ دنوں سے مسجدوں میں اذانیں نہیں ہوئیں اور لوگ بمباری کی وجہ سے مردوں کو کنکن کے بغیر دفن کرنے پر مجبور ہیں لیکن پورا عالم اسلام اس ظلم پر خاموش ہے، کسی اسلامی ملک نے اب تک سرکاری سطح پر امریکہ اور اسرائیل کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا اور کسی اسلامی ملک نے اپنی فوج بیروت بھگانے کا فیصلہ نہیں کیا، حد ملاحظہ کیجیے اسرائیل کے جو طیارے لبنان اور فلسطین پر حملے کر رہے ہیں، اس کے جو ٹینک اور جوتہیں لبنان کے مسلمانوں پر بمباری کر رہی ہیں ان میں سعودی عرب اور امارات کا تیل استعمال ہو رہا ہے،

اسرائیل کو اس جنگ کیلئے جو بینک پیسے دے رہے ہیں ان بینکوں میں عربوں کے شیئرز ہیں، آپ حد ملاحظہ کیجئے اس وقت اسلامی دنیا میں 30 ہزار ملٹی بیٹھل کمپنیاں کام کر رہی ہیں، ان 30 ہزار ملٹی بیٹھل کمپنیوں میں سے 21 ہزار کمپنیوں کے مالک یہودی ہیں اور یہ تمام یہودی اس جنگ میں اسرائیل کو مالی امداد دے رہے ہیں لیکن کسی اسلامی ملک نے ان ملٹی بیٹھل کمپنیوں کو ملک سے نکلنے کا حکم نہیں دیا یہ اس جنگ کا دوسرا پہلو ہے۔

اس جنگ کا تیسرا پہلو اس سے بھی خوفناک ہے پوری دنیا جانتی ہے چھ اسلامی ممالک امریکہ کے ہارگٹ ہیں، یہ اسلامی ملک افغانستان، عراق، ایران، شام، پاکستان اور سعودی عرب ہیں، امریکہ افغانستان اور عراق کو نشانہ بنا چکا ہے وہ اب اسرائیل کے ذریعے شام اور ایران کو نشانہ بنائے گا اس کے بعد وہ بھارت کے ذریعے پاکستان پر حملہ کرے گا اور آخر میں وہ تیل کی قیمتوں کا بہانہ بنا کر سعودی عرب کو ہارگٹ بنائے گا، پوری دنیا جانتی ہے امریکہ پہلے ڈاکٹر عبدالقدیر کو بنیاد بنا کر پاکستان کے ایٹمی پلانٹ پر قبضہ کرے گا اور اس کے بعد بھارت اسرائیل کے مسائل میں پاکستان میں لشکر طیبہ کے ٹھکانوں پر بمباری شروع کر دے گا، پوری اسلامی دنیا جانتی ہے امریکہ دنیا میں تیل کی قلت اور تیل کی قیمتوں میں اضافے کو سعودی عرب کے خلاف جنگ کا جواز بنائے گا اور پوری اسلامی دنیا جانتی ہے لبنان کی یہ جنگ صرف بیروت تک محدود نہیں رہے گی یہ جنگ ہر اس اسلامی ملک تک پھیل جائے گی جس میں ذرا سی بھی غیرت اور ایمان باقی ہوگا لیکن اس کے باوجود کوئی اسلامی ملک سر اٹھا کر نہیں دیکھ رہا، کوئی اسلامی ملک اس آگ کو داپس اسرائیل میں نہیں دیکھتا۔ 169 اسلامی ملک شتر مرغ کی طرح اپنی گردن ریت میں دبا کر بیٹھے ہیں۔ پوری دنیا جانتی ہے یہ جنگ کبھی نہ کبھی پاکستان ضرور پہنچے گی، عالم اسلام کو کبھی نہ کبھی اس مصلحت، اس خاموشی اور اس ناعاقبت اندیشی کی قیمت ادا کرنا پڑے گی پوری دنیا جانتی ہے آج جو لوگ چٹان پر بیٹھ کر جس سیلاب کا نظارہ کر رہے ہیں وہ سیلاب کبھی نہ کبھی ان کی دہلیز تک بھی پہنچے گا اور جو لوگ جس آگ کو پرانے گھر کی آگ سمجھ رہے ہیں وہ آگ کبھی نہ کبھی ان کے گریبان بھی راکھ کرے گی عجیب بات ہے 300 نوجوان پوری دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے ہیں اور 167 لاکھ شتر مرغ ریت کے مورچے میں چبے بیٹھے ہیں۔



سکھ فوج

رنجیت سنگھ سکھوں کی تاریخ کا پہلا حکمران تھا، وہ 13 نومبر 1780ء میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوا، اس کا والد مہان سنگھ چھوٹی سی "مثل" کا سردار تھا، ان دنوں پنجاب میں جاگیریں اور چھوٹی سرداریاں مثل کہلاتی تھیں، رنجیت سنگھ پر بچپن میں چچک کا حملہ ہوا اور وہ اس کی ایک آنکھ لے گئی، بارہ سال کی عمر میں وہ اپنی مثل کا سردار بن گیا، وہ ایک مہم جو انسان تھا، وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا، اس وقت لاہور پر تین سکھ سردار قابض تھے، رنجیت سنگھ نے لاہور کے مسلمانوں سے خفیہ رابطے قائم کئے، مسلمانوں نے اسے لاہور بلایا اور شہر اس کے حوالے کر دیا، اس نے سکھ سرداروں کو مار بھگا دیا اور لاہور پر قابض ہو گیا، اس وقت اس کی عمر صرف 19 برس تھی، 1802ء میں اس نے امرتسر پر بھی قبضہ کر لیا، 1806ء میں اس کا انگریزوں کے ساتھ پہلا معاہدہ ہوا، جس کے بعد وہ وسطی، جنوبی اور شمالی پنجاب کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس نے چند ہی برسوں میں گجرات، ڈسکہ، سیالکوٹ، شیخوپورہ، جھنگ، چنیوٹ، خوشاب، ملتان، راولپنڈی، ڈیرہ اسماعیل خان، ہزارہ، پشاور اور کشمیر کو اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا، 1809ء میں انگریزوں نے اسے دریائے ستلج کے پار پنجاب کا حکمران مان لیا اور وہ پنجاب کا پہلا سکھ حکمران بن گیا۔

1831ء کا سال راجہ رنجیت سنگھ اور سکھ سرکار کی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اس سال اکتوبر میں رنجیت سنگھ کی ہندوستان کے انگریز گورنر جنرل ولیم ہیکل سے ملاقات ہوئی، رنجیت سنگھ انگریزوں کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گیا، وہ بنیادی طور پر دہقان زادہ تھا اور اس نے کبھی سکول کا منت نہیں دیکھا تھا، اس کی زندگی کا زیادہ تر حصہ گھوڑے کی پیٹھ پر گزرا تھا، لہذا جب وہ گورنر جنرل ہاؤس میں داخل ہوا تو وہ انگریز کے کردار سے مرعوب ہو گیا، رنجیت سنگھ کو محسوس ہوا ایک منظم اور طاقتور فوج کے بغیر مضبوط اور دریا پار کرنے کی ممکن نہیں چتا تھا، اس نے تاریخ کی پہلی سکھ فوج بنانے کا فیصلہ کیا، اس نے چند ریٹائر انگریز افسر ملازم رکھے اور انہیں ایک منظم فوج بنانے کی ذمہ داری سونپ دی، 1831ء تک ہندوستان میں پارٹ ٹائم فوجی ہوتے تھے، یہ لوگ پانچ ہزاری یا دس ہزاری کہلاتے تھے، یہ سرداروں اور جاگیرداروں کے قبضے میں ہوتے تھے، یہ لوگ زمانہ امن میں بھینٹ بازی اور تجارت کرتے تھے، لیکن جب بادشاہ کو ضرورت پڑتی تھی تو یہ فوج کی شکل اختیار کر لیتے تھے، ہندوستان کی پہلی منظم فوج انگریز نے

تفکیلی دی تھی رنجیت سنگھ نے انگریزوں کی بیرونی میں سکھ فوج بنانے کا فیصلہ کیا، لاہور میں آج جس جگہ انجینئرنگ یونیورسٹی ہے وہاں اس زمانے میں ایک چھوٹا سا گاؤں "بدھو کا آوا" ہوتا تھا، رنجیت سنگھ نے یہ گاؤں فوج کے حوالے کر دیا، فوج نے اس جگہ پہلی چھاؤنی بنائی، رنجیت سنگھ نے شروع میں چار ہزار سکھ سپاہی بھرتی کئے، انگریز انسرکٹروں نے انہیں ٹریننگ دی اور اس کے بعد فوج میں اضافہ ہونے لگا، 1839ء میں جب رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا تو سکھ فوج کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ چکی تھی اور اس کا ماہانہ خرچ چار لاکھ روپے تھا جبکہ اس کے پاس ایک لاکھ گھوڑے اور ایک ہلاک توپ خانہ بھی تھا۔ رنجیت سنگھ جب فوج تشکیل دے رہا تھا تو اس وقت تک اس کی سلطنت مضبوط ہو چکی تھی اور اسے کارسرا کر جانے کیلئے سول سرویس یا بیورو کرہی کی ضرورت پیش آرہی تھی، وہ ایک ان پڑھ اور نیم مستدان انسان تھا لہذا اس نے سول بیورو کرہی کا کام بھی فوج سے لینے کا فیصلہ کیا، اس نے مالپے کی دھولی پولیس لاء اینڈ آرڈر پھیرے دار، سفارت کاری حتیٰ کہ گردواروں کی حفاظت تک فوج کے حوالے کر دی، یہ رنجیت سنگھ کا وہ فیصلہ تھا جو آنے والے دنوں میں سکھ حکومت کے زوال کی وجہ بنا، رنجیت سنگھ کے دور ہی میں فوج کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہونے لگا تھا لیکن وہ ایک مضبوط اعصاب کا بھدار انسان تھا چنانچہ اس کی زندگی میں سکھ فوج اس کی تابعدار اور فرمانبردار رہی لیکن جوں ہی اس کا انتقال ہوا سکھ فوج شاہی تخت پر حاوی ہو گئی اور اس نے پنجاب کی سیاست اپنے ہاتھ میں لے لی۔

رنجیت سنگھ کے بعد اس کا بیٹا کھڑک سنگھ تخت نشین ہوا تو سکھ دو بڑے سیاسی گروہوں میں تقسیم ہو گئے، ایک گروہ ڈومرا سکھوں پر مشتمل تھا جبکہ دوسرا سندھانوال گروہ تھا آپ اپنی سہولت کے لئے انہیں ڈومرا اور سکھ گروہ کہہ سکتے ہیں۔ کھڑک سنگھ کا تعلق ڈومرا گروہ سے تھا جبکہ سکھ گروہ کا صدر دھیان سنگھ تھا، دھیان سنگھ کھڑک سنگھ کا مخالف تھا، وہ فوج کے ساتھ مل گیا اور اس نے فوج کو اپنا آئینی کردار ادا کرنے پر ابھارا شروع کر دیا، دھیان سنگھ کا کہنا تھا کھڑک سنگھ پنجاب کو انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دے گا اور انگریز آکر سکھ فوج کو ختم کریں گے، فوج نے اپنا آئینی کردار ادا کیا، کھڑک سنگھ کو نندار ڈیکلیر کیا، اسے تخت سے اتارا اور اس کے بیٹے کیشن نو نہال سنگھ کو بادشاہ بنا دیا، نو نہال سنگھ لڑکپن میں فوج میں رہا تھا اور فوج اسے اپنا نمائندہ سمجھتی تھی، فوج نے نو نہال سنگھ کی کاہنہ تشکیل دی تھی اور یوں فوج کو کاہنہ بنانے اور اپنے ناپسندیدہ لوگوں کو نندار ڈیکلیر کرنے کا اختیار مل گیا، بد قسمتی سے ایک سال بعد نو نہال سنگھ حادثے میں مر گیا جس کے بعد اس کی بیوہ چاند کو تخت پر بیٹھ گئی، چاند کو سکھ سلطنت کی پہلی خاتون سکران تھی، وہ ایک با اعتماد و عورت تھی لہذا فوج جلد ہی اس سے "مائیوس" ہو گئی، اس گروہ کے سربراہ دھیان سنگھ نے ایک اور سازش تیار کی، اس نے رنجیت سنگھ کے دوسرے بیٹے شیر سنگھ کو ساتھ ملا یا، ان دونوں نے چند جرنیلوں کو ہاتھ میں لیا، جرنیلوں نے فوج کو قائل کیا اور ستر ہزار فوجیوں نے لاہور کے قلعے پر حملہ کر دیا، چاند کو نے ہتھیار ڈال دیئے، فوج نے شیر سنگھ کو تخت پر بیٹھا دیا، شیر سنگھ کو فوج نے سکران بنایا تھا لہذا اس کے دور میں اقتدار عملاً فوج کے پاس تھا، بادشاہ کے تمام فیصلے اس کا ملٹری سیکرٹری کرتا تھا، لوگ انصاف، ہیکوں اور تک مکا کیلئے سیدھے "بدھو کا آوا" جاتے تھے، فوج کے پاس کسی بھی شخص کو

غدار قرار دے کر پھانسی دینے کا اختیار تھا اور فوج ایک مہر لگا کر کسی بھی ناجر یا ٹھیکیدار کو لاکھ پتی بنا سکتی تھی، شیر سنگھ کے دور میں فوج نے قلعے کے باہر تمام زمینوں پر قبضہ کر لیا اور وہ یہ زمینیں بٹے پر دیئے گئی فوج حکومت کی آمدنی سے نصف رقم بھی لیتی تھی جبکہ تمام سول محکموں کے سربراہ حاضر سرورس فوجی بنا دیئے گئے یہ اسلئے حکومت سے دوہری تنخواہ لیتے تھے۔ اس لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں عوام کی حالت پتلی ہو گئی لاہور میں جلوس نکلنے لگے اور لوگ سرعام خودکشیاں کرنے لگے دوسری طرف ڈگروپ اورس گروپ اقتدار کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل لڑ رہے تھے ڈگروپ نے اس سیاسی اجتری کا فائدہ اٹھایا اور اس نے مہاراجہ شیر سنگھ اور دھیان سنگھ دونوں کو قتل کر دیا جس کے بدلے میں ہیرا سنگھ نے ڈگروپ کا قتل عام شروع کر دیا ڈگروپ نے مزاحمت کی اور یوں ہیرا سنگھ کو فوج کی مدد لینا پڑ گئی ہیرا سنگھ نے فوج کو یقین دلایا اگر وہ کامیاب ہو گیا تو وہ سپاہی کی تنخواہ نو سے بارہ روپے اور گھڑ سوار کی 25 سے 30 روپے کر دے گا، فوج نے ہیرا سنگھ کی حمایت میں ایک بار پھر لاہور پر حملہ کر دیا لاہور کے شہریوں پر دو راتوں تک گولہ باری ہوتی رہی جس سے ہزاروں بے گناہ شہری مارے گئے فوج نے لاہور پر قبضہ کیا رنجیت سنگھ کے چھ سالہ بیٹے دلپ سنگھ کو تخت پر بٹھایا اور ہیرا سنگھ کو اس کا وزیر بنا دیا، ہیرا سنگھ نے نہ صرف فوج کی مراعات اور تنخواہوں میں اضافہ کر دیا بلکہ اس نے فوج کو ہر قسم کے مالیے اور ٹیکسوں سے بھی آزاد کر دیا لیکن فوج جلد ہی ہیرا سنگھ سے بھی مایوس ہو گئی اور اس نے اسے قتل کر دیا، ہیرا سنگھ کی جگہ جواہر سنگھ کو وزیر بنایا گیا، جواہر سنگھ نے سارا خزانہ فوج کے حوالے کر دیا لیکن فوج کے مطالبات بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ یہ مطالبات پورے کرنا مشکل ہو گیا، جواہر سنگھ نے ہاتھ کھڑے کر دیئے فوج نے اسے ”بدھو کا آما“ طلب کیا اور اسے اس کی بہن چنداں کے سامنے قتل کر دیا، فوج نے چنداں کو نو سالہ بادشاہ دلپ سنگھ کا سر پرست نامزد کر دیا۔

اس وقت تک سکھ سلطنت بری طرح دیوالیہ ہو چکی تھی، پنجاب میں بے روزگاری، مہنگائی، کرپشن، اجرام اور بد امنی آسمان کو چھو رہی تھی، لوگ بھوکے مر رہے تھے جبکہ فوج بدھو کے آداس میں پیش کر رہی تھی، لاہور شہر سے باہر فوجی انڈروں کے بڑے بڑے محل اور فارم ہاؤس تھے حالت یہ تھی فوج کا ایک درمیانے درجے کا افسر اٹھتا تھا، شہر میں داخل ہوتا تھا اور جس دکان، جس گھر سے جو چیز چاہتا تھا گھوڑے پر لاد کر واپس چلا جاتا تھا اور کسی کو اسے روکنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، چنداں بی بی ایک سمجھ دار اور معاملہ فہم عورت تھی، اس نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا، اس نے سکھ فوج کو انگریز فوج سے لڑانے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے فوری طور پر دو کام کئے ایک اس نے انگریز کو پنجاب پر حملے پر اکسایا اور دوسرا اس نے سکھ فوج کے جوانوں میں جذبہ الوطنی پیدا کرنا شروع کر دیا، اس نے انہیں باور کرایا دنیا میں سکھ جوان سے زیادہ جرأت مند اور بہادر کوئی نہیں، چنداں بی بی کی کوشش کامیاب ہوئی اور سکھ جوان سینہ ٹھونک کر انگریز فوج کے سامنے کھڑے ہو گئے، سکھ جرنیل انگریز فوج کی طاقت اور اپنی کمزوریوں سے واقف تھے لہذا انہوں نے لڑائی سے بچنے کی بڑی کوشش کی لیکن چنداں بی بی نے فوج میں خبر پھیلا دی کہ ہمارے جرنیل لڑنا نہیں چاہتے، جوانوں نے جرنیلوں پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا لہذا جرنیل بری طرح اندرونی اور خیبرونی دباؤ کا شکار ہو گئے یوں 1849ء میں سکھ جرنیلوں کو مجبوراً انگریز کے خلاف میدان میں اتارنا پڑ گیا، جنگ

شروع ہوئی تو پہلے ہی حملے میں سکھ فوج کے 8 ہزار جوان مارے گئے اس مشکل وقت میں فوج نے عوام سے مدد مانگی لیکن لوگوں نے فوج کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دیا اگلے دن سکھ جرنیلوں نے ہتھیار پھینکے اور میدان سے ہٹا کر کھڑے ہوئے جنڈاں بی بی نے لاہور انگریزوں کے لئے کھول دیا، انگریز آئے اور سکھوں کی پہلی اور شاید آخری سلطنت تاریخ کا حصہ بن گئی اس شکست کے بعد فوج کا لفظ سکھوں میں تحقیر کا نشانہ بن گیا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے آج بھی جب دو تین سکھ اکٹھے ہو کر کسی جگہ جاتے ہیں تو دیکھنے والے ان سے پوچھتے ہیں "اے فوجاں کتھوں آیاں نے" (یہ فوجیں کہاں سے آئی ہیں) یا "اے فوجاں کتھے جارہیں نے" (یہ فوجیں کہاں جا رہی ہیں) اور وہ ہنس کو جواب دیتے ہیں "فوجاں بہروں آیاں نے" جبکہ ڈیڑھ سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی جب کوئی سکھ سیتان کرکڑا ہوتا ہے تو دوسرا سکھ سے کہتا ہے "میں بلاواں جنڈاں نوں" (میں جنڈاں کو بلاؤں) اور وہ سکھ شرمناکری سے نادمہ کر لیتا ہے۔

نوٹ: "یہ محض ایک تاریخی واقعہ ہے اس کا موجودہ سیاسی اور فوجی حالات سے کوئی تعلق نہیں۔"



Kashif Azad @ OneUrdu.com

دفاع

سعودی عرب کے ایک اخبار نے چند روز پہلے دنیا کے 25 ایسے ممالک کی فہرست جاری کی جن میں فوج نہیں، یہ ممالک امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور یورپ کے قرب و جوار میں واقع ہیں اور یہ چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل ہیں، ان ممالک میں انڈورا، بارباڈوس، کوسٹاریکا، ڈومینیکن، گریناڈا، جینی، آکس لینڈ، کیریبائی، لیکٹن شٹین، جزائر مارشل، مارشیس، مائیکرونیشیا، موناکو، پیلاؤ، پانامہ، تووالو، سان مارینو، ساموآ، سلوین جزائر، سینٹ وینسٹ اینڈ گریناڈن، سینٹ کٹس، سینٹ لوشیا، ناورو، نیو کیلڈونیا اور نوٹوا شامل ہیں۔ میں نے یہ خبر پڑھی تو میں نے ان 25 ممالک کا ڈیٹا جمع کیا اور پڑھنا شروع کر دیا، میں ان ممالک کی ان خوبیوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا جن کے باعث یہ نہ صرف فوج کے بغیر اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں بلکہ یہ ترقی بھی کر رہے ہیں، مجھے معلوم ہوا یہ تمام ممالک رقبے، آبادی اور وسائل میں انتہائی چھوٹے ہیں لیکن ان ممالک نے چھوٹا ہونے کے باوجود دنیا میں بعض ایسے اعزاز حاصل کئے ہیں جن سے بڑی بڑی ملکیتیں اور قومیں بھی محروم ہیں مثلاً آپ اپنی کو لہجے، اپنی دنیا کی قدیم ترین جمہوریہ ہے، اپنی میں 1804ء میں پارلیمنٹ بنی اور یہ پارلیمنٹ آج تک چل رہی ہے، ڈومینیکن 1844ء کو آزاد ہوا وہاں اب تک سو صدر آچکے ہیں، یہ تمام صدر جمہوری طریقے سے آئے اور جمہوری طریقے سے رخصت ہوئے، کوسٹاریکا 1825ء میں آزاد ہوا، وہ 1945ء تک خانہ جنگیوں، مارشل لاؤں اور سیاسی ابتری کا شکار رہا، اس نے 1946ء میں فوج ختم کر دی اور تمام شہریوں کیلئے تعلیم مفت اور لازمی قرار دے دی، اس اقدام کے نتیجے میں کوسٹاریکا گولاطینی امریکہ کے سب سے بڑے جمہوری ملک کا اعزاز حاصل ہو گیا، بارباڈوس 1966ء میں آزاد ہوا اور اس کے تمام صدور جمہوری طریقے سے آٹھ آٹھ دس دس سال اقتدار میں رہے اور وہاں آج تک کسی نے کسی کے اقتدار پر شب خون نہیں مارا، اینڈورا فرانس اور اسپین کے درمیان واقع ہے اس ملک کی آبادی 67 ہزار ہے لیکن یہاں ہر سال ایک کروڑ سیاح آتے ہیں، آکس لینڈ میں یورپ کی پہلی پارلیمنٹ بنی تھی، آکس لینڈ کے لوگ اسے آلتھک کہتے ہیں اور یہ 930ء میں بنی تھی، اس ملک میں 1980ء میں دنیا کی پہلی خاتون صدر منتخب ہوئی تھی، اس کا نام مرو گرس فن بوگا وڈر تھا اور یہ مسلسل چار مرتبہ آکس لینڈ کی صدر رہی، کیریبائی 33 جزیروں کا

مجموعہ ہے یہ 1979ء میں آزاد ہوا اور اس کے عوام نے 29 سال کے ایک نوجوان جرمنیائی کو صدر منتخب کیا۔ یہ دنیا کا کم عمر ترین صدر تھا اور یہ مسلسل بارہ سال تک اقتدار میں رہا، لیکن شین آسٹریا اور سوئٹزر لینڈ کے درمیان واقع ہے یہ 1866ء میں آزاد ہوا اور اس نے 1868ء میں فوج ختم کر دی، یہ دنیا میں فوج ختم کرنے والا پہلا ملک تھا، اس نے 1978ء میں یورپ کا کم عمر ترین وزیر اعظم منتخب کیا، اس وزیر اعظم کا نام برن ہرٹ تھا اور انتخاب کے وقت اس کی عمر صرف 22 برس تھی، 1993ء میں اس سے بھی کم عمر شخص ڈاکٹر مار یوزف کو وزیر اعظم بنا دیا گیا، ڈاکٹر مار یوزف کی عمر 28 برس تھی، 2000ء میں لیکن شین کے عوام کا معیار زندگی یورپ کے تمام ممالک میں بلند ترین تھا، 2000ء میں پورے ملک میں کوئی غریب شخص نہیں تھا۔ جزائر مارشل 1991ء میں آزاد ہوا، اس میں 24 ہوائی اڈے ہیں، اس نے 1983ء میں امریکہ پر جوہری آلودگی پھیلانے کا الزام لگایا اور امریکہ سے 183 ملین ڈالر ہرجانہ وصول کیا، یہ امریکہ سے ہرجانہ وصول کرنے والا پہلا ملک تھا، مارٹینیکس 1968ء میں آزاد ہوا اور اس کے وزیر اعظم سر سیدو ساگرام غلام مسلسل 18 برس تک وزیر اعظم منتخب ہوتے رہے وہ 1986ء میں دنیا میں لمبی مدت تک اقتدار میں رہنے والے وزیر اعظم تھے، اسے تیسری دنیا میں سب سے زیادہ سیاح حاصل کرنے اور دنیا کی تیسری بڑی کمپنی بنانے کا اعزاز حاصل ہے۔ مائیکرو نیشیا 1991ء میں آزاد ہوا اور اس میں لوگوں نے آج تک کوئی درخت نہیں کٹنے دیا لہذا یہاں سب سے زیادہ بارشیں ہوتی ہیں، مونا کو دنیا کا دوسرا چھوٹا ملک ہے، اسے دولت مند عاشقوں کی جنت کہا جاتا ہے، یہ دنیا کا سب سے گنجان آباد ملک بھی ہے اس کے ایک مربع کلومیٹر میں 15 ہزار 3 س 21 لوگ رہتے ہیں اور یہ ملک صرف سیاحوں کے ذریعے اتنی دولت کمالیتا ہے جتنی ہر سال جاپان گاڑیوں کی فروخت سے حاصل کرتا ہے، پہلا ڈاؤ 1994ء میں آزاد ہوا اور یہ دنیا کا واحد ملک ہے جس میں بیچ تا حیات بھرتی ہوتے ہیں، یہ ملک پورے امریکہ اور لاطینی امریکہ کو ہنریاں فراہم کرتا ہے، پاناما 1903ء میں آزاد ہوا، یہ ملک بھی شدید مارشل لاؤں اور خانہ جنگیوں کا شکار رہا لہذا 1994ء میں اس کی پارلیمنٹ نے فوج ختم کر دی، اس ملک میں 51 میل لمبی نہر ہے یہ نہر بحر اوقیانوس کو بحر الکاہل سے ملاتی ہے، پاناما اس نہر سے ہر سال 9 بلین ڈالر کماتا ہے، تووالو 1978ء میں آزاد ہوا اور اس نے سیاحت کو انڈسٹری بنا لیا لہذا اس کے عوام خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ سان مارٹو 1631ء میں آزاد ہوا، اس نے انگریزوں کو سرکٹ اور سرائس کو ذریعہ روزگار بنایا اور کمال کر دیا، اس ملک میں چھ ماہ کیلئے صدر کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ساموآ 1962ء میں آزاد ہوا، اس کے 4 ہزار کارکنوں نے مسلسل 90 دن تک ہڑتال کر کے دنیا میں ریکارڈ قائم کر دیا، سولومن جزائر 1978ء میں آزاد ہوئے اور انہوں نے ناریل، سیاحت اور مچھلی کی پیننگ سے کمال کر دیا، اس میں لاطینی امریکہ کی پہلی بین الاقوامی یونیورسٹی بھی قائم ہوئی، سینٹ کٹس نے نمک کو صنعت بنا لیا، سینٹ لوشیا نے بجلی کے پرزوں کی مارکیٹ ہاتھ میں لے لی، ان کے ایک شاعر ڈیرک واکوٹ نے 1992ء میں نوبل پرائز بھی حاصل کیا۔ ناورو کے پاس دنیا کی سب سے چھوٹی جمہوریہ کا ٹائٹل ہے اور اس نے فاسٹیٹ کی کھاد سے پورے ملک کے لوگوں کو خوشحال بنا دیا۔

آج اس ملک میں کوئی غریب شخص موجود نہیں اس ملک نے 1993ء میں ماحولیاتی آلودگی پھیلانے پر آسٹریلیا سے 73 ملین ڈالر ہرجانہ بھی لیا تھا، دناؤ نونے ناریل کو صنعت بنایا اور اس صنعت کی وجہ اس کے لوگ خوشحال زندگی گزار رہے ہیں، وہی کن 1929ء کو آزاد ہوا اور اس نے اس کو ریاست کی بنیاد قرار دیا اور سنسٹ و سنسٹ اینڈ گریڈاؤن نے سیاحوں کی توجہ کو ذریعہ روزگار بنالیا لہذا اس کے عوام بھی اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔

میں نے جب ان ممالک کے حالات کا جائزہ لیا تو مجھے محسوس ہوا ان ممالک نے رقبے، آبادی اور وسائل کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا، انہوں نے محدود وسائل میں رہ کر اپنے لئے ترقی، خوشحالی اور عزت کا راستہ نکال لیا، یہ حقیقت ہے ان تمام ممالک میں فوج نہیں لیکن ان سب ملکوں میں عدالتیں، سکول اور ہسپتال موجود ہیں اور ان ملکوں کا تعلیم، صحت اور انصاف کا نظام انتہائی مضبوط ہے، ان میں 13 ممالک ایسے ہیں جن میں مقدمے کی سماعت کی زیادہ سے زیادہ مدت ایک ماہ ہے، ایک ملک میں ججوں کی تقرری تاحیات ہوتی ہے اور دو ملکوں میں ججوں کے پاس پولیس اور پولیس کے پاس ججوں کے اختیارات ہیں ان تمام ممالک میں تعلیم مفت اور لازمی ہے اور ان تمام ملکوں میں عوام کو صحت کی انتہائی جدید اور یکساں سہولتیں حاصل ہیں، ان تمام ممالک میں میڈیا کھل طور پر آزاد اور لوگوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے، ان 25 ممالک میں سے 9 ملکوں میں پچھلے دس سال میں قتل اور ڈکیتی کی کوئی واردات نہیں ہوئی اور دو ملکوں میں پچھلے تین برسوں سے کوئی رپورٹ درج نہیں ہوئی، مونا کو کی ٹریک پولیس کو دنیا کی بہترین ٹریک پولیس کا اعزاز حاصل ہے، آئس لینڈ کے ہسپتالوں کو دنیا کے صاف ترین ہسپتالوں کا ٹائٹل دیا گیا اور سینٹ لوشیا کے طالب علموں کو بہترین آئی کیو لیول کا ایوارڈ ملا لہذا جب میں نے ان ممالک کا پروفائل پڑھا تو مجھے محسوس ہوا فوجوں کے بغیر بھی ملک قائم رہ سکتے ہیں لیکن عدالتوں، سکولوں اور ہسپتالوں کے بغیر کوئی ملک قائم نہیں رہ سکتا مجھے محسوس ہوا ملک اسلحے اور جوانوں کے بغیر بھی خوشحال ہو سکتے ہیں لیکن دنیا کا کوئی ملک دوا، کتاب اور انصاف کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا، مجھے محسوس ہوا عدالتیں ملکوں کا سب سے بڑا دفاع، سکول سب سے بڑی فوج اور ہسپتال سب سے مضبوط قلعہ ہوتے ہیں اور جن ملکوں کے پاس یہ قلعے، یہ فوجیں اور دفاع کی یہ قوت ہوتی ہے ان ملکوں کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی وہ ملک کسی میدان میں ہار نہیں مانتے۔



رفیوجیز آرگنائزیشن، منسٹری آف پٹرولیم اینڈ نیچرل ری سورسز، ایٹرن منرل ڈویلپمنٹ اتھارٹی، نیشنل لاجسٹک سٹیل ایس ایبلیٹی آرڈرین، منسٹری آف وائٹ اینڈ پاور، منسٹری آف وومن ڈویلپمنٹ، نیشنل ایجوکیشن اور انڈین ہیٹ المائل کی سربراہی دے دیتی اور اگر بھارتی حکومت کسی ریٹائر میجر کو بھارتی پنجاب کا آئی جی لگا دیتی تو آج بھارت سرکار اور بھارتی فوج کی یہ صورتحال نہ ہوتی، آج بریگیڈ میز لال سنگھ اور بریگیڈ میز رمیش کمار دیا جیسے شاہد افسروں کو اسلحہ چوری نہ کرنا پڑتا اور آج پوری دنیا بھارتی حکومت پر نہ ہنس رہی ہوتی۔

مجھے پچھلے دنوں فرانس، جی بی ایس ایٹرنیشنل کی رپورٹ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس رپورٹ میں انکشاف ہوا بھارت رشوت دینے والے کرپٹ ترین ممالک میں دوسرے نمبر پر پہنچ گیا ہے، میرا خیال ہے بھارت کو یہ دن بھی فوج کو سول حکموں سے دور رکھنے کی وجہ سے دیکھنا پڑا، اگر بھارتی حکومت نے ہماری طرح اپنے سول حکمے فوج کیلئے کھول دیئے ہوتے تو آج نہ صرف اس کے 76 ریٹائر جنرل، سو بریگیڈ میز، 181 کرنل، 209 میجر اور 87 کیپٹن برسر روزگار ہوتے بلکہ بھارتی فوج کی کارکردگی اور مورال بھی بہت بلند ہوتا، میں جب بھی اس قسم کی خبریں پڑھتا ہوں تو میں سوچتا ہوں کاش میں بھارت میں ہوتا تو میں بھارتی حکومت کو تین مفید مشورے دے سکتا، میں اس سے درخواست کرتا وہ ملک کی 653 سول پوسٹوں پر فوجی افسر تعینات کر دے وہ یہ قانون پاس کر دے آئندہ بھارتی فوج سے جو بھی افسر ریٹائر ہوگا اسے سول حکمے میں چار گنا زیادہ تنخواہ پر بھرتی کر لیا جائے گا اور وہ تاجر، ٹینشن بھی وصول کرے گا اور تنخواہ بھی اور میں بھارتی حکومت کو مشورہ دیتا وہ ملک میں ارب پتیوں کی ایک نئی کلاس پیدا کرنے کیلئے اپنے 13 بڑے شہروں میں ڈیفنس ہاؤسنگ سکیمیں شروع کر دے، میں بھارتی حکومت کو سمجھاتا سول حکموں میں 653 ریٹائر فوجی افسر تعینات کرنے سے نہ صرف بھارتی فوج کرپشن سے پاک ہو جائے گی بلکہ ملکی معیشت بھی بہتر ہوگی، اس سے جنگ کا خطرہ بھی ٹل جائے گا اور ملک بھی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سیاست سے پاک ہو جائے گا۔



جاپان اب ترقی کر کے دکھائے

ہیڈی کی ٹوجو (Hideki Tojo) چارستارہ جنرل تھا، وہ 1940ء میں جاپان کا چیف آف آرمی سٹاف بنا، وہ جاپان کا سکندر اعظم بنا چاہتا تھا، جنرل ٹوجو نے فوج کی عنان سنبھالنے کے بعد ملک میں بڑی سطح پر اسلحہ سازی اور فوجی مہماتیں شروع کر دیں، اس نے جاپانی فوج میں دنیا کا پہلا خودکش دستہ بھی تیار کیا، ہیرو ہیٹو اس وقت جاپان کے شہنشاہ تھے، وہ جیسے مزاج کے بردبار شخص تھے، وہ جنرل ٹوجو کی پالیسیوں سے اتفاق نہیں کرتے تھے لیکن جنرل ٹوجو نے 1941ء میں شہنشاہ کو مارشل لا کی دھمکی دی اور اس دھمکی کی بنیاد پر خود کو جاپان کا وزیر اعظم منتخب کر لیا، وہ تاریخ کا پہلا باوردی وزیر اعظم بن گیا۔ یہ جنگ عظیم دوم کا زمانہ تھا اس وقت تک امریکہ اس جنگ سے علیحدہ تھا، امریکی صدر روز ویلٹ نے نہ صرف غیر جانبداری کا اعلان کر دکھا تھا بلکہ وہ تازیوں اور اتحادیوں کے درمیان صلح کی کوشش بھی کر رہے تھے، جنرل ٹوجو نے ایک عجیب جنگی منصوبہ بنایا، اس نے 7 دسمبر 1941ء کو اچانک پرل ہاربر پر حملہ کر دیا، اس حملے میں امریکی نیوی کو شدید نقصان پہنچا، جنرل ٹوجو کے اس اقدام کے نتیجے میں امریکہ اور جاپان بھی دوسری جنگ عظیم کا حصہ بن گئے، دنیا اس وقت تک جاپان کی جنگی تیاری اور جاپانی جرنیلوں کی طالع آزمائی سے واقف نہیں تھی لہذا جب جنرل ٹوجو کی فوجوں نے حملے شروع کئے تو اس نے چند ہی ماہ میں کوریا، چین، ملایا، سنگاپور، ہندوچین، تھائی لینڈ، برما، ولندیزی جزائر، فلپائن اور بحر الکاہل کے جزائر فتح کر لئے، جنرل ٹوجو اس کامیابی پر پھولے نہیں سارہا تھا لیکن شہنشاہ ہیرو ہیٹو ان کامیابیوں پر بہت متکبر تھا، شہنشاہ نے جنرل ٹوجو کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن بندوق کی نالی سے سوچنے والے لوگ آسانی سے نہیں سمجھا کرتے لہذا جنرل ٹوجو آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ 1944ء میں جاپان کی معیشت پر جنگ کے اثرات ظاہر ہونے لگے جاپان شدید کساد بازاری، بے روزگاری اور قلت کا شکار ہو گیا اور لوگ دوا کی ایک گولی اور ایک ڈبل روٹی کے لئے ترستے گئے، جاپانی شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھایا اور انہوں نے 18 جولائی 1944ء کو جنرل ٹوجو سے استعفیٰ لے لیا، جنرل ٹوجو نے استعفیٰ دے دیا لیکن وہ جاتے جاتے فوج کو یہ پیغام دے گیا، "ہم دنیا کی بہترین فوج ہیں لیکن ہمارا شہنشاہ ہمیں بزدلی کی موت مارنا چاہتا ہے" 22 جولائی 1944ء کو جنرل کویتا کی کوئی سو

(Kuniaki koiso) جنرل نوجو کی جگہ سپہ سالار بن گیا، شہنشاہ نے اسے جنگ بندی کا ناسک دیا لیکن اس نے بھی جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا، اس کا کہنا تھا ہم آخری گولی اور آخری سپاہی تک لڑیں گے لہذا جاپان جنگ میں آگے بڑھتا رہا۔

1945ء کے شروع میں جرمنی ہسپانی اختیار کرنے لگا جس کے بعد شہنشاہ ہیرو ہینو کو جنگ کا نتیجہ صاف دکھائی دینے لگا لیکن جاپانی فوج مسلسل فاتح عالم بننے کا خواب دیکھ رہی تھی، مارچ کے آخر میں جب اتحادیوں نے جرمنی کا محاصرہ کیا اور ہٹلر کسی نامعلوم مقام پر منتقل ہو گیا تو شہنشاہ ہیرو ہینو نے جنگ بندی کا فیصلہ کیا، فوج نے یہ فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا، جنرل کوئی سواور شہنشاہ کے درمیان طویل ڈائیلاگ ہوا جس کے آخر میں شہنشاہ نے جنرل کوئی سو سے بھی استعفیٰ لے لیا، 17 اپریل 1945ء کو جنرل کانتارو سوزوکی جاپانی فوج کا نیا سپہ سالار بنا، جنرل نے فوج کی کمان سنبھالنے سے پہلے شہنشاہ سے جنگ بندی کا وعدہ کیا لیکن جوں ہی اس کے کندھے پر سپہ سالار کے ستارے لگے جنرل وعدے سے مکر گیا، اس کا کہنا تھا، ہم نیویارک پر جھنڈا لہرائے بغیر جنگ بندی کا اعلان نہیں کریں گے، دوسری طرف ہیرو ہینو کا کہنا تھا، اتحادی جرمنی سے فارغ ہونے کے بعد مشترکہ طور پر جاپان پر حملہ کریں گے اور اس کے بعد فوج بچے گی اور نہ ہی جاپان، جنرل سوزوکی نے شہنشاہ کے خیالات کو تقہوں میں اڑا دیا۔ 30 اپریل 1945ء کو ہٹلر نے خودکشی کر لی اور B سٹی کو جرمنی نے اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، شہنشاہ ہیرو ہینو نے جنرل سوزوکی کو آخری بار بلا کر سمجھایا لیکن جنرل کا کہنا تھا، ”جاپان جرمنی ہے اور نہ ہی میں ہٹلر ہوں، ہم اتحادیوں کی طاقت کو ہوا میں اڑا دیں گے“ شہنشاہ بے بسی سے ہاتھ مل کر رہ گیا۔ شہنشاہ ہیرو ہینو کے خدشات درست ثابت ہوئے، اتحادی جرمنی سے فارغ ہو کر جاپان کی طرف متوجہ ہو گئے، امریکہ نے جاپانی فوج کو دارنگ دی، جنرل سوزوکی نے اس دارنگ کے جواب میں آخری گولی اور آخری سپاہی کا نعرہ لگا دیا اور اس نعرے کے جواب میں امریکہ نے 16 اگست 1945ء کو ہیرو شیمبا، ہیٹیم، بم پھینک دیا، دوسرا بم 9 اگست 1945ء کو ناگاساکی پر پھینکا گیا اور اس کے بعد جاپان رہا اور نہ ہی جاپانی فوج، 14 اگست 1945ء کو جاپان نے امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور امریکی کمانڈر جنرل میک آرتھر جاپان کا مالک اور مختار بن گیا، جاپانی فوج کے تمام جوانوں اور جرنیلوں نے وردیاں اتاریں اور کسانوں اور مزدوروں کے کپڑے پہن کر روپوش ہو گئے، جنرل سوزوکی گرفتار ہوا اور امریکیوں کی قید میں انتہائی ذلت آمیز زندگی گزارنے لگا اور پوری دنیا کی فوجوں میں جنرل نوجو کی ایک نئی اصطلاح سامنے آگئی، چھپیلے 60 برسوں میں جب بھی کسی فوجی مستقر میں کوئی فوجی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کے ساتھی اسے نوجو کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔

جاپان نے 1947ء میں نیا آئین بنایا اور اس آئین کی دفعہ نو کے تحت جاپان میں فوج پر پابندی لگا دی، اسی آئین میں فیصلہ ہوا جاپان دفاع پر اپنے جی ڈی پی کا صرف ایک فیصد خرچ کرے گا، اس فیصلے کے بعد جاپان دنیا کا واحد ملک بن گیا جس میں دفاع کی وزارت نہیں تھی، جس میں فضائیہ، بحریہ اور ملٹری نہیں تھی البتہ جاپان نے

مرٹنے کا مقام

”یہ تم لوگوں کا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے“ اس نے راول جھیل پر نظر میں جمادیں وہاں ہر طرف دھوپ ہریالی اور سکون تھا پانی میں پہاڑوں کا عکس بلکورے لے رہا تھا وہ واپس میری طرف مڑا ”تمام لوگوں کے پاس اللہ کے آخری نبی ہیں چار خلفائے راشدین ہیں اسی نوے ہزار صحابہ کرام ہیں ازواج مطہرات ہیں ان کے بعد اولیا اور صوفیا کرام کا طویل سلسلہ ہے تمہارے ہر شہر ہر قصبے میں دس بیس ہزار ہیں اور لوگ ہر مزار پر فتنیں مانتے ہیں چڑھاوے چڑھاتے ہیں تم لوگ شخصیت پرست ہو لہذا شخصیت پرست معاشروں اور لوگوں کا یہ مسئلہ نہیں ہونا چاہیے تم لوگوں کو بس ایک تحریک ایک پیشو اور ایک قدم کی ضرورت ہے اور تم لوگوں کے مسائل ہمیشہ ہمیش کے لئے ختم ہو جائیں گے“ مجھے اس کی بات عجیب محسوس ہو رہی تھی میرے ذہن میں بے شمار سوال اٹل رہے تھے لیکن میں یہ سوال پوچھ کر اس کا تسلسل نہیں توڑنا چاہتا تھا جان کا یہ نفسیاتی مسئلہ تھا اگر گفتگو کے دوران اسے ٹوک دیا جائے تو وہ پھسل جاتا ہے اس کی گفتگو لائسنی اور بے ربط ہو جاتی ہے اس کی باتوں سے لطف اندوز ہونے کا صرف ایک طریقہ ہے آپ خاموشی سے اس کی گفتگو سنتے رہیں اسے بولنے دیں اور میں اس وقت یہی کر رہا تھا۔

”تم لوگ حضرت امام حسینؑ کی ذات اقدس کو لڑا وہ دوبارہ گویا ہوا“ پورا عالم اسلام ان کے ساتھ گہری عقیدت رکھتا ہے دنیا کے ایک ارب 45 کروڑ مسلمان ہر محرم میں ان کا سوگ مناتے ہیں۔ سوگ منانے کا یہ عمل چودہ سو سال سے جاری ہے اور ہر سال اس میں اضافہ ہوتا ہے“ میں نے ہاں میں سر ہلا دیا وہ گویا ہوا ”میں تم لوگوں کو اس سوگ کو پراڈ کنو بتانے کا طریقہ بتاتا ہوں تم لوگ پاکستان میں حضرت امام حسینؑ کے نام سے دس کینسر ہسپتال بناؤ اور عوام سے درخواست کرو وہ محرم کے مہینے اپنی کمائی کا نصف اس ہسپتال کو دے دیں تم دیکھ لینا تمہارے ملک سے کینسر کا مرض ختم ہو جائے گا“ اسی طرح تم حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے نام پر ہسپتال اور یونیورسٹیاں بناؤ تم ازواج مطہرات کے نام پر چیرٹی سکولز کالجز اور یونیورسٹیاں قائم کرو اور اس کے بعد لوگوں سے درخواست کرو وہ ان اداروں کو ادا کریں وہ اپنے صدقات خیرات اور زکوٰۃ ان اداروں کو دے دیں وہ اپنی اپنی عقیدت کو مالی شکل دے کر ان اداروں کی مدد کریں آپ لوگوں کو دعوت دیں

اگر وہ اپنی زمین جائیداد اور کاروبار کا ایک حصہ ان اداروں کے نام وقف کر دیں تو وہ ایک ایسا صدقہ جاریہ کریں گے جس کا ثواب انہیں قیامت تک ملتا رہے گا۔ میرا خیال ہے تمہارے ملک سے بیاری اور تعلیم کا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ اس نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس طرح تم لاہور میں حضرت داتا گنج بخش یونیورسٹی، پھر کی شریف پھانسیں ہسپتال، شاہ حسین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی اور میاں میر لہبار ٹری بناؤ، ملتان میں حضرت شاہ رکن الدین ہسپتال، بہاؤ الدین ذکر یا سنس فاؤنڈیشن، بہاولپور میں بابا فریدی بی بی ہسپتال، کراچی میں شاہ غازی یونیورسٹی اسلام آباد میں بری امام سکول آف ٹیکنالوجی اور گولڑہ شریف یونیورسٹیاں بناؤ، تم دیکھنا تمہارا صحت اور تعلیم کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ جان بولا۔ میں نے تمہارے ملک میں دو چیزیں دیکھی ہیں تمہارے لوگ ان مقدس ہستیوں سے بے تحاشا شجاعت اور عقیدت رکھتے ہیں یہ لوگ جب تک سر نہ ڈھانپ لیں ان مقدس ہستیوں کا نام نہیں لیتے۔ لوگ جوتے اتار کر ان کے مزاروں میں داخل ہوتے ہیں اور جو بھی درگاہوں پر جاتا ہے وہ وہاں حسب تو فیق صدقہ دیتا ہے۔ دوسری بات ان لوگوں کے مزاروں، ان کی درگاہوں پر بہت برکت ہے، اگر کسی بزرگ نے اپنی زندگی میں ایک دیگ چولہے پر چڑھا دی تو اس کے بعد لوگوں نے یہ دیگ اتارنے نہیں دی، لوگ چار چار سو سال تک چولہے میں لگڑیاں اور دیگ میں چاول ڈالتے رہے اور تین تین چار چار سو سال تک ہزاروں لاکھوں لوگ ان روحانی میسوں سے مفت کھانا کھاتے رہے۔ پورے یورپ میں اس قسم کی ایک بھی مثال نہیں، اگر کوئی شخص اس عقیدت اور اس برکت کو ٹیکہ نیکل طریقے سے استعمال کرے تو پاکستان میں ایسے بے شمار ادارے بن سکتے ہیں جو اس ملک کے لوگوں کا مقدر بدل دیں۔ میں جب دیکھتا ہوں حضرت بری امام کے مزار پر تین سو سال سے آگ نہیں بجھی اور حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر پانچ سو سال سے دودھ کی سپلیں لگی ہیں تو میں سوچتا ہوں اگر ان کے نام سے ہسپتال اور یونیورسٹیاں بنی ہوتیں تو یہ ادارے اب تک کتنے لوگوں کو زندگی دے چکے ہوتے۔ وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔

میں نے پہلو بدلا، وہ میرا سوال بھانپ گیا لہذا مسکرا کر بولا۔ تم سوچ رہے ہو اس ملک میں ان مقدس ہستیوں کے ناموں سے بے شمار ادارے چل رہے ہیں تمہاری بات ٹھیک ہے، لیکن یہ ادارے حکومت نے بنائے تھے، ان میں ان ہستیوں کے چاہنے والوں کا کوئی کنٹری بیوشن نہیں تھا، میں چاہتا ہوں تم لوگ ان بزرگوں کے نام سے باقاعدہ پرائیویٹ لیڈنگ کمپنیاں اور ٹرسٹ بناؤ، یہ کمپنیاں اور ٹرسٹ آگے چل کر جدید تعلیمی ادارے اور ہسپتال بنائیں، ان اداروں کے باقاعدہ شیئرز لالچ کئے جائیں، لوگ یہ شیئرز خریدیں اور ان شیئرز کی قیمت سے یہ ادارے چلیں، اس طرح ان کے مزاروں پر جمع ہونے والے صدقات کا ایک حصہ ان اداروں کے فنڈ میں چلا جائے، اس کے علاوہ لوگوں سے درخواست کی جائے وہ اپنی آمدنی، اپنی جائیداد اور اپنے اثاثوں کے کچھ حصے ان اداروں کے نام وقف کر دیں، مجھے یقین ہے اس عمل سے یہ ادارے نہ صرف چلنا شروع ہو جائیں گے بلکہ ان کی برکت سے تمہارا ملک بھی ترقی کرے گا، میں کراچی کے ایک تاجر کو جانتا ہوں، اس نے دس روپے سے کاروبار شروع کیا تھا اور

عشق کا مقام

عامر چیمہ کون تھا وہ جرنی میں کیا کر رہا تھا وہ دن میں مذہب کا کتنا مطالعہ کرتا تھا اس کی دماغی حالت کیا تھی برلن کی پولیس نے اسے کیوں گرفتار کیا اسے جرمی کے بدنام ترین قید خانے موآبٹ جیل میں کیوں رکھا گیا اس نے تین مئی 2006ء کو خودکشی کی یاد دہینا جیل حکام کے ہاتھوں شہید ہوا وہ غازی ہے شہید ہے یا پھر مقول آئے ہم یہ سارے سوال آنے والے وقت پر چھوڑ دیں ہم ان کے جواب وقت کی تحقیق وقت کے وکیل اور وقت کی عدالت کے حوالے کر دیں ہم اس کا فیصلہ مغرب کے ایماندار سرکارز اور محققین پر چھوڑ دیں اور انتظار کریں آنے والا وقت عامر چیمہ کو کیا فرما رہا ہے وہ عامر چیمہ کے مقدسے کا کیا فیصلہ سنا تا ہے لیکن ہم اس ریفرنڈم کو وقت کے حوالے نہیں کر سکتے جو مئی کے مہینے میں ہوا اور اس نے پوری دنیا کے ذہنوں کا دھارا بدل دیا ہم اس ریفرنڈم کا فیصلہ ابھی اور اسی وقت سنائیں گے یہ ریفرنڈم عامر چیمہ کے انتقال سے برپا ہوا تھا اور اس نے پوری دنیا کے سیکولر ذہنوں کو جڑوں سے ہلا دیا تھا اس نے دنیا پر عوام کے اصل جذبات آشکار کر دیئے تھے اور اس نے تہذیبوں کے تمام تضاد مٹا دیئے تھے۔

اس ریفرنڈم کا آغاز اولینڈی کی ایک متوسط ہستی ڈھوک کشمیریاں کی گلی نمبر 18 سے ہوتا ہے یہ ریفرنڈم اس کے بعد زیر آباد کے قصبے سارو کی میں جاتا ہے اور اس کے بعد اس ریفرنڈم کا سلسلہ پورے عالم اسلام میں پھیل جاتا ہے اور اس کے بعد کرہ ارض پر پھر سے 162 اسلامی ممالک کے ایک ارب 47 کروڑ 62 لاکھ 33 ہزار 4 سو 70 مسلمانوں تک نہ صرف عامر چیمہ کا نام پہنچتا ہے بلکہ وہ مسلمان اسے اپنے خیالات اور خواہشات کا ترجمان سمجھنے لگتے ہیں اس لیے اپنے خیالات اور رویوں میں ایک لبرل شخص ہوں میری سوچ صدر ریش اور جناب پوزیشن شرف سے ملتی ہے جس میں یہ لکھا ہوں مسلمانوں کو اختلاف پسند اور نرم ہونا چاہیے میں بھی یہ یقین رکھتا ہوں انسانوں کے دل کھارے سے فتح نہیں کیے جاسکتے لوگوں کو بدلنے کیلئے فوج اور جرنیلوں کی نہیں بلکہ اولیاء اور صوفیاء کی ضرورت ہوتی ہے جس میں بھی یہ خیال کرتا ہوں آپ جسم سے ہم باندھ کر لوگوں کے جذبات اور خیالات کے دھارے نہیں بدل سکتے میرا بھی یہی خیال ہے آج کے دور میں ایک دوسروں کو لوگوں کے لشکر سے

مغرب کی ٹیکنالوجی کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا' میں بھی یہ سمجھتا ہوں ڈسپین ایجڈ کرنے والا شخص نعرے لگانے اور جلوس نکالنے والے دس لاکھ لوگوں سے بہتر ہے۔ لیکن جب عام چیمر کے ریفرنڈم کی باری آتی ہے تو میرے تمام لیبرل خیالات جراب دے جاتے ہیں، میرے سارے فلسفوں کی بنیادیں بل جاتی ہیں اور میں بھی دنیا کو حیرت سے دیکھنے لگتا ہوں۔

یہ ریفرنڈم کیا تھا اور اس کا آغاز کیسے ہوا؟ عام چیمر نے تین مئی کو موآبٹ جیل میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کر لیں، چار مئی کے پاکستانی اخبارات میں عام چیمر کے انتقال کی چھوٹی سی خبر شائع ہوئی اس کے بعد جوں جوں دن گزرتے گئے عام چیمر کا نام اور خبر بڑی ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ 13 مئی کو جب وزیر آباد کے قصبے سارو کی میں عام چیمر کا جنازہ ہوا تو عام چیمر نہ صرف پاکستان کے سارے میڈیا کی ہیڈ لائن تھا بلکہ دنیا بھر کے اخبارات ریڈیوز اور ٹیلی ویژن اس کے جنازے کی جھلکیاں دکھا رہے تھے، عام چیمر کا جنازہ پنجاب کے پانچ بڑے جنازوں میں سے ایک تھا، گوجرانوالہ ڈویژن کی تاریخ میں پہلی بار کسی جگہ دو لاکھ لوگ اکٹھے ہوئے تھے یہ ایک ایسے شخص کا جنازہ تھا جو تین مئی 2006ء تک ایک عام اور گمنام شخص تھا، اس گمنام اور عام شخص کو کس بات اس ادارے خاص بنا دیا، یہ ادا، یہ بات بنیادی طور پر اسلامی معاشرے اور مسلمانوں کی اساس ہے یہ وہ خون ہے جو ہر مسلمان کی رگوں میں دوڑتا ہے، یہ محبت کا وہ دریا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا جب تک یہ لوگ آپ سے اپنی آل اولاد اور زمین چائیداد سے بڑھ کر محبت نہیں کرتے یہ مسلمان نہیں ہو سکتے، یہ وہ خیال ہے وہ احساس ہے جو ہر مسلمان کے اندر روح کی گہرائی تک بیوست ہے، یہ وہ جذبہ ہے جو ایک مسلمان کو دوسرے شخص سے جدا کرتا ہے، یہ احساس ہے کہ وہ رسول اللہ کی محبت ہے اور یہ محبت جس دل پر دستک دے دیتی ہے وہ شخص گمنامی سے نکل کر عام چیمر بن جاتا ہے، وہ قازی علم دین شہید ہو جاتا ہے، علامہ اقبال نے کہا تھا میں نے قازی علم دین شہید کے رشک میں جتنے آنسو بہائے ہیں وہ میری بخشش کیلئے کافی ہیں عام چیمر کا جنازہ بھی اس محبت کا ایک چھوٹا سا ریفرنڈم تھا۔

سارو کی کے اس ریفرنڈم سے پہلے ایک ریفرنڈم گلی نمبر 18 میں ہوا، اس ریفرنڈم نے اس غیر معروف اور پراسا نہ گلی کا مقدر بدل دیا، رسول اللہ کی محبت میں ڈوبے ہزاروں عقیدت مندوں نے اس گلی کو اپنا مرکز بنا لیا، لوگ اس گلی میں قدم رکھنے سے پہلے وضو کرتے تھے، سفید کپڑے پہنتے تھے اور خوشبو لگاتے تھے، لوگ باادب ہو کر عام چیمر کے والد کے ہاتھ چومتے تھے، 3 مئی سے 15 مئی تک 12 دنوں میں ایک لاکھ لوگوں نے اس بوڑھے پروفیسر کے ہاتھ چومنے سے یہ سعادت اس ملک کے شاید ہی کسی شخص کو حاصل ہوئی ہو، لوگوں نے گلی نمبر 18 میں پھولوں اور گلدستوں کا انبار لگا دیا، عام چیمر کے گھر کے سامنے لوگوں نے اسٹن پھول رکھے، جو بھی شخص اس گلی میں داخل ہوتا تھا اس کا پورا جسم مہکنے لگتا تھا، لوگوں کی اس آمد و رفت سے متاثر ہو کر پولیس کو گلی نمبر 18 میں باقاعدہ چوکی بنانا پڑی، لوگ آتے تھے عام چیمر کے گیٹ کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور گیٹ کو سلام کر کے

واپس چلے جاتے تھے عقیدت کی اس کشش میں اتنی شدت تھی کہ لبرل اور اعتدال پسند حکومت کے ارکان بھی خود کو گلی نمبر 18 سے دور نہ رکھ سکے ان بارہ دنوں میں پنجاب اور وفاق کے 23 وزراء عامر چیمہ کے گھر گئے اور انہوں نے شہید کے والد کے ہاتھ چومے شعلہ راوی لہندی کی ساری انتظامیہ بار بار اس کے گھر گئی اخبارات میں عامر چیمہ کی تصویریں اس کے لواحقین اور اس کے چاہنے والوں کے بیانات منوں کے حساب سے شائع ہوئے عامر چیمہ نے سٹی کے میسج میں ریکارڈ کوریج حاصل کی آج پاکستان کا بچہ بچہ نہ صرف اس کے نام سے واقف ہے بلکہ وہ اس پر فخر کرتا ہے یہ کیا ہے؟ یہ مغرب اور مغربی سوچ کے خلاف ریفریڈم ہے یہ ریفریڈم ثابت کرتا ہے مسلمان اور مغربی انسان کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے جسے مغرب آزادی اظہار کہتا ہے اسے مسلمان نہ صرف توہین سمجھتے ہیں بلکہ وہ توہین کا یہ داغ دھونے کیلئے جان تک دے دیتے ہیں مجھے ایک بار ایک مغربی سکارلر نے کہا تھا "ہمیں سمجھ نہیں آتی ایک مسلمان مغرب میں پیدا ہوتا ہے اس کا سارا لائف سٹائل مغربی ہوتا ہے اس میں تمام شرعی عیب بھی موجود ہوتے ہیں لیکن جب اسلام اور رسول اللہ کا ذکر آتا ہے تو اس مغربی مسلمان اور کٹھن مولوی کے رد عمل میں کوئی فرق نہیں ہوتا؟ کیوں" میں نے عرض کیا "یہ وہ بنیادی بات ہے جسے مغرب سمجھ نہیں سکتا یہ دلوں کے سودے ہوتے ہیں اور دلوں کے سودے کبھی بوجاری کی سمجھ میں نہیں آسکتے نبی اکرم کی ذات ایمان کی وہ حساس رگ ہوتی ہے جو برف سے بے مسلمان کو بھی آگ کا گولہ بنا دیتی ہے مسلمان دنیا کے ہر مسئلے پر سمجھوتہ کر لیتا ہے لیکن وہ رسول اللہ کی ذات پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتا عشق رسول وہ مقام ہے جہاں سے مومن کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے جہاں موت سے بڑی سعادت اور فنا سے بڑی کوئی زندگی نہیں ہوتی جہاں پہنچ کر انسان مرنے کے بعد زندہ ہوتا ہے" میں نے اس سے کہا "دنیا میں لوگ مرنے کے بعد گناہ ہو جاتے ہیں لیکن عشق رسول میں آنے والی موت انسان کو ابد تک زندہ کر دیتی ہے یہ ایک ایسی آگ ہے جو انسان کو جلاتی نہیں اسے بتاتی ہے اسے دوبارہ زندہ کرتی ہے اور تم اور تمہارے لوگ اس کیفیت اس سرور کو کبھی نہیں سمجھ سکتے تم لوگوں نے زندگی میں محبت رسول کا ڈانٹہ چکھا ہی نہیں تمہیں کیا پتہ رسول اللہ سے محبت کرنے والے شخص کے دل سے کون سی روشنی نکلتی ہے اور یہ روشنی کس طرح موت کے خوف کو مالنے کے چھلکے کی طرح اتار کر دور پھینک دیتی ہے یہاں سے سارے دکھوں سے آزاد کر دیتی ہے"

ہم سب لوگ عامر چیمہ جیسے لوگوں کا مقام نہیں سمجھ سکتے۔



ڈائلاگ کی گنجائش موجود ہے

چند روز پہلے سینیٹر مشاہد حسین نے برطانیہ کے ارکان اسمبلی کے اعزاز میں ڈنڈیا تھا اس ڈنڈیا میں برطانیہ سے لارڈ امبر بھائیہ برٹش ایم پی اے شاہد ملک اور ناروے کی پارلیمنٹ کے پاکستانی رکن خالد محمود شریک تھے ان لوگوں نے ڈنڈیا کے دوران میں نبی اکرم کی ذات اقدس کے بارے میں گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کے بعد یورپ میں پیدا ہونے والی صورتحال کے بارے میں بریفنگ دی یہ ایک محدود محفل تھی جس میں چند سینیٹرز ایم این اے اور چند صحافی شامل تھے ایم پی اے شاہد ملک اور ایم پی اے خالد محمود نے یورپ کی صورتحال پر روشنی ڈالی خالد محمود کے ساتھ یہ میری دوسری ملاقات تھی ان کے ساتھ پہلی ملاقات اوسلو میں ہوئی تھی وہ اس وقت سٹی کونسل کے رکن تھے وہ اب ناروے کی پارلیمنٹ کے ممبر بن چکے ہیں انہوں نے اپنی گفتگو میں بتایا ”جنوری میں ناروے کے ایک میگزین نے یہ گستاخ خاکے ری پرنٹ کیے تھے یہ محدود کونسل کا میگزین تھا جس کے قارئین کی تعداد کسی بھی طرح دو تین ہزار سے زیادہ نہیں یہ میگزین ناروے کا ایک ہمسائی فرقہ چلا رہا ہے ہم نے جب یہ خاکے دیکھے تو ہمیں بہت افسوس ہوا ناروے میں مسلمانوں کی ایک بڑی تنظیم ہے جس کا نام اسلامک کونسل ہے اس کونسل کے چیئرمین ایک فلسطینی عالم ہیں جبکہ سیکرٹری جنرل ایک پاکستانی ہیں ہم لوگوں نے کونسل کا اجلاس بلایا اجلاس میں فیصلہ ہوا ہم لوگ اس گستاخی پر احتجاج کریں گے ہم لوگوں نے دن اور وقت طے کیا اور تمام مسلمانوں کو جلوس میں شرکت کی دعوت دی ہم نے اس جلوس کے بارے میں مقامی اخبارات میں خبریں بھی شائع کرائیں ہم لوگ جب وقت مقررہ پر باہر نکلے تو ہم نے دیکھا ہمارے ساتھ بے شمار غیر مسلم نارویجین بھی شامل ہیں ان لوگوں نے نہ صرف ہمارا ساتھ دیا بلکہ یہ ہمارے ساتھ نعرے بھی لگاتے رہے ہم نے ان سے پوچھا تم لوگ غیر مسلم ہو کر ہمارا ساتھ کیوں دے رہے ہو تو ان لوگوں نے جواب دیا ہم سمجھتے ہیں اس میگزین نے آپ کے ساتھ زیادتی کی میگزین کو کسی فرقے مذہب اور طبقے کی دل آزادی کا حق حاصل نہیں لہذا ہم لوگ آپ کے حق کیلئے لڑ رہے ہیں خالد محمود کا کہنا تھا ”ناروے میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو مذہبی تعصب سے بالاتر ہو کر مسلمانوں کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں اور ہمارے مسائل میں ہماری مدد کرتے ہیں“ مجھے خالد محمود کی بات اچھی لگی اور مجھے محسوس ہوا یورپ میں جہاں ہولانڈ پوسٹن جیسے تعصب اخبارات اور ٹیلیوینک روز جیسے بد بودار ایڈیٹر موجود ہیں وہاں بے شمار ایسے لوگ بھی ہیں جو

مسلمانوں اور مسلمانوں کے عقائد کا احترام کرتے ہیں، جو ان پر ہونے والی زیادتیوں پر ان کے ساتھ مل کر احتجاج کرتے ہیں، مجھے محسوس ہوا، ہمیں جہاں ان متعصب اخبارات، ایڈیٹریوں اور اسلام دشمن لوگوں کا مقابلہ کرنا چاہیے وہاں ہمیں ان اسلام دوست شہریوں کا شکر یہ بھی ادا کرنا چاہیے، ہمیں ان لوگوں سے بھی رابطہ رکھنا چاہیے۔

اگر ہم عالم اسلام، یورپ اور امریکہ کے تعلقات کا تجزیہ کریں تو ہمیں یورپ، عالم اسلام کے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے، یورپی ممالک میں اس وقت کروڑوں کی تعداد میں مسلمان آباد ہیں، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور اطالیہ میں اس وقت مسلمانوں کی چوتھی نسل پر دان چڑھ رہی ہے، یورپ میں مساجد، مسلمانوں کے قبرستان، اسلامک سنٹرز اور سکولز موجود ہیں۔ یورپی ممالک مسلمانوں کے عقائد کا بھی خیال رکھتے ہیں، یورپ کے زیادہ تر دفاتر، اداروں، ٹیکسٹیوں اور فرموں میں مسلمانوں کو عید، رمضان اور عاشورہ پر چھٹیاں دی جاتی ہیں، مسلمان نماز جمعہ کیلئے بھی اپنے اپنے دفاتر سے چھٹی لے لیتے ہیں، لہذا اگر دیکھا جائے تو عالم اسلام، یورپ کے زیادہ نزدیک ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں امریکہ میں اسلام نسبتاً ایک نیا مذہب ہے، دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد اسی پندرہ ہزار تھی، مسلمانوں کا امریکہ کی طرف رجحان 80ء کی دہائی میں شروع ہوا، چنانچہ امریکی قوم اسلام اور اسلامی عقائد سے اتنی واقف نہیں تھی، چنانچہ یورپی اقوام آگاہ ہیں، تاہم ایون کے بعد امریکہ نے مسلمانوں کے خلاف جنگ شروع کی تو امریکہ کا خیال تھا یہ صلیبی جنگوں کا ایک نیا سلسلہ ہے جس میں یورپ امریکہ کا کھل کر ساتھ دے گا، لیکن جب یہ جنگ شروع ہوئی تو یورپ نے امریکی توقعات کے برعکس اس کا ساتھ نہ دیا، فرانس، جرمنی اور روس عراق پر امریکی حملے کے خلاف تھے، یوں دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں امریکہ اکیلا رہ گیا، چنانچہ ایک سطح پر امریکی انتظامیہ نے یہ سوچنا شروع کر دیا، اگر اس نے یہ جنگ جیتی ہے تو اسے یورپ کو بھی اس میں ملوث کرنا پڑے گا، اگر ہم اس پس منظر کو مدنظر رکھیں تو یہ خاکے ایک ایسی سازش محسوس ہوتے ہیں جس کے ذریعے بعض ناریہ طاقتیں یورپ کو بھی "دہشت گردی" کے خلاف اس جنگ میں تھمھیٹ رہی ہیں، جن کے ذریعے یورپ بھی صلیبی جنگوں کا حصہ بننا شروع ہو گیا ہے۔

اگر ہم ان خاکوں کے کیوس کو ذرا وسیع پس منظر میں دیکھیں تو ہمیں ان کے مزید دو تین پہلو بھی دکھائی دیں گے، یورپ میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے، تاہم ایون کے بعد جرمنی، فرانس اور اسپین کے ہزاروں شہریوں نے اسلام قبول کیا تھا، اسلام قبول کرنے کا یہ عمل نہ صرف جاری ہے بلکہ اس میں تیزی بھی آ رہی ہے، اس کی وجہ اسلام کا مطالعہ ہے، تاہم ایون کے بعد جب مغربی میڈیا نے اسلام، اسلام اور مسلمان، مسلمان کا رنگ الاچنا شروع کیا تھا تو وہاں کے لوگوں نے تجسس سے مغلوب ہو کر اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا تھا، 2002ء میں یورپ میں قرآن مجید کے جتنے تراجم فروخت ہوئے اتنے پچھلے پچاس برسوں میں مجموعی طور پر نہیں ہوئے تھے، یورپی عوام نے جب یہ مطالعہ شروع کیا تو وہ اسلام کی حقانیت کے قائل ہو گئے اور انہوں نے دھڑا دھڑا اسلام قبول کرنا شروع کر دیا، یہ بات وہاں کے مذہبی طبقات کیلئے بڑی الارمنگ تھی، چنانچہ انہوں نے یہ سلسلہ روکنے کا فیصلہ کیا، میرا خیال

ہے یہ خاکے اس پیش بندی کا ایک حصہ ہیں ان خاکوں کی تیسری وجہ خالصتاً کاروباری اور تجارتی ہے یورپ میں اس وقت مسلمانوں کی چوتھی نسل پر وان چڑھ رہی ہے یہ لوگ جب یورپ پہنچے تھے تو یہ تیسرے درجے کے شہری تھے اور انہیں وہاں صرف وہی نوکریاں دی جاتی تھیں جو عموماً تیسرے درجے کے شہریوں کو ملتی ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لوگ پہلے درجے کے شہری بن گئے انہوں نے تعلیم حاصل کی، کاروبار کیے، انکیشن لڑے یہاں تک کہ وہ آج کارخانوں، فارمز ہاؤسز اور بڑے بڑے اداروں کے مالکان ہیں یورپ کے تین بڑے اداروں کی تحقیق کے مطابق مسلمان یورپ میں ایک بڑی کاروباری طاقت بن کر ابھر رہے ہیں چنانچہ یورپ کے مصعب طبقوں کا خیال ہے اگر مسلمان اسی طرح ترقی کرتے رہے تو یہ لوگ ان کے مذہب کو شدید نقصان پہنچائیں گے چنانچہ یہ لوگ بڑے عرصے سے مسلمانوں کا کاروباری زور توڑنے میں مصروف ہیں میرا خیال ہے اگر ہم اس پس منظر کو سامنے رکھ کر ان خاکوں کو دیکھیں تو ہمیں محسوس ہوگا خاکے شائع کرانے والوں کو مسلمانوں کا اعزازہ قہادہ جانتے تھے مسلمان ان خاکوں کے خلاف احتجاج کریں گے اور وہ بعد ازاں اس احتجاج کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کے خلاف ایسے قوانین منظور کرالیں گے جن کے ذریعے ان کا کاروباری اثر و نفوذ محدود کیا جاسکے۔

یہ وہ سارے خدشات ہیں جن کی روشنی میں اگر ہم خاکوں کو دیکھیں تو مستقبل میں یورپ کے ساتھ اپنے تعلقات کی نوعیت طے کر سکتے ہیں حقیقت یہ ہے عالم اسلام کے موجودہ رد عمل کی وجہ سے یورپ میں مسلمانوں کے ساتھ ڈائلاگ کی موج ابھر رہی ہے یورپ میں ایک بہت بڑا طبقہ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ایسے ڈائلاگ کا خواہاں ہے جس کے نتیجے میں یورپی اقوام اور مسلمان مستقبل میں اس نوعیت کے مذہبی اور نظریاتی تصادم سے بچ سکیں جس کے ذریعے دونوں ایک دوسرے کا نقطہ نظر سمجھ سکیں اور دونوں مل کر ایک ایسا لائحہ عمل طے کر لیں جس کی مدد سے دونوں اچھے مسابوں کی طرح رہ سکیں۔ ہمیں اس موقع کا فائدہ اٹھانا چاہیے ہمیں چاہیے ہم یورپ کے ساتھ ایک سنجیدہ ڈائلاگ کریں اور اس ڈائلاگ کے ذریعے وہاں توہین رسالت کے باقاعدہ قوانین بنوائیں۔ ہم انہیں اپنی روایات، نظریات اور ثقافت کا احترام کرنے پر مجبور کریں ہم دونوں مذاہب اور تہذیبوں کے درمیان ایک ایسی لکیر وضع کر دیں جس کے دونوں طرف رہنے والے ایک دوسرے کا احترام کریں ایک دوسرے سے محبت کریں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے اگر عالم اسلام نے یہ موقع کھو دیا تو ہم تہذیبوں کی اس جنگ میں اپنے دشمنوں میں اضافہ کر لیں گے ہم اپنے دوستوں کی تعداد میں کمی لے آئیں گے۔



زوال کی تین وجوہات

اسلامی دنیا البنان اور فلسطین کی صورت حال پر کیوں خاموش ہے؟ یہ سوال آج دنیا کے ہر شخص کی زبان پر ہے اس سوال کے پیچھے زوال کی طویل تاریخ ہے۔ انسان کی دس ہزار سال تاریخ میں جس قوم نے بھی ترقی کی اس میں تین خوبیاں تھیں، وہ علم میں دوسری قوموں سے برتر تھی، اس کی صحیح مشیبت مشبوط تھی اور وہ باقی قوموں سے طاقت ور تھی، ترقی کا یہ فارمولا آج تک دنیا میں کارفرما ہے لیکن انیسویں اسلامی ممالک ان تینوں شعبوں میں دنیا سے بہت پیچھے ہیں، اس وقت دنیا میں ایک ارب 47 کروڑ 62 لاکھ 33 ہزار 4 سو 70 مسلمان ہیں، دنیا کا ہر پانچواں شخص مسلمان ہے، دنیا میں ایک ہندو اور ایک بودھ کے مقابلے میں دو مسلمان اور ایک یہودی کے مقابلے میں 100 مسلمان ہیں، دنیا میں 161 اسلامی ممالک ہیں، ان میں سے 57 او آئی سی کے رکن ہیں لیکن یہ دنیا کی تیسری بڑی قوت ہونے کے باوجود انتہائی کمزور، حقیر اور بے بس ہیں، کیوں؟ اس کا جواب ہمیں ترقی کے تین بڑے اصولوں میں ملتا ہے۔

دنیا میں ترقی کا پہلا اصول علم ہے، اس وقت پوری اسلامی دنیا میں صرف 500 یونیورسٹیاں ہیں۔ ان یونیورسٹیوں کو اگر ہم مسلمانوں کی مجموعی تعداد پر تقسیم کریں تو ایک یونیورسٹی 30 لاکھ مسلمان نوجوانوں کے حصے آتی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں صرف امریکہ میں 5 ہزار 7 سو 8 یونیورسٹیاں ہیں اور ٹوکیو شہر میں 1000 یونیورسٹیاں ہیں، عیسائی دنیا کے 40 فیصد نوجوان یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں جبکہ اسلامی دنیا کے صرف دو فیصد نوجوان یونیورسٹی تک پہنچ پاتے ہیں، اسلامی دنیا میں ایکس لاکھ لوگوں میں سے صرف 230 لوگوں کو سائنس کا علم ہوتا ہے جبکہ امریکہ کے دس لاکھ شہریوں میں سے 4 ہزار اور جاپان کے 5 ہزار شہری سائنس دان ہوتے ہیں، پوری عرب دنیا میں صرف 35 ہزار خلی نام سرچ سکارلز ہیں جبکہ امریکہ میں ان کی تعداد 22 لاکھ ہے۔ پوری اسلامی دنیا اپنے جی ڈی پی کا صرف اٹھارہ فیصد ریسرچ پر خرچ کرتی ہے جبکہ عیسائی دنیا اپنی آمدنی کا پانچ فیصد حصہ تحقیق اور علم پر لگاتی ہے۔ اس وقت دنیا میں 200 بڑی یونیورسٹیاں ہیں ان دو سو یونیورسٹیوں میں سے 54 امریکہ، 24 برطانیہ، 17 آسٹریلیا، 10 چین، 10 جاپان، 10 ہالینڈ، 9 فرانس، 9 جرمنی، 9 کینیڈا اور 7 سوئزر لینڈ میں ہیں، ان دو سو یونیورسٹیوں میں اسلامی دنیا کی صرف ایک یونیورسٹی ہے جبکہ اس فہرست میں بھارت کی تین یونیورسٹیاں آتی ہیں، اگر ہم اس فہرست کا ذرا سا کڑا جائزہ لیں تو دنیا کی پہلی

ہیں یونورسٹیوں میں 18 یونورسٹیاں امریکہ میں ہیں، کینیڈا کے پہلے دس بڑے ادارے امریکہ میں ہیں اور دنیا کے 30 فیصد غیر ملکی طالب علم امریکہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، پوری دنیا میں امریکہ اعلیٰ تعلیم پر سب سے زیادہ رقم خرچ کرتا ہے، امریکہ اپنے جی ڈی پی کا دو اشاریہ چھ فیصد ہائر ایجوکیشن پر صرف کرتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں یورپ ایک اشاریہ دو اور جاپان ایک اشاریہ ایک فیصد خرچ کرتے ہیں۔ امریکہ ٹیکنالوجی اور ایجادات میں دنیا میں پہلے نمبر پر آتا ہے، اس کی کمپنیاں تحقیق پر دنیا میں سب سے زیادہ رقم خرچ کرتی ہیں، امریکہ تحقیقی اداروں کے معیار میں سب سے آگے ہے اور اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ نوٹل انعام یافتہ سائنس دان امریکہ میں ہیں۔ چین اور بھارت علم اور ٹیکنالوجی میں نئی طاقت بن کر ابھر رہے ہیں، امریکی ماہرین کا خیال ہے چین 2045ء میں امریکہ کی جگہ لے لے گا، اس کی وجہ یونورسٹیاں اور ٹیکنالوجی ہے، چین میں اس وقت 9000 اور بھارت میں 8407 یونورسٹیاں ہیں۔ یہ دونوں ملک ہر سال 9 لاکھ 50 ہزار انجینئر پیدا کرتے ہیں اس کے مقابلے میں امریکہ میں ہر سال صرف 70 ہزار نئے انجینئر مارکیٹ میں آتے ہیں، اس وقت دنیا میں 120 کیمیکل پلانٹس بن رہے ہیں ان میں سے 50 چین میں ہیں لہذا آپ دیکھ لیجیے اس وقت ہر وہ ملک ترقی یافتہ ہے جو علم، یونورسٹیوں اور شرح خواندگی میں دنیا سے آگے ہے اور ہر وہ ملک پسماندہ ہے جو علم میں پیچھے ہے اور بد قسمتی سے اسلامی دنیا اس شعبے میں دنیا میں سب سے پیچھے ہے۔

ترقی کا دوسرا اصول معیشت ہوتی ہے، 61 اسلامی ممالک کا مجموعی جی ڈی پی صرف 2 ٹریلین ڈالر ہے جبکہ امریکہ صرف مصنوعات اور خدمات کے شعبے سے 12 ٹریلین کماتا ہے، امریکہ کے صرف ایک شہر لاس ویگاس کی معیشت سو 131 ٹریلین ڈالر ہے، امریکہ کی شاخ آکسفورڈ وال سٹریٹ 20 ٹریلین ڈالر کی مالک ہے، صرف کوکا کولا کمپنی کے نام کی قیمت 97 ارب ڈالر ہے، دنیا میں اس وقت 36 ہزار ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں ان میں سے 25 ہزار کا تعلق امریکہ سے ہے، دنیا کے 25 اہم ترین لوگوں میں سے 12 کا تعلق امریکہ سے ہے۔ دنیا کی 52 فیصد ٹیکسٹائل کمپنیاں امریکہ میں ہیں جبکہ دنیا کی 70 فیصد صنعتوں کے مالک عیسائی اور یہودی ہیں، دنیا کی دس ہزار بڑی ایجادات میں سے 16103 ایجادات امریکی جبکہ 18315 ایجادات عیسائیوں اور یہودیوں نے کی تھیں، اسلامی دنیا جتنی رقم کا تیل فروخت کرتی ہے امریکہ اور یورپ اس سے دوگنی رقم کی ہر سال شراب بیچتے ہیں، ہمارے سارے تیل کی مالیت امریکہ کی برگر ہٹانے والی تین کمپنیوں کے سالانہ ٹرن اوور کے برابر ہے۔ امریکہ کے سرسبز کے شعبے کی آمدنی پوری اسلامی دنیا کے مجموعی جی ڈی پی سے زیادہ ہے اور ہم 61 اسلامی ممالک ہر سال ایکسپورٹس سے جتنی رقم حاصل کرتے ہیں اتنی رقم ہالینڈ صرف پھول بیچ کر کماتا ہے۔

اب آجائیں طاقت کے اصول کی طرف، ذرا اپنے دل سے پوچھئے اس وقت دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت کون ہے؟ کس ملک کے پاس بڑی فوج ہے، کس کا دفاعی بجٹ زیادہ ہے، کس کے پاس دنیا میں سب سے زیادہ جوہری ہتھیار ہیں، میزائل کس کے پاس زیادہ ہیں، کس کے طیارے پوری دنیا کا چکر لگا سکتے ہیں، وہ

کون سا ملک ہے جو اڑتے ہوئے طیاروں میں بیٹروں بھر سکتا ہے جس کے پاس توپیں اور ٹینک ہیں جو لیزر گائیڈڈ بموں سے ہزاروں میل دور تباہی مچا سکتا ہے، کس کے مصنوعی سیارے دنیا کی ایک ایک آنچ پر نظریں گاڑھے بیٹھے ہیں، کون ہے جو ہزاروں میل دور بیٹھ کر آپ کے جتنے کا نمبر معلوم کر سکتا ہے اور کون ہے جو دنیا کا ہر کیمپیز اور ہر ٹیلی فون مانیٹر کر رہا ہے بالکل آپ کا جواب ہوگا امریکہ، آپ کی بات درست ہے امریکہ کے بعد برطانیہ، جرمنی، فرانس، اٹلی اور روس آتے ہیں اور اس کے بعد چین اور بھارت کا نمبر آتا ہے جبکہ بد قسمتی سے ایک بھی اسلامی ملک دفاعی ساز و سامان بنانے والے ممالک کی فہرست میں شامل نہیں، پورے عالم اسلام میں پاکستان واحد ملک ہے جس کے پاس ایٹم بم ہیں، اسلامی بلاک کے کسی ملک میں اتنا دم نہیں کہ وہ کسی یورپی ملک کے بغیر اپنا دفاع کر سکے، آپ پوری اسلامی دنیا کی فوجی تخصیبات اور فوجی اٹالوں کا تجزیہ کر لیں، ان کے پاس رائل سے لے کر جہاز تک امریکہ اور یورپ کے ہوں گے، وہ رائلوں کی گولیاں تک کسی عیسائی ملک سے لے رہے ہوں گے۔

یہ ہے اسلامی دنیا کی صورت حال، یہ ہیں ہمارے زوال کی اصل وجوہات، قدرت کا قانون ہے جب بھی کوئی چیز بلندی سے گرتی ہے تو وہ ہمیشہ نیچے آتی ہے، قدرت نے آج تک دنیا کے کسی شخص، کسی قوم کے لئے اپنا یہ قانون تبدیل نہیں کیا، دنیا میں کامیابی اور فتح کیلئے خود کو طاقتور ثابت کرنا پڑتا ہے یہ بھی قدرت کا قانون ہے، قدرت نے اپنا یہ قانون اپنے انبیاء کرام تک کیلئے تبدیل نہیں کیا تھا، حضرت آدم سے لے کر رسول اکرم تک دنیا کے ہر نبی کو میدان جنگ میں اپنی طاقت ثابت کرنی پڑی تھی اور وقت کے ہر دور میں صرف وہی تہذیب قائم رہی جس کے پاس فوج، علم اور ٹیکنالوجی تھی لیکن بد قسمتی سے اس وقت عالم اسلام ان تینوں شعبوں میں بہت پیچھے ہے، بد قسمتی سے ہم سب رنگ آلود کھواریں لے کر میزائلوں کے سامنے صف آراء ہیں، ہم سب کی گردنوں میں جہات کے طوق پڑے ہیں اور ہم سب مشکول لے کر غیروں کے دروازوں پر کھڑے ہیں اور اس کے بعد اللہ کی نصرت کا انتظار کر رہے ہیں اور ہمارا خیال ہے اللہ ہمارے لئے اپنے سارے اصول بدل دے گا، ہمارا خیال ہے اللہ تعالیٰ نے جو نظام اپنے نبیوں کیلئے تبدیل نہیں کیا تھا وہ ہمارے لئے بدل دے گا، ہم کس قدر مادہ لوگ ہیں، ہم ڈیڑھ ارب لوگ جو 21 ویں صدی میں ایک نئی ہندوق ایجاد نہیں کر سکتے، جو عالمی سطح کی یونیورسٹی نہیں بنا سکتے اور جو انٹرنیشنل سطح کا ریگراؤ کوکا نہیں بنا سکتے، جو اپنا تیل بیچنے کیلئے عیسائی کمپنیوں کے محتاج ہیں، جو قرآن مجید تک یہودیوں کے پریسوں پر عیسائیوں کی روشنائی سے چھاپتے ہیں اور جن کے خاندان کعبہ میں یہودی کنبھی کا انٹرنیشنل سٹیشن سٹم لگا ہے ان لوگوں کا خیال ہے اللہ تعالیٰ ان کیلئے اپنا نظام بدل دے گا، کیا یہ ممکن ہے؟ ہم لوگ کتنے بے وقوف ہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں ہم خود باللہ اپنے اللہ کو بھی دھوکہ دے لیں گے۔



زوال کی چوتھی وجہ

احسن اقبال کا خیال مختلف تھا، ان کا فرمانا تھا، قوموں کی ترقی کیلئے صرف علم، معیشت اور طاقت کافی نہیں ہوتی اس کیلئے کریکٹری بھی ضروری ہوتا ہے۔ میں نے اتفاق کیا، میں نے ان سے عرض کیا واقعی اسلامی دنیا کے زوال کی چوتھی وجہ کریکٹری کی کمی ہے، ہم کردار میں بھی دنیا سے پیچھے ہیں، ہم اس شعبے میں بھی مار کھارے ہیں۔

کریکٹری پانچ خوبیوں کا مجموعہ ہوتا ہے، یہ خوبیاں ایمانداری، وسعت قلبی، وعدے کی پابندی، سچائی اور انصاف ہیں، جب یہ پانچ خوبیاں جمع ہوتی ہیں تو ان سے کریکٹری پیدا ہوتا ہے، لیکن بد قسمتی سے پوری اسلامی دنیا میں یہ خوبیاں ناپید ہیں، آپ ایمانداری کو لے لیجئے، پاکستان سمیت کون سا اسلامی ملک ہے جس کی اسی یا لوسے فیصد آبادی ایماندار ہے۔ آپ کسی اسلامی ملک میں خوراک اور ادویات کے خالص ہونے کی قسم نہیں کھا سکتے۔ آپ احتجاج دیکھتے پوری عرب دنیا میں یورپ اور امریکہ سے خوراک آتی ہے۔ ڈنمارک کی کپنی ”آرے“ سعودی عرب کو ذیری مصنوعات بیچتی ہے، یو اے ای کی ریباٹس ڈنمارک سے گوشت منگواتی ہیں اور پوری اسلامی دنیا جڑتی سوئزر لینڈ اور امریکہ سے ادویات خریدتی ہے، گویا ہماری ایمانداری کا یہ عالم ہے ایک اسلامی ملک دوسرے برابر اسلامی ملک سے کھانے پینے کی اشیاء تک نہیں خریدتا، کیوں؟ کیونکہ اسے ان اشیاء کی کوٹنگ کا یقین نہیں ہوتا، آپ اسلامی دنیا کا دفتری نظام دیکھ لیجئے، پاکستان سمیت کسی اسلامی ملک کے سرکاری ملازم وقت پر دفتر نہیں آتے۔ پورے عالم اسلام کے دفاتر میں ایمانداری سے کام نہیں ہوتا، پورے عالم اسلام میں کرپشن اور رشوت ستانی عام ہے، ہم لوگ حج اور عمرے کے دوران بیروٹن اور چرس سنگل کرتے ہیں، طواف کے دوران حاجیوں کی جبینیں کاٹتے ہیں اور ہم خرین میں کھڑے ہو کر بھیک مانگتے ہیں، کریکٹری دوسری خوبی وسعت قلبی ہوتی ہے، ہم لوگ بد قسمتی سے تنگ دل اور متعصب لوگ ہیں، چھوٹے بڑے، گورے کالے اور عربی، گجری کی جتنی تفریق اسلامی ممالک میں پائی ہے اتنی دنیا کے کسی ملک میں نظر نہیں آتی، امریکہ نے 1850ء میں ”کاسٹ“ کا لفظ ختم کر دیا تھا، لیکن اسلامی دنیا میں آج تک سرکاری فارموں میں فرقہ، کاسٹ اور سب کاسٹ کے خانے موجود ہیں، دنیا میں بے شمار ایسے اسلامی ممالک ہیں جو ساٹھ ساٹھ سال تک غیر ملکی مسلمانوں کو شہریت نہیں دیتے، اسلامی دنیا 72 فرقوں میں تقسیم

ہے، ایک فرقے کا مسلمان دوسرے فرقے کی مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتا، ہر فرقے کے قبرستان الگ ہیں، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لوٹے کے ساتھ وضو نہیں کرتا اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ایمان کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے، کریکٹری تیسری خوبی وعدے کی پابندی ہے، آپ اپنے گرد و پیش میں نظر دوڑائیے کیا آپ سمیت اسلامی دنیا کا کوئی شہری اپنے وعدوں کا پاس کرتا ہے، ہم لوگ تو اللہ کے ساتھ کئے وعدے نہیں بھاتے، اللہ اور اس کا رسول کہتا ہے مسلمان ایک وجود کی طرح ہیں لیکن لبنان، فلسطین، افغانستان اور عراق میں مسلمان مر رہے ہیں اور ہم مسلمان سب سے پہلے پاکستان کے نعرے لگا رہے ہیں مسلمانوں میں خاندانہ کعبہ میں کھڑے ہو کر نوے دنوں کا وعدہ کرنے والے حضرات گیارہ گیارہ سال تک کرسی سے نہیں ہٹتے اور 2004ء میں یونیفارم اتارنے کا وعدہ کرنے والے 2006ء تک چلے جاتے ہیں، آپ پوری دنیا کا دورہ کریں آپ کو بیہودی، عیسائی، سکھ، ہندو اور بودھ وعدے کا پابند ملے گا لیکن مسلمان وعدے سے پھرتے ہوئے ایک منٹ نہیں لگائے گا، آپ کاروبار سے سیاست تک کوئی شعبہ دیکھ لیں آپ کو ہر شعبے میں وعدہ خلافی اور عہد شکنی ملے گی، ملازم ملازمت کا باغ بھر کر کام نہیں کرتا اور مالک وعدہ کرنے کے بعد ملازم کو پوری تنخواہ نہیں دیتا، چوتھی خوبی سچائی ہوتی ہے، آپ پوری اسلامی دنیا کا مشاہدہ کر لیں آپ کو 61 اسلامی ممالک میں سچ زوال پذیر دکھائی دے گا، ہم لوگ اپنی ذات سے لے کر آئین اور قانون تک ہر چیز سے جھوٹ بولتے ہیں اور ہم لوگ ہاتھ میں قرآن اٹھا کر غلط بیانی کرتے ہیں، میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں جو دکھانے اور اللہ اور رسول کی قسمیں کھائے میں اس سے سو انہیں خریدتا اور کریکٹری پانچویں خوبی انصاف ہوتا ہے، اس وقت اسلامی ماحضروں میں لوگوں کے ساتھ جھٹی، بے انصافی ہوتی ہے اس کی مثال کسی غیر اسلامی ملک میں نہیں ملتی، آج 61 اسلامی ممالک میں سے 23 ملکوں میں آمریت ہے، ہم اپنی ذات سے لے کر جانوروں تک پر ظلم کرتے ہیں۔ 17 میر اسلامی ممالک 9 غریب اسلامی ملکوں سے بچے چوری کرتے ہیں اور انہیں اونٹ دوڑ میں مروا دیتے ہیں، اسلامی ممالک کی عدالتیں تاخیر اور نا انصافی کا گڑھ ہیں اور ان سے صرف طاقتور کو انصاف ملتا ہے۔

میں نے احسن اقبال کے ساتھ اتفاق کیا، میں نے ان سے عرض کیا صفائی مسلمانوں کا نصف ایمان تھی لیکن آپ کو کسی اسلامی ملک میں صفائی نہیں ملے گی، علم مومن کی میراث تھا لیکن آج کے مومن کی جہالت سے دل گھبراتا ہے، جابر سلطان کے سامنے کلہ حق مسلمان کی پہچان ہوتا تھا لیکن آج کا مسلمان جابر سلطان کی اجازت کے باوجود کلہ حق نہیں کہتا، شراب، زنا، جوا اور سود اسلام میں حرام ہیں لیکن یہ چاروں برائیاں تمام اسلامی ممالک میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، پردہ اسلام کی شناخت تھا لیکن فاشی اسلامی ممالک میں انٹرنیٹ کی شکل اختیار کر چکی ہے، برداشت اور اعتدال مسلمان کا طرہ امتیاز تھا لیکن پوری دنیا میں سب سے زیادہ ششے توڑے اور سب سے زیادہ ناز اسلامی ملکوں میں جلائے جاتے ہیں شہریوں کے تحفظ کی بنیاد اسلام نے رکھی تھی لیکن آج حالت یہ ہے پورے یورپ میں کوئی جوان بچی سکرٹ اور شرٹ پہن کر ملک کے دوسرے کوئے تک چلی جاتی ہے اور کوئی اس کی

طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا لیکن اسلامی ملک میں ایک مسلمان بچی برقعہ اوڑھ کر دوسرے محلے تک نہیں جاسکتی، اسلامی ملکوں میں مسجدوں سے جوتے، پگھے اور لاؤڈ سپیکر چوری ہو جاتے ہیں، ہسپتالوں سے نو مولود بچے اغوا کر لئے جاتے ہیں، ڈاکٹر مریضوں کے گروے نکال لیتے ہیں اور سیاستدان پارلیمنٹ ہاؤس میں یونیفارم کی حمایت میں قراردادیں پاس کرتے ہیں یہ ہے ہمارا کریکٹر چنانچہ ہم اللہ تعالیٰ کی محبوب قوم ہونے کے باوجود پوری دنیا میں جوتے کھارے ہیں، ہم رورو کر اپنی جائے نمازیں گیلی کر دیتے ہیں لیکن ہماری دعائیں، ہماری آیہیں مسجد کی چھت تک نہیں جاتیں، میں نے احسن اقبال صاحب سے عرض کیا اللہ کے نزدیک ایک ہا کردار کا فر ایک بے ایمان اور بد کردار مسلمان سے ہزار درجے بہتر ہوتا ہے چنانچہ آج اللہ تعالیٰ ہمارے دشمنوں کو دل کھول کر نواز رہا ہے آج ہمارے دشمنوں کا پانی تیل بن چکا ہے جبکہ ہمارا تیل بھی پانی ہو گیا ہے، آج ان کی مٹی سونا ہے جبکہ ہمارا سونا بھی مٹی کے بھاؤ تک رہا ہے، آج ہم 67 لاکھ کی فوج اور ایک ارب 48 لاکھ کی آبادی کے باوجود 4 کروڑ یہودیوں سے اپنے لبنان کو نہیں بچا سکتے کیوں؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ جعلی دوائیں بنانے اور اونٹ ریس کرانے والوں کیلئے ابلیسیں نہیں بھجوا کر تا اس لئے کہ ہم پوری دنیا کو بے وقوف بنا سکتے ہیں لیکن ہم (نحوۃ اللہ) اپنے خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے اس لئے کہ ہم اس کے قوانین کی خلاف ورزی کر کے اس سے مدد حاصل نہیں کھ سکتے۔

یہ ہمارے زوال کی چوتھی وجہ ہے۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com



نورے کی ماں

نورا مصلیٰ میری زندگی کا پہلا کی تھا میں اس سے پہلے کیوں سے واقف تھا اور نہ ہی مصلیوں کے بارے میں کچھ جانتا تھا میں بس اتنا دیکھتا تھا بعض لوگ ہمارے گھر اور ڈیرے پر آتے ہیں وہ سارا دن ہماری خدمت کرتے ہیں ہمارے جمونے برتن دھوتے ہیں ہمارے ذمور ڈنگروں کو چارہ کھلاتے اور پانی پلاتے ہیں ہمارے کھیتوں میں کام کرتے ہیں ہمارے محنوں میں جھاڑ دیتے ہیں ہمارے بزرگوں کے حقے تازہ کرتے ہیں ہماری بھینسوں کا دودھ دھوتے ہیں ہمارے کپڑے نچڑتے ہیں اور ہمارے مہمانوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں میں یہ بھی دیکھتا تھا ان لوگوں کو چار پائیوں پر بیٹھنے ہمارے بزرگوں کے حقے کو منڈ لگانے اور ہمارے برتنوں میں کھانا کھانے کی اجازت نہیں ہم سب انہیں بھائی چاچا اور پھوپھی کہتے تھے لیکن جب وہ ہم سے ملنے آتے تھے تو وہ ہمارے سامنے چپ چاپ زمین پر بیٹھ جاتے تھے میں ان لوگوں کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا ہمارے کچھ چاہئے پھوپھیاں اور بھائی تو ہمارے ساتھ چار پائیوں پر بیٹھتے ہیں وہ ہمارے ساتھ کھاتے اور پیتے ہیں لیکن اس قسم کے بھائی پھوپھیاں اور چاہے فاصلے پر رہتے ہیں اور زمین پر بیٹھتے ہیں کیوں؟ مجھے اس کیوں کا جواب نہیں ملتا تھا میں یہ بھی دیکھتا تھا ہماری ان پھوپھیوں چاچوں اور بھائیوں کے بچے بھی ہیں یہ بچے ہمارے ہم عمر ہیں لیکن ان بچوں کو ہمارے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں ہم لوگ ان کے سامنے کھیلتے ہیں اور یہ بچے زمین پر بیٹھ کر ہمیں حسرت سے دیکھتے رہتے ہیں اور اپنے کالے ننگے بازوؤں کے ساتھ ناک صاف کرتے رہتے ہیں میں سوچتا تھا ایسے کیوں ہے؟ مجھے اس کیوں کا جواب نہیں ملتا تھا لیکن جب میں پانچ سال کا ہوا اور میری والدہ نے مجھے سکول داخل کرایا تو مجھے ان دونوں کیوں کا جواب مل گیا اس جواب کا نام نور تھا یہ نور کون تھا؟ نور میرا کی تھا؟ مجھے سکول میں داخلے پر سننے جوتوں سننے کپڑوں سننے جیسے نئی نئی اور نئی کتابوں کے ساتھ نور تھے میں ملتا تھا میرے لیے یہ ایک انوکھا تھا مجھے آج بھی یاد ہے جب میں پہلی بار سکول جانے لگا تھا تو میری والدہ نے میرے سامنے ایک بچہ کھڑا کر دیا تھا اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی تھی "یہ تمہارا کی ہے یہ تمہارے ساتھ سکول جایا کرے گا" میں اس بچے کو دیکھ کر حیران رہ گیا وہ کالے سیاہ رنگ کا ایک مضبوط بچہ تھا اس کی آنکھیں سرخ ناک کے تھننے نیلے اور اس کے

دانت پیلے تھے اس کے منہ سے بو آ رہی تھی اور اس کے پورے جسم پر ایک چھوٹے سائز کی شلوار تھی یہ شلوار بے شمار پھیندوں اور داغوں سے اٹی پڑی تھی اور کثرت استعمال سے اس کا اصل رنگ تک اڑ چکا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے نور اچھا لگا۔

نور سے کی ڈیوٹیاں بہت دلچسپ تھیں وہ میرا بست اور میری بوری سکول پہنچاتا تھا میں اکثر اس کے آگے آگے چلا تھا اور نور میری بوری اٹھا کر میرے پیچھے آتا تھا اگر کبھی مجھے اپنی "کھوتی" سکول لے جانے کی اجازت مل جاتی تو میں کھوتی پر بیٹھتا تھا اور نور کھوتی کی دم کھینچ کر اس کی سپینڈ کنٹرول کرتا تھا سکول میں اس کے تین کام ہوتے تھے وہ میری تختی دھوتا تھا میری سلٹیٹ صاف کرتا تھا میری دوات میں پانی ڈال کر لاتا تھا اور اگر کبھی ماسٹر صاحب مجھ سے خفا ہو جاتے تو میری جگہ کان پکڑتا تھا اور ماسٹر صاحب سے میرے حصے کی مار بھی کھاتا تھا واپسی پر وہ میرے لئے دوسروں کے کھیت سے سولیاں گا جریں اور تریوز بھی چوری کرتا تھا مجھے ہیر بھی توڑ کر دیتا تھا اور ان ساری خدمات کے عوض میری ماں اسے ایک پراٹھا دو دو گھنٹے گھاس اور میرے پرانے کپڑے دیتی تھی یہ کپڑے نور سے کتہ کاٹھ اور جسامت کے لحاظ سے بہت تنگ اور چھوٹے ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود نور ایہ کپڑے پہن کر بہت خوش ہوتا تھا وہ میرے کپڑوں کی وجہ سے کیوں کے محلے کا رئیس کہلاتا تھا۔

نور ایک بھر پور کردار تھا اور یہ کردار بھر پور فرمت اور زیادہ تفصیل کا مستقاضی ہے میں ان شاء اللہ کسی اور وقت نور سے پر پوری تفصیل سے روشنی ڈالوں گا سردست میں نور سے کی والدہ کی ایک عجیب عادت کا ذکر کرتا چاہتا ہوں نور سے کی ماں اسے روز صبح ہمارے گھر چھوڑنے آتی تھی وہ جب گھر سے نکلتی تھی تو ایک تازہ گنا توڑ کر ہاتھ میں پکڑ لیتی تھی اور اپنے گھر سے ہمارے گھر تک اس گنے سے نور کی پٹائی کرتی آتی تھی نور اچھیں مارتا ہوا آگے آگے بھاگتا تھا اور اس کی ماں گنا لہراتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے یہ روز کا معمول تھا نور اچھتا صرف میری "خدمت" میں رہا میں نے ہمیشہ اس کے نیچے جسم پر چٹوٹوں کے نشان دیکھے ان چٹوٹوں سے بعض اوقات خون بھی رستا تھا لیکن نور ایک ہا کمال بچہ تھا وہ ٹھیک دس پندرہ منٹ بعد ان چٹوٹوں کو بھول جاتا تھا اور تھپتھپے لگاتا ہوا کھوتی کی دم سے لٹک جاتا تھا میں نے ایک بار اپنی ماں سے پوچھا "اماں نور سے کی ماں اسے روز کیوں مارتی ہے" میری ماں نے عجیب جواب دیا "اس کا کہنا تھا" تمام کیوں کی ماں اپنے بچوں کے ساتھ بھی سلوک کرتی ہیں" میں نے وجہ پوچھی تو ماں نے بتایا "ان لوگوں کا خیال ہے اس سے بچوں میں برداشت پیدا ہوتی ہے" میں نے حیرت سے ماں کو دیکھا انہوں نے بتایا "ان کے بچے کئی ہوتے ہیں انہوں نے جلد یا بدیر کسی ڈیرے پر کام کرنا ہوتا ہے ڈیرے کے لوگ ذرا سخت طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں لہذا یہ لوگ اپنے بچوں کو شروع سے مار کھانے ذلت برداشت کرنے اور ظلم سہنے کی عادت ڈال دیتے ہیں ان کا خیال ہوتا ہے اس سے ان کے بچوں کی آنے والی زندگی آسان ہو جاتی ہے"

مجھے نور اور اپنی ماں کا یہ عجیب و غریب فلسفہ دونوں بھول گئے لیکن میں نے نکل کے اخبار میں ایک عجیب

خبر پڑھی اس خبر نے مجھے نورا اور ماں کا فلسفہ دونوں یاد کر دیئے، خبر یہ تھی حکومت نے کراچی انٹیرپورٹ پر بیرون ملک جانے والے مسافروں کے جوتے اتروا کر تلاشی کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کے بعد سیکورٹی اہلکار پورڈنگ پاس لینے والے تمام پاکستانی مسافروں کے جوتے اور بیٹلس اترواتے ہیں ان کے پرس چابیاں اور سوبائل نکلواتے ہیں اور ان کی بھرپور تلاشی کے بعد انہیں کلیئر کرتے ہیں اب آپ پوچھیں گے اس خبر میں کون سی ایسی بات تھی جس نے مجھے تیس برس پرانا نورا یاد کر دیا اس خبر میں ایک ٹھیک ٹھاک نورا چھپا تھا، میں آپ کو ابھی اس نورے تک لے جاتا ہوں، نائین الیون کے بعد امریکہ اور سیون سیون کے بعد یورپ نے اپنے انٹیرپورٹس پر پاکستانیوں کے جوتے اتروانے شروع کر دیئے تھے انہوں نے جوتا اتروائی کی اس رسم میں بڑا کڑا میرٹ رکھا تھا، وہ سرکاری دورے پر جانے والے ہمارے وزرا، سیکرٹریوں اور جرنیلوں تک کو نہیں بخشتے تھے پاکستانی اس سلوک پر شدید احتجاج کرتے تھے اور حکومت کو اس احتجاج پر عموماً پستی اختیار کرنا پڑتی تھی لہذا حکومت نے طویل غور و فکر کے بعد نورے کی ماں بننے کا فیصلہ کیا، اس نے اپنے ہی شہریوں کے ساتھ اپنے انٹیرپورٹوں پر امریکہ اور یورپ جیسا سلوک شروع کر دیا، اس نے پاک سرزمین سے لوگوں کے جوتے اتروانے اور بیٹلس کھلوانا شروع کر دیں تاکہ ہمارے لوگوں میں برداشت پیدا ہو جائے اور جب یہ لوگ نیو یارک یا لندن کے انٹیرپورٹ پر اتریں اور وہاں ان کی بے عزتی ہو تو انہیں تکلیف نہ ہو اور وہ بڑی آسانی سے یہ ذلت برداشت کر جائیں، مجھے حکومت کا یہ اقدام بہت اچھا لگا اور میں دل سے ان لوگوں کی ذہانت اور فطانت کا قائل ہو گیا اور میں نے سوچا میں براہِ مرام رانا طاہر کے ذریعے اپنے ”ڈزنی“ وزیراعظم صاحب سے رابطہ کروں اور ان سے درخواست کروں وہ اب مہربانی فرما کر پاکستان کے دس بارہ شہروں میں گوانتانا سوبے جیسے ایکسرے کمپ بھی بنوائیں اور پاکستان کے تمام زندہ اور مردہ شہریوں کیلئے ان کمپوں میں ایک ایک ماہ کی ٹریننگ لازمی قرار دے دیں تاکہ جب ہمارا کوئی شہری اچانک غائب ہو جائے تو اس کے لواحقین کو اور اسے زیادہ تکلیف نہ ہو اور وہ اس ذلت اور اس دکھ کو کی کہیں لوگوں کیلئے حکومت کا نارمل بیکنج سمجھے اور نورے کی طرح دس منٹ بعد اپنی ساری تکلیف بھلا کر کھوتی کی دم سے لنگ جائے۔



بھائی لوگوں کی خدمت

ممبئی بھارت کا سب سے بڑا شہر ہے، اس کی آبادی ڈیڑھ کروڑ ہے۔ اس شہر میں دو قسم کی حکومتیں ہیں، ایک حکومت سرکار کہلاتی ہے اور اسے مہاراشٹر کا وزیر اعلیٰ چلاتا ہے جبکہ دوسری حکومت غیر سرکاری ہے اور یہ ”اٹھ ورلڈ“ کے احکامات سے چلتی ہے۔ ممبئی کی اٹھ ورلڈ دنیا میں پانچویں نمبر پر آتی ہے۔ ممبئی شہر کی تمام گلیاں، کوچے، بازار اور آبادیاں مختلف بد محاشوں، کن ٹنوں اور غنڈوں کے قبضے میں ہیں۔ یہ لوگ فٹ پاتھ پر بھیک مانگنے والوں سے لے کر ٹیٹی سنور بڑ بلڈنگ کے مالکان تک سے بہتہ لیتے ہیں۔ یہ لوگ اس بہتے کو اپنی زبان میں ”ہنڈہ“ کہتے ہیں۔ ممبئی میں اگر کوئی شریف انسان ہنڈہ دینے سے انکار کرے یا وہ کسی مجبوری کے باعث ہنڈہ دینے کے قائل نہ ہو تو یہ لوگ اسے سرعام بیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ اس عمل کو ”دھلائی“ کہتے ہیں۔ اٹھ ورلڈ کے ایجنٹ شہر کے مختلف علاقوں سے ”ہنڈے“ جمع کر کے بڑے غنڈے تک پہنچاتے ہیں۔ یہ بڑے غنڈے سیکر انچارج کہلاتے ہیں اور سیکر انچارج یہ مال اپنے سے بڑے غنڈے تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ بڑا غنڈہ ممبئی کی زبان میں ”بھائی“ کہلاتا ہے۔ یہ شخص بنیادی طور پر ممبئی کا اصل مالک ہوتا ہے اور ممبئی کی بھارت سے لیکر سیاست تک ہر شعبہ اس کی انگلیوں پر پانچتا ہے، ممبئی میں اس کی اجازت کے بغیر پتہ تک نہیں مل سکتا۔ یہ ”بھائی“ فوج کی طرح کام کرتا ہے۔ اس کے ہزاروں کارکن شہر میں بکھرے ہوتے ہیں یہ لوگ اسے ہل ہل کی خبر دیتے رہتے ہیں۔ بھائی انکیشن میں اپنی مرضی کے لوگوں کو منتخب کراتا ہے، یہ پولیس چیف تک تبدیل کر دیتا ہے۔ ”بھائی“ کے خاص کارندے ”چھوٹے“ کہلاتے ہیں۔ یہ چھوٹے ”بھائی“ کے جانثار ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے بھائی کی عزت اور خدمت کا خیال رکھنا۔ یہ بھائی کی آن، شان اور جان پر اپنی اور اپنے خاندان کی جان قربان کر دیتے ہیں۔ چھوٹوں کے گھر میں آٹا ہو یا نہ ہو، ان کی بیوی کو دوا ملے یا نہ ملے، ان کے باپ کو کفن نصیب ہو یا نہ ہو اور ان کے سر پر چھت ہو یا نہ ہو انہیں اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی یہ لوگ بس بھائی کے لیے جیتے اور بھائی کے لیے مرتے ہیں۔ ان بھائی لوگوں کی روایات بھی بڑی دلچسپ ہیں مثلاً یہ لوگ جب اپنے ساتھیوں کو جمع کرتے ہیں تو ایک کو ڈور ڈوبولتے ہیں ”فلاں نے بھائی کو گالی دی“ یہ کوڈ ورڈ سن کر تمام غنڈے جمع ہو جاتے ہیں اور ”تو نے بھائی کو گالی دی“ کا غرہ لگا کر ہدف پر ہل پڑتے ہیں۔

میں پچھلے پانچ برسوں سے جب بھی اخبارات پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے امریکہ پاکستان کا

”بھائی“ بن چکا ہے اور پاکستان نے بین الاقوامی سطح پر اپنے لیے چھوٹے کا کردار منتخب کر لیا ہے لہذا دنیا کے کسی بھی کونے میں کوئی شخص امریکہ کی عزت اور حرمت کی طرف انگلی اٹھاتا ہے تو ہم فوری طور پر ”تو نے بھائی کو گالی دی“ کا نعرہ لگاتے ہیں اور ہدف پر ہل پڑتے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو آپ شمالی اور جنوبی وزیرستان کو دیکھ لیجئے، ہم وہاں کیا کر رہے ہیں، امریکہ کا خیال ہے ان بچھڑے بے آب و گیاہ اور دور دراز علاقوں میں دہشت گرد پروان چڑھ رہے ہیں امریکی ماہرین کو خدشہ ہے یہ دہشت گرد بچھڑوں اور گھونڈوں پر بیٹھ کر امریکہ پہنچ جائیں گے اور مسواکوں اور تسمیحوں سے امریکہ کو تباہ کر دیں گے۔ امریکہ کو اٹانے کے فریبوں، ناداروں اور بے بس لوگوں سے خطرہ ہے لہذا ہم لوگ امریکہ کی محبت میں ان لوگوں پر گولیاں اور گولے برس رہے ہیں۔ ہماری چھوٹا گیری کا یہ عالم ہے امریکہ کے کسی دانشور کو خواب میں اسامہ بن لادن نظر آ جاتا ہے تو ہم فوراً اسامہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی امریکی کلرک کو سڑک میں حکمت یار یا ملا عمر کی نشاندہی کر دیتا ہے تو ہم پورا علاقہ چھان مارتے ہیں اور ہم ”بھائی“ کی خدمت کرتے ہوئے یہ تک بھول جاتے ہیں اس وقت ہمارا سارا ملک لاء اینڈ آرڈر کے شدید مسائل کا شکار ہے۔ صوبہ سرحد میں ڈی آئی جی قتل ہو رہے ہیں، لاہور جیسے شہر میں ڈی آئی جی کو لٹیرے لوٹ رہے ہیں اور ہمارے آئی جی یہ اعتراف کر رہے ہیں پنجاب میں بچپوس تیس مافیاز ہیں اور ان مافیاز نے پورے صوبے کو بری حال بنا رکھا ہے۔ ہم ”بھائی“ کی خدمت کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں پاکستان کے پانچ بڑے شہروں میں روزانہ دو سے چار ہزار وارداتیں ہوتی ہیں اور ہمارے مونیٹرنگ سے اب ڈاکوؤں سے محفوظ نہیں رہی، ہم رات کو بچے کے بعد کسی براج روڈ پر سڑ نہیں کر سکتے اور مغرب کے بعد ملک میں حکومت عملاً ختم ہو جاتی ہے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں پاکستان کے تمام بڑے شہروں کے دفاتروں اور گھروں کے باہر سیکورٹی گارڈز کھڑے ہیں، ہمیں ہر دوسری گاڑی میں ایک سیکورٹی گارڈ اور کلاسکوف دکھائی دیتی ہے، تمام صاحب ثروت لوگوں کی گاڑیوں کے آگے پیچھے اب سیکورٹی کی گاڑیاں ہوتی ہیں، لوگ اپنے بچوں کو ”سیکورٹی کور“ میں سکول بھجاتے ہیں، ہمارے پولیس افسروں تک نے ذاتی گاڑیوں کو کھے ہوئے ہیں اور ہمارے ملک میں سیکورٹی کا یہ عالم ہے میرے ایک دوست نے اپنے والد کے لیے گاڑی رکھ لئے ہیں۔ یہ گاڑی والد صاحب کو مسجد میں نماز پڑھاتے ہیں اور میرے دوست کے بزرگ جب نماز کیلئے نکلتے ہیں تو گاڑی انہیں سیکورٹی کور دیتے ہیں اور ختمی دیر بزرگ مسجد میں رہتے ہیں گاڑی ان کے پیچھے کھڑے رہتے ہیں۔ موبائل اور بس کا چھینا جانا ہمارے معمول کا حصہ بن چکا ہے۔ صرف کراچی شہر میں روزانہ تین ہزار موبائل چھینے جاتے ہیں، ملک میں ڈاکوؤں کی یہ حالت ہے آپ کسی دن کا اخبار کھول کر دیکھ لیں آپ کو اس میں دس بیس ڈاکوؤں کی خبر ضرور ملے گی۔ عوام اس صورتحال کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ وہ روز لٹتے ہیں لیکن وہ قہانے نہیں جانتے۔ لاء اینڈ آرڈر کی یہ حالت ہے اب لوگ قتل کے خلاف رپورٹ درج کرانے کی بجائے خود انصاف کرتے ہیں اور چپ چاپ پھانسی چڑھ جاتے ہیں، اس وقت ملک میں ریکارڈ اشتہاری موجود ہیں اور پولیس کو کسی بھی دور میں اتنے لوگ مطلوب نہیں تھے، پچھلے سال پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ لوگوں کو پھانسی کی سزا ہوئی اور ملک میں امن وامان کی یہ حالت ہے وزیر اعلیٰ پنجاب تک پولیس کو یہ دھمکی دینے پر مجبور

ہو چکے ہیں کہ اگر کوئی ایسی ایجنٹ اوکاٹم نہیں کرے گا تو اسے نوکری سے فارغ کر دیا جائے گا لیکن حکومت ان حالات پر توجہ کی بجائے "بڑے بھائی" کی خدمت میں مصروف ہے۔

آپ ملک میں لاء اینڈ آرڈر کی صورتحال دیکھتے دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی سپریم کورٹ نے پولیس کی تنخواہیں زونے کی دھمکی دی ہے۔ لوگ ملک میں بجلی کا بل جمع کرانے کے لیے ڈاکے مارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، بچوں کی لڑائیاں قتل و غارت گری تک پہنچ جاتی ہیں، پاکستان میں خالص دوا ملتی ہے اور نہ پانی اور آٹا، ہمارے ایک وفاقی وزیر پچھلے دنوں افریقہ سے بہرے سمنگ کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ ہاؤسنگ سکیمیں لوگوں کے اربوں روپے لوٹ کر کھا گئیں، لوگوں نے نیپ کو "انٹیکشن کمیشن" کا نام دے دیا ہے اور ملک میں شراب کے کنٹینرز کے کنٹینرز آ رہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں، ملک میں مسجدیں فرقہ واریت کا میدان جنگ بن چکی ہیں۔ اسلام کے نام پر بننے والے ملک میں ہر محرم پر سکيورٹی ارٹ ہو جاتی ہے۔ ملک میں عاشرہ پر موٹر سائیکل کی دوسری سواری پر پابندی لگ جاتی ہے اور اس ملک میں لوگ رائفلوں کے سائے میں جنازے پڑھتے ہیں لیکن ہماری حکومت کے پاس ان مسائل کے لیے کوئی وقت نہیں، ہم نے آج تک اس ملک میں جعلی دواؤں، جعلی خوراک اور جعلی ہاؤسنگ سکیموں کے خلاف کوئی آپریشن نہیں کیا۔ ہمارے پاس ناجائز تجاوزات تک دور کرنے کیلئے وقت نہیں۔ انسانی سمگلرز دس لاکھ روپے لے کر ہمارے نوجوانوں کو مرنے کے لیے ایران کے بارڈر پر چھوڑ آتے

ہیں لیکن ہمارے پاس ان انسانی سمگلروں سے نمٹنے کیلئے بھی وقت نہیں اور ہمارے پاس ڈاکوؤں، رسرہ گیروں اور چوروں سے مقابلے کے لیے وقت نہیں۔ آپ ذرا غور کیجئے ہم لوگ 18 سو کھیلو میٹر لمبی افغان سرحد کی ذمہ داری تو اٹھالیتے ہیں لیکن ہم کراچی، لاہور، پشاور اور فیصل آباد کے شہریوں کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ ہم امریکیوں پر ہونے والے حملوں کی روک تھام تو کر سکتے ہیں اور ہم لوگ برطانیہ کے طیاروں کو لاقانونی خطرات کا چیلنجی اندازہ تو لگا سکتے ہیں لیکن ہم لاہور میں ڈی آئی جی کو قتل کرنے سے نہیں بچا سکتے، ہم لاہور اور کراچی کے شہریوں کی طرف بڑھتے خطرات کا اندازہ نہیں لگا سکتے، ہمارے پاس سات سمندر پار لینے صدر بش کے لیے تو وقت ہے لیکن ہمارے پاس اپنے ہمسائے میں بیٹھے اس بشر کیلئے کوئی وقت نہیں جس کے ٹکس، جس کے خون اور جس کے پسینے سے یہ ملک چل رہا ہے۔ ہم امریکہ اور امریکی مفادات کی حفاظت تو کر سکتے ہیں لیکن ہم اپنے شہریوں کی جان اور مال کا احساس نہیں کر سکتے میرا خیال ہے ہم پوری طرح چھوٹے بن چکے ہیں اور اب دنیا میں ہماری طرف اور صرف ایک ہی ذمہ داری رہ گئی ہے ہم صرف بھائی لوگوں کی خدمت کریں اور ہم بھائی کو گالی دینے والوں سے انتقام لیتے رہیں میرا بھی کبھی دل چاہتا ہے میں "بڑے بھائی" جناب صدر بش سے درخواست کروں وہ ہمارے حکمرانوں کو فون کریں اور انہیں یہ دھمکی دیں "تم لاء اینڈ آرڈر ٹھیک کر دو ورنہ ہم تمہارا تو راہورہ بنا دیں گے" میرا خیال ہے ہمارے ملک میں اب لاء اینڈ آرڈر صرف اسی وقت ٹھیک ہو سکتا ہے جب امریکہ کو پاکستان میں ایک اچھی پولیس درکار ہوگی جب انکل سام جی چاہیں گے اور جب تک وہ وقت نہیں آتا ہم اسی طرح بھائی لوگوں کی خدمت کرتے رہیں گے۔



جادوگر

جان غیر ملکی صحافی ہے وہ تھائی لینڈ میں ایک امریکی اخبار کا بیورو چیف ہے ایشیا کے چار ممالک پاکستان، افغانستان، ایران اور بھارت بھی اس کے دائرہ کار میں آتے ہیں وہ خبروں کی تلاش میں اکثر پاکستان آتا رہتا ہے وہ جب بھی پاکستان آتا ہے تو اس کے ساتھ میری ملاقاتیں رہتی ہیں۔ وہ چند روز پہلے ایم کیو ایم ایٹو کی کوریج کیلئے اسلام آباد آیا ہم دونوں ڈنر کے لئے دامن کوہ چلے گئے وہاں ہماری حالات حاضرہ پر گپ شپ شروع ہو گئی اس گپ شپ کے دوران جان نے بڑے پتے کی بات کہی اس نے کہا ”دنیا میں عورت ’انٹیشن اور کرکٹ کے بارے میں ڈیشن گوی نہیں کی جاسکتی“ میں نے پوچھا ”وہ کیسے“ وہ مسکرا کر بولا ”عورت کے سوڈز میں بڑی تیزی سے تبدیلی آتی ہے وہ پانچ منٹ میں قبضہ بھی لگا سکتی ہے دھمازیں مار کر رو بھی سکتی ہے اور انہی پانچ منٹوں میں کسی کے سر پر گلابھی مار سکتی ہے“ میں نے اثبات میں سر ہلادیا ”جان بولا ”انٹیشن بھی عورت کی طرح ہوتے ہیں ان کے سوڈز کے بارے میں بھی ڈیشن گوی نہیں کی جاسکتی“ جان کا کہنا تھا ”ڈر اور بیٹ بکس کے درمیان پانچ فٹ کا فاصلہ ہوتا ہے لیکن یہ دنیا کا حساس اور قیمتی ترین فاصلہ ہوتا ہے اس پانچ فٹ کے فاصلے کے دوران 30 فیصد ڈر اپنا فیصلہ تبدیل کر لیتے ہیں اور 30 فیصد ڈر کی یہ تبدیلی ہزاروں لاکھوں لوگوں کا مقدر بدل دیتی ہے“ میں نے اثبات میں سر ہلادیا ”وہ مسکرایا۔“ کرکٹ بھی عورت اور انٹیشن کی طرح ہوتی ہے اس کھیل میں آخری گیند پر ایک چھکا ہاری ہوئی ٹیم کو فتح یا بک کر دیتا ہے اور ایک وکٹ کرنے پر جیتی ہوئی ٹیم ہار جاتی ہے اس کھیل میں کسی وقت ایک باؤلر اچھا بیٹسٹین ثابت ہو سکتا ہے اور کسی بھی وقت ایک بیٹسٹین باؤلر بن سکتا ہے ”وہ خاموش ہو گیا۔“

میں نے قبضہ لگایا اور بڑے پیار سے عرض کیا ”جان تم پوری دنیا کے بارے میں یہ رائے دے سکتے ہو لیکن جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ہم دنیا کی پہلی سائنسی قوم ہیں جس نے کم از کم کرکٹ اور انٹیشن کو ڈیشن گوی کے قابل بنا دیا“ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا ”میں نے عرض کیا ”جب ہماری ٹیم میدان میں اترتی ہے تو گولمنڈی کے بٹ صاحب تک کو کھیل کے نتیجے کا پتہ ہوتا ہے وہ سچ دس بجے اعلان کر دیتے ہیں شام کو کون سی ٹیم جیتے گی اور ان کی ڈیشن گوی سو فیصد سچ ثابت ہوتی ہے“ جان نے جذباتی ہو کر کہا ”تم لوگوں کے بٹ تو بڑے جینکس ہیں“ میں نے عرض کیا ”ہمارے بٹ نہیں ہمارے بٹی بڑے جینکس ہیں“ اس نے قبضہ لگایا اور اس کے بعد بولا ”اور انٹیشن“ میں نے قبضہ لگایا اور اس سے الٹا سوال پوچھا ”آگر آج امریکہ میں رانا، انٹیشن، جہا، تو کراہتا

سکتے ہو؟ سو کر بیک پارٹی اور ری پبلکن پارٹی کا صدر کون ہوگا؟“ اس نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا، میں نے مسکرا کر جواب دیا، ”لیکن ہم پاکستان میں پارٹی انکیشن سے پہلے یہ پیش گوئی کر سکتے ہیں کون صاحب کس پارٹی کے صدر منتخب ہونگے“ اس نے تھوڑی دیر سوچا اور بھر مسکرا کر بولا ”مثلاً“ میں نے جواب دیا ”مثلاً تم نے کچھلی ملاقات میں مجھ سے پوچھا تھا، مسلم لیگ ق کے صوبائی ایکشنوں میں کون کون صدر منتخب ہوگا“ میں نے تمہیں بتایا تھا، پنجاب سے چوہدری پرویز الہی، بلوچستان سے جام یوسف اور سندھ سے ارباب غلام رحیم منتخب ہوں گے“ آج دیکھ لو یہ حضرات صدر منتخب ہو چکے ہیں“ اس نے فوراً ہاں میں سر ہلا دیا، میں نے عرض کیا ”تمہیں معلوم ہے مجھے یہ کس نے بتایا تھا“ اس نے انکار میں سر ہلا دیا، میں نے مسکرا کر جواب دیا ”میرے ذرا بیور نے“ وہ چونک کر سیدھا بیٹھ گیا اور حیرت سے بولا ”تمہارا ڈرائیور بھی چیٹس ہے“ میں نے انکار میں سر ہلا دیا ”صرف میرا ڈرائیور نہیں بلکہ اس ملک کے ساڑھے چار کروڑ لوگوں کو اس کا علم تھا، ہم میں سے ہر شخص ایکشن کشن ہے اور ہر شخص پولیٹیکل چیٹس ہے، ہم سب پارٹی انکیشن سے ایک دو سال پہلے اس کے نتائج سے واقف ہو جاتے ہیں“ جان سر ہلا کر بولا ”بڑی حیران کن بات ہے“ میں نے عرض کیا ”میں تمہیں مزید حیران کن بات بتاتا ہوں، چند دن بعد مسلم لیگ ق کے مرکزی صدر کے انکیشن ہوں گے“ میں آج پیش گوئی کرتا ہوں اس انکیشن میں چوہدری شجاعت حسین صدر منتخب ہوں گے“ اس نے حیران ہو کر کہا ”ڈونٹ نیل می“ تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو“ میں نے عرض کیا ”جس طرح میں نے صوبائی صدور کے بارے میں وثوق سے دعویٰ کیا تھا، اسی طرح تم آج لکھ لو دنیا ادھر سے ادھر ہو سکتی ہے لیکن مسلم لیگ قائد اعظم کے صدر چوہدری شجاعت ہی ہونگے اور جب تک صدر پرویز مشرف برسر اقتدار ہیں چوہدری صاحب منتخب ہوتے رہیں گے“

اس نے تھوڑی دیر سوچا اور سنجیدگی سے بولا ”میں نے پچھلے دنوں ذرا اٹلی پنجاب چوہدری پرویز الہی کا ایک بیان پڑھا تھا، اس بیان میں چیف منسٹر نے دعویٰ کیا تھا وہ جنرل پرویز مشرف کو موجودہ اسمبلیوں سے دوبار صدر منتخب کر سکتے ہیں“ مجھے سمجھ نہیں آئی جس چیز کی آئین اور قانون میں ایک بار انتخاب ہو جو وہ نہیں تمہارے چیف منسٹر وہ کام دوبار کیسے کرانیں گے“ میں نے تہتہ لگایا اور تھوڑا سا سوچ کر جواب دیا ”وہ ایک چیٹس سیاستدان ہیں اگر انہیں یہ ناسک دے دیا جائے تو میرا دعویٰ ہے وہ یہ کام اٹھارہ مرتبہ کر سکتے ہیں“ جان پریشان ہو گیا، اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور تھکی تھکی آواز میں بولا ”لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟“ میں ذرا سا آگے جھکا اور آہستہ آہستہ عرض کیا ”ہمارے مسلم لیگی قائدین جاوہر جی، یہ لوگ اگر کرنے پر آجائیں تو پوری دنیا کو حیران کر سکتے ہیں“ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور پریشان لہجے میں پوچھا ”مثلاً“ میں نے فس کر جواب دیا ”مثلاً یہ ملک محمد علی جناح نے بنایا تھا اور محمد علی جناح کو قائد اعظم ان کی بہن محترمہ فاطمہ جناح نے بنایا تھا لیکن ہماری مسلم لیگ نے صدر ایوب خان کی محبت میں اسی فاطمہ جناح کو انکیشن میں شکست دے دی تھی“ یہ مسلم لیگ کی تاریخ ہے یہ جب ٹھان لیٹی ہے تو یہ فاطمہ جناح تک کو خاطر میں نہیں لاتی، مجھ یقین ہے اگر آج قائد اعظم زندہ ہوتے تو وہ بھی مسلم لیگ ق کے ہاتھوں شکست کھا جاتے“



نمک کی چٹان پر گنا

ہمارے محبوب وزیر اعظم جناب شوکت عزیز 1982ء سے 1984ء تک ملائیشیا میں رہے ہیں، وہ ملائیشیا میں شی بیگ کے کنٹری چیف آفیسر تھے، پچھلے دنوں انہوں نے ایک محفل میں ملائیشیا میں اپنے قیام کی چند یادیں دہرائیں، انہوں نے بتایا ملائیشیا میں ایک دن وہ گیلوں کو پانی دے رہے تھے، ان کی ذرا سی بے احتیاطی سے پانی گیلے سے باہر گر گیا اور فرش گیلیا ہو گیا، ملائیشیا میں گندۃ الناجرم ہے چنانچہ انہیں سوڈا لہر جرمانہ ہو گیا، انہوں نے معافی طلبی کی بڑی کوشش کی لیکن انہیں یہ جرمانہ بہر حال ادا کرنا پڑا، وزیر اعظم نے یہ واقعہ کیوں سنایا؟ میں پچھلے پانچ چھ دن سے حیران ہوں، شاید وزیر اعظم اس واقعے سے ملائیشیا میں ”رول آف لاء“ کی صورت حال بتانا چاہتے ہوں، شاید وہ ملائیشیا میں صفائی کی اہمیت ثابت کرنا چاہتے ہوں یا وہ پاکستان میں قانون کی صورت حال اور ہمارے گھروں سے سڑکوں تک پھیلی گندگی کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہوں، یہ بتانا چاہتے ہوں ایک اسلامی ملک صفائی کو کس قدر سنجیدہ لیتا ہے، میں ابھی تک حیران ہوں، اگر ہم صفائی کا پس منظر دیکھیں تو اسلام دنیا کا پہلا مذہب تھا جس کا آغاز صفائی سے ہوا، اسلام کے ابتدائی دنوں میں جب کوئی شخص اسلام قبول کرتا تھا تو نبی اکرمؐ سے سب سے پہلے طہارت اور وضو کا طریقہ سکھاتے تھے، نہینہ منورہ میں ایسے صحابہ کرامؓ موجود تھے جو ایک وضو سے پانچ نمازیں ادا کرتے تھے، پاکیزگی اس دور میں تقویٰ کا حصہ ہوتی تھی، نہینہ منورہ تمام لوگوں کے لباس صاف اور خوشبودار ہوتے تھے، اسلام کے ابتدائی دنوں میں نبی رسالتؐ اور صحابہ کرامؓ کے پاس ستر ڈھانپنے کے لئے صرف دو چادریں ہوتی تھیں، اور ان پر بھی دس دس بیس بیس پونڈ لگے ہوتے تھے، لیکن دونوں چادریں پاک اور صاف ہوتی تھیں، اسلام پہلا مذہب تھا جس نے ماحول کی صفائی کو عبادت کا درجہ دیا، اسلام نے سب سے زیادہ ماحول کو باقاعدہ معاشرے کا حصہ بنایا، آپؐ نے فرمایا اگر میرے ہاتھ میں ایک سوکھی ٹہنی ہو اور دوسری طرف صور اسرافیل بھونکا جا رہا ہو تو میں یہ ٹہنی فوراً زمین میں بوردوں گا، اسلام جانوروں کو گلیوں، ہزاروں میں کھلا چھوڑنے کے خلاف تھا، راستے میں کھوٹا گاڑنے اور گھروں کا گند دروازے کے باہر پھینکنے کو انتہائی ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا تھا، اس کے برعکس اگر آپؐ اس زمانے کے دوسرے مذاہب اور معاشروں کا جائزہ لیں تو آپؐ کو ان میں صفائی کا یہ تصور نہیں ملے گا، میں حیرت میں ہوں، وارسائی فرانسسکی فرانسسکی بادشاہوں کا گرمانی دار الحکومت تھا، وہاں بادشاہوں کے محلات تھے، یہ محلات 1789ء کے

فریج انقلاب کے بعد خالی کرائے گئے اور وہ اب عجیب گھر بن چکے ہیں یہ انتہائی خوبصورت اور پرچشم عمارت ہیں ان کی چھتوں پر سونے سے تصویریں بنی ہیں اور دہلیز سے لے کر باغوں تک سنگ مرمر نصب ہے لیکن اس پورے محل میں کوئی غسل خانہ اور کوئی ٹوائلٹ نہیں! میں نے عمارت کی سیر کے بعد سوچا "بادشاہ لوگ بوقت ضرورت کہاں جاتے تھے" پتہ چلا بادشاہ سلامت تخت پر بیٹھے بیٹھے اشارہ کرتے تھے اور خادم سونے کا پیالہ لے کر حاضر ہو جاتے تھے اور بادشاہ سلامت وہیں بیٹھے بیٹھے فارغ ہو جاتے تھے جبکہ درباریوں کے لئے دربار سے ذرا سا ہٹ کر پردے لگے تھے اور ان پردوں کے پیچھے خادم پتیل کی باللیاں لے کر کھڑے ہوتے تھے درباری ان ہالٹیوں میں پیشاب کرتے تھے درباریوں کی فراغت کے بعد پردے کے آگے پیچھے خوشبو چھڑک دی جاتی تھی 'فرانس کی پرفیوم انڈسٹری نے انہیں پردوں سے جنم لیا تھا' پتہ چلا فرانس کا پہلا ٹوائلٹ 1852ء میں بنا تھا اور 1902ء میں پیرس کے لوگوں کو نہانے پر مجبور کرنے کیلئے باقاعدہ قانون سازی کرنا پڑی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں قرطبہ کی اسلامی حکومت نے 785ء میں شہر کا پہلا سیوریج سسٹم بنایا تھا! اموی دور میں قرطبہ شہر کے ہر گھر میں ٹوائلٹ اور غسل خانہ ہوتا تھا پورے شہر میں پبلک ٹوائلٹس اور غسل خانے بھی تھے ان غسل خانوں اور ٹوائلٹس کے آثار آج بھی موجود ہیں چند رحویں صدی میں اندلس کی اسلامی ریاست کے زوال کے بعد فرڈینینڈ نے قرطبہ کے محل سے ایک غسل خانہ اکھاڑا اور یہ غسل خانہ ملکہ ازابیلہ کو تحفے میں دے دیا! عباسی خلفاء کے دور میں بغداد سے لے کر سرقد تک درخت کاٹنے اور سڑکوں پر گند پھیلانے کی سزاؤں کوڑے ہوتی تھی اور مجرم کو اس سزا کے بعد شہر میں سوراخت بھی لگانا پڑتے تھے اور وہ دن تک سڑک پر جھاڑو بھی دینا پڑتا تھا اور امیر تیمور کے دور میں سرقد دنیا کا صاف ترین شہر تھا یہ وہ ادوار تھے جب یورپ اپنے بدترین دور سے گزر رہا تھا 'لندن میں ٹخنوں تک کچڑ اور لید ہوتی تھی اور دنیا کا کوئی فاتح اس گندے جزیرے پر پاؤں تک رکھنا پسند نہیں کرتا تھا لیکن پھر یورپ جاگا اور اس نے محسوس کیا ترقی اور صفائی کا ایک دوسرے سے انگوٹھی اور ٹکینے کا تعلق ہے اور جب تک کوئی قوم صفائی کو اپنا پورا ایمان نہیں بناتی اس وقت تک وہ ترقی یافتہ اقوام کی فہرست میں شامل نہیں ہو سکتی لہذا یورپ نے اسلام کے فلسفہ صفائی کو قانون بنا دیا جس کے نتیجے میں یورپ ترقی کے اس مقام پر چلا گیا جو اس وقت پورے عالم اسلام کی خواہش ہے آپ آج دنیا کی تمام ترقی یافتہ اقوام کا دورہ کر لیں آپ کو ان سب میں ایک چیز مشترک ملے گی اور وہ چیز ہوگی صفائی! اسی طرح آپ دنیا کے تمام پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں بھی جا کر دیکھ لیں آپ کو وہاں بھی ایک چیز مشترک نظر آئے گی اور وہ چیز ہوگی گندگی! آپ کو تمام پسماندہ ممالک کی گلیاں بازار سڑکیں اور گھر گندے ملیں گے آپ کو وہاں بدبو بڑی گڑبغا اور کچرا ملے گا اور بد قسمتی سے آج پورا عالم اسلام بدبو اور پسماندگی کا دار الحکومت ہے! گندگی کے اس دار الحکومت میں ہمیں صرف ملائیشیا مختلف نظر آتا ہے۔ ملائیشیا کی ترقی کا آغاز بھی صفائی سے ہوا تھا! مہاتیر محمد نے 1980ء میں صفائی کو قانون کی شکل دی تھی! 1980ء میں ملائیشیا میں گند ڈالنے اور پھیلانے والوں کیلئے بھاری جرمانے طے کئے گئے تھے اور ان سزاؤں پر پورا عملدرآمد ہوا تھا لہذا آج ملائیشیا اسلامی دنیا کا واحد ملک ہے جس میں آپ کو یورپی معیار کی صفائی اور سترائی ملتی ہے! آپ کو کوالا لپور شہر میں فائینو سٹار ہوٹلوں کے معیار کے پبلک ٹوائلٹس ملتے ہیں اور آپ کو کسی شہر کی کسی

سڑک پر بڑھا اور شوہر کھائی نہیں دیتا۔

ملائیشیا کے مقابلے میں ہم اگر جناب شوکت عزیز کے پاکستان کا جائزہ لیں تو ہمیں اس ملک کی کوئی سڑک صاف لگتی ہے اور نہ ہی کوئی گلی کوئی محلہ آپ کراچی سے اسلام آباد تک دیکھ لیں آپ کو یقین نہیں آئے گا یہ اسی شوکت عزیز صاحب کا ملک ہے جن کی زندگی کا بڑا حصہ دنیا کے ترقی یافتہ اور صاف ستھرے ملکوں میں گزارا تھا آپ کو یقین نہیں آئے گا یہ شوکت عزیز صاحب جیسے وزیر اعظم کا ملک ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ میرا خیال ہے اس کی وجہ ہمارے وزیر اعظم کی ترجیحات ہیں ان کی ترجیحات میں تمام چیزیں موجود ہیں لیکن ان میں صفائی کی کوئی گنجائش نہیں۔ وزیر اعظم اس ملک کو ترقی یافتہ ملک دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ بھول جاتے ہیں ترقی صفائی کی "بانی پراڈکٹ" ہوتی ہے اور جس ملک کے عوام گھر کا کچرا گلی میں پھینک رہے ہوں یا سگریٹ نوشی اور بوتلیں سڑک پر پھینک رہے ہوں وہ ملک ترقی نہیں کر سکتا، ملکوں کی ترقی ٹوائٹلس، ہاتھ روحو اور کچرے کی ٹوکریوں سے شروع ہوتی ہے اور جو قومیں اپنی "ایلیٹ ٹرے" تک صاف نہیں کرتیں وہ جدید دور میں داخل نہیں ہو سکتیں ہمارے وزیر اعظم بھول جاتے ہیں امریکہ ہوسٹنگا پور ہو یا مہاتیر محمد کا ملائیشیا ترقی صفائی کے پیٹ سے جنم لیتی ہے اور جو قومیں صفائی کو اپنا ایمان نہیں بنا تیں ترقی کبھی ان کا مقدر نہیں بنتی اور صفائی کے بغیر ترقی کا خواب دیکھنا تک کی چٹان پر گناہ اگانے کی خواہش سے مختلف نہیں۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com



خواہشوں کا دن

24 ستمبر کو ہم ایسٹرن ٹائم سے بیس روانہ ہوئے، مخدوم عباس گاڑی چلا رہے تھے، مخدوم صاحب کے لاہور لیے ہیں، وہ تین برس قبل یورپ آئے اور انہوں نے سویڈن میں چاولوں کی پراسیسنگ کا بزنس لگایا، اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور ان کا کاروبار دنوں میں پورے یورپ میں پھیل گیا، وہ اس وقت یورپ میں تیزی سے ترقی کرنے والے پاکستانوں میں شمار ہوتے ہیں، وہ مجھ سے ملنے کے لئے سویڈن سے ایسٹرن ٹائم تشریف لائے تھے، ہم دونوں 24 ستمبر کی شام بیس کے لئے روانہ ہوئے تھے، جب ہم پہنچے تو اچانک برادر طارق بھٹی کا فون آ گیا، طارق شریف بھٹی گوجر خان کے رہنے والے ہیں، اٹلی میں ان کی ٹیلی کمیونیکیشن کی کمپنی ہے، ان کی کمپنی یورپ کے گیارہ ملکوں میں کام کرتی ہے اور اٹلی کی ٹیلی کمیونیکیشن انڈسٹری میں ان کا شیئر 35 فیصد ہے، انہوں نے بیس میں جرائیں بیچنے سے عملی زندگی کا آغاز کیا تھا لیکن صرف 30 برس بعد وہ نہ صرف یورپ کے خوشحال ترین پاکستانی ہیں بلکہ اٹلی کے صدر تک ان کے نام اور کام سے واقف ہیں، پاکستان میں صدر پرویز مشرف اور وزیر اعظم شوکت عزیز کے ساتھ ان کے دیرینہ مراسم ہیں، طارق بھٹی کی آواز میں پریشانی تھی، ان کا کہنا تھا پاکستان میں دوپہر سے مختلف افواہیں گردش کر رہی ہیں۔ بعض لوگ کہہ رہے ہیں امریکہ میں صدر پرویز مشرف کو ہارٹ ایٹک ہو گیا ہے، چند لوگوں کا کہنا ہے پاکستان میں فوج کے جو نیر افسروں نے حکومت کا تختہ الٹ دیا ہے، بعض لوگ دعویٰ کر رہے ہیں صدر مشرف نے وزیر اعظم شوکت عزیز کی حکومت معطل کر دی ہے اور ان کی جگہ سید شاہد حسین کو وزیر اعظم بنا دیا ہے اور بعض لوگ کہہ رہے ہیں چوہدری شجاعت حسین کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اور شوکت عزیز نے مسلم لیگ ق کے صدر کا عہدہ بھی سنبھال لیا ہے وغیرہ آپ مہربانی فرما کر پاکستان فون کریں اور حالات کا جائزہ لیں، میں نے فوری طور پر پاکستان میں مختلف دوستوں سے رابطے کئے، معلوم ہوا ساری اطلاعات محض افواہیں، خدشات اور خواہشیں ہیں، اصل واقعہ بجلی کا طویل بریک ڈاؤن ہے، پاکستان کی تاریخ میں بجلی بارگراچی سے لنڈی کوتل تک بجلی بند ہوئی ہے اور واپٹا بریک ڈاؤن کی اصل وجوہات تلاش نہیں کر سکا، یہ بریک ڈاؤن آہستہ آہستہ افواہوں کی شکل میں دھل گیا اور یہ افواہیں جوں جوں آگے بڑھیں لوگ ان میں اپنی اپنی خواہشیں اور اپنے اپنے خدشات شامل کرتے چلے گئے یہاں تک کہ حکومت

کے مخالفین نے مشائیاں خریدنا شروع کر دیں لیکن جوں ہی بجلی بحال ہوئی لوگوں کے ٹیلی ویژن آن ہوئے اور انہیں اپنے محبوب وزیراعظم کی زیارت نصیب ہوئی تو یہ انہوں نے دم توڑنے لگیں یہاں تک کہ رات تک حالات پوری طرح حکومت کے "قابو" میں آگئے۔ میں نے طارق علی کے تمام خدشات دور کر دیئے وہ مطمئن ہو گئے لیکن میں اور محمد مہاسن انہوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔

ہمارے ملک میں انہوں نے کیوں پیدا ہوتی ہیں اور لوگ انہوں پر کیوں یقین کر لیتے ہیں لوگ صدر پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز کے مستقبل کے بارے میں خدشات کا کیوں شکار ہوتے ہیں اور لوگ معمولی معمولی انہوں پر طوائف کی دکان کی طرف کیوں دوڑ پڑتے ہیں یہ سوال انتہائی اہم ہیں میرا خیال ہے اگر حکومت ان سوالوں پر غور کر لے اور اگر ہمارے حکمران ان وجوہات کا جائزہ لے لیں تو شاید مستقبل میں کبھی وہ وقت نہ آئے جب عوام صرف بڑے بڑے بڑے نتائج اخذ کرنا شروع کر دیں جب لوگ ٹیلی فون، ٹیلی ویژن اور موبائل سروس بند ہونے پر مشائیاں خریدنا اور تقسیم کرنا شروع کر دیں 24 ستمبر 2006ء کا دن ثابت کرتا ہے لوگ حکومت کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں اور پندرہ سولہ کروڑ لوگوں کے دلوں میں کہیں نہ کہیں حکومت کی تبدیلی کی خواہش موجود ہے اور حکومت بھی عوام کی اس خواہش سے آگاہ ہے لہذا وزیراعظم شوکت عزیز تک کو اپنی حکومت کی یقین دہانی کے لئے پورے میڈیا کے ساتھ یوٹیٹیٹی شور جانا پڑا اور بجلی کی بحالی کے بعد وزارت اطلاعات کو وزیراعظم شوکت عزیز کو ٹیلی ویژن سکرین پر پہنچانے کے لئے پوری طاقت صرف کرنا پڑی اور پنجاب حکومت کو اپنے ناظموں کو حکم دینا پڑا وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بتائیں حکومت اپنی جگہ قائم ہے اور جس کسی نے اس اطلاع پر سنجیدہ ہونے کی کوشش کی اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے حکومت کی ہدایت پر ناظم اپنے گھروں اور دفتروں سے نکلے اور انہوں نے "گرس روٹ لیول" تک جا کر لوگوں کو حکومت کی یقین دہانی کرانی شروع کر دی میرے ایک دوست نے بتایا بعض ناظم و قوادری میں اتنے آگے نکل گئے کہ انہوں نے رکشوں پر لاؤڈ سپیکر رکھ کر اعلان شروع کر دیئے "حکومت اپنی جگہ قائم ہے لہذا عوام کو زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں" میرے دوست کا کہنا تھا پنجاب کے ایک شہر میں ناظم صاحب نے مشائیاں کی تمام دکانوں پر تالے لگوا دیئے تاکہ لوگ خوشی منانے کے لئے مشائیاں نہ خرید سکیں اس دن اپوزیشن کے تمام چھوٹے بڑے لیڈروں پر بھی نظر رکھی گئی لیکن سوال یہ ہے ایسا کیوں ہے؟ لوگ حکومت کی تبدیلی کیوں چاہتے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں حکومت اپنی تمام تر خوشحالی، مقدس اصلاحات اور کامیاب سفارشات کے باوجود عوام کی توقعات پر پورا نہیں اتر رہی کہیں ایسا تو نہیں جناب شوکت عزیز کی معاشی فتوحات عوام تک نہیں پہنچ پارہیں اور جناب صدر پرویز مشرف کی اعتدال پسندی اور عوام کے درمیان بھی کوئی ان دیکھی خلیج موجود ہو کہیں ایسا تو نہیں حکومت کی کاشت کردہ خوشحالی صرف ان کے اپنے گودام تک محدود ہو اور عوام کے لئے 1993، 1999ء اور 2006ء میں کوئی فرق نہ ہو کہیں ایسا تو نہیں عوام بے نظیر بھٹو، نواز شریف اور شوکت عزیز کی حکومت میں کوئی فرق محسوس نہ کرتے ہوں اور ان کے لئے تمام حکومتیں محض ناموں کی تبدیلی ہو اور کہیں ایسا تو نہیں لوگوں کی نظر میں جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف

میں کوئی فرق نہ ہو! سوچنے کی بات ہے 12 اکتوبر 1999ء کو جس صدر پرویز مشرف کے آنے پر لوگوں نے مضامیناں تقسیم کی تھیں انہیں لوگوں نے 24 ستمبر 2006ء کو ان کے جانے کی افواہوں پر مضامیناں خریدنا شروع کر دی تھیں اور وہ لوگ جو دو برس پہلے تک وزیراعظم شوکت عزیز کو مبارکبادیں دے رہے تھے وہ 24 ستمبر کو ان کے جانے کی افواہوں پر ایک دوسرے سے گلے ل رہے تھے، کیوں؟ اس کیوں میں حکومت کی ساری کمزوریاں، ساری کوتاہیاں اور ساری مفلکتیں پوشیدہ ہیں یہ کیوں ثابت کرتا ہے لوگ حکومت کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں یہ کیوں دھوئی کر رہا ہے حکومت کی کامیابیاں اور فتوحات لوگوں تک نہیں پہنچ پارہیں اور لوگ جس سے جان چھڑانے کے لئے گرم لوکی دعائیں کر رہے ہیں، لوگ ایک جیلر کی قید سے نکل کر دوسرے جیلر کی قید میں جانا چاہ رہے ہیں یہ کیوں ثابت کرتا ہے کسی حکمران کی نیک نامی کیلئے صرف کتابیں، انٹرویوز، ٹیلی ویژن کے پروگرام، پریس بریفنگز، سیمینار، تالیاں اور عالمی اخبارات اور جرائد میں تصاویر کی اشاعت کافی نہیں ہوتی، حکمرانوں کی اصل کامیابی ان کے عوام ہوتے ہیں اور جب کسی ملک کے عوام اپنے حکمران سے خوش اور مطمئن ہوتے ہیں تو وہ معمولی واقعات کے بعد حلوانیوں کی طرف نہیں دوڑ پڑتے، یہ کیوں ثابت کرتا ہے اگر ملکوں پر اصلی لیڈروں کی اصلی حکومت ہو تو ملکوں میں ایسی افواہیں جنم نہیں لیتیں یہ کیوں ثابت کرتا ہے 24 ستمبر کا دن صرف افواہوں کا دن نہیں تھا یہ لوگوں کی خواہشوں کا دن بھی تھا، یہ لوگوں کی دعاؤں اور تمناؤں کا دن بھی تھا اور یہ کیوں ثابت کرتا ہے حکومت عوام کے دلوں میں اپنا احترام کھو چکی ہے اور عوام حکومت سے دور ہو چکے ہیں۔



تم کافر لوگ

”سناپ‘ سناپ‘ یور پرائم نمسٹرا ڈونگ سم تھنگ“ فلپ کی آواز میں حیرت بھی تھی اور اضطراب بھی میری انگلی ریوٹ کنٹرول پر رک گئی سانسے ٹیلی ویژن سکرین پر وزیراعظم شوکت عزیز عوام میں کھل رہے تھے لوگ عقیدت سے ان کے ہاتھ چوم رہے تھے ان کیلئے زندہ ہاد کے نعرے لگا رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے جبکہ وزیراعظم مختلف سالوں کا دورہ کر رہے تھے وہ ریٹ لٹینس چیک کر رہے تھے یوریوں اور تھیلوں سے وائس چاول‘ چینی اور آٹا نکال نکال کر دیکھ رہے تھے اور دکھاروں کو بھی چیزیں بیچنے پر ڈانٹ پلا رہے تھے اس نے ٹیلی ویژن کا عالم اونچا کر دیا تنہو کا سٹر جو ٹیلی آواز میں انکشاف کر رہی تھی ”وزیراعظم اچانک اسلام آباد کے جی ٹاؤن فور کے اتوار بازار پہنچ گئے اور انہوں نے وہاں عوام کے مسائل کا جائزہ لینا شروع کر دیا وزیراعظم پروٹوکول کے بغیر اتوار بازار پہنچے ان کی گاڑی ٹریفک سکنلز پر کئی رہی وہ اتوار بازار میں پیدل چلے رہے اور انہوں نے سخت گرمی‘ جھس اور بھیڑ میں لوگوں سے ہاتھ ملایا اور بڑے تحمل سے ان کی گفتگو سنی“ میں نے دیکھا وزیراعظم کے ساتھ صحافیوں اور کیمرا مینوں کا پورا سکوڑا ہے اور وہ کیمروں کی طرف دیکھ دیکھ کر سسکار رہے ہیں فلپ بڑے غور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا جبکہ میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہا تھا مجھے وزیراعظم کے عوام میں کھلنے پلنے سے پہلے یہ منظر دیکھنے کی سعادت نصیب ہو گئی۔

وزیراعظم جناب شوکت عزیز سالوں کے درمیان ٹہل رہے تھے لوگ ان کے گرد دائرہ بنا کر چل رہے تھے جبکہ دکھار ان کے جلال سے کانپ رہے تھے فلپ نے میرے ہاتھ سے ریوٹ کنٹرول لے کر آواز بند کر دی اور سسکار کر پوچھا ”وزیراعظم صاحب کیا کر رہے ہیں“ میں نے فخر سے جواب دیا ”وہ قیمتوں کا جائزہ لے رہے ہیں وہ دیکھ رہے ہیں ان کے عوام کو معیاری اور سستی چیزیں مل رہی ہیں یا نہیں؟“ فلپ مسکرایا اور اس نے گردن اٹھا کر آگے پیچھے دیکھنا شروع کر دیا یہ فلپ کا مخصوص شائل ہے وہ جب بھی لمبی چوڑی بات کرنا چاہتا ہے تو وہ سٹر مرغ کی طرح گردن اٹھاتا ہے آگے پیچھے دیکھتا ہے اور اس کے بعد اس کی زبان کے سارے بند کھل جاتے ہیں اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور چمکتی ہوئی آواز میں بولا ”کیا اتوار بازار میں قیمتوں کا جائزہ لینا

وزیراعظم کا کام ہوتا ہے" میں اس کی بات سمجھ گیا لہذا میں نے تقاضا سے جواب دیا "یہ ہماری اسلامی روایات ہیں ہمارے وزیراعظم خلفاء راشدین کی روایات پر عمل پیرا ہیں وہ حضرت عمر فاروق کی طرح ہمیں بدل کر اپنی رعایا کے حالات جاننا چاہتے ہیں" قلم نے تہمت لگایا "ڈونٹ ٹیل می یہ وزیراعظم کا کام نہیں ہوتا مہنگائی پر قابو پانا پرائس کنٹرول انسپکٹروں، میونسپل کارپوریشن کے عملے اور فوڈ اینڈ پارٹمنٹ کی ذمہ داری ہوتی ہے وزیراعظم کا کام پالیسیاں بنانا اور ان پالیسیوں پر عملدرآمد کرنا ہوتا ہے ایک فوڈ کنٹرول انسپکٹر اور وزیراعظم میں فرق ہونا چاہیے اگر ہمارے ملک میں ٹونی بلنیر ایسا کرنا تو شام سے پہلے اس کی حکومت ختم ہو جاتی" مجھے قلم کی بات عجیب لگی میں نے حیرت سے پوچھا "وہ کیوں؟" وہ بولا "ہم سمجھتے ہیں جب وزیراعظم سستے بازاروں کا جائزہ لے گا تو اس کا مطلب ہوگا برطانیہ کا فوڈ کنٹرول ڈیپارٹمنٹ صحیح کام نہیں کر رہا" اپوزیشن یہ ایساٹھانے گی اور ٹونی بلنیر کی حکومت مل جائے گی" مجھے ابھی تک اس کی بات سمجھ نہ آئی وہ میری ناگہانی بھانپ گیا چنانچہ اس نے اپنی بات جاری رکھی "چند برس پہلے ٹونی بلنیر نے اپنے چھوٹے بیٹے کیلئے نیوز کا بندوبست کیا تھا یہ بات کسی طرح پریس تک پہنچ گئی اس کے بعد اپوزیشن نے طوفان کھڑا کر دیا" اپوزیشن کا کہنا تھا وزیراعظم کے گھر ٹیوٹر آنے کا مطلب ہے سرکاری سکولوں کا نظام ٹھیک کام نہیں کر رہا چنانچہ لیبر پارٹی کی حکومت چھوڑ دینی چاہیے" ٹونی بلنیر نے فوراً نیوز کو گھر سے نکالا اور عوام سے معافی مانگ کر جان چھڑائی" میں اس کا نقطہ سمجھ گیا لہذا میں نے عرض کیا "ہماری اور برطانیہ کی حکومت میں بڑا فرق ہے ہماری حکومت ایک آٹوٹیک سسٹم کے تحت چل رہی ہے سرکاری جماعت چودھری شجاعت حسین کے پاس ہے وہ پارٹی کے تمام امور احسن طریقے سے چلا رہے ہیں چنانچہ وزیراعظم کو پارٹی کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں" خاجہ اموز افغانستان کے ساتھ چھوٹی بڑی جہز ہیں، دہشت گردی، انا آپریشن، پاک بھارت دوستی اور نواز شریف بے نظیر کے معاملات صدر کے پاس ہیں چنانچہ وزیراعظم کو ان معاملات کی طرف سے بھی مکمل اطمینان ہے" ایم کیو ایم پٹریاٹ ملت پارٹی (سابق) "منگورا احمد ڈو" حامد ناصر چٹھہ اور مولانا فضل الرحمان کا چارج نیب کے پاس ہے لہذا وزیراعظم کو ان کی طرف سے بھی پوری پوری تسلی ہے اور میڈیا کو ایجنسیاں ڈیل کر رہی ہیں چنانچہ وزیراعظم کو اس کی طرف سے کوئی خوف نہیں رہی معیشت، صنعت، تجارت، بجٹ اور تعلیم تو ہم یہ سارے یکھیزے پہلے ہی امریکہ کے حوالے کر چکے ہیں چنانچہ اب ہمارے وزیراعظم کے پاس وقت ہی وقت ہے یہ ان کی مہربانی اور خلوص ہے وہ یہ وقت عوام میں عمل مل کر گزار رہے ہیں اور وہ یہ وقت اپنی رعایا، اپنے لوگوں کو دے رہے ہیں"

قلم نے تہمت لگایا "یا تم لوگ، بہت عجیب ہو، ہمارے ملکوں میں اگر وزیراعظم ٹیلی فون اٹکھینے سے رابطہ کرنے، وہ ڈاک خانے کا ریکارڈ چیک کرنے، وہ بازار سے چیز خرید کر واپس کر دے، وہ سرکاری ڈپنٹری کی بجائے مارکیٹ سے دو خرید لے اور وہ فرین سے اتر کر ٹیکسی لے لے تو اس کی حکومت خطرے میں پڑ جاتی ہے" اس کے لئے لوگوں کو مت دکھانا مشکل ہو جاتا ہے لیکن تم لوگ....." وہ خاموش ہو گیا، کمرے میں تھوڑی دیر خاموشی رہی، قلم نے سگریٹ سلگایا اور ایک لمبا سش لے کر بولا "اور یہ جو نیوز کا سٹریٹار بار اعلان کر رہی تھی وزیراعظم پر ڈوکول

اور سکیورٹی کے بغیر اتوار بازار تشریف لے گئے ہیں اور ان کی گاڑی ہر سنگٹل پر رکتی رہی تھی، میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا، اس نے دوسرا کس لیا، اس کا مطلب ہے پاکستان میں سربراہان مملکت ٹریفک روڈز کی پابندی نہیں کرتے اور وزیراعظم نے سنگٹل پر رک کرنی تاریخ رقم کر دی، میں خاموش رہا، وہ بولا، "پورے پورے امریکہ پورے مشرق بعید اور پورے مشرق وسطیٰ میں صدر سے لے کر عام شہری تک ہر شخص ٹریفک سنگٹل پر رکتا ہے، وہاں اگر وزیراعظم اشارہ توڑ دے تو یہ میڈیا کی سب سے بڑی خبر ہوتی ہے لیکن تمہارے ملک میں وزیراعظم اشارے پر رک جائے تو یہ اطلاع ہاٹ نیوز بن جاتی ہے اور تم لوگ واقعی حیرت انگیز ہو، وہ رکا، اس نے ایک لمبا کس لیا اور اس کے بعد بس کر بولا، "میں تم سے آخری سوال پوچھتا ہوں، میں نے اثبات میں گردن ہلا دی، وہ بولا، "تمہارے ملک میں بجلی چوری ہوتی ہے پانی چور نہروں کے ناکے توڑ دیتے ہیں، تمہاری دیکھو میں بارہ کی جگہ اٹھارہ سواریاں بٹھائی جاتی ہیں، تمہارے اسکولوں میں چھترول ہوتی ہے، زکوٰۃ کی رقم خورد برد ہو جاتی ہے اور تمہارے استاد جشروں پر حاضری لگا کر سکولوں سے غائب ہو جاتے ہیں، وہ رکا اور مسکرا کر بولا، "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، میں نے اثبات میں سر ہلا دیا، اس نے پوچھا، "تم بتاؤ تمہارے وزیراعظم سکولوں، زکوٰۃ کمیشنوں، تمہارے دیکھو اور بجلی کے دفتروں پر کب چھاپے ماریں گے، میری بروداشت جواب دے گی، میں نے اس کی طرف غصے سے دیکھا اور سختی سے جواب دیا، "تم کافر لوگ بڑے متعصب ہو تم، ہمیں ترقی کرنے نہیں دیکھ سکتے، قلب نے قہقہہ لگایا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com



نمک کی کان

بادشاہ کی عجیب عادت تھی، وہ صبح سویرے شیر خاص اور شاہی حجام کو طلب کر لیتا تھا۔ حجام بادشاہ کی گردن پر چادر لپیٹ کر اس کی حجامت بناتا اور شیر اسے عوام کی خوشحالی اور اس کے بلند ہوتے اقبال کی خوشخبری سناتا تھا۔ وہ بادشاہ کو بناتا تھا حضور آپ کی فلاں پالیسی کی برکت سے ہمارے قارئین کی سچریں بیز روز میں سوا پلین ڈالر کا اضافہ ہو گیا، آپ نے سلیمان شاہ جیسا شاندار اور باصلاحیت شیر منتخب کیا اور اس شیر کی ان تھک محنت سے ہمیں تین پلین ڈالر کا مزید قرض مل گیا، آپ نے عمر ایوب کا انتخاب فرمایا تھا اور اس نوجوان کی مہربانی سے ہمارے چینی بنانے والے مشیروں نے اربوں روپے نکائے اور انہوں نے نہایت ایمانداری سے اپنے منافع کا بیس فیصد پارٹی کے فنڈ میں جمع کر دیا اور اب پارٹی بڑی آسانی سے اگلے الیکشنوں کا بوجھ اٹھا سکتی ہے اور حضور آپ کے یونیٹی سنوروں پر چھاپوں نے تو کمال کر دیا، اس وقت پوری دنیا میں ان کی دھوم مچی ہے۔ مجھے کل امریکہ، جاپان اور برطانیہ کے بادشاہوں نے فون کیا، وہ ہم سے چھاپوں کا ماڈل خریدنا چاہتے ہیں لیکن ہم نے فوراً معذرت کرنی ہم نے احتیاطاً ملک کے چار صوبوں کے 18 یونیٹی سنورز شارٹ لسٹ کر لئے ہیں، ہم بہت جلد آپ کو ان سنورز پر بھی چھاپے مارنے کی تکلیف دیں گے جس کے نتیجے میں پوری قوم آپ کی صلاحیتوں کی معترف ہو جائے گی اور حضور والا عوام دن رات اور رات چوگی ترقی کر رہے ہیں۔ پورے ملک میں خوشحالی کے دریا بہ رہے ہیں، لوگ جمولیاں اٹھا اٹھا کر آپ کو دعائیں دے رہے ہیں، لوگوں کی کئی کئی آدمی میں اضافہ ہو چکا ہے اور جب سے محمد علی درانی آپ کے شیر خاص بنے ہیں اس وقت سے لوگوں کو یاس لگتی ہے، نہ بھوک اور نہ ہی گری اور 18 کروڑ لوگ صبح شام ایک دوسرے سے بھل گئے ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں اور دھمکتے ڈالتے ہیں۔

شیر خاص بادشاہ کو یہ اچھی خبریں سناتا رہتا، بادشاہ آرام اور سکون سے سنتا رہتا اور حجام پوری یک سوئی سے بادشاہ کی حجامت بناتا رہتا، یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا یہاں تک کہ حجام اس گفتگو سے بچک آ گیا اور اس نے کلمہ حق کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز جب شیر خاص بادشاہ کو رپورٹ دے چکا تو حجام نے تپخی اور کٹھنسی ایک طرف رکھی اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا "حضور اگر جان کی امان پاؤں تو میں کلمہ حق کی جسارت کروں" بادشاہ نے رحم دلی کا ثبوت

دیتے ہوئے اسے اجازت دے دی، حجام نے عرض کیا "مشیر خاص بکو اس کر رہا ہے، حکومت کی یہ ساری کامیابیاں اور کامرانیوں محل کی دیواروں تک محدود ہیں، عوام اس وقت مہنگائی، بے روزگاری، بے انصافی، لاقانونیت، بے بسی اور ستم ظریفی کی انتہا سے گزر رہے ہیں، ہماری پاورٹی لائن موٹی ہوتی جا رہی ہے، لوگوں کے پاس کھانے کیلئے روٹی، پینے کیلئے پانی اور پینے کیلئے کپڑا نہیں، ملک میں اہل ایمان کو سزائیں اور بے ایمانوں کو سرکاری عہدے مل رہے ہیں، ڈاکے، قتل اور فراڈ روز کا معمول بن چکے ہیں، سڑکیں کھنڈر ہو رہی ہیں اور قبرستانوں میں مار کھینس بن رہی ہیں، لوگ روٹی اور سالن کی ایک پلیٹ کے بدلے مہینہ مہینہ کام کرنے کیلئے تیار ہیں اور لوگ جموں جیلا پھیلا کر آپ اور آپ کی ٹیم کو بدعائنیں دے رہے ہیں اور آپ کے سارے مشیر آپ کو غلط پورنٹس دیتے ہیں۔"

بادشاہ کا موڈ اچھا تھا لہذا وہ حجام کی بات چپ چاپ سنتا رہا، حجام خاموش ہوا تو بادشاہ نے بڑی شفقت سے اس کی پیٹھ ٹھونگی، سرکاری منشی کو طلب کیا اور اسی وقت مشیر خاص کو حجام اور حجام کو مشیر بنا دیا اور اس کے بعد اسے حکم دیا آئندہ تم مجھے عوام کی صورت حال سے مطلع کیا کرو گے۔ حجام خوش ہو گیا۔

اس کے بعد نیا مشیر خاص روزانہ بادشاہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا اور لوگ حکومت کے بارے میں جو کچھ سوچتے ہیں وہ سب بادشاہ کے گوش گزار کر دیتا۔ شروع شروع میں حجام کی رپورٹیں بہت کڑی ہوتی تھیں لیکن پھر ان رپورٹوں میں خوشگوار تبدیلی آنے لگی اب حجام کی رپورٹوں میں بھی عوام خوشحال ہونے لگے، قارن آکھینچر ریزرو میں اضافہ ہونے لگا، بے روزگاری، مہنگائی اور لاقانونیت میں کمی آنے لگی، عوام بادشاہ سے مطمئن ہونے لگے اور لوگ جموں جیلا پھیلا کر بادشاہ کیلئے دعائیں کرنے لگے۔ بادشاہ یہ تبدیلی نوٹ کرتا رہا، ایک دن جب حجام سب اچھا کی رپورٹ دے چکا تو بادشاہ نے سرکاری جلا دیا اور حجام کو دھوپ میں لٹا کر کڑے مارنے کا حکم جاری کر دیا، حجام نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "حضور میری کیا خطا ہے؟" بادشاہ جلال سے بولا "او بد بخت انسان تمہیں شیر بنے ہوئے صرف ایک مہینہ گزرا ہے، پہلے شیروں کو تو حالات ٹھیک کرنے میں سال چھ مہینے لگ جاتے تھے لیکن تم نے ایک ہی مہینے میں ملک کا مقدر بدل دیا" حجام نے جان کی امان طلب کی اور اس کے بعد عرض کیا "حضور میں ایک مہینہ پہلے بھی صحیح کہہ رہا تھا اور آج بھی صحیح بول رہا ہوں۔" بادشاہ نے اسے فیسے سے دیکھا، حجام بولا "حضور جب میں فقط ایک حجام تھا تو میں تیلی محلے میں رہتا تھا، وہاں بے روزگاری، لاقانونیت، غربت اور مہنگائی تھی اور میں روزانہ انسان مسائل کا مشاہدہ کرتا تھا چنانچہ میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا لیکن جب آپ نے مجھے مشیر خاص بنایا تو آپ نے مجھے شہر انگلیوں میں گھر دے دیا اور میں تیلی محلے سے اٹھ کر محلات میں آ گیا۔ یہاں کے حالات یکسر مختلف تھے۔ یہاں قانون بھی تھا، تحفظ بھی، روزگار بھی، ہسپتال اور ڈاکٹر بھی، شاہی سواری بھی اور سیکرٹ فنڈ بھی، میں دن رات اس ماحول میں رہنے لگا تو میں نے آپ کو بھی وہی کچھ بتانا شروع کر دیا جو میں دیکھ رہا تھا" بادشاہ خاموشی سے سنتا رہا، حجام نے عرض کیا "حضور اگر آپ عوام کی اصل صورت حال جاننا چاہتے ہیں تو آپ

اور آپ انہیں رکشوں اور ویکوں میں گھر بھجوائیں یہ لوگ آپ کو اس وقت محام کی اصل رپورٹس دیں گے "حجام خاصاوش ہو گیا۔"

بادشاہ نے گستاخ حجام کے ساتھ کیا سلوک کیا، راوی اس مسئلے پر خاصاوش ہے لیکن حجام کی بات میں بہت وزن تھا۔ مجھے یہ واقعہ جناب عباس اطہر کا کالم پڑھ کر یاد آیا جناب عباس اطہر مجھ سمیت پاکستان کے بے شمار صحافیوں کے استاد ہیں انہوں نے اپنے گزشتہ کالم میں بڑا خوبصورت نکتہ اٹھایا، انہوں نے گورنر پنجاب جناب خالد مقبول کو محام کی اصل صورت حال بتانے کی "جسارت" کی۔ انہوں نے فرمایا، ہمارے حکمران، گورنر ہاؤسز کے سربراہانوں میں بیٹھ کر عام آدمی کی زندگی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ لوگ زندگی کو کالے شیشوں کے پیچھے سے دیکھتے ہیں لہذا یہ لوگ اس ملک کے اصل ایجنٹوں نہیں سمجھ سکتے، میں شاہ جی سے ذرا سا اختلاف کرتا ہوں، میرا خیال ہے اس میں ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں، یہ دراصل وہ لوگ ہیں جو تیس چالیس برس پہلے تیلی محلوں سے نکلے تھے اور اس کے بعد انہوں نے ان محلوں کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا چنانچہ یہ لوگ تیلی محلوں میں رہنے والے 95 فیصد لوگوں کے مسائل نہیں سمجھ سکتے خود سوچنے جس شخص نے چالیس برس اپنی جیب سے پیٹرول نہ ڈلوایا ہو، جس کے جوتے تک بیٹ مین پالش کرتے ہیں اور جس کی گاڑی کا اسے سی ان کی تشریف آوری سے ایک گھنٹہ پہلے آن کر دیا جاتا ہو وہ زندگی کی حقیقتوں کا کیسے اور اک کرے گا، اسے کیسے معلوم ہوگا درو کیا ہوتا ہے، وہ اس باپ کا دکھ کیسے جانے گا جس کا بیٹا روزانہ ڈگریاں اٹھا کر گھر سے نکلتا ہے اور شام کو نا کام واپس لوٹ آتا ہے، اسے کیا معلوم چیز کیا ہوتا ہے اور ڈس پرین کی ایک گولی اور اینٹی بائیوٹیک کی ایک ڈبی کیلئے انسان کو زندگی کے کس کس تنور سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسے کیا معلوم فقیر کی تباہی ہوتی ہے اور انسان کو خود کشی تک لے جانے والے حالات کیسے ہوتے ہیں۔ شاہ جی کا کہنا ہے ان لوگوں نے غلط بینکس چھ ہار کھی ہیں جبکہ میرا خیال ہے ان لوگوں کی تو آنکھیں ہی نہیں ہیں۔ اللہ نے انہیں جینائی کی نعمت ہی سے نہیں نوازا یہ بے چشم اور بے رحم لوگ دیوار کے اس پار پیدا ہوتے ہیں جہاں ہر چیز ہری اور روشن ہوتی ہے۔ جہاں ڈبل روٹی نہ ملے تو لوگ کیک کھا کر گزارا کر لیتے ہیں اور جن کے فریب ترین ہیرے بھی اپنی گاڑی پر آتے جاتے ہیں یہ ناواقف لوگ ہیں انہوں نے زندگی میں کبھی آنا نہیں خریدنا چنانچہ یہ لوگ بھوک جیسے احساس ہی سے بے بہرہ ہیں اور یہ لوگ نمک کی ایک ایسی کان میں رہتے ہیں جس میں داخل ہونے والے حجام بھی شام سے پہلے نمک ہو جاتے ہیں۔



مٹھے منہ

انور مقصود پاکستان کے لہجہ اداکار ہیں ان کا شمار پاکستان کے ان چند تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جو بیک وقت اچھے لکھاری، اچھے مقرر، اچھے کہیں، اچھے اداکار اور اچھے انسان ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں ذومعنی فخرے بنانے کی صلاحیت بھی دے رکھی ہے لوگ جو بات میں کتابیں لکھ کر نہیں کہہ پاتے انور مقصود وہ بات ایک فخرے میں بیان کر دیتے ہیں میں نے سنا تھا لفظوں کی دھار کو اس سے تیز ہوتی ہے لیکن مجھے انور مقصود کے علاوہ اردو میں کوئی ایسا لکھنے والا نہیں ملا جس کے لفظوں کی دھار بھی ہو اور یہ دھار واقعی کو اس سے تیز ہو دو ماہ پہلے مجھے انور مقصود صاحب کا ایک ٹیلی شوڈیکے کا اتفاق ہوا یہ شوڈیکے کے بارے میں تھا شوڈیکے جینی منگی ہونے کی وجوہات پر گفتگو ہو رہی تھی انور مقصود نے بشری انصاری کو چینی بنا رکھا تھا انور صاحب چینی سے سوال کرتے تھے اور بشری انصاری جواب دیتی تھیں شوڈیکے کے آخر میں انور مقصود نے چینی (بشری انصاری) سے پوچھا "آج کل آپ کہاں ہوتی ہیں" چینی ذرا سا مسکرائی اور شرما کر بولی "کابینہ میں" یہ دو لفظ "کابینہ میں" ایک ایسی حقیقت ہیں جنہیں لکھتے ہوئے پچھلے تین ماہ سے بڑے بڑے صحافیوں کے ہاتھ کانپ رہے تھے لیکن یہ انور مقصود کا کمال تھا انہوں نے بشری انصاری کے منہ سے یہ دو لفظ کہلوائے اور ہم پھینک کر گھر چلے گئے اس دن سے ان دو لفظوں کا مزہ لے رہا ہوں۔

چینی کی حقیقت بہت دلچسپ ہے اس وقت پاکستان میں 75 شوگر ملیں آپریشنل ہیں ان میں سے 41 پنجاب، 28 سندھ اور 6 صوبہ سرحد میں ہیں پنجاب کی 41 شوگر ملوں میں سے 20 سیاستدانوں کی ملکیت ہیں جبکہ 21 ملیں سیاستدانوں اور رینائر جرنیلوں کے برنس مین رشتے دار چلا رہے ہیں صوبہ سندھ کی 28 ملوں میں سے 6 سیاستدانوں، 10 برنس مینوں اور 12 سیاستدانوں کے رشتے داروں کے پاس ہیں جبکہ سرحد کی چھ شوگر ملوں میں سے 5 سیاستدانوں کی ملکیت ہیں ان ملوں کی تفصیل بہت دلچسپ ہے پنجاب کی شوگر ملوں میں سے 9 نواز شریف اور ان کے رشتے داروں کی ملکیت ہیں جبکہ دو ملیں مسلم لیگ ن کے اعلیٰ عہدیداروں کے پاس ہیں ان 11 ملوں میں سے 8 ملوں کے پچھلے دروازے حکومتی جماعت کے محکمے میں کھلتے ہیں پنجاب کی چار شوگر ملیں چودھری برادران کی ملکیت ہیں دو ملیں صنعت و پیداوار کے موجودہ وفاقی وزیر جہانگیر ترین کی ہیں ایک شوگر مل کے مالک وفاقی

وزیر تجارت ہمایوں اختر خان ہیں اور ایک ایک شوگر مل ق لیگ کے ارکان قومی اسمبلی نصر اللہ دریشک اور انور علی چیمہ کی ملکیت ہیں باقی 21 ملوں کے مالکان ہمارے جرنل ہیں اور ان کے نام تحریر کرنا اس وقت تقریباً ناممکن ہے برقیوں کے نام لکھنے کیلئے، ہمیں ڈراما آزادی اور تھوڑی سی فکری بلوفت کا انتھار کرنا پڑے گا۔ صوبہ سندھ کی پانچ ملیں آصف علی زرداری کی ملکیت ہیں یا وہ ان کے بڑے شیئر ہولڈر ہیں ایک مل ہینٹلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل راجہ پرویز اشرف کی ہے جبکہ باقی 22 ملوں کا ذکر بھی سر دست ممکن نہیں۔ صوبہ سرحد کی کل 6 ملوں میں سے 5 ملیں سابق وفاقی وزیر عباس سرفرازی کی ہیں عباس سرفراز آزاد سیاستدان تھے لیکن وہ ان ملوں کی وجہ سے اب مسلم لیگ ق میں شامل ہو چکے ہیں ان 75 شوگر ملوں میں سے پنجاب کی 17 ملوں نے دسمبر 2005ء کے آخر میں "اتحاد قائم کیا" ان اتحادیوں کو قومی اسمبلی میں بیٹھے ان پانچ بڑے جاگیرداروں نے سپورٹ کیا جو پاکستان کا 70 فیصد گناگا تے ہیں ان 17 ملوں نے 31 جنوری 2006ء تک 5 لاکھ 95 ہزار 177 ٹن چینی پیدا کی لیکن انہوں نے اس میں سے 3 لاکھ 63 ہزار 734 ٹن چینی گودا سوں میں ذخیرہ کر دی اس ذخیرہ اندوزی کے رد عمل میں مارکیٹ میں چینی کی قیمت گئی ہو گئی اور ملک میں چینی کا شدید بحران پیدا ہو گیا یہ بحران آنے والے دنوں میں اتنی شدت اختیار کر گیا کہ حکومت نیب کی مدد لینے پر مجبور ہو گئی نیب نے چینی کے بارے میں تحقیقات شروع کر دیں یہ تحقیقات چند دن چلی تو پتہ چلا اگر یہ تحقیقات جاری رہیں تو حکومت بھی نوٹ جائے گی اور ہینٹلز پارٹی کے ساتھ جاری ذیل میں بھی رخصت پڑ جائے گا لہذا نیب نے انکو اٹری سے معذرت کر لی یوں چینی کا مقدمہ ایک بار پھر وزیراعظم کی عدالت میں آ گیا وزیراعظم اپنے اختیارات کے دائرے میں رہ کر مختلف اوقات میں مختلف پالیسیاں بناتے اور بیانات جاری کرتے رہے لیکن چینی 40 روپے سے نیچے نہ آئی اس دوران حکومت نے باہر سے چینی درآمد کرنے کا اعلان بھی کیا لیکن یہ اعلان بھی کاغذوں میں دفن ہو کر رہ گیا حکومت نے اس دوران یوٹیلیٹی سنوروں پر سستی چینی فراہم کرنا شروع کر دی لیکن عوام کی لمبی لمبی قطاروں سے حکومت کا سائٹ ایج متاثر ہونے لگا وزیراعظم نے یوٹیلیٹی سنوروں پر "چھاپہ سیکم" بھی شروع کی لیکن ان کے چھاپوں سے بھی چینی نے سستا ہونے سے انکار کر دیا لہذا مجبوراً وزیراعظم نے 15 جون 2006ء کو اپنے چیمبر میں پریس کانفرنس بلائی اور انہوں نے وہاں اعلان فرمایا "ہم نے چیکوں کو ہدایت کر دی ہے وہ چینی کے ذخیرہ اندوزوں کو قرضے جاری نہ کریں اور ہم نے سی بی آر کو بھی شوگر ملوں کی ٹیکس ریٹرز کے سو فیصد معائنے کا حکم دے دیا ہے" وزیراعظم نے یہ اعلان فرمایا اور وزیراعظم ہاؤس واپس چلے گئے میں نے جب وزیراعظم کا یہ بیان پڑھا تو میرے اوپر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی میں نے پہلے نشوونے آکھیں پوچھیں اور اس کے بعد قہقہہ لگایا "میرے ایک دوست میرے پاس بیٹھے تھے انہوں نے مجھ سے پوچھا "تم پہلے روئے اور اس کے بعد ہنسنے آخر ماجرا کیا ہے؟" میں نے عرض کیا "اے اللہ کے نیک بندے میری دلی خواہش تھی یہ حکومت کامیابی سے چلتی رہے لیکن جب میں نے وزیراعظم کا بیان پڑھا تو مجھے اپنی یہ خواہش خطرے میں محسوس ہوئی لہذا میری آنکھوں میں آنسو آ گئے" میرے دوست نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے بعد بولے "لیکن تم

بٹسے کیوں تھے" میں نے ایک اور تہہ بنگا یا اور نرم لہجے میں جواب دیا "مجھے محسوس ہوا وہ کام جس سے زیب نے بھی معذرت کر لی تھی اس کا بیڑا ہمارے وزیراعظم نے اٹھا لیا ہے وزیراعظم نے نہ صرف کابینہ میں ہٹھی چینی کو پہنچ کر دیا ہے بلکہ انہوں نے اپنی حکومت کے چینی سے بنے ستون بھی ڈھانے کا فیصلہ کر لیا ہے" میں وزیراعظم سے اسی جرأت اور اسی بڑی بین کی توقع رکھتا تھا" مجھے ایک ایسا ہی قائد چاہیے تھا جو حالات کے سامنے دبے اور نہ ہی جھکے میں نے جب ان کا یہ بیان پڑھا تو مجھے محسوس ہوا مجھے وہ قائد مل گیا ہے لہذا خوشی سے میری بانجھیں کھل اٹھیں میرا دل چاہتا ہے" میں اب کئی میں کھڑا ہو جاؤں اور چلا چلا کر نعرے لگاؤں شوکت عزیز قدم بڑھاؤ" ہم تمہارے ساتھ ہیں" میرے دوست نے تھوڑی دیر سوچا اور اس کے بعد مسکرا کر بولا "تمہاری بات درست ہے لیکن حکومت کی یہ چینی محض چینی نہیں یہ وہ ہٹھی دلدل ہے جو ہر کلمہ حق کہنے والے کو نگل جائے گی" پچھلے ساٹھ برسوں میں ہمارا رونگ کلاس پر جم سنے ایک نہیں ہوئی لیکن چینی وہ الٹو ہے جس پر سول اور ملٹری بیورو کسی سے لے کر تمام سیاسی جماعتیں ایک ہیں اس معاملے میں سب کے منہ بیٹھے ہیں اور ہر جو شخص ان کے منہ کڑوے کرنے کی کوشش کرے گا یہ لوگ مل کر اس کا اقتدار پھیکا کر دیں گے"



Kashif Azad @ OneUrdu.com

پاکستان قبل سٹیٹ نہیں

میں نے کہا ”یہ سب بکواس ہے“ پاکستان ناکام ریاست نہیں، یہ ساری فہرست ہی دو نمبر ہے“ اس نے سگریٹ کا نوٹا تیسری انگلی میں دبایا، مٹھی بند کی مٹھی منہ کے ساتھ لگائی اور ایک لمبا کش لیا، میں نے کہا ”یہ میگزین فارن پالیسی اور یہ ادارہ فنڈ فار چیئرس دونوں بااہم تعلق نہیں ہیں، ان کی رپورٹ بھی غلط ہے، خدا کی پناہ پاکستان کا شمار دنیا کے تیزی سے ترقی کرنے والے ممالک میں ہوتا ہے، یہ ایشیا کے ان پانچ ممالک میں شامل ہے جن کی معیشت جیٹ سپینڈ سے آگے بڑھ رہی ہے لیکن فارن پالیسی میگزین ناکام ریاستوں کی فہرست میں پاکستان کو 34 سے نویں درجے پر لے آیا ہے اور فنڈ فار چیئرس کا کہنا ہے سوڈان دنیا کی ناکام ترین ریاست ہے جبکہ کانگو، آئیوری کوسٹ، عراق، زمبابوے، چاد، صومالیہ، یمنی، پاکستان اور افغانستان اس کے بعد آتے ہیں، آج کے دور میں اس سے بڑا جھوٹ کیا ہوگا“

وہ کس لگا تار ہا اور میری بات بڑے غور سے سنتا رہا، وہ فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا، میں اسے ہمیشہ کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دیتا ہوں لیکن اس کا کہنا ہے وہ پچھلی دس نسلوں سے زمین پر بیٹھتا آ رہا ہے چنانچہ وہ کرسی پر ”ایڑی فل“ نہیں کرتا، اسے زمین پر بیٹھ کر سکون اور آرام ملتا ہے اس نے اس سلسلے میں اتنی دلیلیں دیں کہ میں نے اسے کرسی کی دعوت دینا بند کر دی، وہ اب آتا ہے، ہمارے فرش پر اکڑوں بیٹھ جاتا ہے، تیسری انگلی میں سگریٹ لگاتا ہے اور غور سے میری باتیں سنتے لگتا ہے۔

میں نے اس سے کہا ”تم گاڑیاں دیکھو پچھلے سات سال میں پاکستان میں گاڑیوں کی تعداد میں چار گنا اضافہ ہوا، پاکستان کی سڑکوں پر چلنے والی نوے فیصد گاڑیاں نئی ہیں، پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس میں گاڑیاں ”بیک“ میں ملتی ہیں، گاڑی کی قیمت بارہ لاکھ ہے لیکن جب آپ گاڑی خریدنے جاتے ہیں تو آپ کو یہ گاڑی ساڑھے تیرہ لاکھ روپے میں ملتی ہے، پاکستان میں گاڑیاں بنانے والی 4 کمپنیوں کے پاس لوگوں کے 22 ارب روپے ایئر وائس جمع ہیں۔ پاکستان میں ایک ماہ میں 93 کروڑ ڈالر کی گاڑیاں اپورٹ ہوئی ہیں اور پاکستان کا شمار ان ملکوں میں ہوتا ہے جو مہنگی گاڑیوں کی بڑی مارکیٹ ہیں لیکن فارن پالیسی اور فنڈ فار چیئرس کا خیال ہے پاکستان

ایک ناکام ریاست ہے، ہفتی اٹا اڑو، وہ چپ چاپ کش لگا تا رہا، میں نے کہا "پاکستان میں پچھلے سات برسوں میں بے تحاشا خوشحالی آئی پاکستان کے 8 شہروں میں غیر ملکی ریستوران کھلے پاکستان میں برگر اور فرائیز چکن کی کپنیاں آ رہی ہیں دنیا کے بڑے بڑے برانڈز پاکستان آنے لگے ہیں لاہور اور اسلام آباد میں دو دو تین تین لاکھ روپے کے سوٹ بک رہے ہیں، میگا، لاکو، براؤن، کھل رہی ہیں، ہائی رینڈ بلڈنگز بن رہی ہیں، اربوں ڈالر کی ہاؤسنگ سکیمیں شروع ہو رہی ہیں، گوادر کے نام سے پاکستان میں دعویٰ بن رہا ہے، شہروں میں سڑکیں بن رہی ہیں، انیس لگ رہی ہیں، انڈر پاس اور فلانی اور بن رہے ہیں، پورا پاکستان تیزی سے سوئیز سے منسلک ہو رہا ہے، سینٹ پاکستان کی سب سے بڑی انڈسٹری بن چکا ہے، پاکستان اور بھارت مشترکہ فلم سازی پر تیار ہیں، پاکستانی سینماؤں میں بھارتی فلمیں چل رہی ہیں، سات سال میں 27 نئے ٹیلی ویژن چینل کھلے ہیں، ہر شہر میں ایک ایم ریڈیو ہیں، خواتین نے جنیفر پینٹا اور اپنی مرثیہ سے شادیاں کرنا شروع کر دی ہیں، ختاراں مائی پوری دنیا میں میٹ گیٹ کا پروڈو کوں لے رہی ہیں، ریستورانوں میں شراب سرو ہو رہی ہے اور نائج گانا، ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکا ہے، ہر گھر میں کیبل کے ذریعے موسیو چینل دکھئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عطاء الرحمٰن پورے ملک میں پی ایچ ڈی کا سیلاب لے آئے ہیں، ملک میں نئی یونیورسٹیاں کالج اور سکول کھل رہے ہیں، ملک بھر میں پھولوں کے میلے اور تصویروں کی نمائش ہوتی ہیں، خواتین آگے آ رہی ہیں اور مرد پیچھے جا رہے ہیں، فری اینڈ فیئر ایکشن ہو رہے ہیں اور ملک بھر میں سیاسی سرگرمیوں پر کسی قسم کی کوئی تدبیر نہیں لیکن تم مغرب کا تعصب دیکھو اتنی ترقی کے باوجود فاران پالیسی اور فنڈ فار جیس جیسے ادارے پاکستان کو ناکام ریاست قرار دے رہے ہیں "وہ کش لگا تا رہا، میں نے کہا" صدر بنیں اور کوئٹہ ویز اڈا آئیں تک صدر شرف کی جمہوریت نوازی کی تعریف فرما چکی ہیں، نوٹی پلیئر اور من موہن سنگھ تک پاکستان کے جمہوری مستقبل سے مطمئن ہیں، پاکستان کے جمہوری ادارے مضبوط سے مضبوط تر ہو رہے ہیں، ایکشن کمیٹی فری اینڈ فیئر ایکشنز کی تیاری کر رہا ہے، حکومت عوام دوست بخت تیار کر رہی ہے، انسانی سنگٹنگ رک چکی ہے اور پچھلے چھ سات برسوں میں حکومت نے آٹھ لاکھ نو جوانوں کو نوکریاں دی ہیں، چینی اور سینٹ کی قیمتیں گر رہی ہیں اور حکومت کی برڈ فلوسیکم سے پاکستان میں مرفی کا گوشت سستا ہو چکا ہے، یہ حقیقت ہے والہیں اسی نوے روپے کلو بک رہی ہیں لیکن یہ یورپ اور امریکہ سے سستی ہیں، پٹرول، گیس اور بجلی منگنی ہو رہی ہے لیکن یہ بھی ترقی اور خوشحالی کی علامت ہیں چنانچہ جس ملک میں لوگ مہنگا پٹرول انورڈ کر لیتے ہیں اس کا مطلب ہوتا ہے اس ملک کے لوگوں کی قوت خرید بہتر ہے"

اس نے سگریٹ کا ٹوٹا بھجا، 'افرش پر پھینکا اور اسے جو تے سے رگڑ کر بولا، "جناب میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں، اس میں کوئی شک نہیں، ہمارا ملک ترقی کر رہا ہے، ہم ایک کامیاب ریاست ہیں لیکن یہ بتاؤ کیا ملک کے 80 فیصد عوام کی انصاف تک رسائی ہے؟ کیا لوگ عدالت جانے سے نہیں گھبراتے؟ کیا یہ دنیا کا واحد ملک نہیں جس میں جب تک مقتول کی جائیداد نہیں بک جاتی اس وقت تک اس کا مقدمہ جج کی میز تک نہیں پہنچتا"

کیا اس ملک میں تحفظ، امان اور انصاف کے لئے آپ کے پاس پیسے نہیں ہونے چاہئیں؟ کیا اس ملک میں اب زندہ رہنے کے لئے آپ کو نرل واٹر نہیں پینا پڑتا اور کیا یہ پانی اس ملک کے صرف تین فیصد لوگوں کو دستیاب نہیں؟ کیا اس ملک میں جب تک آپ کے گیٹ پر گارڈ نہ کھڑا ہو آپ سکون کی نیند نہیں لے سکتے؟ کیا اس ملک میں پولیس بڑے لوگوں کی پولیس نہیں بن چکی؟ کیا اس ملک میں روزانہ 800 لوگ قتل نہیں ہوتے؟ کیا اس ملک میں ڈاکے فیشن نہیں بن چکے اور کیا یہاں اغواء برائے تاوان معمول نہیں کیا کر رہی ہے صنعت کار اور تاجر اغواء کے خوف سے وہی شفت نہیں ہو رہے کیا۔ اس ملک میں ملل کلاس کے ہاتھ سے تعلیم نہیں نکل چکی؟ کیا حکومت نے بنیادی تعلیم تک پرائیویٹائز نہیں کر دی اور تم بتاؤ میری بیٹی نے بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی لیکن میں اسے کالج میں داخل نہیں کرا سکتا کیوں؟ کیونکہ میرے پاس فیس کے پیسے نہیں ہیں پوری دنیا میں تعلیم، صحت، انصاف اور تحفظ بنیادی ضرورتیں ہیں لیکن کیا اس ملک میں یہ چاروں بنیادی ضرورتیں عوام کے پاس ہیں؟ کیا یہ سچ نہیں اس ملک میں جسے تحفظ چاہیے وہ اپنا گارڈ رکھتا ہے جسے انصاف چاہئے وہ اپنا مکان اور اپنی دکان بچتا ہے اور یہ پیسے وکیل کے حوالے کرتا ہے وہ مقدمہ دائر کرتا ہے اور اس کے بعد روز مارتا روز جیتتا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں اس ملک میں جسے دوا چاہیے وہ ڈاکٹر کو فیس دے اور بازار سے دس ہزار روپے کی دوائیں خرید لے اور جس کے بچوں کو تعلیم چاہیے وہ گردے سچ کر بچوں کو سکول میں داخل کرائے؟ کیا یہ سچ نہیں اس ملک میں بے روزگاری کا یہ عالم ہے پولیس جس ڈاکو جس قاتل کو پکارتی ہے اس کی عمر جس سے تیس برس کے درمیان آگتی ہے کیا یہ سچ نہیں پاکستان میں دنیا میں سب سے زیادہ ایکسٹنٹ ہوتے ہیں اور اس ملک میں ضروریات زندگی اوسط آمدنی سے ساڑھے تین گنا مہنگی ہیں لہذا اگر ان تمام حقائق کو دیکھا جائے تو ہم اپنے ملک کو اتنا زیادہ کامیاب بھی قرار نہیں دے سکتے؟ یہ درست ہے ہم ترقی کر رہے ہیں لیکن کون لوگ ترقی کر رہے ہیں؟ وہ لوگ جو کروڑ پتی ہیں، کیا یہ سچ نہیں کروڑ والا کروڑ سے کروڑ کمار ہا ہے لیکن ہزاروں اور لاکھوں والے روز بروز غریب ہو رہے ہیں یہ ہے حقائق کا دوسرا رخ۔

وہ خاموش ہو گیا مجھے غصہ آ گیا اور میں نے چلا کر کہا "اس کا مطلب ہے تم بھی پاکستان کو ٹیل سٹیٹ سمجھتے ہو؟" اس نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا "تمہیں پاکستان ٹیل سٹیٹ نہیں لیکن اس کا نظام ٹیل ہو چکا ہے کیونکہ یہ سسٹم اپنے شہریوں کو روزگار دے رہا ہے اور نہ ہی احترام مجھے خطرہ ہے اگر ہم نے یہ سسٹم نہ بدلاتو کہیں خدا نخواستہ فنڈ فارٹیس اور فارن پالیسی جیسے اداروں کے خدشات درست ثابت نہ ہو جائیں، کہیں ہم حقیقتاً مار نہ کھا جائیں۔" مجھے اس کی بات سے اتفاق نہیں تھا لہذا میں غصے سے باہر نکل گیا۔



قبر تک

یہ وزیراعظم شوکت عزیز کی کابینہ کے ایک اجلاس کا منظر تھا، اجلاس کے دوران وزیر مملکت اسحاق خان خا کوئی نے اپنی فائل سے ایک ٹینڈر نوٹس نکالا اور وزیراعظم کی خدمت میں پیش کر دیا، وزیراعظم نوٹس دیکھ کر حیران رہ گئے، یہ پاسکو کی انتظامیہ کی طرف سے جاری کردہ نوٹس تھا جس میں پاسکو نے 50 لکڑی گاڑیاں خریدنے کیلئے ٹینڈر طلب کئے گئے تھے، ان گاڑیوں میں بی ایم ڈبلیو، لینڈ کروزر، ٹویوٹا ہائی کس، پراڈو اور ٹویوٹا کرولا شامل تھیں، پاسکو یہ گاڑیاں اسلام آباد میں اپنے افسروں کیلئے خریدنا چاہتا تھا، اسحاق خا کوئی نے وزیراعظم سے عرض کیا "پاکستان کا کوئی سرکاری افسر وزیراعظم کی اجازت کے بغیر قیمتی گاڑیاں نہیں خرید سکتا لیکن پاسکو کی انتظامیہ نے نہ صرف گاڑیاں خریدنے کا فیصلہ کر لیا بلکہ وزیراعظم کی اجازت کے بغیر اخبارات میں ٹینڈر بھی چھپوا دیے" اسحاق خا کوئی نے اس کے بعد با آواز بلند ٹینڈر نوٹس پڑھا، نوٹس سننے کے بعد تمام وزراء ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، وزیراعظم نے زراعت کے وفاقی وزیر سکندر بون کی طرف دیکھا اور ان سے پوچھا "کیا پاسکو نے آپ سے ان گاڑیوں کیلئے اجازت لی تھی" سکندر بون نے بے چارگی سے جواب دیا "پاسکو کے سربراہ ایک فوجی جرنیل ہیں اور میں انہیں گاڑیاں خریدنے سے نہیں روک سکتا" سکندر بون کے اس جواب کے بعد وزیراعظم نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے یہ ٹینڈر نوٹس منسوخ کر دیا۔

آج اس واقعے کو سات دن گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک کسی طرف سے اس واقعے کی کوئی وضاحت آئی اور نہ ہی کسی نے اس کی تردید کی، ابھی تک کسی اتھارٹی نے اس خلاف ورزی کی انکوائری کی اور نہ ہی کسی نے کسی سے وضاحت طلب کی لہذا یہ سنواری بھی بے شمار دوسری کہانیوں کی طرح بے حسی کے قبرستان میں دفن ہو گئی، میری گزشتہ روز روف کلاسرا سے بات ہو رہی تھی روف کلاسرا پاسکو کی فوجی قیادت کو اس کا قصور وار ٹھہرا رہا تھا جبکہ میرا خیال اس سے یکسر مختلف تھا، میں نے اس سے کہا "قیمتی اور آرام دہ گاڑیاں ایک ایسا حرام ہے جس میں حکومت کے زیادہ تر عہدیدار اور وزراء ننگے ہیں، سیکرٹریوں سے لے کر وزیراعظم تک اس ملک کی تمام مقتدر ہستیاں اس دلدل میں اس قدر ڈھنس چکی ہیں کہ ان میں اب کسی دوسرے جگھے کے احتساب کی جرأت اور ہمت نہیں رہی، روف

کلاسرا نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا لیکن میں ڈنکار ہائیں نے اسے بتایا پچھلے سال اخبارات میں ان گاڑیوں کے بارے میں خبریں شائع ہوئیں جو حکومت نے وی وی آئی پیز کے لئے باہر سے 60 بلٹ پروف گاڑیاں منگوائی تھیں، ان میں سے ہر گاڑی کی قیمت 7 کروڑ روپے تھی اور ان میں دو تین ایسی کیوزین بھی شامل تھیں جن کی فی کس قیمت سولہ کروڑ تھی، حکومت نے 20 گاڑیاں کنسل کر دیں لیکن چالیس گاڑیاں آئیں اور یہ گاڑیاں اب وی وی آئی پیز کے زیر استعمال ہیں، حکومت نے ان گاڑیوں کے ٹیکس کی مد میں خزانے کو 70 کروڑ روپے کا نقصان پہنچایا۔ وزیراعظم صاحب نے اپنے لئے دو نئے جہازوں کا بھی آرڈر دیا تھا، ان میں سے ایک جہاز پاکستان آچکا ہے اور وزیراعظم اس میں باقاعدہ سفر کر رہے ہیں جبکہ دوسری ایئر بس ابھی پاکستان نہیں پہنچی، پچھلے سال وی وی آئی پی جہاز کی مرمت پر 58 کروڑ روپے خرچ ہوئے تھے لہذا وزیراعظم کی دیکھا دیکھی دوسرے اعلیٰ عہدیداروں نے بھی اب دھڑا دھڑ بڑی گاڑیاں منگوانا شروع کر دی ہیں، پچھلے سال سپیکر قومی اسمبلی چوہدری امیر حسین نے ایک کروڑ تیس لاکھ کی نئی مرسیڈیز خریدی تھی، جب میڈیا نے اس پر شور کیا تو انہوں نے اس مرسیڈیز کے ساتھ ساتھ 90 لاکھ کی دو لینڈ کروزر بھی خرید لیں۔ اس وقت ہماری کابینہ کے 17 وزراء کے پاس بڑی گاڑیاں ہیں۔ تمام وزراء گاڑیوں کے پورے پورے فلیٹ کے ساتھ سفر کرتے ہیں، ان کے ساتھ پولیس کی سیکورٹی چیف کے علاوہ ذاتی سٹاف کی گاڑیاں بھی ہوتی ہیں، صوبائی حکومتوں کی بھی یہی صورت حال ہے آپ چیف منسٹرز کے پر دو کول نکال کر دیکھ لیجیے، آپ صوبائی حکومتوں سے پوچھتے چار برسوں میں کس کس چیف منسٹر نے کون کون سی گاڑیاں خریدی ہیں اور ان کی قیمت کیا تھی، آپ حقائق جان کر حیران رہ جائیں گے، آپ انواع پاکستان کے چیفس کو بھی دیکھ لیجئے آپ کو حیرت ہوگی ان سب کے پاس بھی نئی بلٹ پروف گاڑیاں ہیں اور وہ بھی پورے نوآبادیاتی پر دو کول کے ساتھ سڑک پر نکلتے ہیں، ان کے آگے بھی پچاس پچاس موٹر سائیکل اور ہونڈو والی گاڑیاں چلتی ہیں اور ان کے سیکورٹی گارڈز بھی سارے راستے اور سارے علاقے کو اپنے نرنے میں لے لیتے ہیں لیکن آپ دلچسپ صورت حال ملاحظہ کیجئے ان حضرات نے یہ گاڑیاں باقاعدہ تحریری اجازت سے منگوائی تھیں اور انہیں یہ اجازت وزیراعظم کے آفس سے دی گئی تھی لہذا کہنے کا مطلب ہے بڑی اور بلٹ پروف گاڑیاں اب باقاعدہ سیاسی کلچر بن چکی ہیں، ہمارے ملک کے ذمہ داروں میں اب سرکاری خزانے سے منگنی سے منگنی گاڑیاں خریدنے کا باقاعدہ مقابلہ ہوتا ہے اور اس مقابلے میں شامل قریباً تمام لوگ جیت جاتے ہیں۔

میں نے رؤف کلاسرا سے عرض کیا یہ مقابلہ صرف اعلیٰ مقدر ہستیوں کے ایوانوں تک محدود نہیں بلکہ سب یہ ایوانوں سے نکل کر کارپوریشنوں، وزارتوں اور ڈویژن میں آچکا ہے اور جب مختلف محکموں کے چیئرمین، ڈی جی اور ایم ڈی اپنے وزراء کو پانچ پانچ کروڑ کی گاڑیوں میں گھومتے دیکھتے ہیں تو ان کے ارمان بھی اٹھائیاں لینے لگتے ہیں لہذا وہ بھی وی وی آئی پی بننے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں پچھلے دنوں بحریر ناؤن کے چیف ایگزیکٹو ملک ریاض حسین نے گیارہ کروڑ روپے کی رولز راس فیٹم منگوائی، میرے ایک مہربان ریٹائر جنرل صاحب کو پتہ چلا تو

انہوں نے مجھ سے فرمائش کی تم مجھے ملک ریاض سے دو گھنٹے کیلئے روٹروائرس لے کر دے سکتے ہو، میں نے عرض کیا "سر ان کے ساتھ میری بے تکلفی ابھی روٹروائرس کے دائرے میں داخل نہیں ہوئی" وہ خاموش ہو گئے، اس کے بعد میں نے ان سے احتیاطاً پوچھ لیا "سر آپ نے یہ گاڑی کیا کرنی ہے" انہوں نے قہقہہ لگا کر فرمایا "میرا ایک جونیئر افسر پرموٹ ہو گیا ہے، اس کے پاس سرکاری بی ایم ڈبلیو ہے، میں اسے مبارک باد دینے کیلئے روٹروائرس پر جانا چاہتا ہوں" جنرل صاحب کی یہ خواہش بظاہر منفی محسوس ہوتی ہے لیکن فی زمانہ یہ بہت بڑی حقیقت ہے جب ملک کا سرکاری کالج بڑی گاڑیوں میں ڈھل چکا ہو تو پھر آپ کس کس کا ہاتھ روکیں گے، آپ کس کس کی خواہشوں کے راستے میں بند باندھیں گے۔ چینی کہاوٹ ہے مچھلی ہمیشہ اپنے سر سے گلنا شروع ہوتی ہے، اگر ہم ذرا سا غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا ہمارے ملک، ہمارے معاشرے کا سرگل چکا ہے، ہمارے سیاسی ایوان بری طرح لرز رہے ہیں لیکن ہم ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں، ارسطو سے سکندر اعظم نے پوچھا تھا "بابا یا تم کب تباہ ہوتی ہیں" اس نے ہنس کر جواب دیا تھا "جب بادشاہ عوام کی انتہیوں کو اپنے دستِ خوان پر سجانے لگیں" اگر ہم سوچیں تو بڑی گاڑیوں پر خرچ ہونے والی یہ رقم بھی بالآخر عوام کے پیٹ سے نکلتی ہے اور یہ اس ملک کے لوگوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے جس میں 34 فیصد لوگ خطِ غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہوں، جس میں لوگ دو اور روٹی کے لئے گردے بچ رہے ہوں اور جس میں لوگ اپنی بیٹیاں نیلام کر رہے ہوں، آخر ہم نے بھی کبھی نہ کبھی مرنا ہے، آخر ہم نے بھی کبھی نہ کبھی اپنے خدا کے سامنے پیش ہونا ہے لہذا مجھے سمجھ نہیں آتی ہم اپنے اللہ کے سامنے کون سا منہ لے کر جائیں گے، اس میں کوئی شک نہیں گاڑی آج کی ضرورت ہے لیکن سرکاری خزانے سے خریدی گئی بڑی اور مہنگی گاڑیاں ضرورت نہیں ہوس ہیں اور یہ حقیقت ہے ضرورت کبھی نہ کبھی پوری ہو جاتی ہے لیکن ہوس کا منہ قبر تک کھلا رہتا ہے۔



بد قسمتی کا اونٹ

یہ تو معلوم نہیں وہ کون تھا، وہ کہاں رہتا تھا، وہ کیا کرتا تھا اور وہ کس جگہ دفن ہے لیکن اس شخص کا تخلیق کیا ہوا فقرہ شاید رتی دنیا تک قائم رہے، لوگ دنیا میں جب بھی بد نصیبی کا ذکر کریں گے تو وہ بے اختیار اس شخص کا فقرہ دہرائیں گے اس نے کہا تھا "بد نصیب انسان اونٹ پر بھی بیٹھا ہوتا ہے کتا کاٹ لیتا ہے"۔ شیخ عبدالحفیظ صاحب میرے بزرگ دوست ہیں، وہ علم نجوم اور رمل کے ماہر ہیں۔ وہ لوگوں کی قسمت کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں لہذا وہ اکثر کہتے ہیں "جب کسی انسان کی خوش نصیبی کا دور شروع ہوتا ہے تو اللہ اس کی خامیوں کو خوبون میں بدل دیتا ہے اور اس کی غلطیوں پر بھی پھل لگنے لگتا ہے لیکن جب کوئی شخص بد قسمتی کے نیر میں داخل ہوتا ہے تو اس کی خوبیاں بھی خامیاں بن جاتی ہیں اور اس کی اچھائیوں پر بھی کانٹے آگے آتے ہیں" میں ہمیشہ ان کی اس آرزویشن سے اختلاف کرتا ہوں لیکن گزشتہ چند ماہ سے مجھے ان کی بات میں تھوڑی تھوڑی صداقت محسوس ہونے لگی ہے، میں دیکھتا تھا ہماری حکومت بڑے ہموار طریقے سے چل رہی تھی، اس کے سامنے کوئی چیلنج نہیں تھا، جناب شوکت عزیز دونوں ہاتھوں سے خزانہ بھر رہے تھے، جناب پرویز مشرف کی مقبولیت کا گراف انتہائی سرے کو چھو رہا تھا اور حکومت میں جو تھوڑی بہت خرابی تھی اس پر ہمارے نئے وزیر اطلاعات محمد علی درانی اپنی دروغ گوئی کا رنگ کر دیتے تھے وزیر اعلیٰ جناب پرویز الہی اور ان کے صاحبزادے پنجاب کی زمینوں اور پلانوں کو "پرائیونائز" کر رہے تھے، لاہور ٹریفک پولیس کے ایک ایس پی اور ان کے امریکہ پلٹ بھائی ڈینیس ہاؤسنگ سکیم کی قیادت کو دونوں ہاتھ سے نواز رہے تھے اور اپوزیشن کے منصوبوں میں دراڑیں پڑ رہی تھیں لہذا حالات بر لحاظ سے حکومت کے ہاتھ میں تھے لیکن پھر اچھائیوں پر کانٹے اگنا شروع ہو گئے اور چیزیں ایک ایک کر کے حکومت کے ہاتھ سے نکلنے لگیں، کراچی سٹیل ملز کا مسئلہ اٹھا اور لوگوں نے پہلی بار وزیر اعظم شوکت عزیز کی معاشی دیانت کو چیلنج کر دیا، سٹیل ملز کا مقدمہ پیریم کورٹ تک پہنچا اور عدالت نے نج کاری کے عمل کو جائیداد قرار دے دیا، اس کے بعد شاک ایکیس چیلنج کا معاملہ بیدار ہوا اور اس معاملے نے وزیر اعظم کی ساری معاشی ٹیم کو اپنی پیٹ میں لے لیا اور وزیر اعظم کے ساتھ ساتھ سلیمان شاہ جیسے بین الاقوامی ماہر بھی بدنام ہو گئے، ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ اچانک ایم کیو ایم رولڈ گئی

اور سندھ حکومت جاتی ہوئی دکھائی دینے لگی، حکومت وہاں سے نقلی تو مولانا فضل الرحمن آگے بڑھے اور وہ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کے ساتھ شامل ہو گئے، حکومت ابھی اس جھکے سے نہیں سنبھال پائی تھی کہ اپوزیشن نے تحریک عدم اعتماد پیش کر دی، اس سے پہلے بھارت میں ٹریڈوں کے دھماکے ہوئے اور پاک بھارت مذاکرات قحط کا شکار ہو گئے، اسی دوران حکومت نے تحفظ حقوق نسواں بل پیش کر دیا اور مسلم لیگ (ق) تک کے ارکان نے اس کی مخالفت کر دی، حکومت ابھی بے شکل ان کا "منت ترہ" کر رہی تھی کہ اچانک ڈاکٹر عبدالقدیر کو کینسر ہو گیا اور لوگوں نے حکومت کو مورہ الزام ٹھہرانا شروع کر دیا اور ابھی یہ خبریں جاری تھی کہ کوہلو کا واقعہ پیش آیا اور نواب اکبر خان کی قتل ہو گئے۔

یہ اوپر تلے پیش آنے والے واقعات بتاتے ہیں شاید حکومت کا وہ دور شروع ہو چکا ہے جس میں حکومتیں اونٹ پر چڑھ کر بھی بد قسمتی کے بیجوں اور جڑوں سے محفوظ نہیں رہتیں، آپ حکومت کی بد قسمتی کا انداز لگائیے نواب اکبر خان کی قتل کی ہلاکت کا واقعہ 27 اگست کے اخبارات میں شائع ہوا اور 28 اگست کو صدر صاحب مری میں سوئی گیس کا افتتاح کر رہے تھے، اس افتتاح پر ایک بلوچ سردار نے مجھے فون کیا اور دیکھی آواز میں پوچھا "حکومت سوئی کے سردار کو قتل کر کے مری میں سوئی گیس کا افتتاح کر رہی ہے یہ لوگ ہمیں کیا پیغام دینا چاہتے ہیں" میں خاموش رہا لیکن اس کے بعد یر تک سوچتا رہا حکومت نے مری میں سوئی گیس کے افتتاح کا پروگرام چار ماہ پہلے بنایا تھا اور یہ حقیقتاً ایک مثبت اور اچھا منصوبہ ہے لیکن آپ بد قسمتی ملاحظہ کیجئے حکومت کے اس ٹیک اور اچھے کام کے ساتھ بھی کاٹنے لگ گئے، اس افتتاح سے لیکر دو دن پہلے نواب اکبر خان کی قتل کا ساتھ پیش آیا اور حکومت کیلئے بدنامی سنبھالنا مشکل ہو گئی اگر ہم بد قسمتی کی اس تیسوری کوچ مان لیں تو صاف محسوس ہوتا ہے حکومت اس خطرناک فیز میں داخل ہو چکی ہے جس میں کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے، کسی بھی وقت ایم کیو ایم حکومت سے الگ ہو سکتی ہے، ایم ایم اے بلوچستان حکومت سے علیحدگی کا اعلان کر سکتی ہے اور اپوزیشن پارٹیاں مل کر اسمبلیوں سے استعفی دے سکتی ہیں جس کے بعد حکومت کا اونٹ بیٹھ جائے گا اور بد قسمتی کے جڑے اونٹ تک کو نگل جائیں گے، میں ایم کیو ایم اور ایم ایم اے کے بارے میں شدید ضد شات کا شکار ہوں، یہ دونوں اپوزیشن کی جماعتیں ہیں لیکن یہ پچھلے چار برس سے اقتدار میں ہیں، ان چار برسوں میں ان کی کارکردگی زیادہ آئیڈیل نہیں رہی لہذا ان لوگوں کی کوشش ہوگی یہ ایکشن سے پہلے حکومت سے الگ ہو جائیں تاکہ یہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کو ایٹھنا کر عوام سے ایک بار پھر روٹ لے سکیں۔

لوگوں کا ہم کالم نویسوں کے بارے میں عمومی خیال ہوتا ہے ہم لوگ ایسے طیب ہیں جو تھمیں میں تو بہت ماہر ہوتے ہیں لیکن ان کے پاس مسئلے کا کوئی حل نہیں ہوتا، بعض لوگ کہتے ہیں ہم لوگ ماہر سرجن کی طرح مریض کا آپریشن تو کر لیتے ہیں لیکن ہمیں ٹانگے لگانے نہیں آتے، میں آج یہ الزام بھی دھونڈتا ہوں، میں آج مریض کو ٹانگے لگا دیتا ہوں میں حکومت کے سامنے ایک ایسا حل رکھتا ہوں جس کے ذریعے وہ بد قسمتی کے

”کتوں“ سے بھی بچ جائے گی اور وہ اس ملک پر مزید دس پندرہ برس تک برسر اقتدار بھی رہے گی اس مسئلے کے دو حل ہیں اول پرانے زمانے میں لوگ مشکل وقت ٹانے کیلئے کالے بکروں کی قربانی دیا کرتے تھے حکومت بھی یہ وقت ٹانے کیلئے ایک آدھ بکرے کی قربانی دے دے حکومت کی ساری بلائیں ٹل جائیں گی اگر حکومت کو چوٹس کا مسئلہ پیش آئے تو میں انہیں دس بارہ بکروں کی فہرست پیش کر سکتا ہوں حکومت ان میں سے اپنی مرضی کا بکرا پکڑے اور قربان کر کے جان چھڑائے دوسرا حل ڈاکٹر امجد پیر صاحب زکوڑی شریف اور ظفر بخٹاوری ہیں، یہ تینوں حضرات وزارت عظمیٰ کے بڑے شاعر امیدوار ہیں، اگر وزارت عظمیٰ کا بوجھ باری باری ان تینوں کے کندھوں پر لا دیا جائے تو میرا خیال ہے یہ لوگ نہ صرف مسائل کے سارے کتے بھاگیں گے بلکہ حکومت کے اونٹ کو دوڑاتے دوڑاتے وائٹنگن تک لے جائیں گے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر حکومت کا دل علی آغا پر پوری طرح اعتماد کر سکتی ہے، آغا صاحب کو بھی اللہ تعالیٰ نے خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے کا ٹھیک ٹھاک ملکہ دے رکھا ہے رہ گیا پنجاب تو اس کیلئے میں میاں عامر محمود کا نام پیش کروں گا، میاں صاحب جنرل صاحب کیلئے وہ کچھ کر سکتے ہیں جو ساری فوج مل کر نہیں کر سکتی۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

ف لیگ

فرعون رامتیس دوم 1279 قبل مسیح میں مصر کا حکمران بنا، اس وقت اس کی عمر صرف 20 سال تھی اس نے 66 برس دو ماہ تک مصر پر حکومت کی وہ ایک شاندار شخصیت کا وڈرنی انسان تھا اس نے مصری تہذیب کو اپنے نقطہ کمال تک پہنچا دیا اس نے پوری دنیا سے ماہرین فن جمع کئے اور ان ماہرین نے آنے والوں دنوں میں مصر کو تاریخ کی پہلی سپر پاور بنا دیا۔ رامتیس نے نہ مٹنے والی روشنائی بنوائی اس نے نعشوں کو ہزاروں سال تک سلامت رکھنے والے کیمیکل ایجاد کرائے اس نے ہادل لانے اور برسانے والی نیکینالوجی حاصل کر لی اس نے ہواؤں کا رخ موڑنے اور موجوں کو پسا کرنے کا فن سیکھ لیا اس نے ایک ایسی نیکینالوجی بنالی جس کی مدد سے مصری انجینئر سینکڑوں فن بھاری پتھر ہوا میں اٹھاتے تھے اور ان کے بعد ان پتھروں کو جوڑ کر اہرام بنا دیتے تھے اس کے پاس ستارہ شناسوں کا پورا سگوا تھا اس کے ستارہ شناس آسمان کی تبدیلیاں دیکھ کر آنے والے حالات بتا دیتے تھے اس نے دریائے نیل کے دونوں کناروں پر اناج اور باغ اگا دیئے تھے جس کی وجہ سے مصر کے لوگ خوشحالی اور استحکام کی آخری صدی چھونے لگے اس نے مصر میں درس گاہوں کا جال بچھا دیا تھا اس کے دور میں فلسفی اور دانشور عام تھے آج دنیا یونان کے جن فلسفیوں سائنس دانوں اور دانشوروں کو علم فن کی بنیاد قرار دیتے ہیں ان تمام لوگوں نے مصریوں سے علم سیکھا تھا اور ان تمام علوم کا منبع رامتیس تھا اس نے دنیا کے بہترین جادوگر جمع کئے اور انہیں دربار میں اعلیٰ عہدے دے دیئے اس کے پاس دنیا کی بہترین فوج تھی اس کے پاس سونے اور چاندی کے پہاڑ تھے اور وہ بھارات جزیرے ہوتوں میں کھانا کھاتا تھا ان تمام کامیابیوں اور فتوحات نے رامتیس کا داغ خراب کر دیا اور اس نے خود کو کائنات کا خدا (نہوہ بانہ) سمجھنا شروع کر دیا اس کا کہنا تھا دنیا کی تمام طاقتیں اس کے کنٹرول میں ہیں اور وہ چاہے تو ہواؤں کا رخ پھیر دے وہ چاہے تو کنگلوں کو بادشاہ بنا دے اور اگر وہ چاہے تو وہ بادشاہوں کو نگلا کر دے خدائی کے اسی زخم میں ایک انسان نے اپنے نجومیوں سے پوچھا "بتاؤ میری خدائی کب تک قائم رہے گی؟" نجومیوں نے ساروں کی چال پڑھی اور اس کے بعد عرض کیا "حضور بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا یہ بچہ آپ اور آپ کی خدائی کیلئے خیر ناک ثابت ہوگا" رامتیس نے اسی وقت حکم دیا "آج کے بعد بنی اسرائیل میں جو بھی بچہ پیدا ہوا اسے فوراً قتل کر دیا جائے" اس حکم کے بعد بنی اسرائیل کے بچوں کا قتل شروع ہو گیا یہاں سے حضرت موسیٰ اور فرعون کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

فرعون راہمیسس دوم 1213 قبل مسیح میں حضرت موسیٰ کا چچھا کرتا ہوا اور یائے نیل میں ڈوب کر مر گیا لیکن قدرت نے اس کی نعش ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دی راہمیسس کی نعش آج بھی قاہرہ کے میوزیم میں رکھی ہے اس کے منہ میں ایک چھوٹی سی نگلی ہے اور اس نگلی کے ذریعے اس کے منہ میں قطرہ قطرہ پانی ٹپکا جاتا ہے اور اس کے ناخن مسلسل بڑھتے رہتے ہیں جنہیں دو تین ماہ بعد باقاعدہ تراشا جاتا ہے اس سارے عمل میں اللہ تعالیٰ کی کیا حکمت ہے اس پر کوئی عالم دین ہی روشنی ڈال سکتا ہے سرحدت ہم 3285 برس بعد آج کے زمانے میں بیٹھ کر فرعون کے اس نفسیاتی خوف کا تجزیہ کرتے ہیں جس نے اسے بنی اسرائیل کے بچے قتل کرانے پر مجبور کر دیا تھا آج ہم فرعون کے احکامات کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے فرعون کو بظاہر اس بے وقتی کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس کی کرسی مضبوط تھی اپوزیشن کا کوئی وجود نہ تھا عوام خوشحال تھے اور علم و ادب میں پوری دنیا میں مصر کا کوئی ثانی نہیں تھا لہذا اگر فرعون قدرت کے نظام سے چھوڑ چھوڑ کر مارتا تو اس کی حکومت اسی طرح چلتی رہتی سوال یہ ہے پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟ تمہارا سامریہ گہرائی میں جا نہیں تو ہمیں محسوس ہوگا یہ بنیادی طور پر فرعون کا خوف نہیں تھا یہ اس کے حواریوں بلکہ اس کی "مسلم لیگ" کا خوف تھا اس کی مسلم لیگ کا خیال تھا اگر نجومیوں کی بات درست ثابت ہوگئی تو ہم سب فارغ ہو جائیں گے چنانچہ انہوں نے فرعون سے ایل ایف او جاری کر دیا جس کے بعد فرعون کی قدرت کے ساتھ لڑائی شروع ہوگئی اور اس لڑائی کے نتیجے میں فرعون رہا اور نہ ہی مصر آپ کو محسوس ہوگا فرعون کا سارا بحران اس کی ق لیگ نے پیدا کیا تھا یہ ق لیگ بنیادی طور پر بحران کی وہ کبیراں ہوتی ہیں جو پتھر اور لوہے کے بنے قلعوں کو کنڈر بنا دیتی ہیں یہ فرعون جیسے شاہانہ بادشاہوں کو برباد کر دیتی ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے یہ ق لیگیں جنم کیسے لیتی ہیں؟ ان کے جنم کو سمجھنے کیلئے آپ کو جنگل کی روایات میں جھانکنا پڑے گا۔

کہا جاتا ہے جنگل میں جب کوئی شیر پہلی بار شکار کیلئے نکلتا ہے تو اس کے حواریوں کا ایک گروہ بن جاتا ہے یہ حواری ایسے چھوٹے اور مسکین جانور ہوتے ہیں جو شیر کے شکار پر زندہ رہتے ہیں ان میں سے کوئی شکار کا سر کھاتا ہے کوئی شکار کی کھال اٹھارتا ہے کوئی اس کی آنتیں چباتا ہے کوئی اس کی دم چوستا ہے کوئی اس کی آنکھیں نوچتا ہے اور کوئی اس کے پائے پکا کر کھاتا ہے حواریوں کا یہ گروہ کبھی جانوروں کا دستہ ہوتا ہے اور ان کی بقا شیر اور شیر کے شکار سے وابستہ ہوتی ہے یہ جانور روز شیر کی کھچار کے سامنے قطار باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں جو ننگی شیر نکلتا ہے یہ چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتے ہیں شیر شکار کے بعد ایک آدھ دن لیٹتا ہے اور دھوپ میں بیٹھ کر خفالی کرنے لگتا ہے جس کے بعد ان حواریوں کی باری آتی ہے یہ حواری جانور اس شکار سے بڑے آرام سے ایک آدھ ہفتہ نکال لیتے ہیں جب یہ شیر بوڑھا ہو جاتا ہے یہ درویشی اختیار کرنے لگتا ہے یا یہ اس جنگل سے اکتا ہوتا ہے تو یہ حواری اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسے یہ بتانا شروع کر دیتے ہیں حضور آپ کا وجود اس جنگل کی خوشحالی اور استحکام کیلئے انتہائی ضروری ہے اگر آپ نے وردی اتار دی تو یہ سارا جنگل برباد ہو جائے گا لہذا خدا کے واسطے اس جنگل کی بقاء کیلئے اپنے ایلٹلے پر نظر ثانی فرمائیں اکثر شیر ان حواریوں کی باتوں میں آ جاتے ہیں اور وہ مزید دس دس برس تک شکار کھیلنے کا اعلان کر دیتے ہیں ان دس بیس برسوں کے دوران

کسی دن شیر کے پنجے کمزور پڑ جاتے ہیں اور اس کے دانت گر جاتے ہیں تو یہ سارے سارے حواری کسی دوسرے شیر کی کھچار کے سامنے تظار باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں یہ سلسلہ جب جنگلوں سے نکل کر شہروں اور نکلوں میں آتا ہے تو اس سے لگیں بنتی ہیں اور ان یگیوں سے انسانی شیروں کے زوال کا دور شروع ہوتا ہے۔

یہ بنیادی طور پر اقتدار کا فلسفہ ہے 'فرعون سے لے کر آج تک ہر صاحب اقتدار کی ایک لیگ ہوتی ہے اور یہ لیگ اسے ہر وقت یہ باور کراتی رہتی ہے "آپ کا وجود اس ملک کیلئے انتہائی ناگزیر ہے اور اگر آپ نے میدان چھوڑ دیا تو خوشحالی اور استحکام کا یہ عمل دم توڑ دے گا جس کے بعد یہ ملک ختم ہو جائے گا" اور دنیا کے 99 اعشاریہ 99 فیصد حکمران ان لوگوں کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں جس کے بعد جب تک وہ حکمران قائم رہتے ہیں یہ لوگ اس کے حکار پر پلے رہتے ہیں ان یگیوں کا ریکارڈ ہے انہوں نے آج تک کسی سربراہ کو اقتدار سے باعزت طریقے سے رخصت نہیں ہونے دیا لہذا آج راجہ مہیسس دوم کے 3285 برس بعد محسوس ہوتا ہے بنی اسرائیل کے بچے نقل کرنے کا منصوبہ فرعون نے نہیں بنایا ہوگا یہ یقیناً فرعون کی ف لیگ کا جمہوری فیصلہ ہوگا 'فرعون کی ف لیگ کو جب نجومیوں کی پیش گوئی کا علم ہوا ہوگا تو اس نے فوراً ایک بڑا اجلاس بلایا ہوگا اور اس اجلاس میں "پارٹی" نے فیصلہ کیا ہوگا ہمیں ملک کی خوشحالی اور جمہوریت کی بھانگیلے ہر قیمت پر فرعون کی جان بچانا ہوگی اس فیصلے کے بعد انہوں نے فرعون کو قائل کر لیا ہوگا وہ بنی اسرائیل کے تمام لوگوں کو بچنے نقل کرنے کا حکم دے دے اور فرعون نے بھی وسیع تر قومی مفاد اور نظریہ ضرورت کے تحت اس قرارداد پر دستخط کر دیئے ہوں گے جس کے بعد جب تک فرعون زندہ رہا ف لیگ بنی اسرائیل کے بچنے نقل کراتی رہی لیکن آخر میں پتہ چلا وہ خطرہ جسے ف لیگ حمل سے باہر ڈھونڈتی رہی تھی وہ فرعون کی گود میں پروان چڑھتا رہا تھا 'مجھے یقین ہے ف لیگ نے آخری وقت بھی اس خطرے سے بچنے کی کوشش کی ہوگی لیکن اس لمحے وقت کی پلوں سے بہت پانی جمع ہو چکا ہوگا۔

میں نے فرعون اور موسیٰ کا واقعہ زندگی میں بے شمار مرتبہ پڑھا لیکن اس واقعے کا یہ نفسیاتی پہلو ہمیشہ میری نظروں سے اوجھل رہا 'میں نے 25 جولائی 2006ء کے اخبارات میں ایک تین کالم خبر پڑھی تو اس خبر نے مجھے فرعون کی ساری مجبوریاں سمجھا دیں اور مجھے وہ پہلی بار بیچارہ بیچارہ سے محسوس ہوا یہ خبر پنجاب کی مسلم لیگ ق کے بارے میں تھی اس خبر میں انکشاف تھا مسلم لیگ ق پنجاب نے 24 جولائی کو لاہور میں قرارداد پاس کی "پاکستان مسلم لیگ ق وطن عزیز میں جاری ترقیاتی پروگراموں اور جمہوری عمل کے استحکام کیلئے جنرل پرویز مشرف کی صدارت کو ناکہ بڑھتی ہے لہذا ہم جنرل مشرف کو موجودہ اسمبلیوں سے اگلے پانچ سال کیلئے دردی سمیت صدر منتخب کرائیں گے" میں نے جوں ہی یہ خبر پڑھی مجھے 3285 برس پرانے حکمرانوں کی مجبوریاں یاد آگئیں اور میں بے اختیار 'مسلم لیگ ق کے دفتر کی طرف دوڑ پڑا میں مارگڈ روڈ پر مسلم لیگ ق کے دفتر کے سامنے رکا اس عمارت کو سیلوٹ کیا اور اس کے بعد عرض کیا "میں اس عمارت اور اس عمارت میں رہنے والے لوگوں کا دل سے ممنون ہوں ان لوگوں نے میرے تمام فکری مقابلے دور کر دیئے انہوں نے دنیا کا 3285 برس پرانا مسئلہ حل کر دیا۔"



کاشف ازاد

چودھری شجاعت سمجھ دار ہیں

ہمارے محبوب صدر جنرل پرویز مشرف کی کتاب "ان دی لائن آف فائر" کا انتہائی دلچسپ حصہ 12 اکتوبر 1999ء کے انقلاب سے متعلق ہے، صدر نے نواز شریف کی جسارت کو "کو" لکھا ہے جبکہ فوجی کارروائی کو "کاؤنٹر کو" کا نام دیا ہے یہ حصہ صفحہ 101 سے شروع ہو کر صفحہ 140 تک جاتا ہے۔ جناب عباس اطہر سمیت ہمارے تجزیہ نگاروں اور ٹیلی ویژن چینلوں نے اس حصے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جبکہ فوج کی طاقت، سوچ اور دست کو سمجھنے کے لئے یہ حصہ انتہائی اہم ہے اس حصے میں ہماری سیاست کا مستقبل اور قوم کے آنے والے دن بھی دکھائی دیتے ہیں۔

صدر محترم نے کتاب کے اس حصے میں 12 اکتوبر کو ایک خود کار واقعہ قرار دیا ہے ان کا فرمانا ہے فوج نے اقتدار میں آنے کیلئے کسی قسم کی منصوبہ بندی نہیں کی تھی، نواز شریف نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے جن کے نتیجے میں فوج ایوان اقتدار میں داخل ہو گئی، صدر نے فرمایا '12 اکتوبر کا انقلاب شام پانچ بجے شروع ہوا' پاکستان ٹیلی ویژن سے ان کی بے دخلی کی خبر نشر ہوئی جس کے بعد فوج حرکت میں آ گئی اور صرف ساڑھے تین گھنٹے میں حالات فوج کے قابو میں تھے، صدر نے فرمایا "پانچ بجے شام چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل محمد عزیز خان اور کور کمانڈر راولپنڈی لیفٹیننٹ جنرل محمود احمد آری کلب چک لالہ میں ٹینس کھیل رہے تھے جبکہ ٹرینل ون بریگیڈ کے دو کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل شاہد علی اور لیفٹیننٹ کرنل جاوید سلطان اسی کلب میں سکوائش کھیلنے میں مصروف تھے جوں ہی ان لوگوں نے بھری بے دخلی کی خبر سنی انہوں نے کھیل بند کیا اور جی ایچ کیو کی طرف دوڑ پڑے۔ ڈی جی ملٹری آپریشنز میجر جنرل شاہد عزیز گھر پر آرام کر رہے تھے وہ بھی خبر سن کر جی ایچ کیو پہنچ گئے جی ایچ کیو آ کر میجر جنرل شاہد عزیز نے ٹرینل ون بریگیڈ کے بریگیڈیئر صلاح الدین سنی کو آپریشن کا حکم دے دیا، کرنل شاہد علی اور کرنل جاوید سلطان کو وزیراعظم ہاؤس ایوان صدر، ٹیلی ویژن اور ریڈیو سٹیشنوں کے تحفظ کی ذمہ داری سونپ دی گئی، کرنل شاہد علی نے چند جوان لئے اور وہ اسلام آباد روانہ ہو گئے، جس کے بعد جنرل شاہد عزیز نے لاہور، کراچی اور پشاور کے کور کمانڈروں کو احکامات جاری کرنا شروع کر دیئے، لاہور کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل خالد مقبول اس وقت کو جرنالوالم میں تھے ان کی غیر موجودگی میں میجر جنرل طارق مجید سینئر افسر تھے، جنرل شاہد عزیز نے جنرل طارق مجید کو گورنر ہاؤس پنجاب، نواز شریف فیملی کی رہائش گاہیں، رائے ونڈ کا فارم ہاؤس، انیس پورٹ، ٹیلی ویژن

ریٹ یوشین اور شہر میں داخل ہونے اور باہر جانے کے تمام راستوں پر قبضے کا حکم دے دیا اسی قسم کے احکامات کراچی کے کورکمانڈر لیفٹیننٹ جنرل مظفر عثمانی اور کورکمانڈر پشاور کو بھی جاری کر دیئے گئے۔

صدر محترم نے صفحہ 123 پر تحریر کیا "جب کرنل شاہد راولپنڈی سے نکلنے لگے تو انہوں نے وزیراعظم ہاؤس کی گاڑی کے انچارج کوفون کیا "یہ ایک سرونگ میجر تھا" میجر اس وقت وزیراعظم ہاؤس کے میدان میں جاٹنگ کر رہا تھا" میجر کو اس کی بیوی کے ذریعے ٹیلی فون پر بلایا گیا "کرنل شاہد علی نے اسے وزیراعظم ہاؤس کو فوراً سیل کرنے کا حکم دے دیا" اسی طرح کرنل جاوید سلطان نے بھی ایوان صدر کے سیکورٹی انچارج میجر کوفون کیا اور اسے حکم دیا "ایوان صدر کو فوراً سیل کر دو اور اس کے بعد ٹیلی ویژن سٹیشن کو قبضے میں لے لو" دونوں میجر آگے بڑھے اور انہوں نے وزیراعظم ہاؤس "ایوان صدر اور پاکستان ٹیلی ویژن سٹیشن سیل کر دیئے" محترم صدر نے لاہور کے بارے میں لکھا "پانچ بج کر 45 منٹ پر پاک فوج کے چار دستے نکلے اور لاہور شہر میں پھیل گئے ان میں سے ایک گورنر ہاؤس چلا گیا" دوسرا ٹیلی ویژن سٹیشن تیسرا وزیراعظم کی رہائش گاہوں اور چوتھا وزیراعظم کے رائے دہن فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہو گیا" گورنر پنجاب ذوالفقار علی بھٹو 200 لوگوں کے مجمع سے خطاب کرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک دو فوجی جوان ان کے دفتر میں داخل ہو گئے "گورنر کے پرائیویٹ گاڑی نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں ایک طرف دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے ان دو جوانوں کے بعد ان کا کمانڈر داخل ہوا اور اس نے گورنر کو اپنے ساتھ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر چلنے کا حکم دے دیا" تیسرا واقعہ ان دونوں سے کہیں دلچسپ تھا "محترم صدر نے تحریر کیا "کرنل شاہد علی اپنے دو تین جوانوں کے ساتھ وزیراعظم ہاؤس کے بڑے پورچ میں داخل ہوئے پورچ میں جنرل ضیاء الدین کی سیاہ گاڑی کھڑی تھی گاڑی پر فل جرنیل کے سنار لگے تھے جنرل ضیاء الدین چیف آف آرمی سٹاف کی یونیفارم میں گاڑی کے پاس کھڑے تھے ان کے ساتھ نئے مقرر شدہ چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل اکرم اور وزیراعظم کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر جاوید کھڑے تھے یہ دونوں افسر بھی یونیفارم میں تھے ان کے ساتھ وزیراعظم کی سیکورٹی کے ڈی جی (یہ ایک ریٹائر میجر جنرل تھے) اور وزیراعظم کے پرنسپل سیکرٹری سعید مہدی کھڑے تھے اور ان کے ساتھ وزیراعظم ہاؤس کے سیکورٹی گاڑی اور ایلینٹ فورس کے جوان تھے، کرنل شاہد علی نے اپنے دو تین جوان پورچ میں تعینات کئے اور ان تمام افسروں کو ہتھیار چھیننے کا حکم دے دیا "صدر کی کتاب میں اس کے بعد افسروں کے طویل مکالمات شروع ہو جاتے ہیں، جنرل ضیاء الدین جی ایچ کیو جاتا چاہتے تھے جبکہ کرنل شاہد علی ان کا راستہ روکے کھڑے تھے، کرنل شاہد کو جنرل ضیاء الدین، جنرل اکرم اور بریگیڈیئر جاوید نے کبھی دھمکانے اور کبھی ترفیب دینے کی کوشش کی لیکن وہ ثابت قدم رہے یہاں تک کہ جنرل ضیاء الدین اور ان کے ساتھی ہتھیار پھینک کر اندر چلے گئے یوں کرنل شاہد علی اپنے چند جوانوں کی مدد سے وزیراعظم ہاؤس پر قابو پا لیتے ہیں۔

میں نے جب یہ تینوں واقعات پڑھے تو مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی اللہ کے کرم سے ہماری فوج اتنی طاقتور

ہے کہ ایک جاگنگ کرتا ہوا میجر دس منٹ میں ہیوی میٹھیٹ وزیراعظم ہاؤس کو تھل کر سکتا ہے اور ایک میجر چند جوانوں کی مدد سے ایوان صدر کو تالے لگا سکتا ہے جبکہ پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کے سیاسی گورنر کو گرفتار کرنے کیلئے صرف دو فوجی جوان کافی ہیں۔ اسی طرح ایک کرنل دو تین جوانوں کی مدد سے نہ صرف وزیراعظم، وزیراعلیٰ، وزیراعز، سینیٹرز اور ایم این اے کو قلعہ کر سکتا ہے بلکہ وہ جنرل اور بریگیڈیئر لیول کے باغی افسروں کو بھی بے دست و پا کر سکتا ہے جبکہ ایک جونیئر افسر پندرہ منٹ میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی نشریات روک سکتا ہے۔ مجھے صدر صاحب کی کتاب پڑھنے کے بعد محسوس ہوا ملک میں ”کاؤنٹر کو“ کرنے کیلئے کسی ایسی چوڑی فورس یا پلاننگ کی ضرورت نہیں ہوتی اگر چند سینئر افسر تیس اور سکوائش کھیلتے ہوئے فیصلہ کر لیں تو وہ صرف پندرہ منٹ میں ملک کو تمام سیاسی خطرات سے آزاد کر سکتے ہیں، مجھے صدر صاحب کی کتاب پڑھ کر معلوم ہوا ہماری فوج میں جونیئر افسر جنٹیوں سے کہیں زیادہ طاقتور اور با اختیار ہیں۔

یہ کتاب پڑھنے کے بعد میرے دل میں چوہدری شجاعت حسین، شیخ رشید احمد اور مشاہد حسین کی قدر میں اضافہ ہوا اور میں ان کی دانشمندی اور معاملہ نمئی کا قائل ہو گیا، یہ تینوں حضرات میاں نواز شریف کے انتہائی قریب تھے، میں نے اپنی آنکھوں سے کئی بار ان حضرات کو نواز شریف پر جان چھڑکتے دیکھا تھا لیکن جب ”کاؤنٹر کو“ ہوا تو یہ لوگ فوراً فوجی حکومت کا حصہ بن گئے ان حضرات کی اس معاملہ نمئی پر اس دور میں بعض لوگوں نے انہیں نامناسب خطاب سے نوازنا شروع کر دیا تھا بد قسمتی سے میں بھی ان بے وقوف لوگوں میں شامل تھا ان دنوں شیخ رشید نے براخوب صورت بیان دیا تھا انہوں نے فرمایا تھا ”میں طویل تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں، پاکستان میں فوج کے بغیر سیاست ممکن نہیں“ مجھے اس وقت شیخ صاحب کے خیالات سے اتفاق نہیں تھا لیکن آج صدر محترم کی کتاب پڑھنے کے بعد مجھے شیخ رشید کی معاملہ نمئی اور الہامی خیالات پر یقین ہو گیا اور مجھے محسوس ہوا شیخ رشید کی طرح چوہدری شجاعت حسین اور مشاہد حسین سمیت مسلم لیگ (ق) کے تمام ارکان، ایم کیو ایم، پیٹریاٹ اور مولانا فضل الرحمن بھی ٹھیک ٹھاک معاملہ نمیم اور سمجھ دار لوگ ہیں یہ لوگ بھی بروقت اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے لہذا آج یہ تمام لوگ تاریخی اختیارات اور اقتدار سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جبکہ وہ لوگ جنہوں نے ابھی تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا وہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر دھکے کھا رہے ہیں، وہ آج تک ملک میں جمہوریت کے خواب دیکھ رہے ہیں مجھے معلوم ہوا قدرت نے ہماری فوج کو اپنا ملک فتح کرنے کی ٹھیک ٹھاک صلاحیت سے نوازا رکھا ہے چنانچہ اب اس ملک میں سیاست کرنے کا صرف ایک ہی فارمولا ہے تمام سیاستدان چوہدری شجاعت بن جائیں جنرل مشرف زندہ باد کے نعرے لگائیں اور انتقال تک حکومت کریں۔



یہ کتاب ثابت کرتی ہے

کسی سردار نے اپنی بیوی سے پوچھا "اگر کوئی شخص تمہاری عصمت کے بدلے تمہیں دس ہزار روپے کی پیشکش کرے تو تمہارا کیا رد عمل ہوگا" بیوی نے غصے سے جواب دیا "میں اس کا منہ توڑ دوں گی" سردار نے پوچھا "اگر وہ ایک لاکھ روپے کی آفر دے تو؟" بیوی نے جواب دیا "میں معذرت کر لوں گی" سردار مسکرایا "اور اگر وہ تمہارے سامنے ایک کروڑ روپے رکھ دے تو؟" بیوی نے تھوڑی دیر سوچا اور پیچیدہ ہو کر بولی "میں خاموش رہوں گی" سردار نے قہقہہ لگایا "اور اگر وہ دو کروڑ روپے دے دے تو؟" بیوی نے فوراً جواب دیا "میں اس کی آفر قبول کر لوں گی" سردار نے میز پر ہاتھ مار کر نعرہ لگایا "لو ایک بات تو ثابت ہو گئی" بیوی نے سراٹھا کر پوچھا "کیا؟" سردار پورے دھوقے سے بولا "میں ایک ایسی عورت کے ساتھ رہ رہا ہوں جسے خریدنا جاسکتا ہے۔"

میں آج تک اس واقعہ کو محض ایک لطیفہ سمجھتا رہا ہوں لیکن جب سے ہمارے محبوب صدر جناب پرویز مشرف کی "خودنوشت" ان دی لائن آف قائماریٹ میں آئی ہے مجھے محسوس ہو رہا ہے یہ محض ایک لطیفہ یا ایک واقعہ نہیں، یہ ایک باقاعدہ فلسفہ حیات ہے اور ہم 16 کروڑ لوگ اس فلسفہ حیات کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں گو صدر پرویز مشرف، جہانوں گوہر اور ان کی صاحبزادی ثانیہ گوہر نے اس کتاب سے عالمگیر شہرت حاصل کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کتاب نے ہماری سیاست، ہماری سفارت اور ہماری عسکری شہنشاہت کو بھی پوری دنیا کے سامنے نکال کر دیا، ہم پہلی مرتبہ مکمل کر دنیا کے سامنے آ گئے دنیا اس سے پہلے ہمیں سرداری بیوی کی طرح قابل خرید اور بد اخلاق سمجھتی تھی لیکن ہم نے پہلی مرتبہ دنیا کو اس کا تحریری ثبوت پیش کر دیا، ہم نے پہلی مرتبہ اپنے جرائم تسلیم کر لئے، صدر صاحب کی کتاب کے اصل تجزیے تو دس پندرہ برس بعد اس وقت ہوں گے جب صدر صاحب ہمیں داغِ سفارت دے چکے ہوں گے تاہم سردست ہم اس کتاب کی چند موٹی موٹی باتوں کا ایک "مختصراً" سا جائزہ لے سکتے ہیں، صدر صاحب نے اپنی ذات اور اپنی خودنوشت دونوں کو اعتدال پسند ثابت کرنے کے لئے کتاب کا آغاز اپنی جوانی کے دو محاشقوں سے کیا۔ صدر نے اعتراف کیا وہ میٹرک میں اپنی ایک ہمسائی کے عشق میں جھلتے اور وہ اپنی نانی کے ہر قے کی جیب میں رقتے ڈال کر اسے بھجوا کر تے تھے۔ صدر نے انکشاف کیا وہ اس دور میں ایک

بنگالی لڑکی کے عمر میں بھی جتنا ہو گئے تھے اور انہوں نے فرمایا وہ اکثر کالج سے غائب ہو جاتے تھے رات کو لگم دیکھتے تھے، واپسی پر مسجد میں لیٹ جاتے تھے اور صبح ہاسٹل آ جاتے تھے، صدر صاحب کے ان انکشافات سے جہاں ان تمام نوجوانوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو راتوں کو ہاسٹلوں سے غائب ہو جاتے ہیں، جن کے گھروں کی کھڑکیاں ہمسایوں کے گھن میں کھلتی ہیں اور جو اپنی اپنی نائینوں کے برقعوں کے اس سائنسی استعمال سے ناواقف ہیں وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے ہمارے ملک میں صدر بننے کے لئے اعلیٰ اخلاقی اقدار یا بہت زیادہ ذہانت اور محنت کی ضرورت نہیں گو صدر صاحب کی جوانی کے یہ تجربات سچ ہیں اور ان تجربات کا اعتراف انہیں ایک جرأت مند اور بے باک شخص ظاہر کرتا ہے لیکن اگر صدر یہ اعتراف نہ کرتے تو بھی ان کی جرأت مندی اور بے باکی پر کوئی حرف نہ آتا، دنیا انہیں پہلے ہی سچا کھرا اور جرأت مند شخص تسلیم کر چکی ہے، صدر صاحب نے انکشاف کیا جنرل جہانگیر کرامت کے دور میں کور کمانڈرز کے اجلاس میں جنرل علی قلی خان فوج کو اقتدار پر قبضے کی ترغیب دیتے رہتے تھے، اس انکشاف سے ثابت ہوتا ہے فوج میں اقتدار تک پہنچنے کی سوچ ہر وقت موجود رہتی ہے، صدر صاحب نے انکشاف کیا نائن ایون کے بعد امریکہ کے نائب وزیر خارجہ چرڈ آر میچ نے پاکستان کو دھمکی دی، "اگر پاکستان نے امریکہ کا ساتھ نہ دیا تو وہ بمباری کے ذریعے پاکستان کو پتھر کے زمانے میں پہنچا دیں گے" اس دھمکی کے بعد حکومت نے امریکہ کی حمایت کا فیصلہ کر لیا، صدر کا یہ انکشاف ثابت کرتا ہے ہم لوگ، ہماری پالیسی، ہمارا قانون، ہمارا آئین اور ہماری حکومتیں ایک دھمکی کے فاصلے پر ہیں اور امریکہ کا ایک درمیانے درجے کا افسر جب چاہے ٹیلی فون اٹھا کر ہمیں یوٹرن لینے پر مجبور کر سکتا ہے، صدر صاحب نے انکشاف کیا امریکی سفیر وینڈی جیمبر لین 13 ستمبر 2001ء کو سات مطالبات کی فہرست لے کر ان کے پاس آئیں۔ یہ انکشاف ثابت کرتا ہے پاکستان میں امریکی سفیر کو وائسرائے کی حیثیت حاصل ہے اور امریکہ جب چاہے اپنا سفیر بھجوا کر ہم سے بڑے سے بڑے فیصلہ کر سکتا ہے، صدر نے انکشاف کیا ہم نے القاعدہ کے 689 ارکان پکڑے، ان میں سے 369 لوگ امریکہ کے حوالے کئے اور لاکھوں ڈالر کمانے، یہ انکشاف ثابت کرتا ہے ہم ڈالر کمانے کیلئے ہر قسم کی "قربانی" دے سکتے ہیں، یہ انکشاف ثابت کرتا ہے ہمارے ملک میں قومی سطح کی ایسی خدمات کا صلہ سرکاری خزانے میں جمع نہیں ہوتا، یہ براہ راست افراد کی جیبوں میں چلا جاتا ہے، صدر نے انکشاف کیا انہوں نے اپنے پرنسپل سیکرٹری طارق عزیز کی مدد سے (ق) لیگ بنائی اور انہوں نے جناب شوکت عزیز کو وزیراعظم بنانے کا فیصلہ ذاتی طور پر کیا، یہ دونوں انکشاف ثابت کرتے ہیں پاکستان میں کوئی بھی طاقتور حکمران کسی بھی وقت ایک بڑے سازش کی مسلم لیگ بنا سکتا ہے اور ملک میں وزیراعظم کے عہدے کیلئے کوئی کوالیفیکیشن موجود نہیں اور صدر صاحب نے اس کتاب کی لائچنگ کے دوران وردی کے بارے میں فرمایا "وردی اتارنے کا وعدہ منہ کے الفاظ تھے"۔ یہ انکشاف ثابت کرتا ہے صدر صاحب کے وعدے کسی بھی وقت منہ کے الفاظ ثابت ہو سکتے ہیں، وہ تین لفظ بول کر اپنے بڑے سے بڑے فیصلے سے انحراف کر سکتے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان کے اس انحراف کا حساب نہیں کر سکتی۔

اگر ہم اس کتاب کا سرسری سا جائزہ لیں تو ثابت ہوتا ہے ہمارے ملک میں اخلاقیات، قانون، آئین اور سیاسی روایات نام کی کوئی چیز موجود نہیں، ہمارے ملک کی کوئی خارجہ پالیسی، کوئی داخلی قانون اور کوئی آئین نہیں اور یہ کتاب ثابت کرتی ہے اس ملک میں 1958ء سے کسی بیرونی خان یا کسی آغا توپ خان کی حکومت چلی آ رہی ہے اور اس توپ خان کا ہر خواب، ہر خواہش اور ہر خیال قانون، آئین اور (نحوہ باللہ) حکم الہی کا درجہ رکھتا ہے اور پوری قوم اس حکم کے سامنے بے بس ہے۔ یہ کتاب ثابت کرتی ہے ہمارا ملک موم کی ناک ہے اور جو شخص جب چاہے اس ناک کو ہتھی میں لے کر اس کا زاویہ بدل سکتا ہے اور یہ کتاب ثابت کرتی ہے ہم لوگ کوئی قوم، کوئی ملک نہیں ہیں ہم سردار کی بیوی ہیں اور دنیا کا ہر سوداگر ہماری قیمت لگا سکتا ہے یہ کتاب ثابت کرتی ہے ہم بک بھی سکتے ہیں ڈب بھی سکتے ہیں ہماگ بھی سکتے ہیں اور ہم معافی بھی مانگ سکتے ہیں۔

میرے ایک سرکاری دوست کا فرمانا ہے "یہ کتاب پاکستان کی تاریخ ہے" میں ان کے فرمان میں تھوڑا سا اضافہ کرنا چاہتا ہوں "میرا یہ خیال ہے یہ کتاب ہماری تاریخ نہیں بلکہ یہ ہمارا مستقبل بھی ہے اور یہ کتاب ثابت کرتی ہے ہم کیا تھے ہم کیا ہیں اور ہم آنے والے دنوں میں کیا ہوں گے یہ کتاب ایک آئینہ ہے جس میں ہم اپنی تمام بد صورتیاں دیکھ سکتے ہیں۔"

Kashif Azad @ OneUrdu.com

پانچ چھ سالوں کی گیم

میں میاں نواز شریف کے دفتر سے واپس آیا تو میرے دوست نے بے تابی سے پوچھا "ملاقات کیسی رہی" میں نے کوٹ کے مشن کھولے اور لمبا سانس لے کر جواب دیا "بہت اچھی، میاں نواز شریف پہلے سے زیادہ بچھور ہیں اس جلا وطنی نے انہیں حقیقی سیاستدان بنا دیا" میرے دوست نے قہقہہ لگایا اور طنز یہ انداز سے بولا "بچھورٹی ا" میں اس کی بات سمجھ گیا، میرا یہ دوست پیشے کے لحاظ سے صحافی ہے اور یہ میاں نواز شریف کو غیر سنجیدہ سیاستدان سمجھتا ہے، اس کا خیال ہے میاں صاحب نے جلا وطنی سے کچھ نہیں سیکھا، وہ ابھی تک خواب و خیال کی دنیا میں رہ رہے ہیں، حکومت انتخابات میں ان کی پارٹی کو جڑ سے اکھاڑ دے گی اور وہ اسمبلیوں میں بمشکل پانچ سات نشستیں لے سکیں گے لیکن میاں صاحب صورتحال کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہے" مجھے اپنے دوست سے ہمیشہ اختلاف رہا، میرا خیال ہے ہم لوگ میاں نواز شریف کو سمجھنے میں غلطی کرتے آ رہے ہیں، ہم کیا غلطی کرتے ہیں یہ میں آپ کو چند لمحے بعد بتاؤں گا، سردست میں میاں صاحب سے ملاقات کی طرف آتا ہوں۔

میاں صاحب سے میری ملاقات 5 مارچ 2007ء کو ساڑھے بارہ بجے ان کے آفس میں ہوئی تھی۔ میاں صاحب کا آفس نادر چودھری اور پرویز رشید چلا رہے ہیں۔ میاں نواز شریف کی کچھلی سیاست کیسی تھی، وہ آنے والے دنوں میں سیاست کے میدان میں کیا رول ادا کریں گے اور میاں صاحب کو قدرت نے کون سے مواقع فراہم کیے تھے اور وہ ان مواقع سے کتنا فائدہ اٹھا سکے، یہ ایک طویل بحث ہے لیکن جہاں تک میاں نواز شریف کی ذات کا تعلق ہے، ان میں ایک دلچسپ خوبی ہے۔ میاں صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایک برکت اور ایک رونق بخش رکھی ہے، وہ جہاں بیٹھے ہیں لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، میں جب ان کے دفتر پہنچا تو گلی تک لوگ کھڑے تھے۔ دفتر میں بھی لوگوں کا ہتھکھٹکا لگا تھا، میں نے پرویز رشید سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بتایا جس دن میاں صاحب لندن نہیں ہوتے اس دن دفتر سنسان ہو جاتا ہے اور ہم لوگ سارا دن ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہتے ہیں۔ پرویز رشید کا کہنا تھا "ہم نے یہ دفتر شروع کیا تو یہاں لوگوں کی بلیخار ہو گئی، جس کے رد عمل میں بلڈنگ کے دوسرے کرایہ داروں نے ہماری شکایت کر دی، یہ لوگ ہمارے کلچر سے واقف نہیں تھے لہذا اب ہم نے بڑی حد تک

لوگوں کو کنٹرول کر لیا ہے، ہماری کوشش ہوتی ہے لوگ میاں صاحب سے ملاقات کیلئے وقت لے کر آئیں لیکن اس کے باوجود روزانہ سو ڈیڑھ سو لوگ آجاتے ہیں" میں نے میاں صاحب سے بھی اپنی آبروروشن کا ذکر کیا۔ انہوں نے تہنید لگایا اور اوردیکھ کر بولے "یہ سب اللہ کا کرم ہے" میاں صاحب نے مجھے اپنا سوبائل دکھایا ان کے سوبائل میں دو ہزار نو سو 34 پیغام تھے یہ سب ایک دن کے پیغام تھے۔

میرکی میاں صاحب سے گفتگو شروع ہوئی تو مجھے ان کے خیالات میں بڑی کیسرتی محسوس ہوئی، ان کا کہنا تھا وہ جنرل پرویز مشرف سے کسی قیمت پر کپرومانتر نہیں کریں گے ان کا کہنا تھا "میری زندگی کا اب صرف ایک ہی مقصد ہے فوج کو سیاست سے الگ کرنا اور پاکستان میں اصل جمہوریت کا نفاذ" میاں صاحب کا خیال تھا "وقت اور حالات بڑی تیزی سے سیاسی جماعتوں کو اتحاد کی طرف لے جا رہے ہیں لہذا وہ وقت دور نہیں جب ساری سیاسی جماعتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں گی اور حکومت کے لیے اپنے آپ کو بچانا مشکل ہو جائے گا" میں نے ان سے پوچھا "اگر کبھی ان کے پرانے ساتھی چودھری شجاعت حسین، مشاہد حسین اور شیخ رشید ان کے پاس واپس آگئے تو" انہوں نے فوراً نفی میں سر ہلایا اور یقین سے کہا "میرے دروازے ان لوگوں کے لیے بند ہو چکے ہیں" میں نے عرض کیا "جب آپ جینظیر بھٹو، مولانا فضل الرحمن اور عمران خان سے اتحاد کر سکتے ہیں تو چودھری شجاعت حسین میں کیا خرابی ہے" میاں صاحب فوراً بولے "مخالفت اور بے وفائی میں فرق ہوتا ہے، جینظیر بھٹو اور عمران خان ہمارے سیاسی مخالف تھے جبکہ چودھری شجاعت مشاہد حسین اور شیخ رشید نے پارٹی اور میرے ساتھ بے وفائی کی۔ میں اگر ان لوگوں کو دوبارہ سینے سے لگا لیتا ہوں تو یہ میرے وفادار ساتھیوں کے ساتھ زیادتی ہوگی" میں نے ان سے عرض کیا "آپ کو برطانیہ جیسے کھلے معاشرے میں رہ کر محسوس نہیں ہوتا قدرت نے آپ کو دوبارہ پاکستان کی قسمت بدلنے کا موقع دیا لیکن آپ پاکستان کو برطانیہ نہیں بنا سکتے" انہوں نے فوراً جواب دیا "برطانیہ کی سیاست میں فوج نہیں، ہم لوگ بھی پاکستان کو ترقی کے اس معیار تک پہنچا سکتے تھے لیکن فوج نے ہمارے ہاتھ باندھ رکھے تھے، میں یہ نہیں کہتا ہم لوگ مکمل طور پر بے قصور ہیں ہم لوگوں سے بھی غلطیاں ہوئی تھیں، میں آج ان غلطیوں کو "ریلائز" کر رہا ہوں اور ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دوبارہ موقع دیا تو میں یہ غلطیاں نہیں دہراؤں گا، میں اقتدار کو صرف اور صرف لوگوں کی بھلائی کیلئے استعمال کروں گا" میاں صاحب کا کہنا تھا "پاکستان کے سیاسی حالات میں بہت بڑی تبدیلی آنے والی ہے، انہیں محسوس ہوتا ہے وہ اور محترمے جینظیر بھٹو ایکشن سے پہلے پاکستان ہوں گے"

میں اب واپس اپنے دوست کی طرف آتا ہوں، میرا دوست نواز شریف کو "ان سیریس" سیاستدان سمجھتا تھا، میں نے نواز شریف کی تعریف کی تو اس نے تہنید لگایا اور مجھے تسخیران نظروں سے دیکھنے لگا، میں نے اس سے کہا، میں تم سے سات سوال پوچھتا ہوں اگر تم ان میں سے کسی ایک سوال کا جواب نفی میں دے دو تو میں تمہاری بات مان لوں گا۔ اس نے کہا "او کے سوال پوچھو" میں نے کہا "پاکستان میں اڑھائی سو کے قریب بڑے کاروباری

خاندان ہیں، ان میں سے صرف ایک خاندان کے ایک فرد نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا اور وہ شخص کامیاب ہو گیا یہ شخص نواز شریف تھا کیا کوئی نان سیریس بزنس میں سیاست میں آسکتا ہے اور کیا آکر کامیاب ہو سکتا ہے؟“ میرا دوست خاموش رہا میں نے پوچھا ”نواز شریف جب سیاست میں آیا تو اس وقت ملک میں بڑے بگاڑا، غلام مصطفیٰ جتوئی، محمد خان جوینجو اور حامد ناصر چٹھہ کا طوطی بولنا تھا لیکن نواز شریف نے آتے ہی ان سب کو سیاست سے باہر بیٹھ دیا۔ تم بتاؤ کیا یہ کام کوئی نان سیریس شخص کر سکتا ہے؟“ میرا دوست خاموش رہا میں نے پوچھا ”نواز شریف پاکستان میں دو بار وزیراعظم بنا، دوسری بار ایک بھائی وزیراعظم تھا اور دوسرا بھائی سب سے بڑے صوبے کا وزیراعلیٰ، کیا کوئی نان سیریس شخص اقتدار کے اس لیول تک پہنچ سکتا ہے؟“ میرا دوست خاموش رہا میں نے کہا ”میاں نواز شریف نے دو صدور غلام اسحاق خان، سردار فاروق احمد لغاری، ایک چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ اور تین سردار چیف جسٹس گھر بھجوا دیئے۔ اس نے نیول چیف منصور الحق اور آری چیف جنرل جہانگیر کرامت سے استعفیٰ لیے کیا یہ کام کوئی نان سیریس شخص کر سکتا تھا“ میرا دوست خاموش رہا میں نے پوچھا ”نواز شریف پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کو لاہور لے آیا تھا۔ اس نے کشمیر کے مسئلے کو حل تک پہنچا دیا تھا۔ کیا کوئی نان سیریس شخص یہ کام کر سکتا تھا؟“ میرا دوست خاموش رہا میں نے پوچھا ”نواز شریف نے پوری دنیا کے دباؤ کے باوجود اٹلی دھماکہ کیا یہ وہ کام تھا جو ذوالفقار علی بھٹو جیسا ایڈراور جنرل ضیاء الحق جیسا با اختیار شخص نہیں کر سکا“ کیا یہ کام بھی کوئی نان سیریس شخص کر سکتا تھا۔“ میرا دوست خاموش رہا اور میں نے اس سے آخری سوال پوچھا ”نواز شریف نے اس دور میں موٹروے، پہلی ٹیکسیوں اور سٹے گھروں کے منصوبے شروع کیے تھے جب یہ منصوبے خواب لگتے تھے، آج سترہ اٹھارہ برس بعد حکومت روڈ میٹ ورک، کارخانہ ننگ اور ہاؤس لونگ کے فیز میں داخل ہوئی ہے۔ کیا یہ بھی کسی نان سیریس شخص کا کام ہے؟“ میرا دوست خاموش رہا میں نے عرض کیا ”میاں نواز شریف کے سارے کام ٹھہرے ہوئے اور دورانہ نیش سیاستدانوں جیسے تھے لیکن اس کے باوجود تم جیسے لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں“ میرے دوست نے بے چینی سے کروش بدلی میں نے عرض کیا ”بس نواز شریف میں دو خامیاں ہیں ایک وہ مشرقی روایات کے باجاء انسان ہیں، وہ اردو اور پنجابی بولتے ہیں، لوگوں سے گلے ملتے ہیں اور ایک خاندانی انسان کی طرح لوگوں کی توجیح کرتے ہیں اور ان کی دوسری خامی پنجابی کلچر ہے وہ منہ میز حاکم کے انگریز کی نہیں بولتے جبکہ ہم لوگ دو سو سال غلام رہے ہیں لہذا اغلامی ہمارے ضمیر میں شامل ہو چکی ہے۔ ہم لوگ صرف فاصلے پر رہنے والے سیاستدانوں کو لیڈر مانتے ہیں ہم صرف انہیں سیاستدان سمجھتے ہیں جو انگریزی بولتے اور پائپ پیٹے ہیں، مجھے یقین ہے اگر یہی نواز شریف و افسٹن سے آیا ہوتا یا روس انگریزی میں لکھی تقریریں کرتا تو ہم اسے ہالیوے سے بلند لیڈر سمجھتے“ میرا دوست خاموش رہا۔ میں نے عرض کیا ”میں اب تمہیں مستقبل کے نواز شریف کے بارے میں بتاتا ہوں، تم لکھ لو نواز شریف اپنے سے پہلے بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم بنائے گا“ میرے دوست نے حیرت سے میری طرف دیکھا ”میں نے عرض کیا“ اس کی دو وجوہات ہیں، پاکستان کے اگلے

وزیراعظم کو جنرل پرویز مشرف کی روشن خیالی اور اعتماد پسندی سے کھمبہ کرنا پڑے گا۔ اسے پاکستان میں شراب نوشی اور کلبوں کی اجازت دینا پڑے گی اور یہ اس وزیراعظم کی پہلی ناکامی ہوگی دوسرا اگلے وزیراعظم کو فوج کے ساتھ بھی کھمبہ کرنا پڑے گا۔ فوج موجودہ حکمرانوں کا احتساب نہیں کرنے دے گی چنانچہ نواز شریف کی کوشش ہوگی گھائے کا یہ سودا بے نظیر بھٹو کرے، یوں بے نظیر اقتدار میں آکر ایک دو برسوں میں ناکام ہو جائے گی اور اس کے بعد نواز شریف پوری طاقت کے ساتھ پاکستانی سیاست میں آئے گا اور وہ کام کر دکھائے گا جو حسین شہید سہروردی سے ذوالفقار علی بھٹو تک کوئی نہ کر سکا۔ میرے دوست نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا "کیا مطلب" میں نے عرض کیا "نواز شریف اپنے لیے صدر کا عہدہ چنے گا اور شہباز شریف کو وزیراعظم بنائے گا" میرے دوست نے تہمت لگایا "لیکن کب" میں نے کہا "یہ صرف پانچ چھ سالوں کی گیم ہے" میرے دوست نے تہمت لگایا اور میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا "تم صحافی رہو تو نبوی بننے کی کوشش نہ کرو جب تک صدر پرویز مشرف ہیں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو پاکستان نہیں جاسکتے یہ گیم شروع نہیں ہوگی"



Kashif Azad @ OneUrdu.com

ون ڈش پر دوبارہ پابندی لگا دی یہ پابندی قومی اسمبلی میں چیلنج ہو گئی اس پر سال بھر بحث چلتی رہی یہاں تک کہ 22 اگست کو حکومت نے ون ڈش کو قانون کی شکل دے دی یوں بوٹی چوٹی ہار کونٹہ بن گئی ہم اب بھی دعوئی سے نہیں کہہ سکتے ون ڈش کے بارے میں اگلی حکومت اور اگلی پارلیمنٹ کی کیا پالیسی ہوگی وہ ویسے اور نکاح کے کھانے پر عمل پابندی لگانے کی یا پھر وہ اسے پوری طرح کھلا چھوڑ دے کی چٹانچھوڑنے کا سفر ابھی جاری ہے۔

ون ڈش ہمارے مزاج کی صرف ایک مثال ہے آپ اگر ذرا سا غور کریں تو آپ کو ایسی سینکڑوں ہزاروں مثالیں ملیں گی جن میں ہم نے ایک ہی کام چار چار بار کیا آپ ان تمام سیاسی اور سماجی کاموں کا جائزہ لیں تو آپ کو محسوس ہوگا ہم پالیسیوں کے حوالے سے "کوٹنے" ہیں آپ حدود کو لیجئے ذوالفقار علی بھٹو تک پاکستان میں "حدود" نام کا کوئی قانون نہیں تھا جنرل ضیاء الحق آئے تو اچانک محسوس ہوا ملک میں فاشی اور آمرانی کا دور دورہ ہے اور اگر اس فاشی کے سامنے بند نہ باندھا گیا تو یہ فاشی ملک کو بھالے جائے گی جنرل صاحب نے فاشی کا راستہ روکنے کیلئے 1979ء میں حدود آرڈیننس نافذ کر دیا اس وقت پاکستان کے تمام حلقوں نے اس آرڈیننس کو خوش آمدید کہا اخبارات میں اس کے حق میں ادارے لکھے گئے لیکن 2006ء میں اچانک یہ آرڈیننس ظلم اور زیادتی محسوس ہونے لگا حکومت نے اس آرڈیننس کی کوکھ سے تحفظ حقوق نسواں بل نکالا اور پوری سرکاری مشینری اس کے نفاذ پر لگا دی اب اخبارات میں اس نئے بل کے حق میں ادارے لکھے جا رہے ہیں اور قوم اسے خوش آمدید کہہ رہی ہے مجھے کچھ نہیں آتی 1979ء کا آرڈیننس صحیح تھا یا 2006ء کا بل جنرل محمد ضیاء الحق کی سوچ درست تھی یا جنرل پرویز مشرف کے انکار جنرل ضیاء الحق کا کونٹہ ٹھیک تھا یا جنرل مشرف کی بوٹی ایک جرنیل صحیح تھا یا دوسرا جرنیل آپ 58 ٹوٹی کو لیجئے 1985ء کی اسمبلی نے صدر کو 58 دوب کے اختیارات دیئے ان اختیارات کے ذریعے صدر کسی بھی وقت کسی بھی منتخب حکومت کو گھر بھجوا سکتا تھا اس زمانے میں سیاستدانوں اور دانشوروں نے اس ترمیم کو جمہوریت کی بھارت قرار دیا 1997ء میں نواز شریف نے دو تہائی اکثریت سے یہ ترمیم ختم کر دی 1997ء میں سیاستدانوں اور دانشوروں نے اس اقدام کو جمہوریت کی فتح قرار دیا صدر پرویز مشرف کی تخلیق کردہ اسمبلی نے 2003ء میں ایک بار پھر 58 دوب کو آئین کا حصہ بنا دیا اور سیاستدانوں نے اسے بھی جمہوریت کی بھارت قرار دیا مجھے سمجھ نہیں آ رہی 1985ء کی اسمبلی درست تھی 1997ء کی اسمبلی نے صحیح فیصلہ کیا تھا یا پھر 2003ء کی اسمبلی کا موقف درست تھا اور اب آنے والی اسمبلی اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرے گی سر درست اس کے بارے میں کوئی پتہ نہیں کی جا سکتی کیونکہ کونٹہ سازی کا عمل ابھی تک جاری ہے آپ اگر تحقیق کریں تو آپ کو ہماری تاریخ سے ایسی بے شمار مثالیں ملیں گی ہم نے آج تک اس ملک میں کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جس میں بعد ازاں ترمیم نہ ہوئی ہو اور ہم نے آج تک کوئی ایسی پالیسی نہیں بنائی جس سے ہم نے 180 درجے کے زاویے پر اپنا رخ نہ بدلا ہو بھارت سے لے کر افغانستان تک اور امریکہ سے لے کر ایران تک ہر دور میں ہماری خارجہ پالیسی مختلف تھی ہر دور کی خارجہ پالیسی پچھلے دور سے الٹ تھی ہماری کونٹہ سازی کی یہ حالت ہے ہم آج

تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے ہماری دفتری اور سرکاری زبان کیا ہوگی اور ہمارا قومی لباس کیا ہے ہم لوگ سوٹ کو بھی قومی لباس کہتے ہیں اور شہروانی کو بھی جناح کیپ ہمارے قومی لباس کا حصہ ہے لیکن صدر اسحاق سے صدر پرویز مشرف اور نواز شریف سے شوکت عزیز تک میں نے آج تک کسی کو جناح کیپ پہنے نہیں دیکھا جناب نظر اللہ بڑالی صاحب نے تو اپنے پورے دور میں شہروانی تک نہیں پہنی لہذا ہم لوگ ہر لحاظ سے کہتے ہیں۔

آپ بلوچ سرداروں کے ایٹھو کو لے لیجئے ہم نے نواب اکبر خان کیٹی کو تاریخ میں پانچ بار محبت وطن اور پانچ بار شہر پسند اور علیحدگی پسند قرار دیا 1947ء میں نواب اکبر خان کیٹی نے پاکستان میں شمولیت کا اعلان کیا تو وہ محبت وطن تھے 1957-1958ء میں وہ وزیر داخلہ اور دفاع کے وزیر مملکت بنے تو بھی وہ محبت وطن تھے لیکن صدر ایوب کے دور میں جب ان کے فیلفڈ مارشل سے اختلافات پیدا ہو گئے تو وہ مجرم بھی ہو گئے نثار بھی اور خالم بھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں وہ گورنر بنے تو وہ دوبارہ محبت وطن ہو گئے بھٹو کے ساتھ ان کے اختلافات پیدا ہوئے تو وہ ایک بار پھر خالم بھی ہو گئے علیحدگی پسند بھی اور نثار بھی جنرل ضیا الحق کے دور میں انہوں نے جنرل ضیا الحق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو وہ ایک بار پھر نثار اور خالم ہو گئے بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے دور میں وہ دوبارہ محبت وطن بن گئے 2003ء میں ان کے موجودہ حکومت سے اختلافات شروع ہوئے تو وہ ایک بار پھر خالم شہر پسند اور علیحدگی پسند ہو گئے آج جب کیٹی صاحب قتل ہو چکے ہیں تو معلوم ہو رہا ہے وہ بلوچستان کے بلا کو خان تھے انہوں نے اپنی ذاتی جیلیں بنا رکھی تھیں اور وہ اب تک سینکڑوں لوگوں کو قتل کر چکے ہیں سوال یہ ہے ایک ہی شخص 60 برسوں میں پانچ بار نثار اور پانچ بار محبت وطن کیسے ہو سکتا ہے؟ سوال یہ ہے اگر نواب اکبر خان کیٹی مسلم لیگ ق میں شامل ہو جاتے وہ صدر پرویز مشرف کی حمایت کا اعلان کر دیتے تو وہ کیا ہوتے؟ اور آج کا سرکاری مورخ انہیں کیا لکھتا؟ میرا خیال ہے وہ اس وقت پاکستان کے سب سے بڑے محبت وطن لیڈر ہوتے وہ اس وقت بلوچستان کے گورنر ہوتے اور انہیں سرکاری پروٹوکول مل رہا ہوتا نثار کی کے اس کو فتنے کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا پاکستان کا کوئی ذی شعور شخص آج یہ دعویٰ نہیں کر سکتا صدر پرویز مشرف کے دور کا یہ ”شہر پسند“ مستقبل قریب میں کیا ہوگا؟ ہو سکتا ہے مستقبل کی کوئی حکومت اس ”شہر پسند“ کو شہید جمہوریت قرار دے اور ان کی قبر پر باقاعدہ فوجی گارڈ لگا دی جائے۔

یہ کیا ہے؟ کیا قومیں کو فتنے بن کر ترقی کر سکتی ہیں؟ کیا پارہ صفت معاشرے آگے بڑھ سکتے ہیں؟ اور کیا غربت اور معاشروں میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے؟ کیا سورج کیسی اور لٹکوں میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے؟ اور کیا ہم ایک رکعت میں پانچ پانچ بار قبلہ بدل کر زیادہ دیر تک زندہ رہ سکیں گے؟ یہ وہ سوال ہیں جو آج ہر سوچنے والے ذہن کو پریشان کر رہے ہیں خدا کے بندو! ہمیں کہیں تو رکنا چاہیے ہمیں کچھ تو طے کرنا چاہیے یہ تو کوئی بات نہ ہوئی جو شخص میرا دشمن ہے وہ شیطان ہے اور جو میری صفوں میں کھڑا ہے وہ شیطان ہو کر بھی نیک ہے ا معاف کیجئے گا ایسی پالیسیوں سے صرف کو فتنے بن سکتے ہیں ملک نہیں۔



اصل مشاہد حسین کون ہے

جناب مشاہد حسین کے ساتھ میری شناسائی آٹھویں سال میں داخل ہو چکی ہے میری ان کے ساتھ پہلی ملاقات 1997ء میں ہوئی تھی یہ ملاقات نسیم انور بیک صاحب کے گھر ہوئی تھی وہ ان دنوں میاں نواز شریف کی کابینہ میں "کڑا کے" نکال رہے تھے اس کے بعد ان سے گاہے بگاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں 1999ء میں ان سے ملاقات ہوئی تو وہ میرے کسی کالم پر ذرا سے ناراض تھے انہوں نے کالم کی ایک سطر دہرائی یہ سطر کچھ یوں تھی "آج کی حکومت کل کی اپوزیشن اور آج کی اپوزیشن کل کی حکومت ہوتی ہے لہذا سیاستدانوں کو اپنے معاملات میں توازن رکھنا چاہیے" اس کے بعد وہ اپنے مخصوص انداز میں تہتہ بگ کر بولے "دیکھ لیں ہمارے دور میں پریس کتنا آزاد ہے" میں نے ان کی مہربانی اور آزادی کا شکر یہ ادا کیا انہوں نے اس ملاقات کے دوران مجھ سے وعدہ کیا وہ کسی دن زیادہ وقت کیلئے میرے ساتھ بیٹھیں گے اور حکومت اور اپوزیشن کے معاملات پر مکمل کربات کریں گے لیکن یہ وعدہ ایفانہ ہو سکا چند دن بعد میاں نواز شریف کی حکومت ختم ہو گئی اور مشاہد حسین کابینہ کے دوسرے ارکان کے ساتھ قید ہو گئے وہ ڈیڑھ سال بعد رہا ہوئے تو ان سے چند ایک مختصر ملاقاتیں ہوئیں میں ان ملاقاتوں میں شاہ جی کا گرویدہ ہوتا چلا گیا اس میں کوئی شک نہیں مشاہد حسین ایک اٹلی جھٹ پڑھے لکھے مہذب اور وڈرنری انسان ہیں ان کے دامن پر سردست کرپشن کا بھی کوئی دھبہ نہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں میں زمانہ طالب علمی سے ان کا فین چلا آ رہا ہوں ہمارے درمیان تعلقات بھی ایسے ہیں لیکن بد قسمتی سے یہ تعلقات کبھی شناسائی سے آگے نہیں بڑھ سکے وہ 12 اکتوبر 1999ء کو گرفتار ہوئے اور 25 دسمبر 2000ء کو انہیں رہائی نصیب ہوئی رہا ہونے کے بعد انہوں نے امریکہ کے مشہور اخبار نیویارک ٹائمز میں اپنے قید کے دنوں کے بارے میں ایک مضمون تحریر کیا میں نے جب یہ مضمون پڑھا تو میں نے یہ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا یہ مضمون میرے پاس 4 سال تک پڑا رہا چند روز پہلے میں نے کسی کانڈکٹر کی تلاش میں اپنی فائلیں دیکھنا شروع کیں تو یہ مضمون میرے ہاتھ لگ گیا میں نے یہ مضمون پڑھنا شروع کر دیا میں اسے جوں جوں پڑھتا گیا میں مشاہد حسین کی کیفیات میں ڈوبتا چلا گیا مشاہد حسین کا یہ مضمون ایک "ماسٹر پیس" تھا اس میں آپ کو ایک ایسے زندہ انسان کے سارے احساسات ملتے ہیں جسے

وراست سے اٹھا کر کوٹھری میں پھینک دیا گیا تھا جو اپنی بے گناہی کی سزا بھگت رہا تھا اس مضمون کے مشاہد حسین اور آج کے مشاہد حسین میں بڑا فرق ہے اس مضمون کا مشاہد حسین ایک دانشور ایک صحافی اور ایک نگہبانی تھا جبکہ آج کا مشاہد حسین ایک کامیاب سیاستدان اور روشن خیال اور اعتدال پسند حکومت کا ایک اعتدال پسند اور روشن خیال "مشیر" ہے اس مضمون کا مشاہد حسین اندھیری کوٹھری میں روشنی کی کرن کا انتظار کرتا ہے اور اس کیلئے انسانی آواز دنیا کی عظیم ترین نعمت ہے جبکہ آج کا مشاہد حسین کیمروں کی روشنیوں اور آوازوں کے جھوم میں رہنے والا ایک کامیاب سیاستدان ہے ان دونوں میں اصل مشاہد حسین کون ہے؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میں اس مضمون کے مشاہد حسین کا فین ہوں آپ مضمون ملاحظہ کیجئے میں یہ مضمون ترجمے کے ساتھ آپ کی نذر کرتا ہوں۔

"میں 12 اکتوبر 1999ء کی شام اپنے سرکاری گھر میں تھا شام کے سات بج رہے تھے اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی وہ میرا ٹیلیفون آپریٹر تھا اس نے بتایا "فوج نے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے فوجی اندر کودنے کی تیاری کر رہے ہیں" میری بیوی اور گیارہ سالہ بیٹا مصطفیٰ دوسری منزل پر تھے۔ میں بھاگ کر اوپر گیا اور ان سے کہا "باہر فوجی ہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں" میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا مسلح فوجی ٹروپوں سے کود رہے تھے اسی لمحے میں نے شیشے ٹوٹنے کی آواز سنی وہ کھڑکیاں توڑ رہے تھے اس کے بعد فوجیوں کے بیڑھوں پر چڑھنے کی آواز آئی میں باہر نکلا اور میں ان سے قاطب ہوا "ٹریٹیکس ریز" ہم سب فیرسٹ ہیں "فوجی اس وقت نہیں تھے شاید ان کے چہروں پر فوجی بغاوت کے آثار تھے وہ میرے کمرے میں گھس آئے انہوں نے میرے کمرے کی تلاش لینا شروع کر دی۔ ٹیلیفون لائنوں کی تاریں کھینچ دی گئیں اس لمحے ایک میجر آگے بڑھا اس نے ٹیلیفون اٹھایا اور پیغام دیا "پندرہ بج رہے ہیں" اور میں ایک لمحے میں حکومتی وزیر سے حکومتی قیدی میں تبدیل گیا۔ اس دن رات گئے جنرل پرویز مشرف اور دوسرے فوجی لیڈروں نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور منتخب حکومت کو اقتدار کے ایوان سے باہر نکال دیا میں نواز شریف حکومت میں شامل تھا۔ میرے سمیت بہت سے سرکاری عہدیداروں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ آج فوجی حکمران پاکستان پر حکومت کر رہے ہیں جبکہ جنرل پرویز مشرف نے 2002ء میں جمہوریت بحال کرنے کا عندیہ دے دیا ہے۔ اکتوبر کی اس رات کے بعد مجھے ایک مکان میں دو ماہ تک قید رکھا گیا اس دوران میری بیوی اور بچے میرے ساتھ رہے 14 دسمبر کو انڈیا کے بعد ایک افسر میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا "آپ کو کسی دوسری جگہ منتقل کیا جا رہا ہے" میں نے چند جوڑے کپڑے اور کتابیں پیک کیں اور ملٹری ٹرک میں چڑھ گیا۔ میں نے تہیہ کیا تھا میں ان کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دوں گا مجھے اس وقت امریکی ناول نگار ہینک وے کا قول یاد آ گیا "ہمت والا وہی ہے جو بحران میں بھی اپنی عزت نفس قائم رکھے" مجھے ایک گیسٹ ہاؤس میں لے جایا گیا اور وہاں مجھے کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی گئی۔ مجھے کسی نے یہ تک بتانا مناسب نہ سمجھا کہ میں وہاں کتنا عرصہ رہوں گا اس وقت مجھے ٹیلن منڈیلا یاد آ گئے ایک سال قبل جب

تیس سنڈیلا پاکستان کے دورے پر آئے تھے تو میں ان کا وزیر مہمان داری تھا، میں نے ان سے پہلی ملاقات کے دوران پوچھا تھا "27 سالہ قید کے دوران آپ کے لئے سب سے تکلیف دہ لمحات کون سے تھے؟" انہوں نے ایک لمبے تاخیر کے بغیر جواب دیا تھا "قید تنہائی"۔ اس وقت میں بھی قید تنہائی کا شکار تھا، گو یہ ایک مختصر قید تھی لیکن اس کے باوجود آپ اس کی شدت کا اندازہ نہیں کر سکتے، مجھے اچانک دنیا سے الگ تھلک کر دیا گیا تھا۔ مجھے قرآن پاک کے علاوہ کسی قسم کا ریڈنگ میٹریل دستیاب نہیں تھا۔ میرے بیرونی دنیا سے تمام رابطے منقطع تھے۔ میں ٹیلیفون ٹیلیوژن یا ریڈیو کے بغیر زندگی گزار رہا تھا۔ میرے ملاقاتی بھی نہیں تھے۔ آزادی کے دنوں میں جو چیز کم اہم ہوتی ہے، قید کے دنوں میں وہی چیز انتہائی اہمیت اختیار کر جاتی ہے، قید کے دنوں میں کسی انسان سے گفتگو دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہوتی ہے۔ میں نے محسوس کیا تنہائی کی قید جسم سے زیادہ دماغ کی آزمائش ہوتی ہے۔ میرے خیال میں جب آپ تنہا ہوتے ہیں تو اس وقت خوف سے لڑنے کا سب سے بہترین طریقہ خدا پر یقین ہوتا ہے۔ مجھے زندگی کی بے شمار حقیقتوں کا علم قید میں جا کر ہوا، میں نے وہاں غم اور خوشی کو دو بہنوں کی طرح دیکھا، میں قید کے دنوں میں قرآن پاک پڑھتا اور بھگتا تھا مجھے اپنی زندگی کے ان تاریک ترین دنوں میں قرآن پاک میں حضرت مصیٰ کے واقعے نے بہت متاثر کیا۔ اس واقعے نے مجھے آنے والے اندیشوں سے بچائے رکھا۔ میں نے مستقبل کے بارے سوچنا بند کر دیا۔ میں آج کے دن پر نظر رکھتا اور اسے شیدول کرتا رہتا تھا۔ قید تنہائی کے دنوں میں میں پوری توجہ کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ ناشتہ کرتا تھا، اپنے کمرے میں 22 قدم واک اور ورزش کرتا تھا اور پھر قرآنی تعلیمات پر توجہ دیتا تھا۔ میں نے اپنے محافظوں سے گفتگو سے احتراز کیا۔ وہ لوگ تنہائی میں قید شخص سے درخواستوں کی توقع رکھتے تھے، یہ درخواستیں انہیں نفسیاتی تسکین دیتی تھیں۔ ان کا خیال تھا میں ان سے موجودہ حالات، قید کی مدت اور رہائی کے متعلق سوال کروں گا مگر میں نے کبھی ان سے کوئی سوال نہیں پوچھا، میری اس پالیسی کی وجہ سے وہ میرے خوف کو نہیں جان سکے تھے، یہی ایک وجہ تھی میں ہر رات گہری نیند سوتا تھا۔

پاکستان میں جمہوریت کی کمزوری اور جمہوری سسٹم میں خامیوں کی ایک بڑی وجہ لیڈرشپ کی ناکامی ہے، سیاسی لیڈروں کے غیر جمہوری رویوں اور عدم برداشت نے جمہوریت کی بنیاد کمزور کر دی ہے۔ ہمارے سیاستدان اقتدار حاصل کر کے اپنی شان و شوکت میں اضافہ کرتے ہیں یہ لوگ سیاست میں نڈل کھاس اور لوہڑ کھاس کے لئے ترقی کے دروازے بند کر دیتے ہیں اور میرٹ کی وجہیں اڑاتے ہیں۔ ہماری ایلٹ کلاس اپنی ترقی اور دوسروں کو مرنے دو کی اپروچ پر کاربند ہے۔ یہاں پر بدلہ لینے کی سیاست بھی رواج پا چکی ہے۔ طاقتور خاندان اور افراد ایک دوسرے کو بچا دکھانے کے لئے خطرناک حد تک چلے جاتے ہیں یہ لوگ ملک میں ایسی اقتدار کو ترویج دے رہے ہیں جن میں نظر اندازی، معافی اور باہمی سہیل جول کی گنجائش نہیں ملتی۔ پاکستان کا سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ یہاں ایسا سیاسی کلچر بنایا جائے جس میں فرد واحد قبیلہ یا گروپ کے مفادات ملک پر ترجیح نہ رکھتے ہوں۔ میں کیم مارچ 2000 تک قید تنہائی میں رہا، یہ تین ماہ بنتے ہیں اس دوران میری فیملی نے ایک عدالتی حکم

۱

۲۔ حاصل کر لیا جس کے بعد مجھے میری بہن کے گھر شفٹ کر دیا گیا۔ 9 مہینوں کے بعد 25 دسمبر 2000 کو مجھے رہا کر دیا گیا۔ سیاسی قیدی کے طور پر میرا تجربہ دوسروں سے زیادہ تلخ نہیں تھا۔ میری فیملی نے میرے لئے سخت جدوجہد کی تھی۔ پاکستانی عدالتوں میں اپیلیں کی گئیں دوسرے لوگوں نے بھی میرا دفاع کیا۔ پبلسٹی انٹرنیشنل نے مجھے ’ضمیر کا قیدی‘ قرار دیا۔ میں 440 دن قید میں رہا لیکن مجھ پر کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکا۔ میں اب آزاد ہو چکا ہوں لیکن میں جمہوری پاکستان کے لئے جدوجہد کی ذمہ داری سے آزاد نہیں ہوا۔ میرے ملک (عوام) کو یہ سب ضرور دیکھنا چاہیے اور اسے یاد رکھنا چاہیے کہ ایک شخص سیاسی طور پر دوسرے شخص کی مخالفت کر سکتا ہے لیکن اسے انسانی اقدار کی نگریم کرنا چاہیے۔ یہی صاف ستمرا قانونی راستہ ہے 1400 سال قبل حضرت علیؑ نے فرمایا تھا ’صاف کر دینا انصاف سے بہتر ہے‘ ہمیں درگزر اور معافی کو اپنی سیاست کا حصہ بنانا چاہیے اس ملک میں ان حالات میں انصاف اور سیاسی انتقام میں فرق ممکن نہیں لہذا ہمیں معافی اور سخاوت سے کام لینا چاہیے اس کو فارمولا بنانا چاہیے۔“

آپ عجیب اتفاق دیکھئے مجھے یہ تحریر 25 دسمبر 2005ء کو ملی اور یہ مشاہد حسین کی رہائی کی سالگرہ تھی اور جب میں نے یہ تحریر پڑھی تو میں نے سوچا اصل مشاہد حسین کون ہے وہ جس نے یہ تحریر لکھی تھی یا وہ جو آج مسلم لیگ ق کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے باوردی صدر جنرل پرویز مشرف کا ساتھی ہے وہ مشاہد حسین اصل ہے جو قید میں جمہوریت کے خواب دیکھ رہا تھا یا وہ مشاہد حسین جو قید سے باہر آتے ہی جمہوریت اور ضمیر فروشی کے کاروبار میں شریک ہو گیا مجھے کوئی سمجھ نہ آئی لہذا میں نے مشاہد حسین کا یہ آرکیٹیکل فائل میں رکھا اور یہ فائل ایک بار پھر الماری میں بند کر دی۔



بزئس مینوں کیلئے بھی وقت نکالئے

آج سے 26 برس پہلے رونلڈ ریگن نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا تو ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں کپیئر نے ان سے ایک عجیب سوال پوچھا۔ اس نے پوچھا ”مسٹر ریگن فرض کرتے ہیں آپ امریکہ کے صدر منتخب ہو جاتے ہیں اور آپ کے سامنے ملاقات کے متنی لوگوں کی فہرست رکھی جاتی ہے اس فہرست میں امریکہ کے نائب صدر کا نام ہے آپ کی کابینہ کے پانچ اہم وزیر ہیں، نئول چیف، چیف آف انٹرنٹاف اور آرمی چیف ہے، یورچین یونین کا سربراہ ہے، گلف کا ایک شاہ اور سات سفیر ہیں، روس کا ایلچی ہے اور امریکہ کا ایک درمیانے درجے کا بزئس مین ہے، آپ ان تمام شخصیات میں سب سے پہلے کس سے ملیں گے۔“ صدر ریگن نے شہادت کی اگلی سے ٹھوڑی رگڑی اور فٹس کر بولے ”امریکی بزئس مین سے!“ کپیئر نے حیران ہو کر پوچھا ”کیوں؟“ صدر ریگن نے کندھے اچکا کر جواب دیا ”روس کا ایلچی، جاپان اور چین کے سفیر، قرعہ ورنلڈ کے ہیڈ آف سٹیشن، گلف کے شہزادے اور یورچین یونین کا سربراہ ریگن سے نہیں بلکہ امریکہ کے صدر سے ملنا چاہتا ہے اور امریکہ کا صدر اس درمیانے درجے کے بزئس مین کی وجہ سے صدر ہے، باقی رہے چیفس، کابینہ کے وزیر اور نائب صدر تو یہ لوگ بھی اس معمولی بزئس مین کی مہربانی سے نائب صدر وزیر اور چیف ہیں۔“ صدر ریگن کے اور مسکرا کر بولے ”اب میں آپ سے ایک اور سوال پوچھنا چاہتا ہوں“ وہ کہے اور پروگرام کے میزبان پر نظر س جم کر بولے ”آپ مجھے بتائیے اگر امریکہ کے تیسرے دوسرے اور پہلے درجے کے بزئس مین کام چھوڑ دیں، اگر امریکی فیکٹریاں نہ چلیں، اگر شاک آکھینج کی سرگرمیاں دم توڑ جائیں اور اگر ہمارے بازار غیر آباد ہو جائیں تو کیا امریکہ امریکہ رہے گا؟ کیا امریکی صدر اتنا ہی باعزت اور اہم سمجھا جائے گا؟ کیا روس کا ایلچی، چین اور جاپان کے سفیر، گلف کے شہزادے، یورچین یونین کا سربراہ اور تیسری دنیا کے ہیڈ آف سٹیشن امریکی صدر سے اسی طرح ملنا چاہیں گے؟“ کپیئر نے گردن لٹی میں ہلادی ریگن نے قہقہہ لگایا اور مائیک پر جھک کر بولے ”مکوں کو سیاست نہیں بلکہ فیکٹریاں چلایا کرتی ہیں اور جن سربراہان کے پاس بزئس مینوں سے ملنے کا وقت نہیں ہوتا ان سربراہان کی زندگی میں جلد وہ وقت آ جاتا ہے جب ان سے کوئی نہیں ملتا۔“

اگر ہم کامیاب امریکی صدر کی فہرست تیار کریں تو ریگن کا شمار ان دو یا تین صدر میں ہوتا ہے جنہیں ہم امریکہ کے مقبول اور محبوب ترین صدر کہہ سکتے ہیں اور اگر ہم ان وجوہات کی فہرست بنائیں جن کے باعث ریگن کامیاب صدر قرار پائے تھے تو اس میں پہلے نمبر پر کاروباری طبقے سے خوشگوار تعلقات آتے ہیں، ریگن کی ترجیحات میں بزنس اور بزنس مین کی کیا حیثیت تھی اس کا اندازہ لگانے کے لئے آپ کریسلر اور ڈیلورین گروپ کی مثالیں لیجئے۔ 80ء کی دہائی میں کریسلر گروپ دیوالیہ ہوا تو ریگن جاپان کا دورہ منسوخ کر کے کریسلر کے ہیڈ آفس میں آ بیٹھے، خود حالات اور وجوہات کا جائزہ لیا اور پھر اپنا سارا اثرو رسوخ استعمال کر کے کریسلر گروپ کو دفاعی آلات کے بھاری ٹھیکے دلوائے جن کے نتیجے میں یہ گروپ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ کچھ ایسی ہی صورت حال ڈیلورین گروپ کو بھی درپیش تھی۔ یہ گروپ آئرلینڈ میں ڈیپالٹ کر گیا، ریگن نے آئرلینڈ پر دباؤ ڈال کر گروپ کو اڑھائی سو ملین ڈالر کا اقتصادی چیک دلایا بعد ازاں گروپ کا سربراہ جان ڈیلورین سفیٹ کی سنگٹانگ میں پکڑا گیا تو صدر ریگن نے گروپ کو بچانے کے لئے اسے باعزت بری کر دیا۔ یہ تھی ریگن کی اقتصادی سوچ، وہ کہا کرتے تھے پورا امریکہ دو صنعتی اداروں کا روٹا ہے ان گروپوں میں معمولی سی گڑبڑ پورے امریکہ کو براہ راست متاثر ہے لہذا جو بھی امریکی صدر وقت کی کتاب میں اپنا نقش چھوڑنا چاہتا ہے اسے چاہیے وہ ان گروپوں کو اپنی ترجیحات کی فہرست میں رکھے۔ دنیا ریگن کے اس فارمولے کو ریگن کا فلسفہ معیشت کہتی ہے اور 80ء اور 90ء کی دہائی میں جن اقوام نے اس فلسفے پر عمل کیا وہ دیکھتے ہی دیکھتے بکری سے ٹائیکر بن گئیں جبکہ جو لیڈر بزنس مینوں کے مقابلے میں سرورجینس، وزراء، سفراء اور ایلیٹیوں کو اہمیت دیتے رہے وہ لیڈر اور ان کی قومیں شیر سے بکری بن گئیں۔

میں جب بھی پاکستان کے کسی تاجر، کسی بزنس مین اور کسی کارخانے دار سے ملتا ہوں تو وہ مجھے حکومت سے تالاں اور ملک کے مستقبل سے مایوس دکھائی دیتا ہے، میں اس سے وجہ پوچھتا ہوں تو وہ اسلام آباد کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے ان لوگوں کے پاس ہمارے لئے وقت ہی نہیں، میں ان کی پریشانی دیکھ کر سوچتا ہوں یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششوں اور محنتوں سے اس ملک کی معاشی رنگوں میں تھوڑی بہت زندگی ہے، اگر ان لوگوں کی پریشانی مایوسی میں بدل گئی، اگر یہ لوگ بھی ہجرت پر مجبور ہو گئے تو پھر ہمارا اور ہمارے ملک کا کیا بنے گا؟ درست ہے کارسکار بہت دراز ہیں اور حکمرانوں کی مصروفیات کا کوئی انت نہیں ہوتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے یہ ساری مصروفیات اور یہ ساری سرکاری لٹلش پیش صرف اس ملک کی وجہ سے ہے، نواز شریف اس لئے وزیر اعظم تھے کہ پاکستان سلامت تھا اور اب پرویز مشرف بھی اس لئے صدر اور جناب شوکت عزیز اس لئے وزیر اعظم ہیں کہ یہ ملک قائم ہے، اگر خدا نخواستہ اس ملک کی سلامتی اندیشوں میں گھر گئی تو پھر پرویز مشرف کہاں ہوں گے اور دنیا شوکت عزیز کسے کہے گی لہذا حکومت کو ہر اس ستون پر توجہ دینی چاہئے جس پر اس ملک کی چھت استوار ہے اور بزنس مین کیونٹی اس ملک کا مرکزی ستون ہے، یقین کیجئے مارکیٹ اکانومی کے اس دور میں اگر ایک ہیڈ آف شیٹ پریشان ہو تو اس کی پریشانی حکومت یا کابینہ کو متاثر کرتی ہے، ایک جزل کی پریشانی کے اثرات صرف ایک کورنگ

محدود رہتے ہیں لیکن اگر کسی ملک کی ایک انڈسٹری، ایک بڑا انڈسٹریل گروپ یا بزنس مینوں کا ایک بڑا حلقہ، شکر پریشان یا ماہوس ہو جائے تو پھر پورا ملک بخار کا شکار ہو جاتا ہے، پوری قوم اس شکایت، اس پریشانی اور اس فکر میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ مجھے چند روز پہلے کوئی صاحب بتا رہے تھے پاکستان کی 13 بڑی صنعتیں بند ہو چکی ہیں، اس وقت پاکستان میں چینی کے برتن بنانے والی تمام فیکٹریاں بند ہو چکی ہیں، پچھلا ساڑھی کبھی پاکستان کی بہت بڑی صنعت ہوتی تھی لیکن یہ صنعت اب آخری سانس لے رہی ہے، سیالکوٹ کے 400 صنعت کار چین نکل ہو چکے ہیں جبکہ کراچی کے تمام بڑے صنعت کار اور تاجروں میں اپنے دفتر کھول چکے ہیں لیکن حکومت کے ایوانوں تک کوئی سرگوشی نہیں پہنچی، حکومت کے کسی کارندے کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی، یقین کیجئے صنعت کاروں اور بزنس مینوں کی پریشانیاں پانی کے کیڑوں کی طرح ہوتی ہیں اگر ان کا بروقت تدارک نہ کیا جائے تو یہ پورے شہر پورے ملک کو تیار کر دیتی ہیں اور ہم لوگ دن بدن تیار یوں کا شکار ہوتے جا رہے ہیں لہذا میری حکومت سے درخواست ہے وہ کبھی کبھی بزنس مینوں کو بھی تھوڑا سا وقت دے دیا کرے۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

خارجہ پالیسی

جلا وطن شہزادہ رک گیا، برہمن نے درخت کی جڑیں کھودیں، جڑیں پوری طرح نکلی ہو گئیں تو اس نے جڑوں میں کھولنا ہوا گرم پانی پھینکا، مٹی ڈالی اور ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا، حیران پریشان شہزادے نے برہمن کو پرنام کیا اور پھر بڑے ادب سے عرض کیا "گرو آپ کیا کر رہے تھے" برہمن نے ہنس کر اپنا ہاتھ گھبے سر پر پھیرا اور شرارتی لہجے میں بولا "کچھ نہیں مہاراج زرا درخت سے انتقام لے رہا تھا، مجھے بچپن میں اس درخت سے ٹھوکر لگی تھی، میں نے آج اس کی جڑوں میں گرم پانی ڈال دیا اب یہ درخت سوکھ جائے گا اور میرا انتقام پورا ہو جائے گا۔" پریشان شہزادے نے حیرت سے پوچھا "گرو آپ اتنی مشقت کی بجائے سیدھا سادا درخت کاٹ دیں۔" برہمن نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور خوفزدہ لہجے میں بولا "رام رام، میں برہمن ہو کر درخت کاٹوں گا؟" شہزادے نے قہقہہ لگایا، نیچے جھکا اور برہمن کے قدم چھو کر بولا "میں چندرگپت ہوں، پائلی پتر سے آیا ہوں، آج سے آپ میرے گرو بھی ہیں اور مشیر بھی۔" یہ برہمن وشنو گپت تھا، اس کے ماں باپ نے اس کا یہی نام رکھا تھا لیکن تاریخ نے اسے چانکیہ کوٹلیہ کے نام سے یاد رکھا، نیپلسکا کے اس برہمن زادے کو قدرت نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا رکھا تھا وہ آج تک اپنے فارمولوں اور اپنی شاطرات چالوں کے باعث دنیا میں زندہ ہے، آج بھی جب "مانیت از رامیت" کی بات آتی ہے یا اقتدار اور طاقت کا سوال اٹھتا ہے تو فوراً "جس کی لاشی اس کی بھینس" کی شکل میں چانکیہ سامنے آ جاتا ہے چندرگپت مور یہ نے چانکیہ کی مدد سے ہندوستان میں پہلی وسیع اور مستحکم سلطنت کی بنیاد رکھی، اس سلطنت کی سرحدیں شمالی ہندوستان کے شہر پائلی پتر (پٹنہ) سے کابل، کابل سے ہرات اور ہرات سے بنگال تک پھیلی تھیں، چندرگپت ہندوستان کا پہلا راجہ تھا جس کا سکہ بھیرہ عرب سے طلح بنگال تک چلتا تھا، چانکیہ اس کا مشیر خاص تھا، وہ چندرگپت کی زندگی میں پوری طرح راج ہنس چکا تھا، چانکیہ نے اس کیلئے ایک کتاب لکھی، تاریخ اس کتاب کو "ارتھ شاستر" کہتی ہے۔ یہ کتاب حکومت کاری کی قدیم ترین دستاویز ہے جس میں چانکیہ نے راجہ کے حرم سے لے کر سماجی جرم تک زندگی کے ہر زاویے پر حکمرانوں کی رہنمائی فرمائی۔ چندرگپت مور یہ 296 قبل مسیح میں "سورگ باش" ہو گیا اور چانکیہ بھی مر گیا لیکن یہ دونوں اپنے پیچھے حکومت کاری کا ایک ایسا ماڈل چھوڑ گئے جسے

ہندوستان کے ہر ہندو راہ نے اپنا یا اور کامیابی حاصل کی۔ ارتھ شاستر، چاکیہ اور چندرگپت مور یہ ہندو نفسیات کی اصلی اور سچی تصویر ہیں اور کوئی بھی شخص ان تینوں کے مطالعے کے بغیر ہندوستان کے ہندوؤں کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی ہندو سلطنت کو تقسیم ہند کے بعد جواہر لال نہرو بھارت کے پہلے وزیر اعظم بنے تھے یہ چاکیہ کو اپنا روحانی گرو کہتے تھے، وہ شروع میں چاکیہ کے لکھی نام سے اخبارات میں کالم بھی لکھتے رہے تھے۔ 48-1947ء میں جب بھارت کی قارن پالیسی کے تعین کا مرحلہ آیا تو نہرو نے ارتھ شاستر کا ایک فقرہ لکھ کر اپنے دفتر خارجہ کے حوالے کر دیا۔ وہ فقرہ تھا "ہمسایہ دشمن ہوتا ہے لیکن ہمسائے کا ہمسایہ دوست" اس دن سے چاکیہ کا یہ فلسفہ بھارت کی قارن پالیسی بن گیا۔ اسی لئے شاید دہلی کے "ڈپلویٹک انکلیو" کا نام چاکیہ پوری ہے اور من بیوارڈ "کوئٹہ مارک" کہلاتا ہے۔ بہر حال یہ بھارت کی قارن پالیسی ہے، بھارت نے ہر دور میں ہمسائے کو اپنا دشمن اور ہمسائے کے ہمسائے کو اپنا دوست سمجھا۔ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ بھارت نے چین کو ہمیشہ اپنا دشمن جانا اور روس کو دوست، پاکستان اس کا دشمن ہے اور افغانستان دوست اور نیپال، برما، سری لنکا، بھوٹان، مالدیپ اور بنگلہ دیش کے ساتھ پولیس مین جیسا سلوک کرتا ہے اور کوریا، تھائی لینڈ، فلپائن، سنگاپور اور جاپان سے دوستی کی پیشکش بڑھاتا ہے۔ آپ ذرا خوب سمجھیں آپ کو بھارت کی ساری قارن پالیسی اسی فلسفے پر استوار دکھائی دے گی۔ بھارت صرف قارن پالیسی میں چاکیہ کا معتقد نہیں بلکہ وہ "آریہ کبھی غلام نہیں رہ سکتا" کے فلسفے کے تحت سپر پاور کے خواب بھی دیکھتا ہے وہ "ہندوستان ماں ہے اور ماں تقسیم نہیں ہو سکتی" کے نظریے کے تحت اکھنڈ بھارت کی خواہش بھی رکھتا ہے اور وہ "دشمن کو قتل نہ کرو، اس کی جڑوں میں گرم پانی ڈال دو" کے فارمولے کے تحت برصغیر سے مسلمانوں کی بیخ کنی کا بھی تئسائی ہے۔ بہر حال یہ ایک تفصیل طلب مسئلہ ہے جبکہ ہمارا فوری مسئلہ بھارت کی افغان پالیسی ہے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد بھارت نے ہمارے ہمسائے افغانستان کو گلے لگا لیا یہ افغان بھارت دوستی 1980 تک قائم رہی۔ افغان وار شروع ہوئی تو پاکستان کو افغانستان میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ 1990ء میں روس گیا تو پاکستان نے ربانی، مہدوی اور حکمت یار کی شکل میں افغانستان پر قبضہ کر لیا، افغانستان کے یہ رہنما فارغ ہوئے تو پاکستان طالبان کی صورت میں افغانستان میں موجود رہا۔ اس دوران بھارت نے شمالی اتحاد پر سرمایہ کاری شروع کر دی، اکتوبر نومبر 2001ء میں شمالی اتحاد نے طالبان کو شکست دے دی، جس کے بعد امریکہ نے حامد کرزئی کو افغانستان کا حکمران بنا دیا، اس کے ساتھ ہی پاکستان افغانستان سے خارج ہونا شروع ہو گیا اور بھارت کو ایک بار پھر ہمسائے کے ہمسائے کو دوست بنانے کا موقع مل گیا 2001ء میں 21 برس بعد بھارت نے افغانستان کے وزیر داخلہ پولس قانونی کو دہلی بلا یا، جسوت سنگھ، فرناٹس اور ایڈوائی نے اس کے ساتھ ملاقات کی اور اسے افغانستان میں پولیس کا نظام ترتیب دینے کی پیشکش کی، بھارت نے افغانستان کیلئے 10 کروڑ ڈالر امداد کا اعلان بھی کیا، دہلی کا بل پروازیں شروع کرنے کا عندیہ بھی دیا اور افغانستان کی تیسرے کیلئے اپنی خدمات بھی پیش کر دیں جس

کے ساتھ ہی افغانستان میں ایک نیا سفارتی کھیل شروع ہو گیا۔

پاکستان بھارت کی یہ سیاسی دست درازیاں دیکھتا رہا لیکن دہشت گردی کی جنگ میں ملوث ہونے کے خطرے اور امریکی دباؤ کے باعث کھل کر بھارت سے احتجاج نہ کر سکا، صدر کرزئی کو پاکستان کی نسبت بھارت زیادہ سوٹ کرتا تھا وہ بھی بازو پھیلا کر بھارت کی طرف بڑھے، یوں ہمسائے کا ہمسایہ بھارت کا دوست بن گیا، بھارت نے افغانستان میں 14 سفارتی اڈے بنائے اور صوبہ سرحد اور بلوچستان میں گڑ بڑ شروع کر دی، بھارت نے وزیرستان میں لانے والے ”مجاہدین“ اور سردار اکبر خان بگٹی کو ہتھیار تک فراہم کئے، بھارت کی اس سفارتی مہربانی سے پاکستان کے اندرونی حالات خراب ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ نواب اکبر خان بگٹی انتقال فرما گئے اور بلوچستان میں آگ لگ گئی، بھارت اب اس آگ پر تیل پھینک رہا ہے، تیل پھینکنے کی وجہ سے حکومت کو پہلی بار تپش محسوس ہو رہی ہے، مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے 6 ستمبر 2006ء کو افغانستان کے دورے کے دوران صدر پرویز مشرف نے افغانستان کے صدر حامد کرزئی سے بھارتی لوازمی کا شکوہ کیا تھا جس کے جواب میں صدر کرزئی نے ”ٹیس سر، نو سر“ کے سوا کوئی جواب نہیں دیا تھا، مجھے اندیشہ ہے آنے والے دنوں میں افغانستان کی طرف سے بھارتی گڑ بڑ میں اضافہ ہو جائے گا اور یہ اضافہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ہم بھی بھارت کے کسی ہمسائے کو اپنا دوست نہیں بناتے، ہم بھی کسی خالصستان کو ”تیل“ فراہم نہیں کرتے کیونکہ چانکیہ نے کہا تھا ”جب تک دشمن وار نہ کرے اس وقت تک اس کے پاؤں میں کانٹے چھوڑتے رہو“ اور یہ بھی بھارت کی خواہش کی پالیسی ہے۔



پاکستان کا سوئزر لینڈ

میرا قیام مرغزار کے واسطے بیس میں تھا۔

واسطے بیس سوات کے پہلے وائس میاں گل عبدالودود نے بنوایا تھا، میاں گل عبدالودود کو لوگ بادشاہ صاحب کہتے تھے، بادشاہ صاحب کا محل یگورہ میں تھا لیکن گرمیوں میں یگورہ کا درجہ حرارت بڑھ جاتا تھا لہذا شاہی خاندان نے ایک گرمائی محل بنانے کا فیصلہ کیا، اس سلسلے میں یگورہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک خوبصورت جگہ کا انتخاب کیا گیا، اس جگہ کو بادشاہ صاحب نے مرغزار کا نام دیا، بادشاہ صاحب نے مرغزار میں سفید سنگ مرمر سے ایک چھوٹا سا خوبصورت محل بنایا، یہ محل 1941ء میں مکمل ہوا، اس محل کیلئے انہیں کانوں سے سنگ مرمر نکلوایا گیا جن سے تاج محل کیلئے ماہل حاصل کیا گیا تھا، بادشاہ صاحب نے سنا تھا انگریزوں کے محل خانوں میں تختے اور گرم پانیوں کی الگ الگ نوئیاں ہوتی ہیں چنانچہ انہوں نے سفید محل کیلئے لندن سے فلش سسٹم اور نوئیاں منگوائیں، یہ اس علاقے کا پہلا فلش سسٹم تھا، انہوں نے ہاتھ روم میں واش بیسن لگوایا اور اس واش بیسن پر تختے اور گرم پانیوں کی نوئیاں بھی لگوائیں، سفید محل کے لئے قدرتی چشموں کا پانی تین مختلف نیچوں میں جمع کیا گیا، یہ پانی بعد ازاں محل کے مختلف لانوں اور مختلف فواروں تک لایا گیا، جب ہندوستان میں کئی نیچے تو سفید محل کیلئے ”پاور پلانٹ“ لگایا گیا، ٹیلی فون آیا تو ایک پیسج کی مدد سے سفید محل کو پورے ہندوستان کے ساتھ جوڑ دیا گیا، بادشاہ صاحب کی خواب گاہ مرکزی محل میں تھی جبکہ شہزادے شہزادیوں اور ملکہ (یا ملکاؤں) کیلئے بائیں جانب تین سطحوں پر کمرے بنائے گئے، محل کے ایک پہلو میں ایک خوبصورت دریائی ندی گزرتی تھی اور دوسرے پہلو میں پھولوں اور پھلوں کے سینکڑوں ہزاروں پودے تھے، یہ محل چاروں طرف سے سرسبز پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا اور ملکہ اربعہ سمیت برطانیہ ہندوستان اور پاکستان کی بے شمار شخصیات کو اس محل میں ٹھہرنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔

بادشاہ صاحب نے 1949ء میں سوات کا تخت اپنے صاحبزادے میاں گل جہاں زیب کے حوالے کر دیا تھا، میاں گل جہاں زیب کے تین بیٹے تھے، میاں گل امیر زیب، میاں گل اورنگ زیب اور احمد زیب، صدر پاکستان ایوب خان نے اپنی ایک صاحبزادی جلیلہ میاں گل امیر زیب اور دوسری صاحبزادی نسیم میاں گل

اورنگ زیب کے عقد میں دے دیں، میاں گل اور نگز زیب ایم این اے اور میاں نواز شریف کے دور میں بلوچستان کے گورنر رہے ہیں، میاں گل امیر زیب کے دو بیٹے ہیں، اسفندیار اور شہریار، ریاست سوات 1969ء میں پاکستان میں ضم ہو گئی جس کے بعد بادشاہ صاحب کی جائیداد ان کی اولاد میں تقسیم ہونا شروع ہو گئی، اس تقسیم میں سفید گل میاں گل امیر زیب کے بیٹے اسفندیار کے حصے میں آ گیا، اسفندیار نے اس محل کو ہوٹل میں تبدیل کیا اور یہ ہوٹل لاہور کے کسی صاحب کو لیکھے پر دے دیا، یہ صاحب کوئی بازوق انسان ہیں لہذا انہوں نے ہوٹل میں تبدیل ہونے کے باوجود اس عمارت کی تاریخی حیثیت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ بادشاہ صاحب کا بیڈروم اصل حالت میں موجود ہے جبکہ باقی کمرے بھی اسی فیصد تک اپنی اصل ہیئت میں برقرار ہیں۔

مجھے اس محل میں دو دن ٹھہرنے کا موقع ملا، یہ واقعی ایک "لائف ٹائم" تجربہ تھا، اس جگہ میں ایک پراسرارت اور ایک تھماتی اداسی ہے، آپ جب رات ایک اور دو بجے کے دوران وہیل چیلنس کے لان میں بیٹھے ہیں تو آپ ہندوستان کی تاریخ کو اپنے ارد گرد چلتے پھرتے دیکھتے ہیں، آپ محسوس کرتے ہیں ہندوستان کے بے شمار وائسرائے اور ملکہ اثر بھ پورے کورفر کے ساتھ آپ کے سامنے بیٹھی ہیں اور آپ ان کی گفتگو سن رہے ہیں، میں نے زندگی میں بے شمار چاند دیکھے ہیں لیکن جو چاند میں نے مرغزار کے اس سفید گل میں دیکھا مجھے وہ چاند دنیا کے کسی ملک، کسی کونے میں دکھائی نہیں دیا، ایک چاند مجھے 2003ء کی گرمیوں میں بہاولپور کے ایک گاؤں میں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس گاؤں میں بجلی نہیں تھی، میں صحن کی ٹوٹی ہوئی چار پائی پر چت لیٹا تھا، میں نے اوپر دیکھا، اوپر ایک شفاف آسمان تھا جس پر ایک چاند اور اریوں ستارے ٹھہرا رہے تھے، میں نے اس سے پہلے کبھی اتنا شفاف آسمان، اتنا ٹھنڈا چاند اور اتنے خشک ستارے نہیں دیکھے تھے، اس منظر نے مجھے اتنا بہوت کر دیا کہ میں اٹھا، میں نے مٹی کے ٹھنڈے کوزے سے وضو کیا اور شکرانے کیلئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھک گیا، میرا خیال تھا اتنا قیمتی اور اچھوتا منظر میری زندگی میں دوبارہ نہیں آئے گا لیکن سفید گل کا چاند بہاولپور کے اس چاند سے سنگڑوں جزاروں گنا خوبصورت اور نظر میں اترنے والا تھا، وہاں اس رات سفید گل تھا، لان میں نرم ہوا تھی اور ندی کی ہلکی ہلکی سرگوشیاں تھیں، مجھے محسوس ہوا میرے پورے بدن کا خون حلق میں جمع ہو گیا ہے اور بس ایک سانس لینے کی دیر ہے اور یہ سارا خون اور یہ سارا بدن فضا میں تحلیل ہو جائے گا اور میں مرغزار کی نرم ہواؤں کی نرم رنگوں میں جذب ہو جاؤں گا، میں ختم ہو جاؤں گا۔

سوات میرا دوراں مان تھا، پہلا دوراں اس ملک کے لاکھوں کردوں شریلیے اور شریف بچوں کی طرح کھڑکیوں کے پنوں، دروازوں کے دروں اور چٹوں کی درزوں کے پیچھے پروان چڑھا اور پروان چڑھتے ہی اس پر شرم و حیا اور شیش کی مہر لگ گئی، میں نے اپنے اپنے ایک قبر کھودی اور اسے اس قبر میں دفن کر دیا، میں ایک مزدور تھا لہذا میں شا جہاں اور جہانگیر کی طرح اس قبر کو سفید سنگ مرمر سے ڈھکا اور وہی اس پر تاج محل بنا سکا لیکن میں نے اسے اپنے دل کی سرخ دیواریں اور اپنی ٹوٹی اور مرنی اور مرجھاتی خواہشوں کی سفیدی ضرور دے دی، میں نے اسے اپنی جنائی کے موتیوں کا تھنڈا سدا بہا سوات میرا

دوسرا رومان تھا، میں نے بچپن میں کسی جگہ پڑھا تھا سوات پاکستان کا سوئزر لینڈ ہے جس کے بعد سوات اور سوئزر لینڈ دونوں میری خواہشوں کی فہرستوں میں شامل ہو گئے لیکن قدرت کے ہیر پھیر سے اس فہرست کی ترتیب بدل گئی، میں پہلے سوئزر لینڈ گیا اور اس کے بعد سوات، سوئزر لینڈ حقیقتاً ایک خوبصورت اور نظروں میں اتر جانے والا ملک تھا، اس ملک میں سمندر نہیں لیکن اس کے لوگوں نے اپنی جھیلوں کو سمندروں کی شکل دے دی، ان کی جھیلیں فقط جھیلیں نہیں تھیں آئینہ تھے، میں ان کی تھن جمیل پر گیا، میں نے انٹر لاکن کی جھیلیں دیکھیں، میں نے یوشیس کی جھیل پر لوگوں کو آتش بازی کرتے دیکھا اور میں جینوا کی جھیل پر گھنٹوں بیٹھا رہا، میں نے ایسی جھیلیں، ایسا سبزہ اور ایسا پاک صاف ماحول کسی دوسری جگہ نہیں دیکھا، پوری دنیا میں گھاس کاٹی جاتی ہے لیکن سوکس دنیا کی واحد قوم ہے جو قہقہوں سے گھاس کاٹی ہے جس کا صفائی میں کوئی جواب نہیں، آپ کو کس فٹ پاتھ، کسی سڑک پر گھاس کا کوئی کالتونکا نہیں ملے گا، میں نے سوئزر لینڈ میں صفائی کو پورے ایمان کی شکل اختیار کرتے دیکھا، لوگ انتہائی مہذب، شائستہ اور دھیسے تھے، وہ اجنبیوں سے محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے اور پورے ملک میں صرف 16 سو پاکستانی تھے اور یہ سوئزر لینڈ کی تیسری بڑی خوبی تھی۔

میں سوئزر لینڈ کا یہ ایسج لے کر پاکستان واپس آ گیا، اس کے بعد میں سوات جانے کے منصوبے بنانے لگا لیکن ہر گرمیوں میں یہ پروگرام التوا کا شکار ہو جاتا، کبھی وقت آڑے آ جاتا اور کبھی حالات اور مصروفیت ہمارے درمیان حائل ہو جاتی لیکن میں نے جولائی کے آخری ہفتوں میں مصروفیت کو ٹھکست دے دی اور میں نے پاکستان کے سوئزر لینڈ میں قدم رکھ دیے۔

(کالم کا باقی حصہ اگلے صفحات میں ملاحظہ کیجئے)



سرحد حکومت سے درخواست

میں سوات میں داخل ہوا تو مجھے فوراً اس لہورے کا واقعہ یاد آ گیا جس نے حج سے واپسی پر کہا تھا "اس میں کوئی شک نہیں مکہ اللہ اور مدینہ رسول کا شہر ہے لیکن یار واپور لہور ہے" سوات کو دیکھ کر مجھے بھی سوئزر لینڈ یاد آ گیا اور میں نے بھی بے اختیار فرہ لگایا "سوات سوات ہے اور سوئزر لینڈ سوئزر لینڈ" مجھے محسوس ہوا جس شخص نے سوات کو پاکستان کا سوئزر لینڈ کہا تھا یقیناً اس قسم ظریف نے سوئزر لینڈ نہیں دیکھا ہوگا ورنہ وہ یہ "کلہ حق" کہنے سے پہلے سو بار سوچتا۔

میں نے محسوس کیا شاید اس شخص نے سوات کی قدرتی خوبصورتی، بہترے اور نظاروں کی وجہ سے اسے پاکستان کا سوئزر لینڈ قرار دیا ہوگا، اگر اس نقطے سے دیکھا جائے تو اس کی بات درست تھی، اللہ تعالیٰ نے سوات کو بھی سوئزر لینڈ جتنی خوبصورتی سے نواز رکھا ہے لیکن صرف قدرتی خوبصورتی کافی نہیں ہوتی ملکوں اور علاقوں کو انسان کی صنائی اور محنت بھی درکار ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہے جب تک قدرت اور انسان کے درمیان ایک "ورکنگ ریلیشن شپ" پیدا نہیں ہوتا، اس وقت تک چیزیں مکمل نہیں ہوتیں۔ حج کو لیجئے اللہ تعالیٰ نے حج پیدا کیا، مٹی، ہوا اور پانی بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے لیکن جب تک انسان اس حج، مٹی، ہوا اور پانی کو کھیت کی شکل نہیں دیتا انسان اناج میں خود کفیل نہیں ہوتا، اس کی بھوک ختم نہیں ہوتی لہذا دنیا کے جس خطے، جس کو نے انسان نے اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کر لیا وہ انسان، وہ کوٹا اور وہ خطہ خوشحال ہو گیا، اس کا مقدر بدل گیا لیکن انسانوں کے جس گروہ نے سستی اور تاخیر کا مظاہرہ کیا وہ گروہ اور اس گروہ کا ملک ترقی کے عمل میں پیچھے رہ گیا، یہ تاریخ کا سب سے بڑا بچ ہے، پانی اللہ تعالیٰ دیتا ہے لیکن اس پانی کو ڈیم میں بدلنا، اس کی نہریں بنانا اور ان نہروں کو کھیتوں اور گھروں تک پہنچانا انسان کا کام ہوتا ہے، موسم، ماحول اور حالات بھی اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے لیکن ان حالات، اس ماحول اور ان موسموں کو اپنے لئے منفعت بخش بنانا انسان کا کام ہوتا ہے، آپ اس ریفرنس کو سامنے رکھ کر اصل سوئزر لینڈ اور پاکستانی سوئزر لینڈ کا تقابل کیجئے تو آپ کو دونوں میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوگا، قدرت نے دونوں خطوں کو خوبصورتی، موسم اور ایک جیسے جغرافیائی حالات بخشے تھے لیکن سوئزر لینڈ کے لوگوں نے ان حالات کے دامن

میں اپنا حصہ ڈال کر اسے دنیا کا خوبصورت ترین ملک بنا دیا جبکہ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں سوات بخشا تو ہم نے اس کا خوبصورت چہرہ نوج لیا، ہم نے اسے 21 ویں صدی کے جدید دور میں 9 ویں صدی کا پسماندہ قصبہ بنا دیا، ہم نے اسے بدترین شکل میں ڈھال دیا۔

آپ اگر اسلام آباد سے سوات جائیں تو اس کا فاصلہ پونے دو سو کلومیٹر بنتا ہے، جدید اور مہذب ممالک میں یہ فاصلہ ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو ہے لیکن لوگ یہ فاصلہ ساڑھے سات گھنٹے میں طے کرتے ہیں، اس کی وجہ سڑک ہے، ملاکنڈ سے ینگورہ تک سڑک انتہائی خستہ اور کھنڈر ہے، تین چار جگہوں پر اس کھنڈر کی مرمت جاری ہے لیکن اس مرمت کی رفتار اور کوالٹی اتنی بری ہے کہ محسوس ہوتا ہے اول یہ سڑک دو سال سے پہلے مکمل نہیں ہوگی اور اگر یہ مکمل ہو بھی گئی تو اس کی یہ چار ماہ سے زائد نہیں ہوگی، میں نے اپنی آنکھوں سے مزدوروں کو ہنسی پر تار کول بچھاتے دیکھا، آپ خود سوچئے یہ تار کول مٹی کو کتنی دیر سنبھال سکے گی ینگورہ سوات کا ہیڈ کوارٹر ہے، اس کے موسم اور پشاور کے موسم میں کوئی فرق نہیں، شہر میں وہی رش، شور، گرد اور گرمی ہے جس سے بھاگ کر لوگ سوات جیسی جگہوں کی تلاش میں نکلتے ہیں لہذا لوگوں کی کوشش ہوتی ہے وہ ینگورہ میں رکنے کی بجائے آگے اصل سوات کی طرف نکل جائیں، سوات کی اصل پہچان اس کے تین مقامات مالم جبہ، بحرین اور کالام ہیں لیکن بد قسمتی سے ان تینوں علاقوں کی سڑکیں بھی انتہائی خستہ ہیں، ینگورہ سے مالم جبہ اور کالام کا فاصلہ 50 اور 90 کلومیٹر ہے لیکن اگر ہم اپنی گاڑی سے وہاں جائیں تو ہمیں مالم جبہ پہنچنے کیلئے ساڑھے تین گھنٹے جبکہ کالام کیلئے ساڑھے پانچ گھنٹے سڑک ٹرانزٹا ہے، اس سفر کے دوران ایسے ایسے مقامات جی آتے ہیں جہاں دس کلومیٹر ٹرنی گھنٹے کی رفتار سے گاڑی چلا نا پڑتی ہے۔ کالام اس وادی کا سب سے خوبصورت مقام ہے، اس مقام تک پہنچنا انتہائی دشوار اور مشکل ہے، مدین کے بعد کالام تک سڑک نوٹ چکی ہے، کالام سے آگے مہوڈنڈ جمیل ہے، یہ جمیل انتہائی خوبصورت اور پرسکون ہے، کالام جانے والے 95 فیصد لوگ مہوڈنڈ جاتے ہیں لیکن اس جمیل تک جانے کیلئے سڑک کی نعمت موجود نہیں، لوگوں کو اڑھائی سے ساڑھے تین ہزار روپے میں جیب لینا پڑتی ہے اور یہ جیب 35 کلومیٹر کا فاصلہ چار گھنٹے میں طے کرتی ہے، راستہ انتہائی غیر محفوظ اور پتھر پلا ہے اس میں بے شمار ایسے سوز آتے ہیں جہاں ہزاروں فٹ گہری کھائی اور جیب کے نازروں کے درمیان ایک دو اونچے کا فاصلہ رہ جاتا ہے، ینگورہ سے کالام اور کالام سے مہوڈنڈ تک راستے میں کوئی ٹوائٹل نہیں، مہوڈنڈ جمیل پر بھی اس قسم کی کوئی سہولت موجود نہیں، میں نے سارا راستہ خواتین اور بچوں کو مشکل میں دیکھا، مردان سے ینگورہ اور ینگورہ سے کالام اور کالام سے مہوڈنڈ تک ہر طرف گندگی کے ڈھیر لگے ہیں، ہر طرف ریپر، خالی بوتلیں، ٹین اور پھٹکے پڑے ہیں۔ مسئلہ یہ گند اور راستوں کی یہ خستہ حالی نہیں اصل مسئلہ صوبہ سرحد کی اسلامی حکومت ہے، حیرت ہوتی ہے یہ سارا گند اور یہ ساری بد نظمی اسلامی حکومت کی ناک کے عین نیچے جمیل رہتی ہے اور حکومت اس سلسلے میں کچھ نہیں کر رہی مجھے سوات جا کر محسوس ہوا جو حکومت ایک سڑک اور ایک پبلک پوائنٹ درست نہیں کر سکتی کل کھلاں کو اگر اسے پورے ملک کا نظم و نسق مل گیا تو وہ کیا کرے گی۔

کالم نگاروں کے بارے میں عموماً کہا جاتا ہے یہ لوگ مسئلہ تو بیان کر دیتے ہیں لیکن اس کا حل نہیں دیتے۔ میں آج یہ گلہ بھی دور کرنا چاہتا ہوں، میں آج سرحد حکومت کو اس مسئلے کا حل بھی بتاتا ہوں، سوات کے تین بڑے مسئلے ہیں اول سڑکیں، دوم تفریحی مقامات پر گندگی اور سوم سیاسی مراکز اور ان کے راستوں میں ٹوائٹلس کی دستیابی، ان تینوں مسئلوں کے ایسے حل موجود ہیں جن پر ایک پیرہ خراج نہیں ہوگا، سب سے پہلے سڑکوں کو لیتے ہیں، سرحد حکومت وادی سوات کی ساری سڑکیں چیکوں سے فنانس کرائے، وہ مختلف چیکوں سے بات چیت کرے، چیکوں کو مہوڈ نثر جمیل تک سڑکیں اور چیمبر لفٹس بنانے پر راغب کرے، بینک سڑکیں بنانے کے بعد انٹری اور ایگزٹ پوائنٹس پر ٹول پلازے بنادیں اور ان تفریحی مقامات میں داخل ہونے والے لوگوں سے فی گاڑی تین سے پانچ سو روپے ٹول ٹیکس وصول کر لیں، اس رقم سے چیکوں کی قطع بھی پوری ہو جائے گی اور سیاحوں کو بھی چھپوں کے کرائے سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اسی طرح حکومت مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں کو گندگی اٹھانے اور عارضی ٹوائٹلس بنانے کی ذمہ داری سونپ دے، اس وقت پاکستان میں مشروبات، سگریٹس، آئس کریم، ٹیلی کیو ٹیکیشن اور پٹرول کی 900 قومی اور بین الاقوامی کمپنیاں کام کر رہی ہیں، حکومت ان میں سے صرف دس کمپنیوں کا انتخاب کرے اور پوری سوات ویلی ان کمپنیوں میں تقسیم کر دے، کمپنیاں اپنے اپنے علاقے میں ڈس بیئر لگا دیں، وہاں اپنے باوردی سوچر تعینات کریں اور اس علاقے میں کوڑا اٹھانے اور جلانے والے ایک دو یونٹ لگا دیں تو اس سے سیاحوں کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور ان کمپنیوں کی ٹیک نامی میں بھی اضافہ ہوگا۔ اسی طرح کسی ٹیلی کیو ٹیکیشن کمپنی یا مشروبات کی کسی فرم سے سوات کے راستے میں عارضی ٹوائٹلس بھی بنوائے جاسکتے ہیں، یہ کمپنی ان ٹوائٹلس کی صفائی اور سیوریج کیلئے باوردی ورکر ملازم رکھ لے۔ اس بندوبست سے لوگوں کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا، حکومت کی جیب سے کوئی پیرہ بھی خرچ نہیں ہوگا اور ان کمپنیوں کو بھی اپنی ٹیک نامی اور ایڈورٹائزنگ کا موقع مل جائے گا لیکن آخر میں پھر وہی بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے، یہ سب کچھ کرے گا کون؟ کنفیوشس نے کہا تھا اگر انسان چلنا چاہے تو اس کے سامنے ہزار راستے ہوتے ہیں لیکن اگر وہ حرکت نہ کرنا چاہے تو اس کے پاس دو ہزار بہانے ہوتے ہیں، ہماری حکومتیں بھی ایسی شہنشاہ ہیں جن کے پاس کام نہ کرنے کے دس دس ہزار بہانے ہوتے ہیں میں یہ حقیقت جانتا ہوں لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں یہ دل چاہتا ہے ایک بار سرحد حکومت سے درخواست ضرور کی جائے ان سے اتنا ضرور کہا جائے اگر وہ سوات کو اپنا ایک ”درنگ ڈے“ دے دیں تو سوات حقیقاً پاکستان کا سونڈر لینڈ بن سکتا ہے۔



بلوچ قیادت بھی تصور وار ہے

علی کا تعلق بلوچستان کے علاقے ژوب سے تھا، وہ قائد اعظم یونیورسٹی میں ایم فل کر رہا تھا۔ وہ گزشتہ روز میرے پاس آیا، اس کے پاس دو فائلیں تھیں، اس نے فائلیں کھولیں، کاغذ نکالے اور یہ سارے کاغذ میرے پھیلا دیئے، میں خاموشی سے اس کی یہ کارروائی دیکھتا رہا۔

اس نے ایک کاغذ اٹھایا اور میری طرف لہرا کر بولا ”سر یہ اسلام آباد کا بجٹ ہے، 22 جون 2006ء کو سی ڈی اے کے چیئرمین نے 21 ارب 23 کروڑ 80 لاکھ روپے کے بجٹ کا اعلان کیا تھا، چیئرمین نے وفاقی حکومت کے 15 پراجیکٹس کا ذکر بھی کیا، ان پراجیکٹس پر 19 ارب 12 کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ وفاقی حکومت یہ 19 ارب روپے بینک سٹیٹمنٹ ڈیپنٹ پروگرام (پی ایس ڈی پی) سے دے گی، سی ڈی اے اس رقم سے ایوان صدر میں ایک نئی کالونی تعمیر کرے گا، ایوان صدر میں پولیس کے لئے رہائش گاہیں بنائے گا، قومی اسمبلی کے سپیکر کا گھر بنائے گا، پارلیمنٹ ہاؤس کا ایئر کنڈیشنڈ اپ گریڈ کرے گا، گلوز سرکٹ ٹی وی سسٹم لگائے گا، سیکرٹریٹ، فارن آفس اور پارلیمنٹ ہاؤس کے سنٹرل ایئر کنڈیشنڈ سسٹم کی مرمت کرانے گا، ایوان صدر، سینٹ ہال اور پارلیمنٹ ہاؤس کا فرنٹیجر بدلے گا اور پارلیمنٹ ہاؤس میں سٹینڈنگ کمیٹیوں کے چیئرمینوں کے لئے نئے دفاتر بنائے گا، میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا، اس نے کہا ”سر اسلام آباد میں صرف دس لاکھ لوگ رہتے ہیں اور اس کا کل رقبہ 906 مربع کلومیٹر ہے، حکومت اگلے سال دس لاکھ لوگوں اور 906 مربع کلومیٹر کے اس چھوٹے سے شہر پر 21 ارب 23 کروڑ 80 لاکھ روپے لگائے گی جبکہ ایوان صدر سے پارلیمنٹ ہاؤس تک نصف کلومیٹر کے دائرے میں 19 ارب 12 کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے، میں خاموشی سے سنتا رہا، اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور دوسرا کاغذ اٹھا کر بولا ”اس کے مقابلے میں بلوچستان کی حکومت 2006-2007ء میں پورے صوبے پر 59 ارب 69 کروڑ روپے خرچ کرے گی، جس میں سٹیٹ بینک کا 17 ارب روپے کا قرضہ بھی شامل ہے۔ اگر ہم یہ 17 ارب روپے نکال دیں تو یہ رقم 42 ارب روپے بن جاتی ہے، گویا اس سال پورے بلوچستان پر 42 ارب روپے جبکہ اسلام آباد پر 40 ارب 35 کروڑ 80 لاکھ (21 ارب 23 کروڑ 80 لاکھ + 19 ارب 12

کر ڈیڑھ روپے خرچ کئے جائیں گے۔ وہ رکا اس نے کاغذ اٹھایا اور اس کے درمیان میں انگلی رکھ کر بولا "آپ بلوچستان کا ترقیاتی بجٹ دیکھئے، حکومت پورے بلوچستان کے ترقیاتی کاموں پر 10 ارب 82 کروڑ روپے خرچ کرے گی" میں خاموش رہا، وہ رک کر بولا "سر بلوچستان کا رقبہ 3 لاکھ 47 ہزار ایک سو 90 مربع کلومیٹر ہے، یہ پاکستان کا سب سے بڑا محروم اور فریب صوبہ ہے۔ سر کیا یہ ظلم نہیں حکومت 906 مربع کلومیٹر کے اسلام آباد اور دس لاکھ لوگوں پر 40 ارب روپے خرچ کرے جبکہ تین لاکھ 47 ہزار ایک سو 80 مربع کلومیٹر کے بلوچستان اور ایک کروڑ بلوچوں کی ترقی پر صرف دس ارب 82 کروڑ روپے خرچ ہوں، کیا یہ ظلم نہیں ایوان صدر سے پارلیمنٹ ہاؤس تک نصف کلومیٹر کی ترقی پر 19 ارب روپے خرچ کئے جائیں اور گوادریس سے لے کر ڈوب تک اور جب سے لے کر چین تک ساڑھے تین لاکھ مربع کلومیٹر پر صرف 10 ارب 82 کروڑ روپے؟" وہ رکا اس نے سانس لیا اور پھر مسکرا کر بولا "لیکن سر اس کے باوجود جب ہم لوگ بولتے ہیں تو آپ لوگ ہمیں غدار کہتے ہیں آپ ہمیں قوم پرست کا خطاب دیتے ہیں۔" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے اسلام آباد کا بجٹ لیا، ایک نظر اس پر ڈالی اور ایک جگہ انگلی رکھ کر کہا "یہ دیکھو چیئرمین نے اعلان کیا ہے، سی ڈی اے 21 ارب روپے میں سے 14 ارب 97 کروڑ 50 لاکھ روپے اپنے وسائل سے حاصل کرے گا جبکہ باقی رقم اس کے پاس پہلے سے موجود ہے" وہ خاموشی سے میری بات سنتا رہا، میں نے عرض کیا "اور جہاں تک ایوان صدر اور پارلیمنٹ ہاؤس پر 19 ارب روپے خرچ کرنے کا معاملہ ہے تو میں اس سلسلے میں تمہارے ساتھ متفق ہوں، واقعی حکومت کو چاہئے وہ پارلیمنٹ ہاؤس کے انٹیرکنڈیشنر کی اپ گریڈیشن کی بجائے اس رقم سے بلوچستان کے لوگوں کے لئے پینے کے پانی، روزگار، ہسپتالوں اور سکولوں کا بندوبست کرے، اس میں کوئی شک نہیں 19 ارب روپے بہت بڑی رقم ہوتی ہے، اس رقم سے بلوچستان کے لاکھوں لوگوں کا مقدر بدل سکتا ہے لیکن تم جانتے ہو....." میں ایک لمحے کے لئے رکا اور اس کے بعد مسکرا کر بولا "بلوچستان کے عوام پر اس ظلم کے تمام تر ذمہ دار خود بلوچ ہیں، یہ بلوچستان کی سیاسی قیادت کا قصور ہے" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، میں نے عرض کیا "کیا تم بتا سکتے ہو پاکستان میں مہنگی ترین جگہ کون سی ہے؟" اس نے ذرا دیر سوچا اور اس کے بعد بولا "اسلام آباد کا ای سیون سیکٹر" میں نے انکار میں سر ہلا دیا "نہیں اس جگہ کا نام گوادریس ہے، بھٹو کے دور میں روس اور جنرل ضیاء الحق کے دور میں امریکہ نے گوادریس کی اتنی قیمت لگائی تھی جس سے اسلام آباد جیسے دس شہر بنائے اور خریدے جاسکتے ہیں، پچھلے پانچ برسوں میں گوادریس میں 80 ہزار ایکڑ سرکاری زمین خریدی اور بیٹی گئی اور گوادریس زمینوں سے سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے دس ہزار پراپرٹی ڈیلر ارب پتی بن گئے، بلوچستان کی سیاسی قیادت ان ساری زمینوں کی خرید و فروخت میں شامل تھی، ان زمینوں کی تمام تر سود سے بازی چیف منسٹر ہاؤس میں ہوئی تھی اور چیف منسٹر نے اس سے باقاعدہ حصہ وصول کیا تھا، مجھے پورٹس اینڈ شپنگ کی سٹینڈنگ کمیٹی کی ایک رپورٹ پڑھنے کا اتفاق ہوا، اس رپورٹ میں انکشاف ہوا حکومت نے بندرگاہ کے لئے 4 ہزار ایکڑ زمین چھوڑی تھی لیکن زمین بھی

اچانک غائب ہو گئی لہذا اگر اسلام آباد کی انتظامیہ پلاس سٹیج کر سال میں 15 ارب روپے جمع کر سکتی ہے تو کیا بلوچستان حکومت کو ادارہ کی زمینوں سے سو دو سو ارب روپے نہیں حاصل کر سکتی تھی؟ کیا وہ کواد کے پلاس سٹیج کر بلوچستان کے لوگوں کا مقدر نہیں بدل سکتی؟" میں رکا میں نے فور سے نوجوان کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر عرض کیا "بلوچستان کے چیف منسٹر جناب جام یوسف بیٹے میں تین دن اسلام آباد میں گزارتے ہیں جناب شوکت عزیز سے پہلے بلوچ سردار میر ظفر اللہ جمالی پاکستان کے وزیر اعظم تھے نواز شریف کے دور میں سردار اختر مینگل مسلم لیگ کے حلیف تھے اور بے نظیر بھٹو کی حکومت میں نواب ذوالفقار نسو بلوچستان کے وزیر اعلیٰ اور پیپلز پارٹی کے اتحادی رہے یہ لوگ بھی اسلام آباد آتے جاتے رہتے تھے یہ لوگ خود اپنی آنکھوں سے ایوان صدر سے پارلیمنٹ ہاؤس کے نصف کلومیٹر پر اربوں روپے خرچ ہوتے دیکھتے تھے اور یہ لوگ آج بھی دیکھ رہے ہیں لیکن کیا انہوں نے آج تک اس پر احتجاج کیا؟ حقیقت تو یہ ہے ان لوگوں نے آج تک صدر اور وزیر اعظم سے اتنا عرض نہیں کیا جناب عالی ہمارے پورے بلوچستان کا ترقیاتی بجٹ 10 ارب روپے ہے جبکہ آپ تین عمارتوں کی تزئین و آرائش پر 19 ارب روپے خرچ کر رہے ہیں، حضور مہربانی فرما کر یہ 19 ارب روپے ہمیں دے دیں، ہم اپنے لوگوں کو پانی، روٹی اور روزگار دینا چاہتے ہیں۔"

میں رکا، اس کی طرف جھکا اور مسکرا کر عرض کیا "میر ظفر اللہ جمالی پورے پاکستان کے وزیر اعظم تھے، وہ اپنے دور میں وزیر اعظم ہاؤس کے پرے اور صوفے بدلنے رہے، وہ بھی کالین اور دیواروں کا رنگ تبدیل کرتے رہے مگر انہوں نے بلوچستان کیلئے کچھ نہ کیا" وہ خاموشی سے میری بات سنتا رہا، میں نے اس سے عرض کیا "میرے عزیز اگر آج بلوچستان غریب ہے اگر آج بلوچستان محروم اور پسماندہ ہے تو اس کی قصور وار بلوچستان کی سیاسی قیادت ہے، تمہارے اصل قصور وار بلوچستان میں بیٹھے ہیں لیکن تم انہیں اسلام آباد میں تلاش کر رہے ہو" اس نے تھوڑی دیر سوچا اور خوابیدہ آواز میں بولا "سرمہار اظالم کون ہے میں آپ سے یہ نہیں پوچھنے آیا، میں تو آپ سے بس اتنا جانتا چاہتا ہوں، اظالم کون ہے میں ہو یا اسلام آباد میں کیا اس کا ضمیر اسے ملامت نہیں کرتا" میں نے قبضہ لگایا اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا "نہیں میرے عزیز ظالموں کے ضمیر نہیں ہوا کرتے۔"



بس آنکھیں بند کریں

”تم پنجابی ہو اور ہمارے دشمن ہو“ اس نے مزہ دوسری طرف پھیر لیا، کمرے میں سنسنی پھیل گئی، ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، مجھے پہلی بار احساس ہوا پنجابی ہونا بری بات ہے اور اس ملک کے بے شمار لوگ پنجابیوں کو دشمن سمجھتے ہیں یہ کراچی شہر تھا اور ہم اس بلوچ سردار سے سو سال پرانی رائفل خریدنے آئے تھے یہ رائفل کینٹن سکاٹ نے اس بلوچ سردار کے پردادا کو دی تھی یہ اس نوعیت کی تیسری رائفل تھی، پہلی دو رائفلیں لندن میوزیم میں ہیں، میرے ایک دوست کو پرانی رائفلیں، پرانی گواہیں اور پرانے خنجر جمع کرنے کا شوق ہے، اس نے اپنے گھر میں اسلحہ خانہ بنا رکھا ہے، اس رائفل کے بارے میں علم ہوا تو اس نے ایک بروکر سردار کے پیچھے لگا دیا، بروکر نے بلوچ سردار کو ملاقات کیلئے تیار کر لیا اور یوں ہم تینوں کراچی پہنچ گئے، سوڈے کے دوران میں نے اور میرے دوست نے آپس میں پنجابی میں گفتگو شروع کر دی، ہمارے منہ سے پنجابی سن کر بلوچ سردار بھدک گیا اور اس نے رائفل نیچے سے اٹکار کر دیا، میرے دوست نے جب پوچھی تو سردار غصے سے بولا، ”تم پنجابی ہو اور ہمارے دشمن ہو“ ہم حیران رہ گئے، اس کا کہنا تھا، ”تم لوگوں نے بلوچستان پر حملہ کیا، ڈیرہ بگٹی پر بم اور میزائل پھینکے، ہمارے سردار کو قتل کیا، ہمارے سینکڑوں لوگ مارے اور اب تم لوگوں نے سردار اختر مینگل کو جیل میں بند کر رکھا ہے“ میں نے اس سے عرض کیا، ”سردار صاحب ڈیرہ بگٹی پر حملہ پنجاب یا پنجابیوں نے نہیں کیا، یہ وفاقی حکومت کا فیصلہ تھا اور حکومت نے اس معاملے میں کسی سے مشورہ نہیں کیا تھا“ سردار نے نفرت سے سر مارا اور غصے سے بولا، ”ملک پر پنجابیوں کی حکومت ہے، ہم بلوچستان آپریشن کو پنجابیوں کا حملہ سمجھتے ہیں، بلوچ قتل کو کبھی نہیں بھولتا، ہم پنجاب سے اپنے بچوں، عورتوں اور بوزھوں کی موت کا بدلہ ضرور لیں گے“ میں نے عرض کیا، ”صدر پرویز مشرف پنجابی نہیں ہیں، وہ مہاجر اور سندھی ہیں، وزیراعظم شوکت عزیز بھی خالص پنجابی نہیں ہیں، جام یوسف بھی بلوچی اور سندھی ہیں، اس سارے منصوبے میں صرف ایک پنجابی شامل تھا اور وہ پنجابی چودھری شجاعت حسین تھے، لیکن ساری دنیا جانتی ہے چودھری صاحب نے حملے کی مخالفت کی تھی، وہ اس مسئلے کو نہ اکر ات کے ذریعے حل کرنا چاہتے تھے، چودھری شجاعت اور شاہد حسین نہ صرف تین بار ڈیرہ بگٹی گئے تھے بلکہ انہوں نے حملے کو نالہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن آپ

اس کے باوجود پنجاب کو الزام دے رہے ہیں "بلوچ سردار نے پہلو بدلا اور اسی لہجے میں بولا "فوج ہو پولیس ہو انتظامیہ ہو یا سیاستدان ہوں یہ سب لوگ پنجابی ہیں اور ہمارے دشمن ہیں آپ میرے مہمان ہیں آپ چائے پیئیں اور اللہ حافظ! میں آپ کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی سودا بلوچ دشمنوں کے ساتھ حساب کرتے ہیں سودے نہیں" ہم دونوں نے سردار کو منانے کی کوشش کی لیکن وہ رخ پھیر کر بیٹھ گیا ہم نے چائے کے آخری گھونٹ پھرے سلام کیا اور باہر آ گئے۔

ہم دونوں بری طرح شرمندہ اور پریشان تھے میرے دوست کا کہنا تھا ہماری حکومت کی پالیسیاں بلوچستان سرحد سندھ اور پنجاب کو بہت فاصلے پر لے گئی ہیں کوئی ان دیکھی طاقت ہمارے لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کر رہی ہے اگر حکومت نے اس نفرت پر توجہ نہ دی تو شاہد ہمارے دشمنوں کو پاکستان کو نقصان پہنچانے کیلئے زیادہ تر وہ نہ کرتا پڑے، ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ لڑنا کر ختم ہو جائیں گے میں نے اس سے وضاحت کی درخواست کی وہ بولا "حکومت نے بلوچستان پر لشکر کشی کی اس حملے میں نواب اکبر بگٹی مارا گیا جبکہ بگٹی قبیلے کے بیسیوں لوگ ہلاک ہو گئے حکومت نے اس کے بعد نواب اختر مینگل کو گرفتار کر لیا اور اس پر ہونے والے انسانیت سوز مظالم کی خبریں اخبارات میں شائع ہونے لگیں کسی ان دیکھی طاقت نے لاکھوں کی تعداد میں پمفلٹ شائع کئے اور یہ پمفلٹ بلوچوں میں تقسیم کر دیئے بلوچستان میں خفیہ ریڈیو بنے اور یہ ریڈیو بلوچوں کے غمے کو نفرت کی شکل دینے لگے بلوچوں کا غصہ اب پنجاب اور فوج کی طرف منتقل ہو رہا ہے" میرا دوست خاموش ہوا اور ذرا دیر رک کر بولا "تم جنوبی وزیرستان کے آپریشن کو دیکھو ہم نے امریکہ کی خواہش پر وزیرستان میں اپنے لوگوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی، امریکہ کی غلط اطلاعات پر وانا میں میزائل داغ رہے ہیں امریکہ کہتا ہے فلاں جگہ اتنے دہشت گرد چھپے ہیں، ہم اس جگہ میزائل داغ دیتے ہیں بعد ازاں بی بی سی اور سی این این انکشاف کرتے ہیں اس جگہ دہشت گردوں کی بجائے محصور طالب علم تھے اور ہم نے تہجد پڑھتے بچوں کو بھوس سے اڑا دیا یہ انکشافات صوبہ سرحد کے حوام میں حکومت فوج اور پنجاب کے خلاف نفرت پیدا کر دیتے ہیں وانا میں سو سو بے گناہ لوگوں کے جنازے اٹھتے ہیں یہ جنازے بھی نفرت کی ایک طویل لکیر ہیں لوگ کہتے ہیں نیو فورسز بغیر اطلاع جنوبی وزیرستان پر حملہ کر دیتی ہیں اور ہماری حکومت اپنی کمزوری چھپانے کیلئے یہ بدنامی اپنے ذمہ لے لیتی ہے، ہم اگر جنوبی وزیرستان جا کر دیکھیں تو وہاں کے لوگ پنجاب اور فوج کو ذمہ دار سمجھتے ہیں" میرا دوست رکا اور ذرا سا سوچ کر بولا "ہم اب کشمیریوں کے دلوں میں بھی نفرت پیدا کر رہے ہیں، ہم نے 25 برس تک کشمیر میں آزادی کا الاء جلائے رکھا، پاکستان کے تمام شہروں سے سینکڑوں ہزاروں نوجوان کشمیر گئے اور آزادی کی جنگ کا اہدہ منے، مقبوضہ کشمیر میں کوئی ایسا گھر کوئی ایسا خاندان نہیں جس میں کوئی نہ کوئی شہید نہ ہو 25 برسوں میں کوئی ایسا ہفتہ نہیں گزرا جب سرینگر ڈوڈا اور جموں میں ہڑتال نہ ہوئی ہو لیکن پھر ہم نے کشمیر پر یونٹن لے لیا، کشمیر اب دو ماہ کا مسئلہ محسوس ہوتا ہے، دو ماہ میں آزاد اور مقبوضہ کشمیر کی سرحدیں کھل جائیں گی جس کے بعد پاکستان اپنے موقف سے کئی

کوس پیچھے ہٹ جائے گا کشمیر سے ہماری یہ پہپائی بھی نفرت کی بنیاد بنے گی آزاد اور مقبوضہ کشمیر کے وہ لاکھوں خاندان جو آزادی کا راستہ دیکھ رہے تھے اور پاکستان کے وہ ہزاروں خاندان جنہوں نے کشمیر کی آزادی کیلئے اپنے بچوں کی قربانی دی تھی وہ حکومت کے خلاف ہو جائیں گے یہ نفرت بھی کسی نہ کسی شکل میں باہر آئے گی اور ہمیں اس کا تاوان بھی ادا کرنا پڑے گا“

میرا دوست ذرا دیر کیلئے رکا اور دوبارہ گویا ہوا ”یہ ملک بہت مضبوط تھا ہمارے لوگوں میں جذبہ ایمان اور حب الوطنی تھی پاکستان کے پاس دنیا کی بہترین فوج تھی اور ہماری فوج پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی محافظ تھی لیکن حکومت کی چند سیاسی غلطیوں کی وجہ سے ہماری فوج کا بیج بھی خراب ہوا اور ہمارے لوگ فوج سے بھی نفرت کرنے لگے تم خود سوچو دانا کے جن گھروں پر میزائل گرے اور جن لوگوں کے بچے شہید ہوئے اگر انہیں بدلے لینے کا موقع ملے تو وہ کیا کریں گے؟ یہ کس پر حملہ کریں گے؟ اور اس حملے میں کون لوگ مارے جائیں گے؟ ذرا سوچو اگر بلوچستان کے لوگ انتقام کا فیصلہ کر لیں تو یہ کس سے انتقام لیں گے اور اگر کشمیر میں شہید ہونے والے بچوں کے لواحقین خون بہا کا مطالبہ کریں اور اگر کشمیری اپنی پچیس تیس سال کی قربانیوں کا تاوان وصول کرنا چاہیں تو وہ کس کا گریبان پکڑیں گے؟“ وہ رکا اور مسکرا کر بولا ”تم خود سوچو ہم نے دو بڑی سیاسی جماعتوں کی قیادت کو جلا وطن کر رکھا ہے ہم افغانستان کی سرحد کو غیر محفوظ بنا چکے ہیں ہم ایران کے دشمنوں کی صف میں شامل ہو کر ایرانیوں کا دل توڑ چکے ہیں ہم روز بڑھی طبقے کا دل دکھاتے ہیں اور ہم نے یہ ملک ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا ہے جو کبھی قرآن مجید کے چالیس سیپارے بنا دیتے ہیں اور کبھی سال میں دو دو جوں کا انکشاف فرما دیتے ہیں لہذا میرا خیال ہے اب اس ملک کو نقصان پہنچانے کیلئے کسی بیرونی طاقت کی ضرورت نہیں ہم سب ایک دوسرے سے لڑنا کر ختم ہو جائیں گے بلوچ پنجابیوں کا گلہ پکڑ لیں گے اور سندھی اور پشتون ایک دوسرے کا گریبان پھاڑ دیں گے ہم ان سے فارغ ہوں گے تو کشمیری ہماری ٹانگ توڑ دیں گے مولوی کلین شیو کو مارے گا اور کلین شیو مولوی پر حملہ کر دے گا تم یقین کرو ہمارے درمیان نفرتوں کے بیج بودیے گئے ہیں اور اب ان بیجوں کو قد آور درخت بنتے زیادہ دیر نہیں لگے گی“

میرا دوست خاموش ہو گیا میں نے ایک لمبا سانس لیا اور سر پشت کے ساتھ ہکا کر آنکھیں بند کر لیں میں نے سوچا ان حالات میں کیوں تپالیسی سب سے اچھی حکمت عملی ہے بس آنکھیں بند کریں اور ملی کا انتظار کریں۔



بلوچوں کے ساتھ زیادتی ہوتی رہی

بس تھوڑی سی عقل مندی اور دوراندیشی کی ضرورت تھی، اگر ہم پچاس یا ساٹھ کی دہائی میں یہ فیصلے کر لیتے تو آج بلوچستان میں پنجابیوں کے گھر جلنے، علیحدگی کے نعروں لگنے اور مذاہن دفاق مخالف عناصر پیدا ہوتے۔

بلوچستان میں 1952ء میں قدرتی گیس نکلنے لگی تھی، اگر حکومت اس وقت گیس کی ڈسٹری بیوشن بلوچوں کو دے دیتی تو آج صورتحال مختلف ہوتی، حکومت بلوچستان کے بارہ بڑے قبائل یعنی، ان بارہ قبائل کی بارہ کمپنیاں بناتی اور ہر کمپنی کو گیس کی ترسیل اور فروخت کے حقوق دے دیتی، یہ کمپنیاں پاکستان کے مختلف علاقوں کو گیس فروخت کرتیں، گیس کی اس ڈسٹری بیوشن سے بلوچ قبائل خوشحال ہو جاتے جس سے انہیں گیس اور گیس سپلائی کی افادیت کا اندازہ ہوتا، انہیں معلوم ہوتا اگر گیس کی سپلائی اور فروخت بند ہو گئی تو ان کی آمدنی بند ہو جائے گی لیکن ہم نے ایسا نہ کیا، ہم نے گیس کی ترسیل اور ڈسٹری بیوشن وفاقی حکومت کے حوالے کر دی، اس دوران مائع گیس کی 30 سے 40 کمپنیاں بنیں، یہ کمپنیاں بھی پنجابی اور سندھی بزنس مینوں کی ملکیت تھیں، یہ کمپنیاں سوئی گیس سے مائع گیس لیتیں اور اسے سلنڈروں میں بھر کر ملک میں فروخت کر دیتیں جس سے بلوچوں کے ذہن میں یہ بات چبھ گئی ان کی گیس مندی اور پنجابی لے جاتے ہیں اور بلوچوں کے حصے صرف پائپ لائن آتی ہے، ہماری اس پالیسی کے باعث بلوچوں کی اس گیس کے ساتھ کوئی وابستگی پیدا نہیں ہو سکی لہذا وہ پچھلے چالیس برس سے اس پائپ لائن کو ہموں سے اڑاتے چلے آ رہے ہیں، گیس کی اس نفرت سے بھی بلوچ سرداروں اور اپنی پاکستان انٹیمٹ نے خوب فائدہ اٹھایا، انہوں نے لوگوں کو پنجاب کے خلاف بھڑکایا، اس پر وہ پیگنڈے کی وجہ سے بلوچ پنجاب سے حرید دور ہوتے چلے گئے گو اس میں پنجاب اور پنجابیوں کا براہ راست کوئی قصور نہیں تھا اور یہ سب کچھ دارالحکومت میں پیشی ہوئی اور ملٹری بیورو کر سکی کر رہی تھی لیکن اس کا نقصان پنجاب اور پنجابیوں کو پہنچا۔

بلوچستان انڈسٹری کے حوالے سے بھی محروم ہے۔ بلوچستان کی گیس سے پنجاب، سندھ اور سرحد میں ایک لاکھ اٹھارہ ہزار چھوٹے بڑے صنعتی یونٹ چلتے تھے، کھاد اور سینٹ بنانے والی تمام فیکٹریاں گیس سے چلتی تھیں لیکن بلوچستان میں کوئی فیکٹری، کوئی مل اور کوئی صنعت نہیں تھی، حکومت بھی جب کوئی سرکاری صنعتی یونٹ

لگاتی تھی تو وہ بلوچستان سے گیس لیتی تھی اور یونٹ پنجاب یا سندھ میں لگاتی تھی، اگر حکومت اس معاملے میں تھوڑی سی دسعت لگتی کا مظاہرہ کرتی اور وہ بلوچوں کے ساتھ پارٹنرشپ کی بنیاد پر بلوچستان میں فیکٹریاں لگاتی تو آج وہاں کی صورت حال یکسر مختلف ہوتی، اگر ہم بلوچستان میں صرف کھاد کے چھ کارخانے لگا دیتے تو بلوچوں کے حالات بدل جاتے لیکن ہم نے ہر دور میں بلوچوں سے فاصلہ رکھا، ہم نے ان کے وسائل تو استعمال کئے لیکن ان وسائل کے بدلے میں انہیں دیا کچھ نہیں، ہم نے بلوچوں کو ہمیشہ برطانوی حکمرانوں کی طرح ذلیل کیا، قیام پاکستان سے پہلے وانسرائے دہلی میں بیٹھ کر بلوچوں پر حکومت کرتا تھا اور کوئٹہ جیکب آباد اور نورٹ سنڈیمین (ٹوب) میں اس کے کارندے ہوتے تھے جو ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے سرکاری احکامات پر عملدرآمد کرتے تھے لیکن پاکستان بنا تو پاکستان بننے کے بعد بلوچستان پر فوج پنجابی اور سندھی حکومت کرنے لگے انہوں نے پنجابی اسٹنٹ کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں اور پولیس افسروں کی مدد سے بلوچوں کو دہانا شروع کر دیا، اگر ہم بلوچوں کو بلوچ افسر دے دیتے تو شاید ان کے دل میں ہمارے لئے اتنی نفرت پیدا نہ ہوتی۔

صوبائی خود مختاری چھوٹے صوبوں کا ازلی مطالبہ ہے، چھوٹے صوبے یہ کہتے ہیں وفاق دفاع اور امور خارجہ اپنے پاس رکھے اور باقی سارے اختیارات ہمارے حوالے کر دے، شیخ مجیب الرحمان بھی وفاق حکومت سے یہی مطالبہ کرتا تھا، میں جب بھی اس مطالبے پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا، میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا ہم لوگ صوبوں کو وفاق کی ذمہ داریوں میں کیوں جکڑ کر رکھنا چاہتے ہیں، اگر ہم ایک خوبصورت سی فیڈریشن بنا لیں اور صوبوں کو داخلی خود مختاری دے دیں، صوبے اپنے حالات، کلچر اور آبادی کے مطابق پالیسیاں بنالیں، وہ خود فیصلہ کریں انہوں نے کس طرح تجارت کرنی ہے، انہوں نے کس طرح ٹیکس جمع کرنا ہے، انہیں کون سا نظام تعلیم چاہئے اور وہ اپنے معاشرے میں کس طرح انصاف قائم کر سکتے ہیں، ہم یہ سب ان پر چھوڑ دیں اور انہیں اپنے ٹیکس خود لگانے اور خود وصول کرنے کی اجازت دے دیں، انہیں دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت کرنے کی آزادی بھی دے دیں تو میرا خیال ہے اس سے ملک میں مثبت تبدیلیاں آئیں گی، اس سے صوبوں کی معاشی اور اقتصادی حالت بھی بدل جائے گی۔ لوگوں میں اعتماد بھی پیدا ہوگا اور ان کے تمام گلے شکوے بھی اپنی مقامی قیادت کی طرف منتقل ہو جائیں گے، اس قسم کی داخلی خود مختاری امریکہ تک میں موجود ہے، امریکہ کی 50 ریاستوں کا قانون تک ایک دوسرے سے مختلف ہے، وہاں صنعت کار فیکٹریاں لگانے کیلئے ریاستوں سے سہولتوں کے ٹینڈر مانگتے ہیں اور ریاستیں بزنس مینوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ان کے ساتھ ہاتھ دہ ڈائیلاگ کرتی ہیں، اگر ہم بھی ایسا کر لیں تو سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب میں ایک صحت مندانہ ترقیاتی مقابلہ شروع ہو سکتا ہے جس کے بعد پنجاب بھارتی پنجاب سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، بلوچستان ایران کے بلوچ علاقوں کے وسائل اور صوبہ سرحد کے محام افغانستان کے پشتون علاقوں کے قدرتی ذرائع سے استفادہ کر سکتے ہیں، اسی طرح سندھ عرب کی ریاستوں کے ساتھ کاروبار کر سکتا ہے لیکن شاید یہ انتظام ہمارے حکمرانوں کو ”سوٹ“ نہیں کرتا کیونکہ صوبائی خود مختاری کے بعد

ملک پر مارشل لا لگانا مشکل ہو جائے گا، ایکشنوں میں دھاندلی اور لوٹا کرسی کا سلسلہ بند ہو جائے گا اور وفاقی حکومت کے لئے اپنے شاہی اخراجات پورے کرنا مشکل ہو جائے گا اور شاید اس سے فوجی بجٹ میں بھی کمی لانا پڑے جو درست ممکن نہیں۔ مشرقی پاکستان میں بھی یہی ہوا تھا اگر ہم مشرقی پاکستان کو داخلی خود مختاری دے دیتے تو سارے تنازعے ختم ہو جاتے لیکن اس وقت سوال پیدا ہوا تھا اگر داخلی خود مختاری دے دی گئی تو جنرل یحییٰ خان کا کیا بنے گا؟ نئے نظام میں باوردی صدر کی مہجاش مشکل تھی چنانچہ ہماری وفاقی قوتوں نے جنرل یحییٰ خان کی مہجاش نکالنے نکالتے پورا پاکستان خارج کر دیا، ہم آج بھی یہی کر رہے ہیں ہم کچھ لوگوں کی مہجاش پیدا کرنے کے لئے چھوٹے صوبوں کے احساس محرومی کو آگ لگا رہے ہیں، ہم انہیں 1971ء کی طرح سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔

بلوچستان اور بلوچوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، یہ ایک سنگتی ہوئی حقیقت ہے، ہمیں نہ صرف اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے بلکہ بلوچوں کے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کا ازالہ بھی کرنا چاہیے، ہم ساٹھ برس لیت ہیں اگر ہم نے مزید 60 مہینوں کی تاخیر کر دی تو مجھے خدشہ ہے ہم وہاں پہنچ جائیں گے جہاں واپسی کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں اور جہاں بچھتاوے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

پنجابی تصور وار ہیں

مہاتیر محمد نے 16 جولائی 1981ء میں ملائیشیا کے وزیر اعظم کا حلف اٹھایا اس وقت ملائیشیا دو بڑے نسل گروہوں میں تقسیم تھا ملائیشیا میں 60 فیصد ملائی مسلمان تھے اور 32 فیصد چینی ان دونوں گروہوں میں صدیوں سے آویزش چلی آرہی تھی چینی باشندے فطرتاً سرماہیہ کار اور برنس مین تھے لہذا وہ ملائیشیا کی 70 فیصد فیکٹریوں 'فرموں' کمپنیوں 'منڈیوں' بازاروں اور کاروبار پر قابض تھے جبکہ ان کے مقابلے میں ملائی باشندے انتہائی ناگفتہ بہ حالت کا شکار تھے ان کے پاس تعلیم تھی روزگار تھا اور نہ ہی اچھی اور خوبصورت زندگی لہذا ملائی مسلمان چینیوں سے شدید نفرت کرتے تھے وہ ان کی املاک پر حملے بھی کرتے رہتے تھے اس کے ردعمل میں چینی ملائی مسلمانوں کو اپنی فیکٹریوں اور کمپنیوں میں نوکری نہیں دیتے تھے مہاتیر محمد آیا تو اس نے ایک عیب قانون بنایا اس نے قانون بنایا جس چینی برنس مین کا کاروبار 5 ملین رگٹ تک پہنچ جائے گا وہ کسی ملائی مسلمان کو اپنے کاروبار میں 30 فیصد کا حصہ دار بنائے گا چینیوں نے شروع شروع میں اس قانون کی بھرپور مخالفت کی انہوں نے اسے ظلم زیادتی اور سرماہیہ کاری کی تو جین بھی قرار دیا لیکن بہت جلد وہ مہاتیر محمد کے وٹن کے قائل ہو گئے مہاتیر محمد کا خیال تھا ملائی مسلمان بے روزگار 'غریب' نا آسودہ اور ان پڑھ ہیں لہذا ملائیشیا میں ان کے 'سلیکس' نہیں ہیں اور یہ اسے اپنا ملک نہیں سمجھ رہے یہ لوگ جب کاروبار میں شریک ہوں گے اور جب ملائی اور چینی ایک ساتھ بیٹھیں گے تو دونوں کی دوری ختم ہو جائے گی اور ملائی مسلمانوں کی ملائیشیا کے ساتھ دلچسپی اور محبت پیدا ہو جائے گی مہاتیر محمد کا خیال درست نکلا آج آپ ملائیشیا جائیں تو آپ کو وہاں کے چینی خود کو چینی اور ملائی خود کو ملائی کہتے نہیں ہیں گے یہ سب لوگ خود کو ملائیشین شہری کہیں گے

اگر ہم ملائیشیا کی صورتحال کو سامنے رکھ کر پاکستان کا جائزہ لیں تو ہمیں دونوں میں بڑی مماثلت دکھائی دیتی ہے 1971 تک پاکستان پانچ قومیتوں کا ملک تھا اس میں بنگالی، پشتون، بلوچ، سندھی اور پنجابی تھے ان پانچوں میں پنجابی زیادہ خوشحال تھے اس خوشحالی کی چار بڑی وجوہات تھیں ایک پنجاب دوسرے صوبوں کی نسبت ایک ہموار اور زرخیز صوبہ تھا اس کے پاس زمین پانی اور دوسرے قدرتی وسائل تھے دوسرا یہ صوبہ ہزاروں سال برصغیر کا دروازہ رہا تھا دنیا بھر کی اقوام پنجاب میں آئیں اور اس میں رچ بس گئیں قوموں کے اس 'انٹرایکشن'

کے نتیجے میں اس خطے کی ذہانت میں اضافہ ہوا اور پنجابی دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ ذہین اور معاملہ فہم ہو گئے تیسرا پنجاب انگریزوں کا "مین فوکس" تھا انگریزوں نے یہاں تعلیمی ادارے بنائے جن کی وجہ سے پنجاب کی شرح خواندگی زیادہ ہو گئی اور بیوروکریسی میں پنجاب کے لوگوں کی تعداد بڑھ گئی اور چار پنجاب فوجی بھرتی کیلئے بڑا آئیڈیل صوبہ تھا یہاں کے لوگ قد کاٹھ اور ڈچلن میں دوسرے صوبوں سے بہتر تھے چنانچہ انگریزی فوج میں ان کی تعداد زیادہ تھی پاکستان کے قیام کے بعد جب بھارت اور پاکستان کی فوج الگ الگ ہوئی تو پاکستانی فوج میں پنجابی جوانوں کی تعداد 72 فیصد تھی ان چار وجوہات کے باعث قیام پاکستان کے بعد سول اور ملٹری بیوروکریسی پر پنجاب کا قبضہ ہو گیا یہ لوگ اچھے کاروباری بھی تھے یہ لوگ 50 اور 60 کی دہائی میں پنجاب سے نکلے اور انہوں نے بلوچستان، سندھ، سرحد اور بنگال کی منڈیوں پر قبضہ کر لیا آپ اس معاملے میں مشرقی پاکستان کی مثال لیجئے 1971ء تک بنگلہ دیش کی 80 فیصد ٹیکسٹائلں پنجاب کی چنیوٹی اور منوں ٹیلی کے پاس تھیں پٹ بن بنگالی پیدا کرتے تھے لیکن اس کا منافع پنجابی بزنس مین کی جیب میں جاتا تھا، مچھلی بنگالی پکڑتا تھا لیکن اسے مارکیٹ میں پنجابی بیچتے تھے بیوروکریسی میں بھی یہی صورت حال تھی بنگلہ دیش کے 90 فیصد افراد کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا اس دور میں بلوچستان، سندھ اور سرحد کا بھی یہی حال تھا ایوب خان کے عہد میں پنجابی کا شکار پنجاب سے نکلنا حکومت نے اس کی سرپرستی کی اور اس کا شکار نے سندھ اور بلوچستان میں کوڑیوں کے مول زمین خریدی اسے زمین کاشت کرنا آتی تھی لہذا وہ چند برسوں میں کا شکار سے زمیندار اور زمیندار سے جاگیر دار بن گیا جبکہ اس کے مقابلے میں مقامی لوگ غریب سے غریب تر اور بے بس سے بے بس تر ہوتے چلے گئے جس کے نتیجے میں مقامی لوگوں نے پنجابیوں کو قابض اور لٹیروں سے بھنا شروع کر دیا موقع پرست لیڈروں اور بیرونی طاقتوں نے اس نفرت کا فائدہ اٹھایا پنجاب سے یہ نفرت 60ء کی دہائی کے آخر تک مشرقی پاکستان میں بنگلہ دیش، سرحد میں پشتونستان، بلوچستان میں گریٹر بلوچستان اور سندھ میں سندھو دیش کی تحریک بن گئی اس وقت سول اور ملٹری بیوروکریسی پر پنجابیوں کا اثر و رسوخ تھا، علیحدگی پسندی نے ان تحریکوں کو طاقت سے دبانے کی کوشش کی یوں یہ تحریکیں جنگ کی شکل اختیار کر گئیں اس جنگ کے نتیجے میں 1971ء میں ہمارا اکثریتی صوبہ ہم سے الگ ہو گیا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ میرا دعویٰ ہے اگر 1979ء میں افغانستان میں امریکی جہاز دار ایران میں انقلاب سنا تو ہمیں شاید صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی مشرقی پاکستان جیسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔

1971ء تک جب بنگالی عوام صوبائی خود مختاری اور پنجاب کی افسر شاہی سے چھٹکارے کے مطالبے کرتے تھے تو ہم "سازھے چارٹ کے کالے بنگالی" کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے ہم نے بنگالیوں کی فوج میں بھرتی پر بھی پابندی لگا رکھی تھی ہم کہتے تھے ان کی چھاتی کا سائز ٹھیک نہیں ان کے قد چھوٹے ہیں لیکن جب یہ لوگ ہم سے آزاد ہوئے اور انہیں اپنا ملک خود چلانے کا موقع ملا تو انہوں نے ہم سے کہیں بہتر طریقے سے ملک چلا کر دکھایا آج آپ ان کی کرنسی دیکھئے ان کی کرنسی ہم سے زیادہ مضبوط ہے آپ ان کی ایکسپورٹ ان کی صنعت ان کی تجارت دیکھئے وہ ہم سے دو تین گنا ہے اور آپ ان کا نظام دیکھئے ان کی جمہوریت دیکھئے اور ان کے ملک میں

کام چور

میرے دوست کی ناک سے خون نکل رہا تھا میں نے اس کے ہاتھ میں تو لیدیا اس نے تولیے سے اپنی ناک دبا لی ہم لوگ تیزی سے ہسپتال کی طرف دوڑے ہسپتال قریب ہی تھا میں نے گاڑی پارک کی اور اسے لے کر اندر داخل ہو گیا سامنے ایمر جنسی میں کوئی شخص نہیں تھا بیڈ خالی پڑے تھے کاؤنٹر پر کرسیاں اور میز اوندھی پڑی تھی اور ڈاکٹر کے آفس پر تالا لگا تھا ہم دونوں حیران رہ گئے میرے دوست کی تکسیر بند نہیں ہو رہی تھی میں نے اسے کرسی پر بٹھایا اور کسی وارڈ یوانے نرس یا ڈاکٹر کی تلاش میں نکل گیا مجھے باہر کوریڈور میں ایک سوپر ملا میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اس سے پوچھا "ایمر جنسی میں کس کی ڈیوٹی ہے" اس نے سراٹھا کر ایمر جنسی کی طرف دکھا اور ہنس کر بولا "آج چھٹی ہے" میں نے پوچھا "لیکن کس چیز کی" اس نے تہقیر لگایا "آج چودہ اگست ہے سب لوگ گھروں میں آزادی کا جشن منا رہے ہیں" مجھے یہ چھٹی عجیب لگی میں نے اپنے دوست کو اٹھایا اور پرائیویٹ کلینک کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

میں نے راستے میں سوچا ہسپتال ہو یا پرائیمری سکول یا شاہک کچھ صحیح ہم مجموعی طور پر ایک چھٹی پسند قوم ہیں۔ پاکستان میں بارش ہو جائے تو ہم بارش کو بہانہ بنا کر چھٹی کر لیتے ہیں بارش نہ ہو تو ہم خشک سالی کو عذر بنا کر گھر بیٹھ جاتے ہیں۔ سردی ہو جائے تو ہم درخواست لکھ بھیجتے ہیں۔ گرمی ہو جائے تو عرضی آ جاتی ہے۔ بسنت آ جائے تو دفتر کے دفتر ویران ہو جاتے ہیں۔ عید آ جائے تو خوشی میں چھٹی کر لیتے ہیں۔ محرم ہو تو سوگ میں گھر جا بیٹھتے ہیں اور پاکستان سچا جیت جائے تو چھٹی ہو جاتی ہے ہار جائے تو تعطیل عام ہی محسوس ہوتی ہے۔ آپ عید سے ایک ہفتہ پہلے کسی دفتر چلے جائیں آپ کو جواب ملے گا عید کے بعد آئے گا۔ ذرا عید کا رش نکال لیں۔ بس جی عید کی وجہ سے کام رکے ہوئے ہیں ان شاء اللہ عید کے بعد کام ہو جائے گا وغیرہ۔ آپ عید کے بعد چلے جائیں وہی صاحب کہیں گے عید کی وجہ سے سارے کام رکے ہوئے تھے اب ان شاء اللہ ہفتے دس دن میں آپ کا کام ہو جائے گا۔ یہ تو ہیں روٹین کے کام! اگر خدا نخواستہ آپ نے کسی سے رقم لینی ہو یا آپ کا کوئی کسلی دفتر میں پھنسا ہوا ہے تو بس پھر آپ ناک سے لکیریں نکال کر ہی رقم وصول کریں گے۔ کبھی بارشوں کی وجہ سے آپ کا بل پاس نہیں

ہوگا۔ کبھی بیچ اس بل کے سامنے کھڑا ہوا جائے گا، کبھی ٹینکوں کی کلوزنگ اسے روک کر کھڑی ہو جائے گی اور کبھی دھوپ سردی، خزاں اور بہار اس کا راستہ روک لے گی آپ ہفتوں بلکہ مہینوں ایک دفتر سے دوسرے اور ایک صاحب کے دربار سے دوسرے صاحب کے دربار میں دوٹوکے کھاتے رہیں گے لیکن آپ کو رقم نہیں ملے گی۔

اس وقت شاید ہم دنیا میں سب سے زیادہ چھٹیاں کرنے اور کام چوری کے سب سے زیادہ عذر تلاش کرنے والی قوم ہیں۔ ہنگامی چھٹیاں میڈیکل لیوز، ارن لیوز اور ڈیپارٹمنٹ لیوز تو رہیں ایک طرف ہماری قومی چھٹیوں کی تعداد بھی ہوش ربا حد تک زیادہ ہے۔ اس وقت بھارت میں سالانہ چھ قومی تعطیلات ہوتی ہیں۔ چین 10، روس 8، سنگا پور 6، نیوزی لینڈ 7، امریکہ 12، برطانیہ 8 اور ہانگ کانگ میں قومی سطح پر 12 چھٹیاں منائی جاتی ہے۔ اسلامی ممالک کی صورتحال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ بحرین میں یکم جنوری اور 16 دسمبر کو عید یکم جنوری 25، فروری اور یکم جنوری 8، فروری 21، مارچ 14 اور 17 جولائی، قطر یکم جنوری 22، فروری 3، ستمبر اور 25 دسمبر، سعودی عرب 30 مئی، 4 جون، عید الفطر اور عید النحر، متحدہ امارات یکم جنوری، یکم مئی، 17 اگست، 14 اکتوبر اور 2 دسمبر، شام یکم جنوری 8، مارچ 17، اپریل، یکم مئی اور 25 دسمبر، یمن یکم جنوری، یکم مئی، 13 جون، 22 جون، 24 ستمبر، 14 اکتوبر، 30 نومبر اور 31 دسمبر، سوڈان یکم جنوری 3، مارچ 18، اپریل 25، مئی 13، اکتوبر اور 25 دسمبر اور اردن میں یکم اور 15 جنوری 22، مارچ، یکم مئی 25، مئی 13، اکتوبر اور 25 دسمبر کو قومی سطح پر چھٹی ہوتی ہے جبکہ پاکستان میں ہر سال 17 سے 23 قومی تعطیلات منائی جاتی ہیں جبکہ ہم جو چھٹیاں ان چھٹیوں کے ساتھ ملا کر کرتے ہیں ان کی تعداد ان سے دوگنی بلکہ تینگنی ہے۔ جب بھی کوئی قومی تعطیل ہوتی ہے تو ہمارے سرکاری اور نیم سرکاری ملازم اس کے ساتھ ایک آدھ چھٹی لے کر اس چھٹی کو تین چار دن میں بدل لیتے ہیں اور اس "سازش" کی مہربانی سے اس سرکاری ملازم کا کام دو تین ہفتے پیچھے چلا جاتا ہے۔

ہماری چھٹیوں کی روایات بھی بہت دلچسپ ہیں مثلاً ایک بار میں ایک سرکاری دفتر گیا تو میں نے دیکھا دن کے گیارہ بجے سارا عملہ دفتر سے نکل کر بسوں میں سوار ہو رہا تھا۔ میں نے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا مجھے کے چیف کو اللہ تعالیٰ نے تیس سال کی ازادہی دوڑ دھوپ کے بعد چاند سا بنادیا ہے اور اب سارا عملہ مبارک باد دینے ان کے گھر جا رہا ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایک بار ماسٹر صاحب کی بھینس "انتقال" کر گئی۔ یقین کیجئے مرحومہ کے سوگ میں سکول میں تین دن چھٹی رہی۔ سوگ کے دن پورے ہونے کے بعد بھی سال چھ مہینے تک ماسٹر صاحب ریاضی کے مسائل سمجھانے کی بجائے مرحومہ کی باتیں سناتے رہے تھے۔ مرحومہ بھینس کو یاد کرتے ہوئے ماسٹر صاحب کی آنکھیں بھر جاتی تھیں جس کے جواب میں احتیاطاً بچوں کی کھٹکھی بھی بندھ جاتی تھی۔ ہم میں سے جو زیادہ سیانے تھے وہ ماسٹر صاحب سے اظہارِ کینجی کیلئے ایک آدھ چیخ بھی جڑ دیتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک مرحومہ کی صاحبزادی "کنی" نے بائبل ہو کر دودھ دینا شروع نہ کر دیا۔ میں اس واقعے کو اپنی زندگی کا

حیران کن واقعہ سمجھتا تھا لیکن جب جوان ہوا تو پتہ چلا ہمارے ملک میں صاحبوں کے کتے مرنے پر بھی دفتر بند ہو جاتے ہیں جبکہ بھینس اور کئی تو پھر بھی نجیب الطرفین جانور ہیں۔

میں نے یورپ بھی دیکھا ہے وہاں آندھی ہو طوفان ہو صاحب کا کتا مرے یا والد محترم قوم بیچ جیت جائے یا برف پڑنے لگے سورج سوائیزے پر آجائے یا دن بارہ بجے اندھیرا چھا جائے وہاں دفتر کھلے رہتے ہیں اور لوگ اپنی اپنی میزوں پر اپنا اپنا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ وہاں چھٹی کرنے آج کا کام کل پر چھوڑنے یا خارش کرنے کا نہ کھجانے یا سگریٹ پینے کا کوئی تصور نہیں۔ یہ ہوتے ہیں ملک ایسے کرتی ہیں تو میں ترقی۔ مرحوم اختر حمید خان فرمایا کرتے تھے جب تک ملک سے چوروں اور کام چوروں کا خاتمہ نہیں ہوتا ملک ترقی نہیں کر سکتا لہذا ہمیں چوروں کے ساتھ ساتھ کام چوروں سے بھی تیننا ہوگا ہمیں چھٹی مانفا سے بھی جان چھڑانا ہوگی۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

کرپٹ

ابراہام لیکن رات تین بجے سوتا تھا اور صبح چوبیس بجے جاگ جاتا تھا، وہ رات بارہ بجے کے قریب فائلیں پڑھنا شروع کرتا تھا اور دو بج کر 55 منٹ تک نوٹس لیتا رہتا تھا، سونے سے ایک منٹ پہلے تک اس کے ہاتھ میں قلم ہوتا تھا اور وہ کسی فائل کے کسی فقرے کے نیچے لکیر کھینچ رہا ہوتا تھا، وہ جتنی بھانسنے کے بعد اس فائل کو سائیز میبل پر رکھ دیتا تھا، صبح چوبیس بجے جونہی اس کی آنکھ کھلتی تھی اس کا ہاتھ بے اختیار سائیز میبل کی طرف جاتا تھا اور وہ فائل اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتا تھا، وہ امریکا کا پہلا اور شاید واحد صدر تھا جس نے اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ کام میں صرف کیا، اس نے زندگی بھر تفریح نہیں کی لہذا اس نے ولیم شکسپیر کے ڈراموں سے دس گنا زیادہ صفحے لکھے اور ہارورڈ یونیورسٹی کی ایک چوتھائی کتابوں جتنے صفحات پڑھے، اس نے زندگی بھر تین گھنٹوں سے زیادہ نیند نہیں لی، لیکن کو 15 اپریل 1865ء کو فرصت کے دو گھنٹے ملے اور اس نے یہ دو گھنٹے تھیز میں گزارنے کا فیصلہ کیا لیکن فرصت کے ان دو گھنٹوں کے دوران وہ قتل ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد کسی امریکی مورخ نے لکھا تھا ”کام لیکن کی زندگی تھا وہ جونہی کام سے باہر نکلا اس کی زندگی ختم ہو گئی“ لیکن سے ایک بار کسی نے اس شب بیداری کے بارے میں پوچھا تو لیکن نے اسے جواب دیا تھا ”میرے لیے تین گھنٹے کی نیند کافی ہے لہذا میں سمجھتا ہوں میں اس کے علاوہ جو وقت چنگ پر گزاروں گا وہ بددیانتی ہوگا، وہ کرپشن ہوگی“ ابراہام لیکن نے مزید کہا ”جو لوگ قدرت کی دی ہوئی صلاحیتوں سے پورا کام نہیں لیتے وہ کہتے ہیں، وہ بھی قدرت کے سامنے جوابدہ ہیں۔“

مجھے نہیں معلوم ہمارے دانشور، علماء کرام اور ہمارے مسٹر کلین وزیراعظم جناب شوکت عزیز ابراہام لیکن کے اس فلسفے سے کہاں تک متفق ہیں لیکن مجھے لیکن کی بات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کرپشن صرف رشوت، لوٹ کھسوٹ اور کالے دھن تک محدود نہیں، کرپشن کی تعریف میں مالی بددیانتی ایک انتہائی چھوٹا اور معمولی جرم ہے اصل جرم اس کے بعد شروع ہوتے ہیں اور بدقسمتی سے ہم نے آج تک ان جرائم پر غور کیا اور نہ ہی ہم نے کبھی ان کے تدارک کے لیے کوشش کی۔ اصل کرپشن نیت اور صلاحیتوں سے پورا کام نہ لینا ہوتی ہے مثلاً اگر طالب علم 45 منٹ کے پریزم میں 30 منٹ تک دماغی طور پر غیر حاضر رہتا ہے تو یہ بھی کرپشن ہے، استاد تیار

کے بغیر کلاس میں آجاتا ہے تو یہ بھی کرپشن ہے، ایک ڈاکٹر کو اللہ تعالیٰ نے روزانہ تیس مریض دیکھنے کی ہمت اور صلاحیت دے رکھی ہے لیکن وہ پانچ دس مریضوں کے بعد کلینک سے اٹھ جاتا ہے تو یہ بھی کرپشن ہے، انجینئر سائٹ کا دورہ نہیں کرتا، پنڈاری کاغذ پر غلط لکیر کھینچ دیتا ہے، کانسٹیبل چوک میں کسی شریف شہری کی بھڑی اچھال دیتا ہے۔ ایس ایچ او کسی کو بلاوجہ پکڑ لیتا ہے، چیز اسی ایک میز کی فائل دوسری میز پر چھوڑ آتا ہے، دودھ والا دودھ میں پانی ملا دیتا ہے، سائیکس گھوڑے کو وقت پر پانی نہیں پلاتا، تندورچی تندور میں روٹیاں جلا دیتا ہے، باورچی سالن میں نمک نہیں ڈالتا، موذن وقت پر اذان نہیں دیتا، امام صاحب رکعت لمبی کر دیتے ہیں، گاڑی چلانے والا ٹریفک کے قوانین کی پابندی نہیں کرتا، کسان فصل کو پانی نہیں دیتا، ایم اے پاس نوجوان خود کو چیز اسی اور ٹکڑی کی نوکری تک محدود کر لیتا ہے، کپنی کا مالک ملازمین کی تعداد میں اضافہ نہیں کرتا، بیمار بازار سے دوایا خریدتا، پروفیسر کتا میں نہیں پڑھتا، سریلے گلے کا مالک گاٹا نہیں گاتا، کھلاڑی میدان میں نہیں اترتا، مسلمان نماز، روزے اور زکوٰۃ کی پابندی نہیں کرتا، مسٹری اینٹ نہیں لگاتا، مزدور سالے میں پورا سینٹ نہیں ڈالتا، کیسٹ دواؤں میں اجزاء کی ترتیب درست نہیں رکھتا، ایم این اے اسمبلی نہیں جاتا، وزیر وزارت کا کام نہیں کرتا اور وزیر اعظم دفتر نہیں بیٹھتا تو یہ بھی کرپشن ہے۔ وزیر اعظم صاحب اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن کیا پاکستان جیسے غریب ملک میں 70 وزراء کی کابینہ کرپشن نہیں؟ کیا وزیر اعظم نامزد ہونے کے بعد انکیشن لڑنا کرپشن نہیں؟ کیا سال میں ستر ستر غیر ملکی دورے کرنا اور ہر دورے میں سو سو لوگوں کو ساتھ لے جانا کرپشن نہیں؟ کیا انٹرنل زر دکان کے فنڈز سے دواہار روپے نکال کر فوج کے حوالے کر دینا کرپشن نہیں؟ کیا 728 سول عہدوں پر ریٹائر فوجی افسر تعینات کر دینا، کیا 78 سیکرٹریوں کو ڈیڑھ ہزار روپے کے پلاٹ دے دینا اور کیا لینڈ مافیا کو نوازنے کے لیے پنڈی گھیب میں اینرپورٹ کی اجازت دے دینا کرپشن نہیں، کیا باوردی جمہوریت اور نیب زدہ سیاستدانوں کو اقتدار سونپ دینا کرپشن نہیں، کیا چرڈ آرٹھیج کا حکم اور اس حکم پر سر تسلیم خم کر دینا کرپشن نہیں، کیا وزیر اعظم ٹوٹی پلیٹر کے اعزاز میں اذان رکوا دینا، کیا امریکہ کے حکم پر حدود آرمڈ فورسز میں ترمیم کر دینا اور کیا نصاب سے آہٹیں حذف کر دینا کرپشن نہیں اور کیا اسلامی ملک میں شراب اور بدکاری کی اجازت دے دینا کرپشن نہیں، وزیر اعظم صاحب ایک لمحے کیلئے سوچیں اور جواب دیں۔

9 دسمبر کو پوری دنیا میں کرپشن کا عالمی دن تھا۔ اس دن ہمارے وزیر اعظم صاحب نے فرمایا تھا "صدر پرویز مشرف اور میں مالی کرپشن سے پاک ہیں" وزیر اعظم صاحب نے درست فرمایا ہوگا اس میں کوئی شک نہیں آج تک صدر پرویز مشرف اور وزیر اعظم شوکت عزیز پر مالی کرپشن کا کوئی الزام نہیں لگا لیکن پچھلے دس برسوں سے جو کچھ ملک میں ہو رہا ہے ہم اسے کس خانے میں رکھیں گے اور وزیر اعظم کی توجہ کے لیے عرض ہے پاکستان میں آج تک جنرل ضیاء الحق سے بڑا کوئی مسز کلین نہیں گزرا تھا۔ انہوں نے پوری زندگی ایک پیسے کی ہیرا بھیری نہیں کی تھی لیکن اپنی تمام تر ایمانداری کے باوجود انہوں نے پاکستان میں تاریخ کی سب سے بڑی کرپٹ کلاس پیدا کی تھی، انہوں نے عمروں اور حج تک کو رشوت کی شکل دے دی تھی، وہ نظریہ ضرورت سے مغلوب ہو کر اپنے

جائزہ۔ سیاستدانوں کے مندرجاتوں سے بھر دیتے تھے۔ ان کے دور میں غیر مستحق لوگوں کو جتنے پلاٹ ملے اس کی تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ جنرل ضیاء الحق پہلے حکمران تھے جن کے دور میں ہیروئن کے سنگروں کی کلاس پیدا ہوئی جن کے دور میں سرکاری جہازوں میں ہیروئن سمگل ہوتی رہی اور ان کے پروردہ لوگ نعشوں کے بیڑوں اور حج کے احراموں میں ہیروئن رکھ کر سعودی عرب لے جاتے رہے۔ جناب وزیراعظم صاحب کی توجہ کے لیے عرض ہے سردار فاروق احمد لغاری ایک تہجد گزار صدر تھے، ان پر آج تک مالیاتی کرپشن کا کوئی الزام نہیں لگا لیکن انہوں نے اقتدار کے دوران کیا کیا؟ انہوں نے ذاتی عناد پر ایک منتخب حکومت کو کمر بھجوا دیا، کیا یہ کرپشن نہیں تھی؟ پاکستان کی بیوروکریسی کی تاریخ میں غلام اسحاق خان جیسا کوئی دوسرا ایماندار افسر نہیں گزارا لیکن انہوں نے کیا کیا انہوں نے اپنی انا کی تسکین کے لیے دو منتخب اسمبلیاں توڑ دیں، کیا یہ کرپشن نہیں؟ پیچھے رہ گئے ہمارے موجودہ صدر جنرل پرویز مشرف تو، ہمارے صدر معظم نے خود فرمایا تھا ”اگر نواز شریف مجھے نہ چھیڑتے تو وہ آج بھی وزیراعظم ہوتے“ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیجئے، کیا یہ کرپشن نہیں ایقین کیجئے صرف رشوت لینے والا شخص کرپٹ نہیں ہوتا بلکہ ہر وہ شخص جو اللہ کی دی ہوئی نعمت اور قابلیت سے پورا کام نہیں لیتا اور ہر وہ شخص جو اپنے اختیار کو دوسروں کی ناک تک وسیع کر دیتا ہے، جو اپنی ٹانگیں دوسرے کی چادر تک پھیلا دیتا ہے جو شور بے دالی پلیٹ میں بونیاں ڈال دیتا ہے اور ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی جینائی سے شیطان کی سوئی میں دھاگہ ڈالتا ہے وہ شخص بھی کرپٹ ہوتا ہے وہ شخص بھی بے ایمان ہوتا ہے لیکن افسوس ہم نے کرپشن کو صرف جو مال دولت اور نیب تک محدود کر دیا۔ افسوس ہماری نظر میں پیسے لے کر کام کرنے والا تو کرپٹ ہے لیکن وہ شخص جو دفتر آ کر کام نہیں کرتا اور جو دفتر کے اسے سی اور بیٹرس بیٹھ کر سارا سارا دن کھیاں مارتا ہے ہم اسے ایماندار سمجھتے ہیں



ایماندار

میں نے عرض کیا "سروہ بہت ایماندار افسر ہے" وہ مسکرائے اور نرم آواز میں بولے "کیا آپ پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں" میں نے عرض کیا "سروہ ایک پیسے کار و ادار نہیں، اس پر آج تک رشوت، لوٹ کھسوٹ، ہیرا پھیری اور خرد برد کا کوئی الزام نہیں لگا اور اس کے گھر میں صرف دو نوکر ہیں۔" انہوں نے قہقہہ لگایا اور ہنستی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگے: "ایمانداری کے معاملے میں ہماری اپرویج قطعی غلط ہے، ہم صرف اس شخص کو ایماندار سمجھتے ہیں جو روپے پیسے میں خرد برد نہ کرے، جو رشوت نہ لے، جو سرکاری فنڈز میں ہیرا پھیری نہ کرے اور جو مال نہ بنائے جبکہ ایمانداری ایک وسیع تر اصطلاح ہے۔ مالیاتی گڑبڑ اس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے ایمانداری اور بے ایمانی کے تقصین سے پہلے ہمیں بے شمار دوسری چیزیں دیکھنا پڑتی ہیں"

میرے لئے یہ فلسفہ اذو کما تھا، میں نے ان سے عرض کیا "جناب عالی ہم تو آج تک صرف اس شخص کو ایماندار سمجھتے آئے ہیں جو لین دین میں کھرا ہو، جو مالیاتی معاملات میں درست ہو لیکن آپ نے ہمارے اس تصور کی شکل ہی بدل دی" وہ مسکرائے اور مسکرا کر بولے "تم میرے چند سوالوں کا جواب دو" میں ہمدن گوش ہو گیا۔ وہ بولے "کیا وہ صاحب قانون بنا سکتے ہیں" میں نے ہاں میں سر ہلا دیا، وہ بولے "کیا وہ صاحب اس قانون پر عملدرآمد بھی کر سکتے ہیں" میں نے ہاں میں سر ہلا دیا، وہ بولے "کیا وہ صاحب لوگوں کو انصاف دلا سکتے ہیں، لوگوں کی تعلیم کا بندوبست کر سکتے ہیں اور لوگوں کو دوا، پانی اور اچھا ماحول دے سکتے ہیں" میں نے ہاں میں سر ہلا دیا، وہ بولے "کیا وہ صاحب معاشرتی انصاف قائم کر سکتے ہیں، وہ لوگوں کیلئے جاب کا بندوبست کر سکتے ہیں، وہ ملک سے دی آئی پی کلچر ختم کر سکتے ہیں، وہ ملک میں قطار کا نظام نافذ کر سکتے ہیں، کیا وہ میرٹ کو قطعی بنا سکتے ہیں اور کیا وہ مہنگائی کنٹرول کر سکتے ہیں" میں نے ہاں میں سر ہلا دیا، وہ بولے "کیا وہ اس ملک کے صدر یا وزیر اعظم ہیں" میں نے نفی میں سر ہلا کر عرض کیا "نہیں سروہ صدر، وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ نہیں ہیں لیکن وہ اقتدار کے اس کوریڈور میں ضرور موجود ہیں جہاں لوگوں کے مقدر کا فیصلہ ہوتا ہے، جہاں قوم کی سمت طے ہوتی ہے" انہوں نے قہقہہ لگایا اور اس قہقہے کے درمیان پوچھا "کیا ان صاحب نے اقتدار کے کوریڈور میں رہ کر وہ تمام کام کر دیے جن کی اللہ تعالیٰ

سے انڈین سلاجیت بخشی تھی، کیا انہوں نے لوگوں کو انصاف دے دیا، میرٹ قائم کر دیا، مہنگائی کنٹرول کی، وی آئی پی ہجرت کر دیا، کیا انہوں نے مریشوں کو دوا، شہریوں کو پانی اور نئی نسل کو صاف ماحول دے دیا، کیا انہوں نے ایتھے قوانین بنائے، کیا ان کے عہد میں لائینڈ آرڈر کی صورت حال بہتر ہوئی، کیا ان کے دور میں قتل، ڈاکے، چوریاں، ہیرا پھیری، لوٹ کھسوٹ اور فرادہ بند ہو گئے، کیا ان کے دور میں پولیس اور شہری انتظامیہ ٹھیک ہو گئی، کیا ان کے دور میں سرخ فیتہ ٹوٹ گیا، کیا ان کے اقتدار میں مسائل کی افسر تک رسائی آسان ہو گئی، کیا ان کے دور میں ملک سے بھکاری ختم ہو گئے اور کیا ان کی وجہ سے ملک میں امیر غریب کا فرق مٹ گیا؟ میں نے انکار میں سر ہلا دیا، وہ بولے "جب حالات جوں کے توں ہیں، جب دس سال پہلے اور آج کے پاکستان میں کوئی فرق نہیں، جب لوگ گارڈز کے بغیر گھروں سے نہیں نکلے، جب اخبارات جرم کی خبروں سے آلودہ ہیں اور جب عام شخص کیلئے اس ملک میں سانس لینا مشکل ہے تو پھر تم کس بنیاد پر انہیں ایماندار کہہ رہے ہو، میرے بچے ایمانداری کا تعلق صرف مال و دولت اور رشوت اور لوٹ کھسوٹ سے نہیں، اس کا تعلق صلاحیت اور اختیار کے استعمال سے ہوتا ہے، وہ حاکم جو ایک شہوار، ایک قمیض، ایک درمی اور بیس ہائی بارہ فٹ کے ایک کمرے میں پوری زندگی گزار دے لیکن اس کے اختیار، اس کے اقتدار سے کس شخص کو کوئی فائدہ نہ پہنچے، اس حاکم سے وہ چیز اسی ہزار روپے بہتر اور ایماندار ہے جو صاحب کے کمرے سے نکل کر سائیکلو کو خوش خبری سنا تا ہے، جس کے وجود، جس کے اختیار سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے"

میں خاموشی سے ان کی بات سن رہا تھا، وہ بولے "اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا 'اے نبی! یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں ہم اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں آپ ان سے فرما دیجئے جو ان کی ضرورت سے زائد ہو، اس آیت کا کیا مطلب ہے؟' وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے، میں نے عرض کیا "بھئی صمدتہ اور خیرات" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور فرمانے لگے "لیکن صمدتہ اور خیرات کا تعلق صرف مال اور دولت سے نہیں، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر صلاحیت، ہر انعام، ہر خوبی، ہر اختیار، ہر عہدہ اور ہر قسم کا اقتدار بھی اس دائرے میں آتا ہے اور ان کے سلسلے میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ اقتدار، اختیار، خوبی، انعام اور صلاحیت میں جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں تقسیم کر دے یقین کرو حشر کے دن ایمانداری کا تعین اسی تقسیم کی بنیاد پر ہوگا" میں نے پوچھا "مثلاً" وہ بولے "مثلاً جس ڈاکٹر کو اللہ تعالیٰ نے علاج کی سکت بخشی ہے لیکن وہ مریشوں کا علاج نہیں کرتا وہ ڈاکٹر بے ایمان ہے، جس جج کو اللہ نے عدل کا اختیار دے رکھا ہے لیکن وہ لوگوں سے انصاف نہیں کرتا وہ جج بے ایمان ہے، جس پولیس افسر کو اللہ نے جرم اور بے گناہی کے فیصلے کی اتھارٹی دے رکھی ہے لیکن وہ یہ اختیار استعمال نہیں کرتا وہ پولیس افسر بے ایمان ہے اور جس وافر کو اللہ نے اچھے نمائندے منتخب کرنے کا اختیار دے رکھا ہے لیکن وہ جان بوجھ کر ایک بد کردار اور بے ایمان سیاستدان کو منتخب کرتا ہے وہ وٹریگی بے ایمان ہے، جو کارسوار سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں کو راستہ نہیں دیتا، جو شخص اپنا گندھج سڑک پر پھینک جاتا ہے، جو استاد شاگردوں کو اپنا سارا علم ٹرانسفر نہیں کرتا، جو محقق غور سے پڑھے نہیں پڑھتا اور جولائین مین سمجھے بریوری تاریخیں لگا تا وہ لاکھوں، ملینوں، سو کروڑوں، سو کروڑوں کا۔"

سوار بھی بے ایمان ہے، میرے بچے اللہ نے ہمیں آنکھیں، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں، دل، دماغ اور پیپڑے دے رکھے ہیں جو لوگ اپنے ان اعضاء سے پورا کام نہیں لیتے، جو ان اعضاء کو لوگوں کی بھلائی میں صرف نہیں کرتے، وہ لوگ بھی بے ایمان ہیں، وہ لوگ بھی غاصب ہیں۔

وہ خاموش ہو گئے، میں نے عرض کیا "آپ کو اپنی زندگی میں کوئی ایماندار شخص ملا؟ انہوں نے مسکرا کر سر ہلا دیا" میں نے زندگی میں سندھ کے ایک ہندو کو بھتا دیانت دار پایا تھا مجھے آج تک اس جیسا کوئی دوسرا شخص نہیں ملا، بھٹو کے دور میں راشن ڈپو ہوتے تھے، لوگوں کو چینی اور آٹا ان ڈپوؤں سے ملتا تھا، اس ہندو کے پاس راشن ڈپو تھا، جب تک آٹے کی آخری ٹھی اور چینی کا آخری دانہ اس کے ڈپو میں رہتا تھا وہ اپنے ڈپو کا دروازہ بند نہیں کرتا تھا، اس کا کہنا تھا، یہ راشن لوگوں کی امانت ہے اور اگر وہ یہ امانت ادا کئے بغیر مر گیا تو وہ اپنے بھگوان کو کیا منہ دکھائے گا، میں نے پوری زندگی اس ہندو سے بڑا دیانت دار شخص نہیں دیکھا، تم بتاؤ کیا تمہاری زندگی میں بھی کوئی ایسا شخص ہے؟

میں نے ذرا سا سوچا اور پھر انکار میں سر ہلا دیا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

شاید ہم کبھی

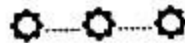
میں اور شاہ جی لندن میں چند دن اکٹھے رہے تھے شاہ جی کا تعلق حکمران کلاس سے تھا وہ تیسری نسل سے اس خطے کے بادشاہ چلے آ رہے ہیں ان کے دادا برطانوی دور میں وزیر تھے والد ایوب خان سے ذوالفقار علی بھٹو تک گورنر وزیر اعلیٰ اور سینئر وزیر رہے جبکہ شاہ جی بے نظیر بھٹو سے میر ظفر اللہ جمالی کی حکومت تک مختلف حیثیتوں سے اقتدار کے ایوانوں میں آتے جاتے رہے وہ اس وقت بھی جوڑ توڑ کے بادشاہ کہلاتے ہیں اور پنجاب کی دانتوں کی طرح سیاست کے پیٹ میں جھانکنے کا ملکہ رکھتے ہیں میری ان کے ساتھ پرانی یاد اللہ ہے آج سے تین سال پہلے ہم دونوں لندن گئے اس سفر کا مقصد گپ شپ اور چند دن عافیت میں گزارنا تھا ہم دونوں نے یہ دن سیر و تفریح اور لمبی لمبی بحثوں میں گزارے تھے ایک دن شاہ جی اور میں آکسفورڈ سٹریٹ میں گھوم رہے تھے شاہ جی اچانک میری طرف مڑے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا "یار کبھی ہم لوگ بھی گوروں کی طرح ترقی کر سکیں گے" میں نے سٹریٹ میں گھومتے پھرتے ہجوم کی طرف دیکھا اور ذرا دیر تک جواب دیا "شاہ جی شاید کبھی نہیں" شاہ جی کا دوسرا سوال تھا "کیوں" میں نے ہنس کر جواب دیا "اس کا جواب میں آپ کو پاکستان جا کر دوں گا" شاہ جی خاموش ہو گئے۔

ہم چند دن بعد پاکستان واپس آ گئے بات آئی گئی ہو گئی شاہ جی سیاست بازی میں مصروف ہو گئے اور میں اپنی محنت مزدوری میں لگ گیا ایک دن ایک سفارتی تقریب میں شاہ جی سے ملاقات ہو گئی شاہ جی کے پاس اس دن بہت وقت تھا لہذا ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئے ہمارے سامنے مختلف ایسی سیوں کے سفار کار پنچی آواز میں ایک دوسرے سے گپ شپ کر رہے تھے محفل میں سفارتی تکلف اور شائستگی تھی شاہ جی کو اچانک آکسفورڈ سٹریٹ یاد آ گئی اور وہ میری طرف مڑ کر بولے "میں نے تم سے لندن میں ایک سوال پوچھا تھا اور تم نے وعدہ کیا تھا تم اس کا جواب پاکستان میں دو گے" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ان سے عرض کیا "شاہ جی ہمارے ملک کی پسماندگی کی وجہ آپ لوگوں کے دوہرے معیار ہیں" شاہ جی نے مجھے گھور کر دیکھا میں نے عرض کیا "شاہ جی ہم لوگ جب لندن میں تھے تو آپ گوروں کی طرح زندگی گزار رہے تھے آپ قطار میں کھڑے ہوتے تھے لوگوں کو

مسکرا کر دیکھتے تھے دوسروں کیلئے دروازہ کھولتے تھے ہمارے فلیٹ میں کوئی ملازم نہیں تھا آپ میرے اور اپنے لئے ناشتہ خود بناتے تھے آپ نے 7 دن اپنے برتن بھی خود دھوئے تھے آپ اپنا سامان خود اٹھاتے تھے اور آپ ٹاکی اور کوٹ کے بغیر زندگی گزارتے تھے اور آپ اس وقت ایک عام مہذب اور پڑھے لکھے شخص کی طرح اٹھ بیٹھ رہے تھے لندن میں آپ کا رویہ مکمل طور پر ترقی یافتہ اور مہذب تھا "شاہ جی بڑے غور سے میری بات سنتے رہے میں نے عرض کیا " لیکن شاہ جی جوں ہی آپ اسلام آباد میں اترے آپ نے تہذیب اور شانگلی کا لہا وہ اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور آپ کے اندر سے نوآبادیاتی نظام کا ایک خالم اور اکڑ جاگیر دار باہر آ گیا " میں نے دیکھا آپ جوں ہی جہاز سے باہر آئے پروٹوکول کا ایک افسر آپ کا انتظار کر رہا تھا آپ نے پاسپورٹ اور سامان کے "ٹیک" اس کے حوالے کر دیئے "شاہ جی آپ نے دوسرے مسافروں کے ساتھ ایگریگیشن کی قطار تک میں کھڑا ہونا پسند نہیں کیا تھا " آپ وی آئی پی لائونج میں بیٹھ گئے اور آپ کا سامان کنسٹبل کپڑوں کے بنیر باہر آ گیا " شوفر نے آپ کیلئے گاڑی کا دروازہ کھولا آپ پچھلی نشست پر بیٹھے اور آپ نے سو بائبل پر اپنے عمل کو جہاز شروع کر دیا " شاہ جی میری بات سنتے رہے " میں نے عرض کیا " آپ لوگوں کی یہ سماجی منافقت اس ملک کی ترقی کے راستے کی واحد رکاوٹ ہے آپ لوگ باہر سے تہذیب شانگلی اور اخلاقی اقدار سیکھ کر آتے ہیں لیکن جوں ہی آپ کے قدم پاکستان کی زمین کو چھوتے ہیں تو آپ کے اندر کا جاگیر دار جاگ جاتا ہے آپ فوراً آقا بن جاتے ہیں اور آپ ساری شانگلی ساری تہذیب بھلا دیتے ہیں " شاہ جی خاموشی سے میری گفتگو سنتے رہے " میں نے عرض کیا " مجھے میاں نواز شریف نے جناب شوکت عزیز کے بارے میں ایک واقعہ سنایا تھا " مجھے میاں صاحب نے بتایا تھا 1998ء میں جب حکومت نے ایٹمی دھماکہ کیا اور اس کے رد عمل میں اقوام متحدہ نے پاکستان پر معاشی پابندیاں لگا لیں تو حکومت شدید دباؤ میں آگئی اس وقت دنیا بھر سے پاکستانی اسلام آباد آتے تھے اور ملک کو اس صورتحال سے نکلانے کیلئے نئی نئی معاشی تکنیک سمجھاتے تھے اور وہ ان کی باتیں غور سے سنتے تھے ایک دن جناب شوکت عزیز امریکہ سے پاکستان تشریف لائے اور لاہور کے گورنر ہاؤس میں ان کی نواز شریف سے ملاقات ہوئی شوکت عزیز نے نواز شریف کو بتایا پاکستان میں حکمرانوں اور عوام کے معیار میں بڑا فرق ہے پاکستان کے پچاس فیصد عوام خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں جبکہ حکمران سوسائٹیز کے ایوانوں میں عیش کر رہے ہیں جناب شوکت عزیز نے گورنر ہاؤس پر نظر ڈال کر میاں نواز شریف کو مشورہ دیا " میاں صاحب آپ یہ گورنر ہاؤس خالی کرادیں " آپ وزیراعظم ہاؤس اور ایوان صدر چھوڑ دیں اور یورپ کے حکمرانوں کی طرح دو دو تین تین بیڈروم کے فلیٹس میں شفٹ ہو جائیں اور اس کے بعد عوام سے محنت اور جدوجہد کی درخواست کریں " مجھے یقین ہے لوگ آپ کا ساتھ دیں گے اور ملک اس معاشی مشکل سے باہر آ جائے گا " میاں نواز شریف نے مجھے بتایا ان کو شوکت عزیز کی بات نے بہت اپیل کیا اور انہوں نے ان لائنوں پر سوچنا شروع کر دیا لیکن کسی عملی نتیجے سے پہلے ان کی حکومت ختم ہوگئی اور وہ مختلف قسم کے حالات سے گزرتے ہوئے جلاوطن ہو گئے ان کے بعد جناب شوکت عزیز پاکستان کے وزیراعظم

بنے اور انہوں نے اسی شاہانہ وزیراعظم ہاؤس میں رہنا شروع کر دیا مجھے نواز شریف نے بتایا جب شوکت عزیز صاحب سوائیکڑ کے وزیراعظم ہاؤس میں شفٹ ہوئے اور انہوں نے نواز شریف سے تین گنا پروٹوکول انجوائے کرنا شروع کیا تو وہ حیران رہ گئے نواز شریف نے بتایا ان کی خواہش ہے کہ کسی ان کی ملاقات شوکت عزیز صاحب سے ہو تو وہ ان سے پوچھیں "جناب اب آپ وزیراعظم ہاؤس کیوں نہیں چھوڑ دیتے" شاہ جی میری بات سنتے رہے میں نے عرض کیا "شاہ جی 2004ء کے رمضان میں مجھے وزیراعظم شوکت عزیز کے اظہارِ ذہن میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا ڈونر کے آخر میں جب سوال وجواب شروع ہوئے تو میں نے انہیں نواز شریف کا یہ پیغام پہنچا دیا وزیراعظم صاحب نے قہقہہ لگایا اور مسکرا کر جواب دیا "1998ء اور 2004ء کے حالات میں بڑا فرق ہے اس وقت ملک ڈیفالٹ کر رہا تھا جبکہ اب ہم نے خزانہ بھر دیا ہے" میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

میرے اور شاہ جی کے درمیان خاموشی کا طویل وقفہ حائل ہو گیا اس وقفے کے آخر میں شاہ جی نے کھنگار کر گلا صاف کیا اور غصے سے لرزتی آواز میں بولے "تمہارے اندر ڈل کلاس کا پکیٹس بول رہا ہے تم اشتراکی دور کی فلموں اور تاولوں سے باہر نہیں نکل سکتے" میں نے قہقہہ لگا کر عرض کیا "شاہ جی لندن اور پاکستان میں آخری فرق آپ کا یہ رد عمل ہے لندن میں آپ میری بڑی سے بڑی بدتمیزی کو اختلاف رائے سمجھ کر برداشت کر جاتے تھے لیکن یہاں اس ملک میں آپ میرے اختلاف رائے کو بھی بدتمیزی سمجھ رہے ہیں وہاں لندن میں آپ اور میں محض دو انسان تھے اور ہم دونوں نام اور ہنری کی طرح برابری کی سطح پر گفتگو کرتے تھے لیکن یہاں آپ اپر کلاس اور میں ڈل کلاس ہوں شاہ جی آپ لوگوں کی یہی وہ اخلاقی اور معاشرتی منافقت ہے جو اس ملک کو آگے نہیں بڑھنے دے رہی میں نے آپ لوگوں کی اس منافقت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ سے عرض کیا تھا شاید ہم کبھی گوروں جتنی ترقی نہ کر سکیں" شاہ جی اٹھے انہوں نے غصے سے میری طرف دیکھا اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔



سواتین دن میں

یہ جاوید ہاشمی کے آزادوں کی بات تھی۔ وہ اس وقت میاں نواز شریف کی کابینہ میں وفاقی وزیر صحت تھے۔ وہ شام کو مارگلہ کی پہاڑیوں میں واک کرتے تھے، میں بھی ان دنوں روزانہ مارگلہ کی پہاڑیوں میں جاتا تھا اور اکثر جاتے ہوئے اور بعض اوقات واپس آتے ہوئے ان کے ساتھ کراؤ ہو جاتا تھا، ہم چند منٹ گپ شپ کرتے تھے اور پھر اپنے اپنے راستے پر چل پڑتے تھے، ہم بعض اوقات اکٹھے واپس بھی چلے جاتے تھے، مجھے وہ دن تو یاد نہیں لیکن اس دن کی تمام یادیں ابھی تک مجھے یاد ہیں، اس دن ہماری گپ شپ ذرا سی لمبی ہو گئی تھی، میں نے گفتگو میں جاگیرداروں کو مسائل کی اصل جز قرار دے دیا تھا، میں نے ان سے عرض کیا تھا ”یہ آپ لوگ ہیں جن کی وجہ سے ملک آگے نہیں بڑھ رہا“ جاوید ہاشمی نے قہقہہ لگایا اور اپنے مخصوص سرائیکی لہجے میں بولے ”یار جاگیرداریاں تو کب سے ختم ہو چکی ہیں، ان کی جگہ اب بے شمار دوسری چیزیں لے چکی ہیں“ میں ان کی بات سنتا رہا، ہاشمی صاحب نے انکشاف کیا ”میں کئی نسلوں سے جاگیردار ہوں لیکن چند سال پہلے میں نے اسلام آباد میں ایک گھر خریدا، یہ گھر خریدنے کے لیے مجھے اپنی پانچ مربیعہ آبائی زمین بیچنا پڑی تھی“ یہ بات سنانے کے بعد جاوید ہاشمی نے مجھ سے پوچھا ”تم جانتے ہو وہ مکان کس کا تھا“ میں نے انکار میں سر ہلا دیا، ہاشمی صاحب بولے ”یہ مکان ایک ریٹائرڈ فیڈرل سیکرٹری کا تھا“ میں خاموشی سے سنتا رہا، وہ بولے ”سیکرٹری صاحب کو یہ پلاٹ سی ڈی اے نے ریٹائرمنٹ کے بعد 26 ہزار روپے میں الاٹ کیا تھا انہوں نے اس پلاٹ پر چند لاکھ روپے لگائے تھے اور کروڑوں روپے جیب میں ڈال کر اپنے دوسرے مکان میں شفٹ ہو گئے تھے“ ہاشمی صاحب بولے ”تم خود فیصلہ کرو کیا وہ جاگیردار برما ہے جسے ایک مکان خریدنے کے لیے اپنی ساری زمین بیچنا پڑی یا وہ فیڈرل سیکرٹری جو چند ہزار روپے لگا کر کروڑوں روپے کا مالک بن گیا، تم خود فیصلہ کرو کیا تو م اور ملک کے لیے میری خدمات زیادہ ہیں یا پھر اس سیکرٹری کی جس نے ٹھنڈے کمرے میں نوکری شروع کی اور ماتحتوں کی ہتھیلیوں پر بیٹھ کر تیس سال گزار دیئے“ وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔

میرے پاس ان کے اس سوال کا جواب نہیں تھا، جواب تو میرے پاس موجود حکومت کے اس اقدام کا بھی نہیں جس کے ذریعے ہمارے اسپورٹس وزیر اعظم شوکت عزیز نے 22 گریڈ کے 86 افسروں کو دو دو کروڑ

روپے کا مالک بنا دیا، یہ اقدام بھی اٹھایا وزیراعظم کی دوسری پالیسیوں کی طرح معیشت سے مہر پور ہوگا اور اس سے بھی پاکستان سے غربت ختم کرنے میں بڑی مدد ملے گی، وزیراعظم نے پچھلے ماہ 48 وفاقی سیکرٹریوں کو اسلام آباد کے ایک ہجے سیکرٹری 12 میں چھ چھ سو گز کے پلاٹ دینے کا اعلان کیا، یہ پلاٹ فیڈرل سیکرٹریوں کی اعلیٰ کارکردگی کے صلے میں دیے گئے، سیکرٹری حضرات کو ان پلاٹوں کے ساتھ میں فیصد اضافی تنخواہ اور تاحیات دو ملازم بھی ملیں گے، وزیراعظم کے اس اعلان کے فوراً بعد سرسری، منی، وزیراعظم نے اس سرسری کی منظوری دی اور نومبر کے شروع میں سیکرٹریوں کو پلاٹ الاٹ کر دیئے گئے، یہ خبر جب عام ہوئی تو مختلف صوبوں میں کام کرنے والے 22 گریڈ کے دوسرے افسروں نے سپریم کورٹ سے رجوع کی دھمکی دے دی، سیکرٹریوں نے وزیراعظم صاحب سے رابطہ کیا اور وزیراعظم نے محروم رہ جانے والے ان 38 افسروں کو بھی پلاٹ دے دیئے، ان افسروں میں 9 ایسے افسر بھی شامل تھے جو ریٹائرمنٹ کے بعد کنٹریکٹ پر دوبارہ بھرتی ہوئے تھے، یہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا فیصلہ تھا جس پر ریکارڈ تیزی سے عملدرآمد ہوا، یہ سارا عمل محض سات تین دنوں میں مکمل ہو گیا اور 86 سیکرٹری اور چیف سیکرٹری دو ڈوڈا اڑھائی اڑھائی کروڑ روپے کے مالک بن گئے، یہ موجودہ حکومت کا ایک شاہکار فیصلہ تھا، اس فیصلے کے مطابق یہ پلاٹ ان تمام پلاٹوں کے علاوہ ہوں گے جو سیکرٹری حضرات مختلف اوقات میں فیڈرل گورنمنٹ ایمپلائز ہاؤسنگ سکیم کے تحت لیتے رہے ہیں اور یہ پلاٹ خالصتاً وزیراعظم صاحب نے سیکرٹریوں کی کارکردگی سے متاثر ہو کر عطا کیے گئے تھے۔

اگر ہم اپنے موجودہ سیکرٹریوں کا ٹریک ریکارڈ دیکھیں تو یہ سیکرٹریوں کا تیسرا اور چوتھا پلاٹ ہے، اسلام آباد میں پچھلے تیس برس سے فیڈرل گورنمنٹ ایمپلائز ہاؤسنگ سکیم کام کر رہی ہے، یہ سکیم ہر سیکٹر میں سرکاری ملازموں کو پلاٹ دیتی ہے اور ہمارے تمام سینئر افسر اس سکیم کے ذریعے پلاٹ لے چکے ہیں۔ حکومت نے ان لوگوں کو آئی ایٹ سیکٹر میں تین تین لاکھ روپے میں پلاس دیئے تھے، سیکرٹریوں نے یہ پلاٹ آسان قسطوں پر حاصل کیے تھے اور آج ان پلاس کی مالیت دو دو کروڑ روپے ہے۔ اس کے علاوہ وفاق کی تمام وزارتوں اور ڈویژنوں کی اپنی اپنی ہاؤسنگ سکیمیں بھی ہیں، ہمارے تمام سیکرٹری ان ہاؤسنگ سکیموں میں بھی پلاٹ لے چکے ہیں، ہمارے فیڈرل سیکرٹریوں کی اکثریت کا تعلق "ڈی ایم جی" سے ہے، یہ لوگ زندگی میں بے شمار خصلوں اور ڈویژنوں میں ڈپٹی کمشنر اور کمشنر رہ چکے ہیں اور انہوں نے اپنے اپنے دور میں وہاں بے شمار ہاؤسنگ سکیمیں بھی بنوائی تھیں، انہوں نے ان سکیموں میں بھی پلاٹ لئے تھے، ہمارے ایک سیکرٹری صاحب نے جب ترقی پائی تھی تو ملک کے نامور کالم نگار جناب اجمل نیازی نے انکشاف کیا تھا "یہ صاحب 64 پلاٹوں کے مالک ہیں" سیکرٹری صاحب نے قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی لیکن جب اجمل نیازی نے اپنے نیازی ہونے کا ثبوت دیا تو وہ خاموش ہو گئے، یہ صاحب بھی حکومت کی اس نوازش سے استفادہ کرنے والوں لوگوں میں شامل ہیں اور اس نئے پلاٹ کے بعد وہ اب 65 پلاٹوں کے مالک بن چکے ہیں، ہمارے سیکرٹریوں میں بے شمار ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو پانچ سے دس برس بیرون ملک ملازمت "کٹ" کرتے ہیں، یہ لوگ بیرون ملک ڈالروں اور پائونڈوں میں چھٹو لیتے رہے تھے اور وہاں

سے کروڑ پتی ہو کر واپس آئے تھے لہذا اگر ان لوگوں کے اثاثوں کی پڑتال کی جائے، اگر ان کے اکاؤنٹس چیک کیے جائیں یا ان کے پلائوں کی تفصیل جمع کی جائے تو یہ لوگ ارب پتی ہوں گے لہذا امیر ادعوئی ہے ہمارے اکثر سیکرٹریوں کے پاس برادرم ہمایوں اختر عبدالرحمن اور ہمارے امیر ترین وزیر خارجہ جناب خورشید محمود قسوری سے زیادہ دولت ہے چنانچہ پھر ایسے مختصر حضرات کی دولت میں بیک جنٹس قلم دروازہ حالی کروڑ روپے کا اضافہ فرمادینا کہاں کی سٹکی ہے۔

ہمارے محبوب وزیر اعظم نے سیکرٹریوں کو پلاٹ پیش کرتے ہوئے بڑی خوبصورت دلیل دی تھی، میں پچھلے کئی دنوں سے ان کی اس دلیل کے نئے نئے جھٹلا ہوں وزیر اعظم نے فرمایا "ہم نے یہ پلاٹ اپنی فینسی کی بنیاد پر الاٹ کئے ہیں" میں نے جب سے یہ بیان پڑھا ہے میں اپنی فینسی کے لفظ سے لطف اندوز ہو رہا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے اگر ہم ان کروڑ پتی سیکرٹریوں کی پانچ سال کی کارکردگی دیکھیں گے تو ہمیں ان کی پرفارمنس شیٹس میں ایک بھی ایسی فائل نہیں ملے گی جس پر انہوں نے وزیر اعظم، صدر، وزیر اعلیٰ، گورنر یا وزیر کے احکامات سے اختلاف کیا ہوگا لہذا اگر وزیر وزیر اعلیٰ، گورنر، وزیر اعظم اور صدر صاحب کے احکامات سے اتفاق کرنا اپنی فینسی ہے تو یہ لوگ اس میں واقعی باکمال اور ہنرمند ہیں اور ان کی "اپنی فینسی" کا گراف حقیقتاً اس حد کو چھو رہا ہے جس کے صلے میں اگر انہیں اسلام آباد کا ایک پورا سیکٹر الاٹ کر دیا جائے تو بھی ان کا حق نمک ادا نہیں ہوتا، ویسے بھی ان لوگوں نے وزیر اعظم کی اس سہری پر سواتین دنوں میں مملکت آباد کر کے اپنی اپنی فینسی کا ثبوت دے دیا لہذا یہ لوگ اس انعام کے پورے پورے حق دار ہیں، ہم خوش قسمتی سے ایک ایسے اسلامی ملک میں رہ رہے ہیں جس میں حاکم وقت زمین پر اللہ کا نائب ہوتا ہے اور جو انہیں اس کی بیعت میں دوسروں سے سبقت لے جاتا ہے صرف وہی اپنی فینسی کے معیار پر پورا اترتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں جو لوگ ضابطوں اور اصولوں کو اپنا مقصد حیات بنا لیتے ہیں اس ملک میں ان کی حیثیت فقیر کے گیلے چھتروں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ لوگ حقیقتاً معاملہ فہم اور بوجھ دار ہیں یہ جانتے ہیں حکومت حضرت موسیٰ کی ہو یا فرعون کی ان کا کام بس "اپنی فینسی" ہے انہوں نے بس حاکم وقت کو خوش رکھنا ہے وہ صبح کھدے تو صبح ہے اور اگر وہ شام کھدے تو بس شام ہے باقی سب کچھ اس ہے یہ لوگ واقعی بڑے "اپنی فینسی" اور کارگر ہوتے ہیں بس ان میں ایک خامی ہوتی ہے یہ کسی کے نہیں ہوتے" میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا بیٹو صاحب جن لوگوں کی "اپنی فینسی" کی تعریف کیا کرتے تھے وہی لوگ بعد ازاں نہ صرف جنرل ضیاء الحق کے مقرب افسروں میں شامل ہوئے بلکہ انہی نے بیٹو صاحب کے "ڈیڑھ وارنٹ" پر دھتلا بھی کئے "میں ادعوئی ہے کہتا ہوں جو لوگ آج "اپنی فینسی" کی بنیاد پر جناب شوکت عزیز سے پلاٹ لے رہے ہیں اگر خدا نخواستہ ان لوگوں کو سن موہن سنگھ کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا تو یہ ان سے بھی ایک دو پلاٹ اٹھ لیں گے یہ انہیں بھی اپنی اپنی فینسی سے متاثر کر لیں گے۔



علیحدگی کی وجہ

اس کا کہنا تھا "یہ جدائی ہمارے لئے اچھی تھی، ہم نے الگ ہو کر ہر شعبے میں ترقی کی اور ہم بڑی تیزی سے پسماندہ ممالک کی فہرست سے نکل کر ترقی پذیر قوموں میں شامل ہو رہے ہیں" وہ سانس لینے کے لئے رکا، ہمارے سامنے "ڈیم سکوئرز" کی رونق تھی، ایمسٹرزڈیم سیاحوں سے لہالب بھرا تھا، لوگ دھوپ سینک رہے تھے، تصویریں کھینچ رہے تھے اور ٹرام کے پیچھے بھاگ رہے تھے جبکہ ہم دونوں ریسٹوران کے شیشے سے ایمسٹرزڈیم کی نال اور کینال میں ڈولتی بھانجی موٹر بوس دیکھ رہے تھے۔ وہ بگلہ دیش کا صحافی تھا، اس کا نام مظہر السلام تھا اور ہم دونوں چند دن کے لئے ایمسٹرزڈیم میں اکٹھے ہو گئے تھے، میں پاکستان سے میر کے لئے گیا تھا اور وہ پن چکیوں پر تحقیق کے لئے ہالینڈ پہنچا تھا، میں نے ہالینڈ کے محکمہ سیاحت سے "پے ایگ گیسٹ" کیلئے درخواست کی اور گیسٹ ریڈنگ افسر نے مجھے مظہر السلام کا ٹیلی فون نمبر دے دیا، مظہر ڈیم سکوئرز کے قریب ایک سٹوڈیو فلیٹ میں رہ رہا تھا، فلیٹ کا کرایہ زیادہ تھا لہذا اسے کسی ایسے مسلمان سیاح کی تلاش تھی جو اس کے ساتھ فلیٹ اور کچن شیئر کر سکے ہوں، میں اس کے پاس پہنچ گیا اور ہم دونوں کی دوستی ہو گئی، وہ سارا دن پن چکیوں کے جنگل میں گھومتا رہتا تھا اور میں کبھی ڈیلیف چلا جاتا تھا، کبھی بیک، کبھی اوٹرش اور کبھی ڈیم سکوئرز کے سینکڑوں ہزاروں سیاحوں میں گم ہو جاتا تھا، وہ شام کو واپس آتا تو ہم چرسیوں کے قبوہ خانوں میں جھانکنا شروع کر دیتے، وہ بھی میری طرح مسگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن اسے چرسی دیکھنے کا بہت شوق تھا، وہ جب کسی حینہ کو چرس کے نشے میں دھت دیکھتا تھا تو اس پر ایک عجیب سرشاری سی طاری ہو جاتی تھی اور وہ گردن ہلا کر کہتا تھا "یہ ہوئی نہ بات، شمالی اب آسمان پر گھوم رہی ہے۔"

یہ 14 اگست کی بات تھی، میں نے اسے جلدی بلایا اور ہم دونوں ریسٹوران کی تیسری منزل سے ایمسٹرزڈیم میں جھانکنے لگے، میں نے اس سے اچانک پوچھا "یار مظہر السلام اگر بگلہ دیش پاکستان کا حصہ ہوتا تو آج تم بھی میرے ساتھ آزادی منارہے ہوتے، آج ہم دونوں بہت خوش ہوتے،" اس نے گرم کافی کا لمبا سا گھونٹ بھرا اور مسکرا کر بولا "لیکن شاید ہم دونوں بیک وقت خوش نہ ہوتے، ہم بنگالی آپ لوگوں کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے تھے، ہماری ثقافت، ہماری سوچ اور ہماری ذہنیت میں بڑا فرق تھا، ہم دونوں نے کبھی نہ کبھی الگ ہونا

ہی تھا" میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا وہ بولا "مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں روایات اور ثقافت کا بہت فرق تھا" آپ پر "لیوڈل لارڈز" حاوی تھے آپ کے کلچر میں ایک وڈیا "سردار یا چودھری ہوتا ہے اور باقی سب کی "کین اور ہاری" آپ کا وڈیا تمام ہاریوں اور کیوں پر حکومت کرتا ہے یہ کلچر جب دیہات سے نکل کر شہروں میں داخل ہوتا ہے تو وہاں بیوروکریٹ سیاستدان اور جرنیل وڈیرے بن جاتے ہیں اور عوام ہاری "کین اور کئی" آپ لوگ اس کلچر میں پر دان چڑھے تھے" آپ لوگ دو طبقوں میں بھی تقسیم تھے "ظالم یا مظلوم" آپ کے مظلوم پوری زندگی ظالم کلاس میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ظالم اپنی پوزیشن برقرار رکھنے کی سعی کرتے رہتے ہیں جبکہ ہم لوگ پچھرا کلاس کے لوگ ہیں "پچھرے آزاد مشن ہوتے ہیں" یہ زندگی بھر سردار بنتے ہیں اور نہ ہی کسی کی سرداری قبول کرتے ہیں" یہ آزاد رہتے ہیں اور دوسروں کو آزاد رکھتے ہیں" یہ لوگ ٹیم ورک کے عادی ہوتے ہیں ان میں سے ہر شخص اپنا رول متعین کر لیتا ہے اور اس کے بعد چپ چاپ کام کرتا رہتا ہے ہمارے ہاں اگر کوئی شخص ایک بار چھوٹا ہمارے لئے تو وہ زندگی بھر چھوٹے نہیں رکھتا ہمارے معاشرے میں کوئی کسی کا ہاس نہیں ہوتا" سب مل کر کوشش کرتے ہیں اور آخر میں نتائج آپس میں بانٹ لیتے ہیں ہمارے برعکس آپ لوگوں کو ہر وقت ایک لیڈر ایک جاگیر دار ایک جرنیل اور ایک ڈیکٹری ضرورت ہوتی ہے آپ لوگ ڈیکٹری کے بغیر ترقی نہیں کر سکتے جبکہ ہم لوگ ڈیکٹری کے ساتھ ترقی نہیں کر سکتے" آپ اور ہمارے درمیان یہ بہت بڑا فرق تھا"۔

وہ بولتا رہا اور میں منتارہا "اس نے بتایا" آپ لوگ دہاتوں سے ہماری آزاد منش فطرت کا اندازہ لگا لیجئے۔ ہندوستان کی تاریخ میں کوئی فاتح، کوئی طالع آرزو ہمیں زیادہ دیر تک غلام نہیں رکھ سکا۔ جو بھی جرنیل بنگال پہنچا وہ بالآخر وہاں سے پسا ہوا۔ مغل بنگال آئے لیکن انہیں بنگال چھوڑنا پڑا۔ انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی بنگالی رجسٹ نے شروع کی، وائسرائے کی گاڑی پر پہلا حملہ بنگالیوں نے کیا، ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ دو بڑی سیاسی جماعتیں ہیں۔ ان دونوں سیاسی جماعتوں نے بنگال میں جنم لیا اور انگریزوں نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کیا لیکن بنگالیوں نے انگریزوں کو یہ فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر دیا وغیرہ۔ ہم حقیقتاً آزاد لوگ ہیں، ہم کسی جرنیل، کسی جاگیر دار اور کسی وڈیرے کو برداشت نہیں کرتے۔" وہ رکھا، اس نے سانس لیا اور اس کے بعد بولا "آپ ظلم کرنے اور ظلم سہنے کے عادی ہیں لیکن ہم لوگ ظلم کرتے ہیں اور نہ ہی ظلم سہتے ہیں چنانچہ ہم لوگ آپ سے الگ ہو گئے، ہمیں اس جدائی کا فائدہ ہوا، ہم نے پچھلے 35 برسوں میں ہر شعبے میں ترقی کی، ہم نے فوج اور سیاست کو الگ کر دیا۔ ہمارے سیاستدانوں کے درمیان یہ اتفاق ہو چکا ہے۔ بنگلہ دیش میں حالات جیسے بھی ہوں وہ فوج کو اقتدار میں نہیں آنے دیں گے۔ ہم نے فوج کا سائز چھوٹا کر دیا اس وقت پوری اسلامی دنیا میں بنگلہ دیش کا فوجی بجٹ سب سے کم ہے۔ ہماری کرنسی پاکستان کے مقابلے میں مضبوط ہے۔ ہمارا کیونٹیکیشن نیٹ روک پاکستان سے بڑا اور مضبوط ہے۔ ہمارے تمام دیہات میں سڑکیں، بجلی، سکول، ہسپتال اور ٹیلی فون موجود ہیں۔ ہم بڑی تیزی سے درآمدی ملک سے درآمدی ملک بن رہے ہیں، ہم ہر سال پاکستان کے مقابلے میں

چالیس گنا زیادہ گارمنٹس برآمد کرتے ہیں، ہم نے گرامین بینک بنایا، یہ بینک اب تک دو کروڑ بنگالیوں کا مقدر بدل چکا ہے۔ یہ دنیا کا پہلا بینک ہے جو کسی پسماندہ ملک سے ترقی یافتہ ممالک میں ایکسپورٹ ہوا۔ دنیا کے 68 ممالک نے اپنے شہروں میں گرامین بینک کے ماڈل کو کاپی کیا۔ منگول (او آرائس) بنگلہ دیش کی ایجاد ہے۔ ہماری یہ ایجاد اس وقت پوری دنیا میں استعمال ہو رہی ہے۔ ہماری ایک "این جی او" بریک نے بنگلہ دیش کی آخری سرحد تک سکول کھول دیئے۔ ہم لوگ تعلیم میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں، ہمارے تمام دیہات میں ڈاکٹر اور ڈسپنسریاں موجود ہیں۔ ہماری یونیورسٹیاں، کالج اور سکول سال میں تین سو دن کھلتے ہیں اور بنگلہ دیش کا شمار دنیا کے ان دس ممالک میں ہوتا ہے جن کی طرف ملٹی نیشنل کمپنیاں تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ آج حالت یہ ہے آپ کا "نارو" گاڑیوں کا ٹریڈنگ سٹم بناتا ہے لیکن یہ ٹریڈنگ سٹم پاکستان سے پہلے بنگلہ دیش میں نصب ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش دنیا کا واحد اسلامی ملک ہے جس میں شیعہ اور سنی کی لڑائی نہیں، جس میں دہشت گردی نہیں ہو رہی اور جس میں خود کش حملہ آور پیدا نہیں ہو رہے، ہمارے بازار بھی آباد ہیں اور تعلیمی ادارے بھی جبکہ آپ لوگ 2005-06ء میں بھی انہی مسائل کا فکار ہیں جن میں آپ 1947ء میں مبتلا تھے۔ آپ سے جدائی کا دکھ ہمیں بھی ہوا تھا۔ آج بھی بنگلہ دیش کے ایسے ہزاروں لاکھوں لوگوں کی گھڑیاں پاکستانی وقت بتاتی ہیں لیکن اگر ان لوگوں کو بھی پاکستان میں شامل ہونے کا موقع دیا جائے تو شاید یہ لوگ بنگلہ دیش چھوڑنا پسند نہ کریں؟ کیونکہ یہ لوگ پاکستان سے محبت کرتے ہیں، پاکستان کے لارڈز اور ڈیکٹیٹروں سے نہیں "دوہرا اور لہسا سانس بھر کر بولا" ہم لوگوں نے 1971ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم ڈیکٹیٹروں کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے، ہم نے جب 1971ء میں آپ کو چھوڑا تھا تو اس وقت پاکستان میں ایک ہاورڈی جرنیل کی حکومت تھی، آج 35 برس بعد بھی آپ کے ملک میں یونیفارم حکومت کر رہی ہے، میں آج یہاں ایسٹریڈیم میں بیٹھ کر دعویٰ کرتا ہوں، بنگلہ دیش میں کبھی مارشل لا نہیں لگے گا لیکن کیا تم یہ دعویٰ کر سکتے ہو "میں خاموش رہا، وہ بولا "تمہاری یہ چپ ہماری علیحدگی کی وجہ تھی، ہم بول پڑتے تھے لیکن تم لوگ خاموش رہتے تھے اور خاموش رہتے ہو، ہم اس وقت بھی تم لوگوں سے آگے تھے اور ہم لوگ آج بھی تم سے آگے ہیں"۔



کیا پوری اسلامی دنیا میں

رانا خاندان 1965ء میں برطانیہ منتقل ہوا، وہ لوگ اپنے بچوں کو بہتر اور خوشحال مستقبل دینا چاہتے تھے رانا سجاد کی عمر اس وقت پانچ سال تھی یہ لوگ سکاٹ لینڈ کے شہر گلاسگو میں اقامت پذیر ہو گئے رانا سجاد کو مقامی سکول میں داخل کر دیا گیا رانا صاحب نے کالج تک تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد ذاتی کاروبار شروع کر دیا 1984ء میں ان کی ملاقات لوئیس کیمپبل سے ہوئی لوئیس ایک سولہ سالہ خوبصورت سکاٹس لڑکی تھی لوئیس رانا سجاد کی محبت میں گرفتار ہوئی اس نے اپنا مذہب اور گھریلو چھوڑا مسلمان ہوئی اور دونوں نے شادی کرنی اللہ تعالیٰ نے انہیں چار بچوں سے نوازا سب سے بڑا بیٹا عمر تھا، عمر 1986ء میں پیدا ہوا 1988ء میں تیسرے پیدا ہوئی آدم 1990ء میں پیدا ہوا اور 1994ء میں مصباح ارم نے آنکھ کھولی۔ مصباح ارم اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔

2000ء میں لوئیس اور رانا سجاد کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے لوئیس مسلمان ہونے کے باوجود اسلامی تعلیمات پر عمل نہیں کر رہی تھی جبکہ رانا سجاد تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہو رہا تھا یہ اختلاف بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ لوئیس نے گھر چھوڑ دیا اور وہ اپنے ایک کزن کینی کیمپبل کے ساتھ رہنے لگی کینی مغربی معاشرے کا نمائندہ شخص تھا اس میں وہ سارے عیب موجود تھے جسے ہم عیب کہتے اور عیب سمجھتے ہیں لوئیس کینی کی گرل فرینڈ بن گئی لہذا رانا سجاد نے 2001ء میں لوئیس کو طلاق دے دی لوئیس نے بیچے رانا سجاد کے پاس چھوڑ دیئے اس وقت مصباح کی عمر صرف سات سال تھی رانا سجاد اکثر سفر پر رہتا تھا لیکن وہ جہاں بھی جاتا تھا اپنے بچوں کو ساتھ رکھتا تھا بیچے اس دوران والد کے بہت قریب آ گئے رانا سجاد نے 2002ء میں مستقل طور پر پاکستان شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا بیچے بھی اس کے ساتھ پاکستان آ گئے یہ لوگ لاہور میں رہنے لگے چند ماہ بعد جہنہ اور آدم نے مستقل طور پر لاہور میں رہنے کا فیصلہ کیا جبکہ بڑا بیٹا عمر تعلیم مکمل کرنے کے لئے واپس گلاسگو چلا گیا مصباح کی عمر اس وقت آٹھ برس تھی اور برطانوی قانون کے مطابق اسے اپنی ماں کے پاس واپس جانا تھا لہذا مصباح اپنی ماں کے پاس سکاٹ لینڈ چلی گئی لوئیس اپنے بوائے فرینڈ اور مصباح کے ساتھ گلاسگو سے شیردر (Stranraer) شفٹ ہو گئی۔ لوئیس کثرت شراب نوشی اور نشیات کی عادی ہو چکی تھی وہ نشے کے عالم میں مصباح پر تشدد کرتی تھی

مصباح رانا سجاد کے ساتھ رہ کر عبادت کی عادی ہو چکی تھی وہ نماز پڑھنا چاہتی تھی لیکن لوئیس اور اس کا بوائے فرینڈ اسے نماز سے روکتے تھے وہ اسے حرام گوشت کھانے اور شراب پینے پر بھی مجبور کرتے تھے ان لوگوں نے اس کا نام بھی بدل دیا تھا وہ اسے مصباح کی بجائے مولیٰ جلاتے تھے مصباح اس ماحول میں شدید ٹھنڈ کا شکار ہو گئی۔ مصباح کا اپنے بھائیوں اور بہن تھینڈ کے ساتھ رابطہ تھا وہ انہیں اپنے اوپر ہونے والے مظالم کے بارے میں بتاتی رہتی تھی بچے یہ باتیں اپنے والد کو بتادیتے تھے چنانچہ رانا سجاد نے اپنی بیٹی کو پاکستان لانے کا فیصلہ کیا رانا سجاد اور تھینڈ اگست 2006ء میں سکاٹ لینڈ گئے تھینڈ مصباح کے سکول گئی اور اسے لے کر والد کے پاس ہوئی آگئی یہ لوگ Stranraer سے گلا سکو آئے اور اسی روز گلاسکو سے پاکستان آ گئے لوئیس نے جب مصباح کو قابض پایا تو اس نے فوراً پولیس اسٹیشن میں رپٹ لکھوادی لوئیس کا کہنا تھا اس کے سابق خاندان نے اس کی نابالغ بیٹی کو اغوا کر لیا ہے اور وہ اسے پاکستان لے جا کر کسی بوڑھے کے ساتھ بیاہ دے گا برطانوی میڈیا نے اس خبر کو ایسا ہی بنا دیا اور لوئیس 24 گھنٹے ٹیلی ویژن سکرین پر دکھائی دیے گئے وہ سکاٹ لینڈ کے اخبارات کی "یڈ سٹوری" بھی بن گئی یہ معاملہ فوراً انٹرپول کے پاس گیا اور انٹرپول نے حکومت پاکستان کو مطلع کر دیا گلاسکو کے ایم پی اور پاکستانی برطانوی سیاستدان چودھری سرور نے مداخلت کی وہ پاکستان آ گئے۔

چودھری سرور 28 اگست کو مصباح سے ملے انہوں نے ملاقات کے بعد میڈیا کو بتایا "مصباح اپنی مرضی سے پاکستان آئی ہے اور اس پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں تھا" دو دن بعد رانا سجاد نے پریس کانفرنس کی اور مصباح کو میڈیا کے سامنے بٹھا دیا مصباح نے پوری دنیا کے میڈیا کو بتایا وہ اپنی والدہ اور اس کے بوائے فرینڈ کے ساتھ خوش نہیں تھی وہ اپنی مرضی سے والد کے پاس آئی ہے اور وہ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ پاکستان رہنا چاہتی ہے اسی دوران لوئیس کے وکیل نے سکاٹ لینڈ حکومت کو مصباح کی تحویل کی درخواست دے دی وکیل نے 2003ء میں برطانیہ اور پاکستان کے درمیان ہونے والے سمجھوتے کو جواز بنایا سکاٹ لینڈ نے حکومت پاکستان کو لکھ دیا اور حکومت رانا سجاد پر دباؤ ڈالنے لگی رانا سجاد نے مصباح کی تحویل کیلئے لاہور ہائی کورٹ میں رٹ کر دی ہائی کورٹ نے 2 ستمبر 2006ء کو مصباح کو رانا سجاد کی عارضی تحویل میں دے دیا لیکن مصباح کا پاسپورٹ جمع کر لیا گیا اور اسے عدالت کی حدود میں رہنے کا حکم دے دیا گیا ستمبر میں مصباح ازم کا کس قومی اور عالمی شکل اختیار کر گیا تمام پاکستانی اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینلوں پر مصباح کی خبریں اور انٹرویوز چلنے لگے لوئیس نے پاکستان میں کس لڑنے کا فیصلہ کر لیا اس کے بعد عدالتی جنگ شروع ہو گئی رانا سجاد 29 ستمبر کو یہ جنگ ہار گیا ہائی کورٹ نے مصباح کو 7 دن کے اندر برٹش ہائی کمیشن کے حوالے کرنے کا حکم دے دیا رانا سجاد نے فیڈرل شریعت کورٹ میں اپیل کر دی اسی دوران چیف جسٹس آف پاکستان نے ذاتی دلچسپی لی اور مقدمہ سپریم کورٹ میں چلا گیا سپریم کورٹ کا نفل بیج تشکیل پایا اور کس کی سماعت شروع ہو گئی لیکن فیصلے سے پہلے لوئیس کی وکیل ناہیدہ محبوب الہی نے "آؤٹ آف کورٹ" سمجھوتے کا عندیہ دے دیا جس کے بعد لوئیس اور رانا سجاد کے درمیان حاربنا سمجھوتہ

پا گیا۔ یوں مصباح کو پاکستان میں رہنے کی اجازت مل گئی، میں نے دس جنوری 2007ء کو مصباح کو خوشی سے روٹے اور اپنے والد کے گلے لگتے دیکھا تو مجھے بہت خوشی ہوئی، یہ پاکستان کے ساتھ ساتھ اسلامی ثقافت کی بھی فتح تھی، مصباح ہماری اخلاقی برتری ثابت ہوئی تھی لیکن پھر 8 فروری کا دن آ گیا، اس دن نے مجھ سمیت بے شمار پاکستانیوں کا دل دہلا دیا۔

چھ فروری 2007ء کو پاکستانی اخبارات میں مصباح ارم کے حوالے سے ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی ”پاکستانی نژاد سائنس دان سائنس دان مصباح ارم کا نوٹ سکول میں داخلہ لے گی“ یہ خبر بین الاقوامی نیوز ایجنسی اے ایف پی نے جاری کی تھی اور یہ پاکستان سمیت دنیا کے تمام اخبارات میں شائع ہوئی تھی، نیوز ایجنسی نے اس خبر میں دعویٰ کیا ”مصباح ارم کے والد سجاد احمد رانا نے بتایا، وہ کسی اچھے سکول کے متلاشی تھے جس پر ان کے دوستوں نے انہیں مشورہ دیا وہ مصباح کو کیتھولک سکول میں داخل کرادیں کیونکہ وہاں کا تعلیمی معیار اور نظم و ضبط شاندار ہے“ ایجنسی نے دعویٰ کیا ”مصباح ارم کے والد کا کہنا ہے، وہ اپنی بیٹی کو کیتھولک سکول میں بھجوانے کے معاملے میں متعصب نہیں ہیں“ میں نے جب یہ خبر پڑھی تو میرا سر شرم سے جھک گیا اور میں نے سوچا کیا ہم لوگ مصباح جیسی بیٹی کو پاکستان میں ایک معیاری تعلیمی ادارہ بھی فراہم نہیں کر سکتے، وہ بیٹی جو اسلام کی محبت میں سکاٹ لینڈ کی تہذیب چھوڑ کر آئی تھی کیا ہم اس بیٹی کو معیار کے نام پر ایک بار پھر کیتھولک تہذیب میں دھکیل دیں گے، میں نے سوچا، اس ملک میں ایک ہزار کے قریب ارب بچی ہیں، کیا یہ ارب بچی لوگ پاکستان میں کاؤنٹ معیار کا ایک اسلامی سکول بھی قائم نہیں کر سکتے؟ میں نے سوچا، وہ کون لوگ تھے جنہوں نے پوری دنیا میں کاؤنٹ جیسے تعلیمی ادارے قائم کئے اور بچے عالمی معیار کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور کیا ایک ارب 55 کروڑ مسلمانوں میں کوئی ایک بھی ایسا مسلمان نہیں جو اسلامی ممالک میں اسلامی کاؤنٹ سکول بنا سکے، جو 58 اسلامی اور 109 عیسائی ممالک میں مدینہ سکول، مکہ سکول یا اسلامک ایجوکیشنل سکول بنا سکے اور یہ سکول معیار اور نظم و ضبط میں ہارورڈ یونیورسٹی، کیمرج سکول اور کاؤنٹ کا مقابلہ کر سکیں، میں نے سوچا مصباح کا امتحان دس جنوری کو ختم ہو گیا لیکن ہمارا امتحان فروری سے شروع ہوا اور یہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔



دل کے ارب پتی

خاور نقوی صاحب میرے ایک مہربان ہیں۔ خاور صاحب نے پچھلے دنوں میانوالی کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک ہیڈ ماسٹر کا ذکر کیا یہ ہیڈ ماسٹر صاحب سادات سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے اپنے اخلاص، محبت اور محنت سے پورے علاقے کی تقدیر بدل دی انہوں نے اس گاؤں میں علم اور تعلیم کی ایک ایسی کھیتی تیار کی جس کی فصل اب پورا ملک کھا رہا ہے، نقوی صاحب کا کہنا تھا یہ ہیڈ ماسٹر صاحب دل کے ارب پتی تھے اور اگر اس ملک کو دل کے ایسے چند ارب پتی مل جائیں تو یہ ملک ترقی کی قطار میں سر اٹھا کر کھڑا ہو سکتا ہے، نقوی صاحب کا فرمانا تھا "آپ نے اپنے کالم بعنوان 'پوری اسلامی دنیا میں' پاکستانی نژاد سکاٹش بچی مصباح ارم کے حوالے سے جو معلومات مجھ پہنچائی ہیں وہ واقعی ایک لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس بچی نے مغربی تہذیب کے سختی رویوں سے جان چھڑا کر پاکستان کو اپنا مسکن بنایا۔ اس منزل پر آپ نے بجا طور پر دکھ کا اظہار کیا کہ اس بچی کے سچے جذبے کو ایک معیاری تعلیمی ادارہ بھی نصیب نہ ہو سکا جس میں وہ یہاں کی تہذیب و ثقافت کے مطابق تعلیم حاصل کر سکے، یہاں بھی اسے کیتھولک سکول کا رخ کرنا پڑا، اسے کیتھولک تہذیب کو اپنانا پڑا۔ آپ نے یہ المناک سوال اٹھایا ہے، کیا اس ملک کے ایک ہزار کے قریب ارب پتی لوگ کاؤنٹ معیار کا ایک سکول بھی قائم نہیں کر سکتے؟ آپ سے عرض ہے ارب پتی لوگ معیاری ادارہ قائم کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں مگر آپ جاننے ہیں تعلیم ان کی ترجیحات میں شامل نہیں، ان کی ترجیحات امارت، مزید امارت اور لامتناہی امارت ہے، ان لوگوں نے تعلیم کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ آپ نے اس طبقے کا ذکر کیا ہے جس کے سچے سہولیات سے آراستہ سکولوں میں بیرون ملک تعلیمی اداروں میں تعلیم پاتے ہیں لہذا یہ لوگ اس ملک میں کسی معیاری تعلیمی ادارے پر اپنی جیب سے پیسہ کیوں خرچ کریں گے؟ اس سے انہیں یہ خطرہ لاحق ہوگا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو عام لوگوں کے بچے ان کے بچوں کے مقابلے میں آجائیں گے جس کے نتیجے میں ان کی اولاد غریب عوام کی اولاد پر سکرانی نہیں کر سکے گی۔ اس کے علاوہ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ کوئی لاجی کام کرنے کے لئے دولت مند یا ارب پتی ہونا ضروری نہیں، دل کا ارب پتی ہونا ضروری ہوتا ہے"

خاور نقوی صاحب نے مزید لکھا ”میں آپ کو دل کے ایک ارب پتی کی کہانی سنانا چاہتا ہوں“ اس نے ایک دور افتادہ اور پسماندہ گاؤں میں بے سرو سامانی کے عالم میں فقط دل کی دولت کے ثل بوتے پر ایک سکول کھول دیا۔ دل کے اس ارب پتی کا نام سید عطاء محمد شاہ تھا۔ انہوں نے 1952ء میں گورنمنٹ پرائمری سکول نورنگا ضلع میانوالی میں بے وی بچہ کی حیثیت سے تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ انہوں نے اس کے بعد مسلسل محنت سے ایس ڈی، فاضل فارسی، ایف اے، سی ٹی، بی اے اور بی ایڈ کے امتحانات پاس کیے۔ انہوں نے کچھ عرصہ گورنمنٹ پرائمری سکول نورنگا کے ہیڈ ماسٹر کے طور پر بھی کام کیا اور جب اس ادارے کو نڈل سکول کا درجہ ملا تو انہوں نے اس کے سربراہ کی حیثیت سے بھی فرائض سرانجام دیے۔ انہوں نے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ایسی بے لوث، پر خلوص اور مثالی خدمت کی کہ پورے علاقے میں ان کا نام ہیڈ ماسٹر صاحب مشہور ہو گیا۔ ان کے قریبی رشتہ دار بھی انہیں ہیڈ ماسٹر صاحب کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب خانی احمد رئیس تھے۔ کڑکڑاتے جاڑے کی طویل راتوں اور چھپلائی گرمی کے لمبے دنوں میں بھی ان کا سلسلہ تدریس جاری رہتا تھا۔ نورنگا دریاے سندھ کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے کئی بار دریا کی زد میں آ جاتا تھا۔ موسم گرما میں دریا بھر کر کناروں سے اٹا آتا تھا اور نورنگا جمیل کی شکل اختیار کر لیتا تھا، جس کے نتیجے میں اہل نورنگا کے کچے مکان اور چھپر پانی کی نذر ہو جاتے تھے۔ سیلاب کے دنوں میں علاقے کی فصلیں پانی میں تیرتی نظر آتی تھیں، کبھی دریا غیض و غضب میں زمین کے کٹاؤ کا شعل اختیار کرتا تھا تو پانی گھروں کو بنیادوں اور درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیتا تھا۔ دریا کی اس منہ زور طغیانی اور ہیبت ناک جولانی میں بھی ہیڈ ماسٹر صاحب کسی درخت کی چھاؤں میں خشکی کا کوئی ٹکڑا تلاش کر لیتے تھے اور وہاں بیٹھ کر فریب کسانوں، شتر بانوں، چرواہوں اور محنت کشوں کے خاک نشین بچوں کو علم کے نور سے منور کرنے کی بھرپور کوشش کرتے رہتے تھے اس لگن اور انتھک محنت کی وجہ سے دور دور تک ان کی شہرت ہوئی اور دور دراز سے لوگ اپنے بچوں کو ان کے ہاں داخل کروانے آنے لگے، وہ اپنی جب سے نادار طلباء کے اخراجات بھی برداشت کرتے تھے ان کے قیام و طعام کا بندوبست بھی کرتے تھے اور وہ رات کو اٹھ اٹھ کر ان کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے، تعلیم کے ساتھ تربیت اور نظم و ضبط بھی ان کے طریق تدریس کے اہم اجزاء تھے۔ جب ان کے ہونہار طلباء اس ادارے سے فارغ التحصیل ہو جاتے تو وہ ان کی آئندہ تعلیم اور عملی زندگی کے بارے میں شہروں میں مقیم اپنے دوستوں اور عزیز واقارب سے مشورہ کرتے تھے اور اس طرح اپنے طلباء کی مکمل رہنمائی کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو ٹیم بھی منتخب ملی تھی لیکن وہ ان سے فقط ڈیوٹی ٹائم میں کام لیتے تھے جبکہ انہوں نے اضافی وقت صرف اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔

اس محنت اور جانفشانی کا پھر ٹھکانا تھا کہ اس سکول کا نتیجہ نہ صرف سو فیصد رہتا تھا بلکہ اس سکول کے جتنے طلبہ پرائمری اور نڈل کے دہلیئے کے امتحانات میں شریک ہوتے تھے وہ سب کامیابی حاصل کرتے تھے، ان کے بعض طلباء ضلع اور ریجن کی سطح پر اول پوزیشن بھی حاصل کرتے تھے۔ اس ادارے کے طلباء نے نصابی سرگرمیوں

کے علاوہ اہم ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس مثالی کارکردگی کی بناء پر سکول ضلع کا بہترین سکول قرار پایا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو کئی بار ڈپٹی کمشنر ضلع میانوالی سے نقد انعامات اور تعریفی اسناد بھی ملیں تھی۔ بلاشبہ یہ سب اعزازات اپنی جگہ قابل قدر ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا اعزاز ان کے وہ شاگرد ہیں جو آج نہایت اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہیں، ہیڈ ماسٹر صاحب دارقانی سے کوچ کر چکے ہیں مگر وہ آج بھی اپنے شاگردوں کی صورت میں زندہ ہیں۔ بات کانٹنٹ سکول سے شروع ہوئی تھی۔ شہروں میں دیکھا جائے تو ایک طرف بڑے بڑے ناموں والے اور تمام جدید سہولیات سے آراستہ و پیراستہ تعلیمی ادارے ہیں جبکہ دوسری طرف نورنگ جیسا گاؤں ہے اور اس گاؤں میں بے سروسامان بے درود و یار مشکلات و مسائل میں گھرا ہوا ایک تعلیمی ادارہ ہے جس میں دل کے ایک ارب پتی نے قابل قدر اور یادگار کام کر دکھایا۔ میں جب بھی اس سکول کو ملک کے بڑے تعلیمی اداروں کے ساتھ تقابلی نگاہ سے دیکھتا ہوں تو مجھے یہ مراعات یافتہ ادارے اس بے خانماں سکول کے مقابلے میں پیچ نظر آتے ہیں۔ آج سرزمین وطن سید عطا محمد شاہ صاحب جیسے دل کے ارب پتیوں کے انتظار میں ہے جو ملک کے کسی حصے میں نادار عوام کے بچوں کے لئے دل سوزی اور تندی کے ساتھ گورنمنٹ ٹرل سکول نورنگ جیسے تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھیں۔“

خاور نقوی صاحب سے سید عطا محمد شاہ صاحب کے بارے میں سن کر دل سے ہوک سی اٹھی اور مجھے اپنے وہ تمام استاد یاد آ گئے جو ہمیں شاہ صاحب مرحوم کی سپرٹ سے پڑھاتے تھے ہمارے پاس اچھے سکول نہیں تھے سکولوں میں کمرے، بیچ اور تختہ سیاہ بھی نہیں ہوتے تھے ہم لوگ تنگی اور سختی زمین پر بیٹھتے تھے اور ہمیں اس وقت کانٹنٹ کے سپینگ تک نہیں آتے تھے لیکن ہمارے پاس شاہ صاحب جیسے استادوں کی شکل میں اللہ کی نعمت موجود تھی۔ آج یہ اس نعمت کا اعجاز ہے میں اور میرے طبقے کے لوگ نہ صرف اس معاشرے میں پورے قدم سے کھڑے ہیں بلکہ کانٹنٹ سکولوں سے فارغ التحصیل کلاس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لوگوں کا حق بھی مانگ رہے ہیں۔ یہ سب دل کے ان ارب پتیوں کی مہربانی تھی جنہوں نے خود بھوکے رہ کر ہم جیسے لوگوں کو علم اور فکر کا رزق دیا تھا جنہوں نے علم کو کاروبار نہیں بلکہ عبادت بنایا تھا۔



ریڈزون

شیخ صاحب نے کہا اس کر جواب دیا "میں ہسپتال شفٹ ہو رہا ہوں" میں نے انہیں غور سے دیکھا وہ ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک صحت مند دکھائی دے رہے تھے ان کے چہرے کی سرخی اور آواز کی کھنک بھی قائم تھی وہ مسکرائے "مجھے معلوم ہے تم وجہ پوچھو گے" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا انہوں نے اپنے گنج پر ہاتھ بھیرا اور پراسرار لہجے میں بولے "یار گل صدر بٹش پاکستان کے دورے پر آ رہے ہیں" وہ خاموش ہو گئے یہ حیرت کا دوسرا ہم تھا میں نے عرض کیا "حضور صدر بٹش کا آپ کے ساتھ کیا تعلق" شیخ صاحب نے قہقہہ لگایا "یار میں 55 برس کا ہو چکا ہوں ڈاکٹر کہتے ہیں پاکستان جیسے ممالک میں 55 برس ہالی رسک عمر ہے اور اس عمر کے بابوں کو کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے انہیں ہارٹ ایک ہو سکتا ہے انہیں برین ہیجیمیرج فالج اور شوگر ہو سکتی ہے اور کسی بھی وقت ان کے گردے نفل ہو سکتے ہیں" وہ سانس لینے کیلئے رکے انہوں نے پانی کے جگ کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ گویا ہوئے "صدر بٹش پاکستان آ رہے ہیں وہ جتنی دیر اسلام آباد میں رہیں گے پورا شہر سیزر رہے گا تمام سڑکوں پر ٹرانسپورٹ معطل رہے گی تمام ٹریفک بند کر دی جائے گی اس دوران اس شہر میں پرندہ تک پر نہیں مار سکے گا" وہ رکے جگ کی طرف دیکھا اور پھر گویا ہوئے "میں 55 سال کا بڑھا ہوں میں سوچتا ہوں اگر ان دنوں مجھے کچھ ہو گیا تو میں ہسپتال کیسے پہنچوں گا" قریب ترین ہسپتال بھی میرے گھر سے 25 کلومیٹر دور ہے اور اس ہسپتال کے راستے میں بھی ٹھیک ٹھاک ریڈزون پڑتا ہے"

مجھے شیخ صاحب کا مسئلہ سمجھ آ گیا میں نے ان سے عرض کیا "ماشاء اللہ آپ کی پلاننگ تو لاجواب ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے اگر ان دنوں خدا نخواستہ آپ کے گھر کا کوئی دوسرا فرد بیمار ہو گیا تو کیا بنے گا" یہ تمام بیماریاں آپ کی ہیگم صاحب آپ کے دونوں بیٹوں اور آپ کی بہوؤں کو بھی تو لگ سکتی ہیں" شیخ صاحب نے میری طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر بولے "میں پورے خاندان کا بندوبست کر کے ہسپتال جا رہا ہوں میری ایک بہو امید سے ہے میں نے اسے اس کے بیٹے بھجوا دیا ہے میں نے پوتوں اور پوتیوں کو سکول سے چھٹی کرادی ہے اور وہ اپنے نفعیال چلے گئے ہیں میرے دونوں بیٹوں کو دفاتروں سے چھٹی ہے ان کے دفتر ریڈزون میں آتے ہیں اور حکومت

نے جمعرات کو یہ سارا علاقہ خالی کر لیا تھا وہ یہ دن مری میں گزاریں گے میری بیگم میرے ساتھ ہسپتال رہے گی جبکہ تمام نوکر اپنے اپنے گھروں میں رہیں گے ان کا منصوبہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں نے ان سے عرض کیا "آپ ایک صحت مند شخص ہیں ڈاکٹر آپ کو ہسپتال کیوں داخل کریں گے" شیخ صاحب نے تہقہہ لگایا "مجھے یہ راستہ ڈاکٹر ہی نے دکھایا تھا ڈاکٹر قصوری میرے پرنسپل فزیشن ہیں انہوں نے گزشتہ روز مجھے فون کیا اور مجھے یہ اطلاع دی اسلام آباد کے تمام صاحبِ ثروت دو دن کیلئے ہسپتال داخل ہو رہے ہیں ہمارے پاس ایک کمرہ اور دو بیڈ خالی ہیں اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں یہ بیڈ اور یہ کمرہ آپ کیلئے بک کر سکتا ہوں آپ تیس ہزار روپے جمع کرائیں اور دو دن ہسپتال میں موج کریں میں نے ڈاکٹر سے سوچنے کیلئے وقت مانگا تو اس نے کہا شیخ صاحب ہمارے پاس ایک لمبی چوڑی ویٹنگ لسٹ ہے اگر آپ نے فوراً فیصلہ نہ کیا تو شاید آپ کو یہ کمرہ ایک لاکھ روپے میں بھی نہیں ملے گا بندھاں ڈر گیا اور میں نے فوراً بنگلہ کراچی میں ابھی ابھی تیس ہزار روپے جمع کرا کر آیا ہوں" میرے لیے یہ بات انکشاف کی حیثیت رکھتی تھی میں نے ان سے پوچھا "ہسپتال میں آپ کے علاوہ کون کون ہے" شیخ صاحب نے تہقہہ لگایا "وہ تمام لوگ جو تیس چالیس ہزار روپے انورڈ کر سکتے ہیں لوگوں نے تو اپنے پورے چھوڑے اور لیکن تک ہسپتالوں میں شفٹ کر لیے ہیں آج کل ہسپتال کم اور پبلک پوائنٹ زیادہ لگ رہے ہیں"

میں خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا وہ مسکرائے "یار میں اس بات پر حیران ہوں بیش ہماری عزت میں اضافہ کیلئے پاکستان آ رہے ہیں یا پھر اس ملک کے لوگوں کو سزا دینے ان کی آمد سے چار دن پہلے پورا شہر سیزر کر دیا گیا مارگلہ کی پہاڑیوں پر تو جیس لگادی گئیں تمام گاڑیوں کی تلاشی شروع ہوگئی جمعرات تک امریکہ کے 730 مکائدوز اسلام آباد پہنچ گئے تھے وہ اپنے ساتھ اپنی گاڑیاں سکیورٹی آلات اور سیکورٹی سسٹم بھی لائے تھے انہیں سیٹلائٹ کی سہولت بھی حاصل تھی وہ لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر اسلام آباد کا چپہ چپہ دیکھ رہے تھے ہماری فوج اور ہماری پولیس بھی ہماری جیبوں ہمارے کپڑوں کی تلاشی لے رہی تھی میرا بیٹا راول ڈیم پر واک کرنے جاتا ہے کل شام اسے راستے میں روک لیا گیا اس کا شناختی کارڈ چیک کیا گیا اس سے اس کا ریکارڈ پوچھا گیا اس نے بتایا وہ ایک پرائیویٹ فرم میں اکاؤنٹنٹ ہے تو سکیورٹی افسر نے اس سے کہا آپ اگلے چار دن اس جگہ واک نہیں کر سکتے یار میں پچھلے تیس برس سے اس شہر میں رہ رہا ہوں لیکن میں نے پچھلے دو دنوں میں خود کو اس شہر میں جتنا اجنبی اور مشکوک پایا ہے اتنا میں نے کبھی محسوس نہیں کیا مجھے محسوس ہوتا ہے اس شہر اس ملک کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں میں ایک اعتماد پسند اور روشن خیال پاکستانی نہیں ہوں میں ایک دہشت گرد اور شدت پسند شخص ہوں یار میں گھر سے نکلتا ہوں تو مجھے اس ملک کا وہ سپاہی بھی مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے جو مجھے دس برسوں سے جانتا ہے یار مجھے امریکی گاڑیاں اور امریکی سیٹلائٹ تک گھورتے ہیں یار مجھے یوں محسوس ہوتا ہے یہ بیش صاحب صرف مجھے میری اوقات سمجھانے آ رہے ہیں اور وہ صرف مجھے ذلیل کرنے کیلئے پاکستان آ رہے ہیں یار میں انورڈ کر سکتا ہوں اس لیے میں یہ دو دن ہسپتال میں لیٹ کر بیش صاحب کا مقاب جھیل لوں گا لیکن یار تم ان لوگوں کے بارے

میں سوچو جو یہ دو دن گھروں میں گزاریں گے یا سوچو اگر ان لوگوں کو ایمر جنسی میں ہسپتال جانا پڑ جائے کسی نے ایمر جنسی میں شہر سے باہر جانا ہو یا کسی نے ہنگامی حالت میں شہر میں آنا ہو تو اس کا کیا بنے گا وہ کہاں جائے گا یا کیا دنیا کے کسی دوسرے ملک میں بھی ایسا ہوتا ہے یا اس سے تو اچھا ہے جب بھی ہمارے شکرانوں کو بنش صاحب کی زیارت کی حاجت ہو تو وہ پوری کاجینہ کو ساتھ لیں اور امریکہ چلے جائیں بنش صاحب سے ہاتھ ملائیں تصاویر کھینچوائیں اور مسکراتے مسکراتے واپس آ جائیں کم از کم ہماری جان تو بچ جائے مجھے محسوس ہوا شیخ صاحب ذرا سے جذباتی ہو گئے ہیں اور وہ جذبات کی رو میں بہہ کر یہ تک بھول گئے ہیں وہ ایک پاکستانی شہری ہیں وہ جذبات کی رو میں خود کو کسی اچھے ملک کا اچھا شہری سمجھنے لگے ہیں ان کا خیال ہے جس طرح برطانیہ فرانس اور جاپان کے شہری ایسے دوروں کے دوران حکومتوں کو اپنے شہری حقوق سلب کرنے کی اجازت نہیں دیتے بالکل اسی طرح اس ملک کے حکمران اپنے شہریوں کی ضروریات اور مجبور یوں کا بھی خیال رکھیں گے مجھے محسوس ہوا شیخ صاحب کی دماغی حالت خراب ہو چکی ہے لہذا انہیں یہ دو دن واقعی ہسپتال میں گزارنے چاہئیں انہیں واقعی ہسپتال شفٹ ہو جانا چاہیے۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

مہنگائی

جناب سلیمان شاہ وزیر اعظم شوکت عزیز کے شیر ہیں ان کا شمار پاکستان کے نامور اقتصادی ماہرین میں ہوتا ہے چند روز پہلے ”نیو“ کے ایک پروگرام میں مجھے ان سے گفتگو کا شرف حاصل ہوا ان کے ساتھ خزانے کے وزیر ملک عمر ایوب بھی تھے عمر ایوب پاکستان کے سابق صدر ایوب خان کے پوتے ہیں یہ پروگرام ”مہنگائی“ کے حوالے سے تھا پروگرام کے شروع میں عمر ایوب نے مہنگائی کی وہ ایسی حیران کن وجوہات بیان کیں جنہوں نے میرے چنگے چھڑا دیئے انہوں نے فرمایا ”پاکستان اقتصادی لحاظ سے ترقی کر رہا ہے اور دنیا میں جو ملک ترقی کرتے ہیں ان میں مہنگائی کا سیلاب آتا ہے دوسرا دنیا میں پٹرول کی قیمتیں بڑھی ہیں جس کا اثر پوری دنیا کی معیشت پر ظاہر ہو رہا ہے“ میں نے ان سے عرض کیا ”موجودہ اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں“ انہوں نے مہربانی فرما کر مجھے امان دے دی میں نے عرض کیا ”پٹرول کی قیمتیں تو پوری دنیا میں بڑھی ہیں لیکن مہنگائی صرف پاکستان میں آئی ہے برطانیہ میں دودھ اور ڈبل روٹی کی قیمتیں 1967ء میں طے ہوئی تھیں ان میں آج تک کوئی اضافہ نہیں ہوا امریکہ میں کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتیں وہی ہیں جو آج سے پانچ برس پہلے تھیں اسی طرح لنڈن ایسٹ میں بھی قیمتیں مستحکم ہیں حتیٰ کہ بھارت تک میں پٹرول کی قیمتیں اشیائے ضرورت پر اثر انداز نہیں ہوئیں جبکہ پاکستان میں پچھلے پانچ برسوں میں ضروریات زندگی کی قیمتوں میں تین گنا اضافہ ہوا دوسرا دنیا میں صرف پاکستان واحد ملک نہیں جو ترقی کر رہا ہے اس وقت دنیا میں ایسے 30 ممالک ہیں جن کی معیشت مستحکم ہو رہی ہے لیکن ان میں سے کسی ملک میں مہنگائی نہیں ہوئی“ جناب سلیمان شاہ نے میری بات کاٹی اور پوری اقتصادی قوت سے بولے فرمایا ”پاکستان میں مہنگائی ہے ہی نہیں آپ غلط کہہ رہے ہیں“ ان کے اس دعوے سے وہاں سراسر ایسی جھیل مچی اور ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

جناب سلیمان شاہ کی بات درست تھی اگر ان کے زاویے سے دیکھا جائے تو پاکستان نہ صرف ایک سستا ملک ہے بلکہ اس میں چیزوں کے نرخ تیزی سے گر رہے ہیں لیکن یہ الگ بات ہے اس سستے پن کا فائدہ کسی عام شخص کو نہیں پہنچ رہا دنیا میں چیزیں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک وہ جنہیں ہم ضروریات زندگی کہتے ہیں یہ وہ چیزیں ہوتی

ہیں جن کے بغیر کوئی ذی روح زندہ نہیں رہ سکتا مثلاً آغا دالیں، کھئی دودھ اور ہزریاں جبکہ دوسری چیزوں کو ہم سامان قعیش کہتے ہیں یہ چیزیں زندگی کو آرام دہ بناتی ہیں لیکن ان کی کمی یا غیر موجودگی سے زندگی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا مثلاً ریفریجریٹر، ٹیلی ویژن، گاڑیاں اور ڈائمنگ فیمل وغیرہ پوری دنیا میں حکومتیں ایشیائے ضرورت پر نظر رکھتی ہیں وہ ان کی قیمتیں بڑھنے نہیں دیتیں کیونکہ وہ جانتی ہیں ایک عام غریب آدمی سے لے کر صدر تک سب کی زندگی کا دار و مدار انہی اشیاء پر ہوتا ہے جبکہ حکومتیں ان کے مقابلے میں سامان قعیش کی قیمتوں کی کوئی پروا نہیں کرتیں ان کی قیمتیں خواہ دس گنا بڑھ جائیں حکومتوں کو پروا نہیں ہوتی لیکن بد قسمتی سے پاکستان میں اس سے الٹ ہے پاکستان میں سامان قعیش کی قیمتیں تو تیزی سے گھری ہیں جبکہ ایشیائے ضرورت کے نرخ آسمان کو چھو رہے ہیں مثلاً آپ ایک سال کی قیمتیں نکال کر دیکھ لیں آپ کو معلوم ہوگا 60 اچ کا وہ نیلی و بڑن جو سال پہلے تین ساڑھے تین لاکھ روپے میں ملتا تھا وہ آج لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ روپے میں دستیاب ہے اسی طرح دو لاکھ کا فرنج ایک لاکھ روپے میں اور 185 لاکھ کی گاڑی 60 لاکھ روپے میں مل رہی ہے اس کے برعکس ایشیائے ضرورت میں سے کبھی سبھی غائب ہو جاتا ہے کبھی دالیں، کبھی چینی اور کبھی آلو کبھی بیازتا قابل خرید ہو جاتے ہیں کبھی چینی مہنگی ہو جاتی ہے اور کبھی گھی، جناب سلیمان شاہ اور ان کی حکومت جب قیمتوں کی قیمتوں پر نظر ڈالتی ہے تو انہیں یہ ملک سستا لگتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں جب ایک عام شہری ضروریات زندگی کی تلاش میں باہر نکلتا ہے تو اسے رو پیہ چھوٹا اور آلو بڑے دکھائی دیتے ہیں اور اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے وہ وہاں دینے لگتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے یہ مہنگائی ہے کیوں؟ اور دنیا نے اسے کس طرح کنٹرول کیا تھا؟ پوری دنیا میں حکومتیں ضروریات زندگی پر ٹیکسوں کی شرح کم رکھتی ہیں وہ ٹیکس کا یہ خسارہ سامان قعیش پر بھاری ٹیکس لگا کر پوری کرتی ہیں لیکن پاکستان میں حکومت سرمایہ حاصل کرنے کیلئے ان ڈائریکٹ ٹیکس بڑھا دیتی ہے اس وقت حکومت 32 فیصد ڈائریکٹ ٹیکس لے رہی ہے جبکہ ان ڈائریکٹ ٹیکس 68 فیصد تک ہیں اس ان ڈائریکٹ ٹیکس کا نتیجہ مہنگائی کی شکل میں نکھل رہا ہے اب سوال یہ ہے پاکستان میں ڈائریکٹ ٹیکس وصول کیوں نہیں کئے جاتے؟ اس کی وجہ بڑی دلچسپ ہے دنیا بھر میں حکومتیں جن لوگوں سے ڈائریکٹ ٹیکس وصول کرتی ہیں پاکستان میں وہ لوگ یا تو حکومت کا حصہ ہوتے ہیں یا پھر وہ حکومت سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں لہذا حکومت اپنا خسارہ پورا کرنے کیلئے اندھا دھند ان ڈائریکٹ ٹیکس لگا دیتی ہے جس کے نتیجے میں ضروریات زندگی قوت خرید سے باہر ہو جاتی ہیں آپ حکومت سے پوچھئے وہ لوگوں کو 20 روپے لیٹر پٹرول کیوں نہیں دیتی، حکومت پٹرول کے ہر لیٹر پر 24 روپے ٹیکس کیوں لیتی ہے؟ اگر حکومت عوام کو پٹرول کے ہر لیٹر پر 24 روپے کی چھوٹ دے اور یہ خسارہ بالائی طبقے سے وصول کرے تو پاکستان کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے لیکن حکومت ایسا کبھی نہیں کرے گی کیونکہ اس کے نتیجے میں حکومت میں شامل لوگوں کو اپنی جیبیں خالی کرنا پڑیں گی اور یہ ممکن نہیں۔

میں نے اس پر وکرام کے دوران اپنے معزز ساتھیوں سے پوچھا تھا کیا آپ لوگوں کو دودھ کی قیمت

معلوم ہے وہ گھبرا گئے، میں ہنس پڑا اور میں نے ان سے کہا آپ ہماری بد قسمتی ملاحظہ کیجئے ہماری اقتصادی پالیسیاں وہ لوگ بنا رہے ہیں جنہیں دودھ کے نرخ تک معلوم نہیں ہیں اور یہ وہ جنس ہے جو پاکستان کے 15 کروڑ لوگ روزانہ استعمال کرتے ہیں، میں نے انہیں بتایا مہاتما گاندھی نے نہرو کو وصیت کی تھی ”نہرو دیکھو تم جب تک بھارت میں آئے، سائیکل اور سینما کے کٹ کی قیمت نیچے رکھو گے تمہاری حکومت چلتی رہے گی، نہرو نے گاندھی سے وجہ پوچھی تھی تو انہوں نے فرمایا تھا یہ وہ اشیاء ہیں جو اس ملک کا غریب شہری استعمال کرتا ہے، نہرو نے یہ بات پلے باندھ لی تھی لہذا وہ موت تک بھارت کا وزیر اعظم رہا لیکن ہمارے حکمران قیامت تک حکمران رہنا چاہتے ہیں مگر وہ غریب کو اس کا حق دینے کیلئے تیار نہیں ہیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

سات سوالوں کے سات جواب

دنیا میں یہودی دکاندار اور گجراتی بیٹے منافع خوری میں یہ طوطی رکھتے ہیں ان لوگوں کے نفع اور نقصان کے اپنے ہی پیمانے ہوتے ہیں یہ لوگ منافع میں کمی کو نقصان تصور کرتے ہیں مثلاً ایک گجراتی بنیا گلی میں بیٹھ کر رو رہا تھا کسی نے رونے کی وجہ پوچھی تو وہ روتے ہوئے بولا "مجھے دو لاکھ روپے نقصان آد گیا" پوچھنے والے نے نقصان کی تفصیل دریافت کی وہ آنکھیں پونچھ کر بولا "مجھے پچھلے ہفتے مریچوں میں دس لاکھ روپے منافع ہوا تھا لیکن اس بار صرف آٹھ لاکھ روپے بچے ہیں"

مجھے نفع نقصان کا یہ پیمانہ قومی اسمبلی میں جناب عمر ایوب کی تقریر میں کر یاد آ گیا "خزانہ کے وزیر مملکت نے 22 مارچ کو قومی اسمبلی میں پٹرول کی قیمتوں کے حوالے سے اپوزیشن سے سات سوال پوچھے ان کا فرمانا تھا "ان سوالوں کا دیا استدرا نہ جواب ساری قوم کو صحیح فیصلے تک پہنچنے میں مدد دے گا" ان سات سوالات کو آج سات دن ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک اپوزیشن کی طرف سے ان کے جواب نہیں آئے لہذا قوم ایک ہفتہ گزرنے کے باوجود صحیح فیصلے تک نہیں پہنچ سکی چنانچہ میں نے اس سلسلے میں برادر عمر ایوب کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ایک پاکستانی ہونے کی حیثیت سے قوم کو صحیح فیصلے تک پہنچانا میری بھی اتنی ہی ذیوبی ہے جتنی ذمہ داری اپوزیشن ارکان کے ہازک کندھوں پر استوار ہوتی ہے برادر عمر ایوب کا پہلا سوال تھا "کیا پاکستان 80 فیصد تیل عالمی منڈی سے نہیں خریدتا" عمر ایوب کا سوال درست ہے واقعی پاکستان اپنی ضرورت کا 80 فیصد تیل درآمد کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے پاکستان دنیا میں تیل درآمد کرنے والا واحد ملک نہیں دنیا کے 180 ممالک میں 91 ممالک سو فیصد پٹرول درآمد کرتے ہیں 32 ممالک 70 سے 90 فیصد 11 ممالک 50 فیصد اور 27 ممالک اپنی ضرورت کا 30 سے 50 فیصد تیل درآمد کرتے ہیں دنیا میں 6 ممالک تیل کے معاملے میں خود کفیل ہیں جبکہ 13 ممالک تیل برآمد کرتے ہیں پوری دنیا عالمی منڈی سے روزانہ 184 اعشاریہ 3 ملین بیرل تیل خریدتی ہے اور پاکستان بھی تیل خریدنے والے ان 161 ممالک میں سے ایک ملک ہے ان کا دوسرا سوال تھا "کیا حکومت نے 2004ء میں پٹرول کی قیمتیں برقرار رکھنے کیلئے 39 ارب روپے خرچ نہیں کئے" عمر ایوب

کے اس سوال کا جواب ہے ”نہیں“ حقیقت یہ ہے حکومت پٹرول پر 45 سے لے کر 55 فیصد تک ٹیکس وصول کرتی ہے اس وقت بھی حکومت عالمی منڈی سے 432 ڈالر میٹرک ٹن خام تیل خرید رہی ہے اس خام تیل سے پٹرولیم کی دس مصنوعات حاصل کی جاتی ہیں سب سے پہلے نفعائیہ کے طیاروں کیلئے جیٹ آئل نکالا جاتا ہے اس کے بعد ہائی آکٹین پمپٹرول ہائی سپیڈ ڈیزل لائٹ ڈیزل فرنس آئل بیچمن گریس لوبریکٹس آئل اور سڑکوں پر بچھانے والی تارکول اس ایک میٹرک ٹن خام تیل سے ایک ہزار 3 سو 62 لیٹر پٹرول نکلتا ہے اگر ایک میٹرک ٹن خام تیل سے صرف پٹرول نکالا جائے اور باقی 9 اشیاء ضائع کر دی جائیں تو بھی یہ پٹرول 18 روپے 39 پیسے لیٹر پڑتا ہے یہ 18 روپے 39 پیسے لیٹر پٹرول بازار میں 45 روپے 60 پیسے لیٹر بیچا جا رہا ہے آپ خود فیصلہ کریں حکومت اس پر کتنا ٹیکس لے رہی ہے جبکہ اس خام تیل سے حاصل ہونے والی دوسری مصنوعات اس منافع کے علاوہ ہیں اب آتے ہیں ان 39 ارب روپے کی طرف یہ درست ہے حکومت نے 2004ء میں اپنے ٹیکس میں کمی کی تھی جس کے نتیجے میں تیل کی مدد میں حاصل ہونے والے ٹیکس میں 39 ارب روپے کم ہو گئے تھے حکومت ان 39 ارب روپوں کو نقصان قرار دے رہی ہے ان کا تیسرا سوال تھا ”اگر حکومت عوام کو تیل کی مدد میں 70 سے 80 ارب روپے سبسڈی دے تو کیا ملک مالی طور پر تباہ نہیں ہو جائے گا“ اس کا جواب بھی ہے ”نہیں“ کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے یہ سبسڈی دراصل سبسڈی ہے ہی نہیں آپ خزانے میں سے ایک پیسہ نہیں دیں گے“ آپ تیل کے منافع میں سے 70 سے 80 ارب روپے کی قربانی دیں گے دوسرا اگر مان لیا جائے یہ سبسڈی ہے تو بھی آپ یہ سبسڈی کسی دشمن کو نہیں دے رہے آپ یہ اپنے عوام اپنے ملک کے لوگوں کو دے رہے ہیں ان لوگوں کو جو آپ کی رعایا ہیں اور آپ نے جن کے حقوق کی حفاظت کا حلف اٹھایا ہے چوتھا سوال تھا ”کیا حکومت کے مخالفین پاکستان کو مالی طور پر تباہ نہیں کرتا چاہتے“ اس کا جواب بھی ہے ”نہیں“ سوال یہ ہے تیل کے معاملے میں حکومت کی مخالفت کون لوگ کر رہے ہیں؟ یہ لوگ بھی ارکان اسمبلی ہیں یہ بھی عوام کے نمائندے ہیں اور انہیں بھی پاکستان کے عوام نے اپنی بات ایوان اقتدار تک پہنچانے کیلئے اسمبلی بھیجا ہے لہذا یہ لوگ مخالفت کر کے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں اپنی آئینی ذمہ داری بھار ہے ہیں پانچواں سوال تھا ”کیا شوکت عزیز حکومت تیل پر ٹیکس لگانے والی پہلی حکومت ہے؟“ عمر ایوب کا یہ سوال درست ہے واقعی تیل پر ٹیکس لگانے والی یہ پہلی حکومت نہیں ماضی میں بھی تیل پر ٹیکس لگتا رہا تھا لیکن سوال یہ ہے اگر ماضی کی حکومتیں عوام پر ظلم کرتی رہی ہیں تو کیا آنے والی حکومت پر یہ ظلم جاری رکھنا فرض ہو چکا ہے کیا ماضی کی زیادتیاں حال اور مستقبل کی زیادتیوں کا جواز بن سکتی ہیں اگر ماضی میں سو قتل ہوتے تھے تو کیا آج بھی سو قتل ہونے چاہئیں“ ان کا چھٹا سوال تھا ”اگر حکومت تیل پر ٹیکس نہیں لگائے گی تو کیا وہ یہ کہ دوسرے ٹیکسوں کے ذریعے پوری ٹیکس کرے گی“ عمر ایوب کا یہ سوال دراصل سوال نہیں جواب ہے ہاں حکومت پٹرول پر ٹیکس ختم کر دے اور یہ کمی انکم ٹیکس جیسے دوسرے ڈائریکٹ ٹیکسوں سے پوری کرے حکومت تمام بڑی گاڑیوں پر پٹرول ٹیکس لگانے کا ایک کینال سے بڑے پائوں پر ٹیکس لگانے اور دوسری گاڑی اور دوسرے گھر

پر بھاری ٹیکس لگا دے تو یہ کی بڑی آسانی سے پوری ہو جائے گی ان کا ساتواں سوال تھا ”کیا بھارت میں پٹرول کی قیمتیں پاکستان سے زیادہ نہیں ہیں“ عمر ایوب کی بات درست ہے واقعی بھارت میں پٹرول کی قیمتیں زیادہ ہیں وہاں پٹرول پچاس روپے لیٹر تک رہا ہے لیکن اس وقت میکسیکو اور برازیل میں پٹرول کی قیمتیں بھارت سے بھی زیادہ ہیں وہاں پٹرول پاکستانی کرنسی میں 92 روپے لیٹر ملتا ہے لہذا اگر دنیا کے کسی ملک میں کوئی چیز مہنگی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں آپ بھی اپنے ملک میں اس کی قیمت بڑھا دیں دوسری بات بھارت میں پٹرول مہنگا ہے لیکن وہاں دودھ آنا سبزیاں کھجی چینی اور دالیں سستی ہیں اگر آپ کا معیار بھارت ہے تو آپ نے اس کی پیروی میں یہ چیزیں سستی کیوں نہیں کیں؟ کیا یہ زیادتی نہیں؟ اگر یہ زیادتی نہیں تو صدر پرویز مشرف نے حکومت کو مہنگائی کم کرنے کا حکم کیوں دیا وزیر اعظم نے اس سلسلے میں کئی کئی کیمپنیں بنائی؟“

یہ تو تھے برادر عمر ایوب کے سات سوال اور ان کے جواب اب میں ان سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں ”حکومت 143 وفاقی وزراء اور وزرائے مملکت شینڈنگ کمیٹیوں کے چیئرمینوں اور پارلیمانی سیکرٹریوں کو مفت پٹرول فراہم کرتی ہے ان میں سے 70 وزراء مہینے میں جتنا پٹرول چاہیں مفت حاصل کر سکتے ہیں جبکہ باقی لوگوں کی حد مقرر ہے سوال یہ ہے پٹرول کی قیمتوں میں اضافے کے بعد جب پوری قوم بحران کا شکار ہے تو ان 143 لوگوں میں سے وہ کون سا شخص ہے جس نے یہ اعلان کیا ہو میں آج سے مفت پٹرول نہیں لوں گا میں قوم کے مفاد میں اپنی یہ مراعات واپس کرتا ہوں“

قوم کو صحیح فیصلہ کرنے کیلئے اب عمر ایوب کے جواب کا انتظار رہے گا۔



ذمہ داری

1956ء میں لال بہادر شاستری بھارت میں ریلوے کے وزیر تھے ان کے دور میں جنوبی بھارت میں ریل کا حادثہ ہوا اس حادثے میں 33 لوگ مارے گئے لال بہادر شاستری نے حادثے کی ذمہ داری قبول کی اور وزارت سے استعفیٰ دے دیا ان کے استعفیٰ سے ایک برس بعد 29 ستمبر 1957ء کو ساہیوال میں بھی ریل کا ایک حادثہ ہوا جس میں اڑھائی سو لوگ جاں بحق ہو گئے اس دور میں ایک مشہور مسلم لیگی رہنما پاکستان ریلوے کے وزیر تھے قومی اسمبلی میں کسی رکن نے لال بہادر شاستری کا واقعہ بیان کیا اور وفاقی وزیر سے استعفیٰ ہونے کی درخواست کی محترم وزیر اس وقت ایوان میں موجود تھے وہ فوراً اپنی نشست پر کھڑے ہوئے اور مسکرا کر بولے ”میں الحمد للہ مسلمان ہوں اور کسی مسلمان کو کسی ہندو کی بیروی نہیں کرنی چاہیے“ ایوان میں ایک فلک شکناف قبچہ گونجا اور ساہیوال کے اڑھائی سو مظلوموں کا خون انگوٹری کیمٹی کی فائلوں میں جذب ہو گیا۔

پاکستان دو لحاظ سے بد قسمت ملک ہے اس ملک میں جب بھی ریلوے کا کوئی حادثہ ہوتا ہے حکومت اور میڈیا اسے تاریخی حادثہ قرار دیتے ہیں اور دم آج تک پاکستان کی کسی اہم شخصیت نے ریلوے کے کسی تاریخی حادثے کی ذمہ داری قبول نہیں کی 1947ء سے 2005ء تک ریلوے کے کسی وزیر کسی مشیر کسی چیئر مین اور کسی ڈائریکٹر جنرل نے کسی حادثے کے بعد استعفیٰ نہیں دیا آج تک ریلوے کے کسی بڑے ذمہ دار کو سزا نہیں ہوئی پاکستان میں ریلوے کے حادثے میں دو افراد جاں بحق ہو جائیں یا پانچ سو لوگ آج تک سزا کا عمل کاٹنا بدلنے والوں ڈرائیوروں اور سٹیشن ماسٹروں سے اوپر نہیں گیا آپ دلچسپ امر ملاحظہ کیجئے 1990ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت تھی 3 جنوری 1990ء کو ساہیوال کے مقام پر ریلوے کا حادثہ ہوا اس حادثے میں 307 لوگ جاں بحق ہو گئے اس وقت یہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ تھا ظفر لغاری ریلوے کے وزیر تھے لوگ مطالبہ کر رہے تھے وفاقی وزیر اس حادثے کی ذمہ داری قبول کریں اور استعفیٰ دے دیں ظفر لغاری بھی خود کو حادثے کا ذمہ دار سمجھتے تھے لہذا انہوں نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا کابینہ کے اجلاس میں انہوں نے بے نظیر بھٹو کے کان میں سرگوشی کی ”میں استعفیٰ لکھ کر لے آیا ہوں“ بھی ان کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ کسی دوسرے وزیر نے محترمہ کو

اپنی طرف متوجہ کر لیا، محترمہ اس وزیر سے فارغ ہوئیں تو وہ ریلوے حادثے اور ظفر لغاری تینوں کو بھول چکی تھیں، ظفر لغاری نے استعفیٰ چھاڑا، پاؤں کے قریب پڑی نوکری میں ڈالا اور سر جھٹک کر دو بارہ کاروبار سلطنت میں مصروف ہو گئے۔

پاکستان میں پچھلے پندرہ برسوں میں ریل کے 25 بڑے حادثے ہو چکے ہیں ان حادثوں میں اب تک تین ہزار لوگ مر چکے ہیں، یہ حادثے اور ان حادثوں میں مرنے والوں کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے، کل 13 جولائی کو گھونگی میں تین مسافر ٹرینیں ٹکرائیں، یہ پاکستان کا پہلا "ملٹی پل ریلوے ایکسیڈنٹ" ہے، یہ ایکسیڈنٹ ثابت کرتا ہے ریلوے کا نظام انتہائی نا اہل اور سفاک لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، دنیا کہتی ہے اگر دو ٹرینیں ٹکرائیں تو یہ حادثہ ہو سکتا ہے لیکن اگر ایک ہی جگہ تین ٹرینیں ٹکرائیں تو یہ حادثہ نہیں غفلت، نا اہلی اور سفاکی ہوتی ہے، لہذا 13 جولائی کے اس حادثے نے وفاقی وزیر سے لے کر گھونگی سٹیشن کی انتظامیہ تک سب کی سفاکی، نا اہلی اور غفلت ثابت کر دی لیکن مجھے یقین ہے اس حادثے کی ذمہ داری بھی پاکستان کا کوئی بڑا شخص قبول کرے گا اور نہ ہی استعفیٰ دے گا، یہ حادثہ بھی ڈرائیور کا ناپا بند لے والے لکڑک یا سٹیل دینے والوں کے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا، دو چار مہینے تک اس کی انکوائریاں ہوں گی اور اس کے بعد اسے بھی داخل دفتر کر دیا جائے گا اور اس کے بعد مزید دو چار ہزار مسافروں کو موت کی ہٹری پر چڑھایا جائے گا، یہ ہیں ہماری روایات، ہم نے آج تک پاکستان کے کسی حادثے کو جرم قرار نہیں دیا، ہم نے آج تک کسی وزیر کو ان حادثوں کا مجرم قرار نہیں دیا، مجھے یقین ہے اگر ہم ایک بار سرحد کے اس پار دیکھ لیں تو ہم شرم سے پانی پانی ہو جائیں، بھارت میں بھی یہی ریلوے ہے وہاں بھی یہی ہٹری ہے لیکن آپ بھارت جا کر دیکھ لیں آپ کو وہاں کے ریلوے سٹیشنوں اور پاکستان کے سٹیشنوں کے کلچر، عمارتوں، زبان اور نظام میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا، دہلی ریلوے سٹیشن اور لاہور کے سٹیشن کے چکے تک ایک ہی برانڈ اور ایک ہی شکل کے ہیں لیکن جہاں تک حادثوں اور ان کے رد عمل کی بات ہے تو پاکستان اور بھارت کے رویوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، وہاں اگر اس قسم کا کوئی حادثہ ہو جائے تو ریلوے وزیر پہلا شخص ہوتا ہے جو اپنا استعفیٰ پیش کرتا ہے، اگست 99ء کو مغربی بنگال کے علاقے دیناج پور میں دو ٹرینیں ٹکرائیں، اس حادثے میں بھارت کے 500 مسافر مارے گئے تھے، اس وقت نیشنل کمار بھارت کے وزیر ریلوے تھے انہوں نے فوراً اپنا استعفیٰ وزیر اعظم اٹل بھاری واجپائی کو پیش کر دیا، پوری قوم نے ان کے اس اقدام کو سراہا جبکہ ہمارے ملک میں کئی بار ایسے حادثے ہوئے، کئی بار سینکڑوں مسافر جاں بحق ہوئے لیکن کسی نے ہمارے کسی وزیر سے استعفیٰ طلب کیا اور نہ ہی کسی نے پیش کش کی۔

میں نے گزشتہ روز ایک وفاقی وزیر کو لال بہادر شاستری کا واقعہ سنایا اور ان سے عرض کیا "آپ ریلوے کے وزیر کو مستعفی ہونے کا مشورہ دیں" انہوں نے فرمایا "یہ ٹرینیں وفاقی وزیر نہیں چلا رہا تھا" میں نے ان سے عرض کیا "مستحضر 1956ء میں لال بہادر شاستری اور 1999ء میں نیشنل کمار بھی ٹرینیں نہیں چلا رہے تھے، عوام نے

ان سے استعفیٰ کا مطالبہ بھی نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود ان لوگوں نے عوام کا مقدمہ اپنے ضمیر کی عدالت میں پیش کیا ضمیر نے ان کے خلاف فیصلہ دیا اور یہ لوگ مستعفی ہو گئے۔ میرے مہربان وزیر نے تہنہ لگایا اور میری آنکھوں میں جھانک کر بولے "بھارت اور پاکستان میں بڑا فرق ہے ہمیں ہمیشہ اپنے زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے" میں نے ہاں میں گردن ہلا دی وہ صحیح فرما رہے تھے واقعی ہمارے اور بھارت کے زمینی حقائق میں بڑا فرق ہے ہم مضبوط اور روشن خیال لوگ ہیں ہم ہر قسم کا وار سہہ جاتے ہیں جبکہ بھارت کے سیاستدان کمزور اور بے بس ہیں وہ عوام کی نظروں کی تپش برداشت نہیں کر سکتے لہذا ان میں اور ہم میں بڑا فرق ہے میں وہاں سے واپس آ گیا لیکن راستے میں مجھے بار بار الال بہادر شاستری کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے جو اس نے 1956ء میں استعفیٰ دیتے ہوئے لوگ سجا میں کہے تھے انہوں نے کہا تھا "میں جسٹسی طور پر ایک کمزور شخص ہوں لوگ میرے نرم لہجے کو بھی میری کمزوری سمجھتے ہیں لیکن میں آج یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں میں صرف ظاہری طور پر کمزور ہوں میرے اندر تو اتنی ہی جوش ہے طاقت بھی اور ضمیر بھی میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں میں قوم کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں ریلوے کے وزیر کی حیثیت سے مسافروں کی جان اور مال کی حفاظت میری ذمہ داری تھی اور میں یہ ذمہ داری نبھانے میں ناکام رہا اس حادثے نے ثابت کر دیا میں اس عہدے کے اہل نہیں تھا لہذا میں اپنا استعفیٰ پیش کرتا ہوں اور قوم سے درخواست کرتا ہوں وہ یہ ذمہ داری کسی ایسے اہل اور ذمہ دار شخص کو سونپ دے جو ان کی حفاظت کر سکنے جو انہیں تحفظ دے سکے"



اللہ کے سفیر

احمد علی سید میر سے دوست ہیں وہ پیشے کے لحاظ سے ٹیلی ویژن پروڈیوسر ہیں اور ان کی ساری زندگی پلی ٹی وی میں تفریحی ان کی تنظیم بھی ریڈیو پاکستان کی تنظیمی ہوئی پروڈیوسر تھی یہ دونوں میاں بیوی چند ماہ قبل برطانیہ شفٹ ہو گئے میر سے لئے یہ خبر انتہائی حیران کن تھی میں دونوں میاں بیوی کو بڑے قریب سے جانتا ہوں یہ دونوں محبت وطن اور سچے فنکار تھے اور الیکٹرانک میڈیا میں بھی دونوں کا بڑا نام تھا یہ دونوں مالی اور خاندانی لحاظ سے بھی بڑے خوشحال اور مضبوط تھے لہذا ان کے باہر منتقل ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی مجھے جب ان کی ہجرت کی خبر ملی تو میں نے ایک مشترکہ دوست سے اس کی وجہ پوچھی میر سے یہ دوست شاہ جی سے برطانیہ میں مل کر آئے تھے انہوں نے بتایا شاہ جی کا ایک بچہ معذور ہے دونوں میاں بیوی بچھلے دس بارہ سال سے اس بچے کی نگہداشت کر رہے تھے دونوں اپنی ذہنی کوششوں اس طرح مرتب کرتے تھے کہ ان میں سے کوئی ایک ہر وقت بچے کے ساتھ رہے پچہ ان برسوں میں بڑا ہو گیا لہذا اب ان دونوں کیلئے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا بچہ ایٹارل تھا چنانچہ اسے اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا شاہ جی اور ان کی تنظیم نے پاکستان میں ایٹارل بچوں کے تمام ادارے دیکھے لیکن وہ کسی ادارے سے مطمئن نہ ہوئے ایک آدھ ادارہ اچھا لگا لیکن اس ادارے کے اخراجات بھی بہت زیادہ تھے اور وہ دونوں خوشحال ہونے کے باوجود اس ادارے کی فیس ادا نہیں کر سکتے تھے شاہ جی لندن آتے جاتے رہتے تھے انہوں نے وہاں ایٹارل بچوں کے ادارے دیکھے تو انہیں ان کا ماحول بہت اچھا لگا لہذا دونوں میاں بیوی بچوں سمیت برطانیہ منتقل ہو گئے وہ جب برطانیہ پہنچے تو برطانوی حکومت نے نہ صرف اس ایٹارل بچے کا وظیفہ لگا دیا بلکہ حکومت نے بچے کے میڈیکل تعلیم اور تربیت کے اخراجات بھی اپنے ذمے لے لئے حکومت نے اس ایٹارل بچے کی وجہ سے شاہ جی اور ان کے خاندان کو بعض ایسی رعایتیں بھی دے دیں جو عام شہریوں یا ایگریٹنس کو نہیں ملتیں شاہ جی کا کہنا تھا سوشل بچوں کے ادارے کی ایک وین روزانہ ان کے گھر آتی ہے ان کے بچے کو سکول لے جاتی ہے وہاں وہ اس بچے کو دوسروں کے سہارے کے بغیر زندگی گزارتا اور اپنا مطمح نظر سمجھانے کا طریقہ سکھاتے ہیں وہ اسے کھیلنے کو دینے اور تفریح کرنے کے طریقے بھی بتاتے ہیں ہر تیسرے دن ایک نرس ان کے گھر آتی ہے

اور بچے کو اپنا کمرہ درست کرنے، ہاتھ روم صاف کرنے اور کپڑے پینے کے طریقے سکھاتی ہے، وہ بچے کے ساتھ گپ شپ بھی کرتی ہے، شاہ جی کا کہنا تھا جب سے وہ برطانیہ آئے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے ان کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ مل ہو گیا اور ان دونوں میاں بیوی نے زندگی میں پہلی بار آزادی اور فراغت کے ساتھ کام کرنا شروع کیا ہے اور اب انہیں گھر واپس جانے کی فکریں ہوتی ہیں میرے دوست نے شاہ جی سے واپسی کے بارے میں پوچھا تو شاہ جی نے فوراً جواب دیا "ہم اپنے بچے کیلئے یہاں آئے ہیں لہذا جب تک پاکستان میں ہمارے بچے کو ایسی سہولتیں نہیں ملتیں ہم برطانیہ ہی میں رہیں گے"

کل 3 دسمبر کو معذور بچوں کا عالمی دن تھا، میں نے جب صبح کے اخبارات میں معذور بچوں کے بارے میں رپورٹس دیکھیں تو مجھے بے اختیار شاہ جی اور ان کا بچہ یاد آ گیا اور میں نے سوچا کیا ہماری حکومت ہمارا معاشرہ اور ہمارے لوگ معذوروں کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں اور کیا ہمارے ملک میں معذوروں کو ان کے حقوق مل رہے ہیں، مجھے محسوس ہوا، ہم لوگ معذوروں کو ایک فیصد سے بھی کم توجہ دیتے ہیں اور یہ ان لوگوں کا رویہ ہے جنہوں نے دنیا میں معذوروں کے حقوق کی بنیاد رکھی تھی، جنہوں نے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار معذوروں کو سٹیٹ کی ذمہ داری قرار دیا تھا، حضرت عمر فاروق کے دور میں معذوروں کیلئے بیت المال سے نہ صرف خصوصی وظیفہ جاری ہوتا تھا بلکہ معذور بچوں کے والدین کو بھی ریاست کی طرف سے خاص رعایتیں دی جاتی تھیں، ان کے دور میں اندھوں کو حکومت کی طرف سے خصوصی خادم سپاہی کئے جاتے تھے، یہ خادم روزمرہ کے کاموں میں ان کی مدد کرتے تھے، حضرت عثمان کے دور میں حکومت معذوروں کو گھر تک بنا کر دیتی تھی جبکہ مساجد میں ان کیلئے خصوصی وضو خانے بنائے جاتے تھے، خلفائے راشدین کے بعد بھی تمام اسلامی حکمرانوں اور ریاستوں نے ایٹارل اور خصوصی بچوں کیلئے خاص قسم کے قوانین پاس کئے، ہسپانیا اور ہندوستان میں معذوروں کو بعض ملازمتوں میں ترجیح دی جاتی تھی، شاہ جہاں اور اورنگزیب کے دور میں 80 فیصد سرکاری مشین اور وسیقہ نویس ناگھوں سے معذور تھے جبکہ زیادہ تر ہر کارے بازوؤں یا آنکھ سے محروم ہوتے تھے لیکن آج اسلام کے نام سے بننے والی ریاست میں معذوروں کی بحالی کا کوئی قانون ہے اور نہ ہی ان کیلئے فنڈ جبکہ آپ اس کے مقابلے میں غیر اسلامی ممالک میں جا کر دیکھ لیں، آپ کو محسوس ہو گا وہ لوگ معذوروں، ایٹارل اور خصوصی شہریوں کو انتہائی پروٹوکول دیتے ہیں آج یورپ میں اس وقت تک کسی عمارت کا نقشہ منظور نہیں ہوتا جب تک اس عمارت میں خصوصی افراد کی نقل و حمل کا بندوبست نہ ہو جائے، تمام ترقی یافتہ ممالک کے پبلک ٹرانسپورٹ میں خصوصی افراد کیلئے ٹوائٹ ہوتے ہیں اور یہ ٹوائٹ دوسرے ٹوائٹس کے مقابلے میں سائز اور خوبصورتی میں کہیں اچھے ہوتے ہیں، یورپ کے تمام ممالک کے سٹاپنگ سنٹروں میں خصوصی افراد کیلئے "ریسٹ" بنے ہوتے ہیں، تمام سینما ہاؤسز، کلبوں، پارکوں، سینسوز، چیئرز، ہونٹوں، ٹرینوں اور جہازوں میں خصوصی لوگوں کیلئے خصوصی راستے اور نشستیں ہوتی ہیں، تمام پارکنگ میں ان کی گاڑیوں کیلئے جگہ مخصوص ہوتی ہے، برطانیہ میں قلعہ پارکنگ بہت بڑا جرم ہے اور ملک سے لے کر روزیرا عظیم تک کوئی شخص اس

قانون سے مبرا نہیں لیکن معذور افراد برطانیہ کے جس مقام اور جس شاہراہ پر چاہیں گاڑی کھڑی کر دیں، کوئی شخص ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا، ذمہ دار کے تمام سگنلز میں اندھوں کیلئے گھنٹیاں لگی ہیں جو نئی سگنل گرین ہوتا ہے یہ گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتی ہیں جبکہ دیگر ترقی یافتہ ممالک میں معذوروں کا علاج، تعلیم، تربیت اور نگہداشت مفت ہے اور حکومت پیداوار سے لے کر انتقال تک ان کی تمام ضرورتوں کی ذمہ دار ہوتی ہے اس کے مقابلے میں آپ اپنے ملک کا جائزہ لیں تو اس ملک میں خصوصی شہری اور معذور بچے انتہائی افسوسناک صورتحال کا شکار ہیں چند سال پہلے تک اسلام آباد جیسے شہر میں معذوروں کیلئے پارکنگ اور ریپ نہیں تھے اللہ تعالیٰ ہی ڈی اے کے موجودہ چیئرمین کا مران لاشاری کا ہلکا کرے انہوں نے آکر شہر میں ان لوگوں کیلئے ریپ اور پارکنگ بنوائیں پورے ملک میں خصوصی افراد کی بحالی کیلئے کوئی اچھا سنٹر نہیں، حکومت نے آج تک معذوروں کیلئے کسی خصوصی سگنل کا اعلان نہیں کیا لہذا پاکستان کے تمام معذور بچے والدین کی ذمہ داری ہو کر رہ گئے ہیں اور حکومت نے آج تک ان کی ذمہ داری نہیں اٹھائی۔

ہم جب ایک مسلم معاشرے کا غیر مسلم اور لادین معاشرہ سے مقابل کرتے ہیں تو ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور ہم سوچتے ہیں وہ لوگ ہم سے ہزاروں گنا بہتر ہیں جو بے دین ہونے کے باوجود شرمگاہ تک خوف خدا سے لبریز ہیں، ہمارے ملک میں لوگ مجھ سے کر کے ماتھے پر عراب ڈال لیتے ہیں لیکن ان کے خصوصی افراد سڑکوں پر بھیک مانگ رہے ہوتے ہیں، میں جب بھی یورپ کی ترقی دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے پیچھے ان معاشرہ کے معذوروں، غریبوں اور لاچاروں کی دعائیں نظر آتی ہیں، میرا ایمان ہے زندگی کی نعمتوں اور صلاحیتوں سے محروم لوگ بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کے سفیر ہوتے ہیں، یہ لوگ معاشرہ میں اللہ کا پیغام لے کر اترتے ہیں اور جو معاشرے اللہ تعالیٰ کے ان سفیروں سے محبت سے پیش آتے ہیں، جو ان کو علاج، معالجے، تعلیم اور نگہداشت کی سہولت فراہم کرتے ہیں اور جو ان پر اپنا حق، امن اور دھن قربان کر دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی ترقی، خوشحالی، عروج، رزق اور خوشی میں اضافہ فرما دیتے ہیں، وہ ان پر نعمتوں اور انعامات کے دروازے کھول دیتے ہیں، وہ انہیں برطانیہ، جاپان اور امریکہ بنا دیتے ہیں اور جو ملک اللہ تعالیٰ کے ان سفیروں کو پاگل خانوں، سڑکوں اور چوکوں میں کھڑا کر دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان قوموں کے ہاتھ میں کشتوں دے کر انہیں اقوام عالم کی دہلیز پر لا بٹھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان ملکوں سے نعمتیں چھین لیتا ہے اور اللہ انہیں بھکاری بنا دیتا ہے۔



جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے

”اوائے سائیز پر ہو جاؤ“ ایک نہایت کھردری، غیر مہذب اور بھدی آواز میری سماعت سے گرائی۔ میں غصے سے پیچھے مڑا لیکن میرے پیچھے ایک مہذب، پڑھا لکھا اور خوبصورت شخص کھڑا تھا۔ اس نے قیمتی اطالوی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے بالوں پر جل لگا تھا، اس کی آنکھوں پر دھوپ کا مہنگا چشمہ تھا اور اس کے بدن سے اعلیٰ درجے کی خوشبو آ رہی تھی، میں ایک لمبے کیلے ٹھنک گیا۔ میں ابھی مجھے میں تھا کہ دوسری مرتبہ وہی کھردری آواز آئی ”سائیز ہونا“ میں نے دیکھا اس مہذب شخص کے پیچھے انتہائی آٹھ دس اجڑے غیر مہذب اور بد معاش قسم کے لوگ کھڑے تھے، ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھیں۔ انہوں نے لمبے گھیرے کی شلواریں اور کھلے کرتے پہن رکھے تھے اور ان کے گلے میں چادر میں لٹک رہی تھیں ان سب نے اس مہذب شخص کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا، میں چند لمحوں کے لیے سکتے میں آ گیا اور میں نے گھبرائی آواز میں پوچھا ”کیا مطلب“ بد معاشوں میں سے ایک نے اپنا کھردرا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور مجھے ایک طرف دیکھ کر بولا ”میں کہہ رہا ہوں ڈاکٹر صاحب کو راستہ دو، سائیز پر ہو جاؤ“ میں نے حراحت کی کوشش کی لیکن وہ کھردرا ہاتھ مجھ سے زیادہ طاقتور تھا۔ میں سائیز پر ہو گیا، اس مہذب شخص نے کلینک میں پاؤں رکھا آگے بڑھا اور وہ سارے بد معاش اسے حصار میں لے کر چل پڑے۔

مجھے اس سارے معاملے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی، میں تھوڑی دیر گیت پر کھڑا رہا اور اس کے بعد میں بھی اندر آ گیا اور اپنے دوست کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا وہ سارے بد معاش میرے دوست کے کمرے کے باہر کھڑے تھے، وہ مونچھوں پر تازہ دیتے تھے، کلاشنکوفیں لہراتے تھے اور دائیں بائیں دیکھتے تھے، میں اندر داخل ہونے لگا تو ایک بد معاش نے آگے بڑھ کر دروازے کے فریم پر ہاتھ رکھ دیا، میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ کھردری آواز میں بولا ”تم ابھی اندر نہیں جا سکتے“ میں نے وجہ پوچھی تو بولا ”اندر ہمارے ڈاکٹر صاحب ہیں جب تک وہ باہر نہیں آتے، کوئی اندر نہیں جا سکتا“ مجھے غصہ آ گیا اور میں نے پیش میں دروازے پر دستک دے دی۔ وہ لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے جکڑ لیا، میں ان کے ساتھ الجھ پڑا جس کے بعد کلینک میں شور ہو گیا۔ میرا شور اندر گیا تو میرا دوست باہر آ گیا وہ میری حالت دیکھ کر گھبرا گیا اور بھاگ کر اندر واپس چلا گیا ذرا دیر بعد اندر سے وہی مہذب آواز باہر آئی ”بھئی انہیں اندر آنے دیں، یہ ہمارے دوست ہیں“ بد معاشوں نے فوراً میرا

سربان چھوڑا، میری شرٹ کی سلوٹس درست کیں اور مجھے بڑے آرام سے اندر دھکیل دیا۔ اندر وہی مہذب شخص کرسی پر بیٹھا تھا اور میرا دست اس کے پہلو میں کھڑا ہو کر شرمندگی اور محنت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا منہ سرخ تھا اور میرے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ مہذب شخص اٹھا، اس نے انگریزی میں میرے ساتھ معذرت کی اور مجھے ساتھ والی کرسی پر بٹھا دیا۔ ہم تینوں چپ چاپ بیٹھ گئے، میرے دوست کی نظریں نیچی تھیں۔

کمرے کی فضا بوجھل تھی، میرے دوست نے حالات بہتر بنانے کیلئے قہقہہ لگایا اور ان صاحب کی طرف اشارہ کر کے بولا "آپ ہیں ڈاکٹر عزیز، ملک کے مشہور کارڈیالوجسٹ" وہ ساتھ ہی میری طرف مڑا اور مسکرا کر بولا "آپ کو کون نہیں جانتا، آپ ہیں....." میں خاموش رہا، چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد ڈاکٹر عزیز بولے "میرے گارڈ نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی، میں معافی چاہتا ہوں، یہ گنوار لوگ ہیں، یہ کسی کے سٹینس سے واقف نہیں ہیں" میں نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا، ڈاکٹر عزیز بولے "میں نے یہ لوگ اپنی حفاظت کیلئے رکھے ہیں اور میرا تجربہ ہے آپ کے گارڈز جتنے گنوار، اجڈ اور غیر مہذب ہوں گے" اس معاشرے میں آپ کو اتنی ہی عزت ملے گی "میں نے پہلی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کی طرف دلچسپی سے دیکھا، ڈاکٹر صاحب مسکرائے "میں ایک کامیاب ڈاکٹر ہوں، گراچی، لاہور اور اسلام آباد میں میرے کلینک ہیں، میں ہفتے میں دو دن دینی بھی جاتا ہوں لہذا یہ گارڈز میری جان، میری پرنکس اور میرے سٹینس کی حفاظت کرتے ہیں، اگر یہ میرے ساتھ نہ ہوں تو میں اغواء ہو جاؤں، جان سے جاؤں یا دس بیس کروڑ دے کر جان چھڑاؤں" میں چپ چاپ سنتا رہا، وہ بولے "گارڈز سے پہلے ملک میں میری کوئی عزت نہیں تھی، میں بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے جاتا تھا تو گھنٹہ گھنٹہ لائن میں کھڑا رہتا تھا اور میری باری نہیں آتی تھی۔ مریضوں کے لواحقین میرے کلینک میں میری بے عزتی کر جاتے تھے، لوگ میری گاڑی پر سکرینچ ڈال دیتے تھے، کار پوریشن کا مکمل دس دن میرے گھر کے سامنے سے کچرا نہیں اٹھاتا تھا اور لوگ سڑک پر مجھے راستہ نہیں دیتے تھے لیکن جس دن سے میں نے گارڈز رکھے ہیں پورا ملک میری عزت کر رہا ہے، میں بینک جاتا ہوں تو فیجر مجھے ریسیو کرنے کیلئے باہر آ جاتا ہے، میرے گارڈز کی ایک نازی میرے آگے اور دوسری پیچھے چلتی ہے لہذا ساری گاڑیاں ہمیں راستے دیتی جاتی ہیں اور ٹریفک پولیس تک اشارہ توڑنے پر مجھے نہیں روکتی چنانچہ مجھے محسوس ہوتا ہے میں زندگی میں اس سے پہلے جھک مارتا رہا ہوں"

میں نے کرسی پر پہلو بدلا اور ان سے عرض کیا "آپ نے یہ سب کہاں سے سیکھا" ڈاکٹر صاحب مسکرائے "میں نے یہ فارمولا اس ملک کے حکمرانوں سے سیکھا، میرے ملک کے حکمرانوں نے مجھے سکھایا اس ملک میں صرف وہی شخص کامیاب اور محفوظ ہے جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے۔ حکمرانوں نے مجھے بتایا اس ملک کا سب سے بڑا قانون، سب سے بڑا آئین اور سب سے بڑا دستور ڈنڈا ہے۔ ڈنڈا پاکستان کی ہر روایت، ہر قانون اور ہر ضابطہ بدل سکتا ہے اور اس ملک میں جس شخص کے پاس ڈنڈا نہیں وہ وہ تہائی اکثریت کے باوجود بے بس اور لاچار ہے۔ اس شخص کا اس ملک میں کوئی ٹھکانہ نہیں" میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا، وہ بولے "آپ صدر ایوب خان سے صدر پرویز شرف تک پاکستان کے تمام فوجی سربراہوں کو کچھ لیجئے، یہ لوگ کس قانون کے تحت صدر بنے

تھے "وہ رے کے اور دو بارہ بولے" ان لوگوں کا قانون ڈنڈا تھا، ان کے پاس طاقت تھی لہذا محترمہ فاطمہ جناح ہوں، شیخ مجیب الرحمن ہوں، ذوالفقار علی بھٹو ہوں پھر یانواز شریف کوئی سیاسی لیڈر ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکا، انہوں نے اسے اٹھا کر ڈسٹ بین میں پھینک دیا" میں خاموش رہا، وہ بولے "جبکہ ان کے مقابلے میں ڈنڈے والے اس وقت تک حکمران رہے جب تک زندگی اور صحت نے انہیں مہلت دی اور پارلیمنٹ سے لے کر عدالت اور مذہب سے لے کر عوام تک کوئی ادارہ، کوئی قانون ان کا بال تک بیکانہ کر سکا۔ ان لوگوں نے ذاتی اقتدار کے لیے اسمبلیاں توڑیں، آئین منسوخ کیے، اپنی مسلم لیگیں بنائیں اور اپنی مرضی کے ایکشن کرائے مگر کسی نے ان کا ہاتھ نہ روکا، یہ لوگ پوری زندگی اپنی مرضی کرتے رہے اور جب ان کا انتقال ہوا تو انہیں پورے اعزاز سے دفن کیا گیا، کیوں؟ کیونکہ ان کے پاس ڈنڈا تھا "وہ رے کے اور قہوڑی دیر بعد بولے" ڈنڈے کا یہ فلسفہ اس ملک کے جس شخص کو سمجھ آ گیا وہ سکھی ہو گیا، آپ یقین کریں اس ملک کی پولیس عوام کی حفاظت کیلئے معرض وجود میں نہیں آئی یہ صرف ڈنڈے والوں کی سیوریٹی اور ان کے دشمنوں کو کچلنے کے لیے بنائی گئی ہے، اس ملک کی عدالتیں کمزوروں اور مظلوموں کو انصاف فراہم کرنے کے لیے نہیں بنیں۔ یہ ڈنڈے والوں کے ناجائز اقتدار کو قانونی شکل دینے کیلئے بنی ہیں اور سی بی آر سے لے کر ریٹوں تک اس ملک کا کوئی ادارہ عوام کے لیے نہیں بنا، یہ تمام ادارے حکمران کلاس کی معیاشی کے لیے پیسے جمع کرنے کے لیے بنے ہیں چنانچہ میں جان گیا اگر میں نے اس معاشرے میں زندہ رہنا ہے تو مجھے بھی ہاتھ میں ڈنڈا اٹھانا ہوگا"

میں حیرت سے انہیں دیکھا رہا، وہ بولے "تم مدرسہ ہفصہ کی مثال لو، اس مدرسے کی پانچ ہزار طالبات نے ہاتھوں میں ڈنڈے اٹھا رکھے تھے۔ تم ان ڈنڈوں کی طاقت دیکھو، ان طالبات نے 21 جنوری سے چلڈرن لائبریری پر قبضہ کر رکھا ہے لیکن حکومت کو جو اوائی تک قبضہ چھڑانے کی جرأت نہیں ہوئی ان ڈنڈوں کے پیچھے چہرہ کر مولانا عبد العزیز اور مولانا عبد الرشید غازی نے اپنی پولیس اور اپنی عدلیہ بنالی، انہوں نے اسلام آباد کے دس مربع کلومیٹر میں شریعت نافذ کر دی لیکن تاریخ کے طاقتور ترین صدر جنرل پرویز مشرف بھی خاموش بیٹھے رہے وہ کبھی علماء کرام سے مدد کی اپیل کر رہے تھے اور کبھی سول سوسائٹی کو مداخلت کی دعوت دے رہے تھے کیوں؟ کیونکہ مدرسہ ہفصہ کی طالبات کے پاس پانچ ہزار ڈنڈے تھے" وہ رے کے اور میری طرف مڑ کر بولے "ان طالبات کو ڈنڈے اٹھانے پر کس نے مجبور کیا تھا؟" میں خاموش رہا، وہ گویا ہوئے "ان کے ہاتھ میں بارہ اکتوبر نے ڈنڈے دیے تھے یہ لوگ سمجھ گئے تھے اگر ایک ڈنڈے سے سارا آئین اور قانون فارغ ہو سکتا ہے تو پانچ ہزار ڈنڈے حکومت کی ساری رٹ بھی لپیٹ سکتے ہیں" وہ رے کے اور دو بارہ بولے "اب تم بتاؤ حکومت نے دس جولائی 2007ء تک ان کے خلاف ایکشن کیوں نہیں لیا" میں خاموش رہا، وہ بولے "حکومت جانتی تھی ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے ہیں اور اس ملک میں جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہو کوئی شخص اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا" ڈاکٹر اٹھے "سلام کیا اور گارڈز کے جلو میں کیلنک سے باہر نکل گئے۔"



میں جانتا ہوں یہ پاگل ہے

ڈاکٹر رشید چودھری ملک کے مشہور نفسیات دان تھے انہوں نے لاہور میں "فونٹین ہاؤس" کے نام سے ایک شاندار ادارہ بنایا۔ یہ دماغی امراض کا ادارہ ہے جس میں شیزوفرینیا، پاگل پن اور مینٹل کا علاج ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک دلچسپ اور شاندار انسان تھے ان کی باتوں میں بڑی گہرائی اور دانائی تھی، میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کیلئے کبھی کبھی لاہور جاتا تھا، ایک دن میں ان کے پاس گیا تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ یہ میری زندگی کا واحد واقعہ ہے جو مجھے روزیاد آتا ہے اور یہ ہر بار مجھے کسی نہ کسی بحران، کسی نہ کسی خرابی سے بچا جاتا ہے، میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا تو وہاں ایک صاحب بیٹھے تھے ان کی عمر پچاس اور بچپن کے درمیان تھی اور وہ شکل سے ابھی خامے معزز انسان دکھائی دیتے تھے ڈاکٹر صاحب نے میرا حال احوال پوچھا، ہم نے آپس میں چند جملوں کا تبادلہ کیا، اس دوران وہاں موجود صاحب نے نہایت خشکی سے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور درحقیقت سے بولے "ڈاکٹر صاحب میں آپ سے گفتگو کر رہا تھا" آپ نے مجھے چھوڑ کر اس لوٹے سے ہاتھیں شروع کر دیں، آپ دونوں کو میری موجودگی میں ایک دوسرے سے سلام لینے کی جرات کیسے ہوئی، میں اس صاحب کے طرزِ نظم اور بدتمیزی پر حیران رہ گیا لیکن ڈاکٹر صاحب بڑے پیار سے بولے "یہ نوجوان میرا دوست ہے اور میں آپ سمیت اپنے تمام دوستوں کا احترام کرتا ہوں" وہ صاحب مزید غصے میں آگئے اور انہوں نے اونچی آواز میں ڈاکٹر صاحب کو گالیاں دینا شروع کر دیں، انہوں نے پہلے انگریزی میں بکواس کیا، اس کے بعد نہایت نستعلیق اردو میں مہلکات بکس اور آخر میں وہ پنجابی پر اتر آئے، میں نے زندگی میں اتنی غلیظ گالیاں کبھی نہیں سنی تھیں لیکن ڈاکٹر صاحب مسکرا مسکرا کر ان کی طرف دیکھتے رہے، وہ صاحب گالیاں دے دے کر ہنسنے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے چہرہ اسی کو بلایا اور ان کی طرف اشارہ کر کے بولے "آپ مرزا صاحب کو اندر لے جائیں، میں ابھی آتا ہوں" مرزا صاحب نے فوراً چہرہ اسی کو بھی مہلکات میں شامل کر لیا، ڈاکٹر صاحب نے تہہ لگایا اور میری طرف دیکھ کر بولے "ہور کی حال اے" میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا "اس شخص نے آپ کو اتنی گالیاں دیں لیکن آپ کو لہر نہیں آیا" ڈاکٹر صاحب آگے جھک کر بولے "کیونکہ میں جانتا ہوں یہ شخص پاگل ہے اور کسی پاگل

شخص کی بات کا برامتنا ہے وقوفی ہوتی ہے۔ میرے ذہن میں ایک فلیش سا ہوا اور وہ لمحہ وہ دفتر، وہ سارا منظر اور ڈاکٹر صاحب کے خیالات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے دماغ میں نقش ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب بعد ازاں انتقال کر گئے لیکن آج بھی جب کوئی شخص میرے ساتھ نامقول بات کرتا ہے، کوئی مجھے غیر ضروری بحث میں گھسیٹنے کی کوشش کرتا ہے یا پھر کوئی شخص بلاوجہ میرے ساتھ الجھنے لگتا ہے تو مجھے فوراً ڈاکٹر رشید چودھری کا دفتر یاد آ جاتا ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے میرے سامنے مرزا صاحب بیٹھے ہیں اور اگر میں نے ان کی بات کا برامتنا یا تو اس کو براہِ ارض پر مجھ سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں ہوگا۔

میرے ایک دوست اس معاملے میں ڈاکٹر رشید چودھری سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ میں نے انہیں کبھی غصے میں نہیں دیکھا، میں نے ایک بار ان سے پوچھا "آپ کو غصہ نہیں آتا" وہ مسکرا کر بولے "غصہ انسانی فطرت ہے، میں انسان ہوں لہذا مجھے بھی غصہ آتا ہے" میں نے عرض کیا "لیکن میں نے آپ کو کبھی غصے میں نہیں دیکھا" وہ دوبارہ مسکرائے "میں نے اپنے غصے کو سولتا نڈ کر لیا ہے، میں نے اسے مہذب شکل دے دی ہے" میں نے عرض کیا "مجھے بات سمجھ نہیں آتی" وہ بولے "ہمیں زندگی میں دو قسم کے لوگ غصہ دلاتے ہیں، ایک وہ لوگ ہیں جو جان بوجھ کر پوری منصوبہ بندی سے ہمارے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ حادثاتی ہوتے ہیں، پہلی قسم کے لوگ ہمارے دشمن ہوتے ہیں یہ لوگ ہمیں تنگ کر کے نفسیاتی لطف لیتے ہیں، مجھے جب پہلی قسم کا کوئی شخص تنگ کرتا ہے تو میں فوراً اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کیا یہ دکھ، یہ تکلیف اور یہ توہین اس لذت سے زیادہ تھی جو ابو جہل اور ابولہب نبی کریم ﷺ کو پہنچاتے رہے، میں فوراً تو یہ کہتا ہوں اور میری ساری مینشن اور ساری اینگلو اینی دور ہو جاتی ہے۔ دوسری قسم کے لوگ حادثاتی ہوتے ہیں، یہ غصہ لے کر گھر سے نکلتے ہیں اور کوئی ایسا شخص تلاش کرتے ہیں جس کے سر پر اپنے غصے کی گھڑی رکھ سکیں، مجھ سے جب بھی کوئی ایسا شخص الجھتا ہے تو میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کیا یہ شخص علم، عقل، سماجی رتبے اور تہذیب میں مجھ سے بہتر ہے؟ کیا میرے جیسے پڑھے لکھے نہیں، شائستہ اور معزز شخص کو ایک ریڑھی بان دیکھنے والے، کرپا نہ مرچنٹ، کنڈیکٹر، ڈرائیور، مزدور، چڑھاسی یا کھرک سے الجھنا چاہیے لہذا میں فوراً مسکرا کر آگے بڑھ جاتا ہوں" مجھے ان کی بات ادھوری لگی "میں نے پوچھا" لیکن آپ کو برا تو لگتا ہوگا، آپ کو غصہ بھی آتا ہوگا، آپ اس کا کیا کرتے ہیں" وہ مسکرائے "میں نے اپنے غصے کو پریکٹیکل بنا دیا ہے" میں خاموشی سے سنتا ہا، وہ بولے "میں نے ایک غریب طالب علم کو اعلیٰ تعلیم دلوائی، اسے یونیورسٹی میں ملازمت لے کر دی اور وہ اب طالب علموں کو شائستگی کی تعلیم دیتا ہے، وہ انہیں برداشت کرنے اور مسکرنے کا آرت سکھاتا ہے یہ میرے غصے کی ایک پریکٹیکل شکل ہے اس کی اور بھی بے شمار صورتیں ہیں مثلاً میں اپنے دوستوں کو برداشت کرنے کا ہنر سکھاتا رہتا ہوں، میں ہر مینے سیرت کی کتابیں خریدتا ہوں اور لوگوں کو تحفہ دیتا ہوں، میں سلمان رشدی جیسے لوگوں کی گستاخوں کا جواب دینے کے لیے عالمی سطح کے پانچ سالہ تیار کر رہا ہوں، میں بٹس کو کالی دینے کی بجائے لوگوں کو امریکی معاشرے کی خامیاں بتاتا ہوں اور میں لوگوں کو ورزش کرنے، معیاری کتابیں پڑھنے اور روزے رکھنے کی

تراب دیتا ہوں، میری یہ کوششیں میرے غصے کو کھا جاتی ہیں“ میں نے ان سے عرض کیا، ”اگر کوئی شخص آپ کی فکری، نفسیاتی اور اخلاقی غیرت پر حملہ کرے تو بھی آپ کو غصہ نہیں آتا“ انہوں نے قہقہہ لگایا، ”آتا ہے لیکن میں گالی کا جواب گالی اور دھمکی کا جواب دھمکی میں دینے کی بجائے اپنی غیرت، اپنی عزت کو مزید مضبوط بنالیتا ہوں میں اپنے نظریات، اپنی فکر اور اپنے اخلاق کو مزید قوت دے دیتا ہوں میں یہ سمجھتا ہوں وہ نظریہ، نظر یہ اور وہ فکر، فکر نہیں جو ایک بد اخلاق اور بد نظریہ شخص کی گالی سے متاثر ہو جائے میں یہ سمجھتا ہوں دھمکی، گالی اور غصہ کمزور لوگوں کے ہتھیار ہوتے ہیں اور اگر ہماری شخصیت کے قلعے مضبوط ہیں تو یہ ہتھیار کنکر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔“

اگر ہم انسانی تاریخ کو نکال کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے دنیا کی تمام لڑائیوں، کشمکشوں، اختلافات اور جنگوں کا آغاز کسی ایک نامعقول بات یا کسی ایک گالی سے ہوا تھا، کسی پاگل شخص نے ایک احمقانہ بات کی ہے دوسرے نے اس بات کا جواب دیا اور اس کے بعد فرد سے لے کر قوموں تک کی زندگی عذاب ہو گئی۔ خاندان سے لے کر ملک تک قتل و غارت گری کا شکار ہو گئے۔ اگر لوگ ڈاکٹر رشید چودھری کی طرح ایک لمحے کے لیے اپنے مخاطب کو پاگل سمجھ لیں اور اس کی بات یا گالی کا جواب نہ دیں، اگر وہ دوسروں کے ساتھ اچھے سے پرہیز کریں گے تو یقین کیجئے غصے اور بد تمیزی کی یہ چنگاری فوراً بجھ جائے، ہم اگر غصے کا نفسیاتی تجربہ کریں تو معلوم ہوتا ہے ہماری زندگی میں جب بھی کوئی شخص بد تمیزی کرتا ہے، کوئی ہمارے ساتھ دھمکی سے مخاطب ہوتا ہے تو ہم اسے سمجھ دار، عاقل اور ذہین شخص سمجھ بیٹھتے ہیں اور اس کے ساتھ بحث میں الجھ جاتے ہیں، ہم اسے سمجھانے، بھانے یا سبق سکھانے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں چنانچہ اس کا وہی نتیجہ نکلتا ہے جو ایک پاگل اور سمجھدار شخص کی بحث کا نکلے گا، میرا دعویٰ ہے عام گلی محلے کی لڑائی سے لے کر عالمی جنگیں تک کسی ایک رد عمل، کسی ایک جواب سے شروع ہوتی ہیں ہم کسی ایک نامعقول اعتراض، کسی ایک واہیات بات یا کسی ایک گالی کا جواب دیتے ہیں اور اس کے بعد لوگوں کا اختلاف پورے شہر یا پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، اگر ہم خود کو کسی نامعقول رویے، کسی فضول بات کا جواب دینے سے روک لیں تو ہماری پوری زندگی، بحران سے بچ جائے کیونکہ گالی کا جواب دینا بہادری نہیں ہوتا، گالی پر مسکرا دینا بہادری ہوتا ہے۔



شاید ہمیں

خاتون اردو سیکنگ تھی مگر اس نے مضمون پنجابی میں لکھنا تھا، اس کا خیال تھا میں ایک پکا ٹھکانہ پنجابی ہوں لہذا میں اس کی مدد کر سکتا ہوں، اس نے مجھ سے پوچھا ”سر جزیرے کی پنجابی کیا ہوگی“ میری ہنسی نکل گئی۔ وہ پنجابی کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھی۔ پچھلے پچاس برسوں میں پنجابی زبان نے دوسری زبانوں کا جتنا اثر لیا اس ملک کی کوئی دوسری علاقائی زبان اتنی ساثر نہیں ہوئی، اس وقت اردو اور انگریزی سب سے زیادہ پنجاب میں بولی جا رہی ہیں لہذا اگر دیکھا جائے تو پنجابی زبان میں جس قدر اردو اور انگریزی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اتنے سنگی، پشتو، بلوچی، براہوی، ہندکو اور سرائیکی میں نہیں ہوتے، ہم شہروں میں رہنے والے پنجابی لوگ اس ثقافتی پلغار سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں، انگریزی ہماری کاروباری مجبوری ہے جبکہ اردو ہماری قومی زبان ہے لہذا ان دونوں مجبوریوں نے مل کر پنجابی زبان کا طیبہ بگاڑ دیا، آج عالم یہ ہے ایک پنجابی لڑکے کی شادی پنجابی لڑکی کے ساتھ ہوتی ہے تو دونوں پہلے دن اردو بولنا شروع کرتے ہیں اور پوری زندگی بولتے چلے جاتے ہیں، اگر آپ اردو بولنے والے پنجابی گھرانوں میں جا کر دیکھیں تو آپ کو وہاں عجیب منظر دکھائی دے گا، آپ دیکھیں گے خاتون اپنی ماں اور سر کے ساتھ پنجابی میں گفتگو کر رہی ہے اور خاوند اپنے دوست احباب، پڑوسیوں اور دوکانداروں سے پنجابی بول رہا ہے لیکن جوں ہی دونوں کا آنا سامنا ہوتا ہے دونوں اردو بولنا شروع کر دیتے ہیں، یہی صورت حال بچوں کے ساتھ ہے، بعض گھرانوں میں میاں بیوی آپس میں پنجابی بولتے ہیں لیکن بچوں کے ساتھ وہ اردو میں گفتگو کرتے ہیں، پنجابیوں کے مقابلے میں پشتو لوگ، بلوچوں اور سندھیوں کا رویہ یکسر مختلف ہے، یہ لوگ گھروں سے لے کر دفتروں اور کاروباری مراکز تک احساس کتری کے بغیر اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں لہذا ان لوگوں کی زبانیں بڑی حد تک بیرونی اثرات سے محفوظ ہیں، جبکہ ہم پنجابیوں کو عام روزمرہ کے الفاظ تک نہیں ملتے اور ہم پنجابی میں اردو اور انگریزی کے لفظ جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ میں واپس خاتون کی طرف آتا ہوں، خاتون نے مجھ سے ”جزیرہ“ کی پنجابی پوچھی تھی، مجھے معلوم نہیں تھی، میں نے اپنے چند پنجابی دان دوستوں سے رابطہ کیا لیکن انہیں بھی معلوم نہیں تھا، ذرا سا غور و فکر اور بحث و تحقیق کے بعد معلوم ہوا پنجابی زبان میں ”جزیرہ“ کا لفظ ہی نہیں اور

اس کی وجہ پنجاب کا جغرافیہ ہے پنجاب کی سرحدیں کیونکہ سمندر سے بہت دور ہیں چنانچہ پنجابی زبان کو سمندر اور جزیرے جیسے الفاظ کی ضرورت نہیں پڑی لہذا پنجابی زبان ان الفاظ سے محروم ہے۔

زبانیں کیسے بنتی ہیں اور کن کن مراحل سے ہو کر بنتے ہوتی ہیں یہ ایک مکمل سائنس ہے میں اس سائنس سے ناواقف ہوں لیکن میں ایک بات جانتا ہوں زبانوں کا جغرافیہ، ثقافت اور لوگوں کے مزاج سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے زبانیں ہمیشہ ماحول سے جنم لیتی ہیں اور لوگوں کا مزاج ان میں رنگ بھرتا ہے پچھلے دنوں ملک کے نامور ادیب، شاعر اور صف اول کے کالم نگار جناب عطاء الحق قاسمی صاحب کے ساتھ میری گپ شپ ہو رہی تھی اس گپ شپ کے دوران ہم لوگوں نے "ڈسکور" کیا پوری پنجابی زبان میں شکر یہ اور معافی کے الفاظ نہیں ہیں ان دو بنیادی الفاظ کی کمی ہماری تاریخ اور ہماری ثقافت کو ظاہر کرتی ہے ہم لوگ کیونکہ کسی کے مشکور ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی سے معافی مانگتے ہیں لہذا ہماری زبان میں یہ دونوں لفظ موجود نہیں ہیں ہم لوگ کندھا مارنے کے باہر ہیں اور کندھا مارنے کے بعد اس کی زد میں آنے والے شریف انسان کی طرف آکھ تک اٹھا کر نہیں دیکھتے لہذا آج تک ہماری زمین میں شکر یہ اور معافی جیسے الفاظ کاشت نہیں ہوئے میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں اگر اسلام میں شکر یہ ادا کرنا تنگی نہ ہوتا تو پنجابی اسلام قبول کرنے کے بعد بھی کسی کے مشکور نہ ہوتے۔ عطاء الحق قاسمی صاحب کا کہنا تھا پنجابی کی طرح اردو میں "کھرے" کا لفظ نہیں ہے وہ انتظار حسین جیسے سکھ ہنداردو دان تک سے پوچھ چکے ہیں لیکن آج تک کوئی اردو دان کھرے کا مترادف نہیں پیش کر سکا اس کی وجہ اردو دان طبقے کا "لیونگ سینڈرز" تھا یہ لوگ نلکے کے ساتھ کھرائیں بناتے تھے جبکہ پنجاب میں ہر نلکے کے ساتھ کھرا ہوتا تھا چنانچہ پنجابی کھرے کے لفظ سے واقف ہیں اس کے بعد وہاں بحث چمڑگی جس میں ہم لوگوں نے "ڈسکور" کیا انگریزی زبان میں غیرت کا لفظ نہیں ہے اس کی وجہ انگریزی ثقافت ہے انگریزی ثقافت میں کیونکہ غیرت کا جذبہ نہیں ہوتا لہذا انگریزی زبان کو آج تک لفظ غیرت کی ضرورت نہیں پڑی۔

اس بحث کے بعد میں نے محسوس کیا جس طرح زبانیں نئے جذبوں، نئی روایات اور نئے ماحول کے مطابق نئے الفاظ ایجاد کرتی رہتی ہیں بالکل اسی طرح زبانوں سے غیر ضروری الفاظ خارج بھی ہوتے رہتے ہیں۔ زبانوں کے لفظ مرتے بھی رہتے ہیں مثلاً آپ جمہوریت کو لے لیجئے، یہ لفظ ہمارے معاشرے میں بڑی تیزی سے غیر ضروری اور بے وقعت ہوتا جا رہا ہے لہذا عوام نے اس پر توجہ دینا بند کر دی ہے میرا خیال ہے اگلے دس پندرہ برسوں میں یہ لفظ ہماری لغات سے خارج ہو جائے گا، اسی طرح انصاف، قانون اور مساوات کے الفاظ ہیں یہ بھی بڑی تیزی سے بے وقعت اور پھیکے ہوتے جا رہے ہیں، یہ لفظ بھی بہت جلد ہمارا ساتھ چھوڑ دیں گے، اسی طرح بعض الفاظ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے معانی بھی بدل لیتے ہیں۔ مثلاً آپ سیاست کو لے لیجئے یہ لفظ 1930ء سے 1978ء تک مقدس سمجھا جاتا تھا لیکن 1979ء کے بعد اس لفظ کے تقدس میں بڑی تیزی سے کمی آئی یہاں تک کہ 2006ء تک پہنچ کر اس کے معنی سمجھوتہ، منافقت، ابن الوقتی اور بے اصولی ہو گئے، روشن خیالی کا

مطلب کبھی وسعت قلبی، برداشت اور دوسرے کی رائے کا احترام ہوتا تھا لیکن اب اس کا مطلب بے حیائی، فحاشی اور عریانی ہو چکا ہے، اعتدال کا لفظ کبھی تو ازن کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن اب اس کا مطلب امریکہ نوآزی اور اسلام دشمنی بن چکا ہے، وہشت گردی کبھی ذہنی اور عمل و عادت گری کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن آج یہ لفظ اہل ایمان کے لیے استعمال ہوتا ہے، آج اس کا مطلب قرآن و سنت پر عمل کرنے والے لوگ ہیں، حکومت کی نظر میں مجاہد کا لفظ کبھی اتہامی محترم ہوتا تھا اور ہمارے ملک میں "اے جاگ ذرا مرد مجاہد جاگ" جیسے ٹی ٹرانے تک بنائے اور سنائے جاتے تھے لیکن اب یہ لفظ بھی متروک ہو چکا ہے اور حکومت کی ڈکشنری میں اس کے معانی بھی بدل چکے ہیں لہذا اگر ہم اپنے معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیں تو یوں محسوس ہوتا ہے شاید آنے والے دنوں میں ہماری ڈکشنریوں سے ماں اور باپ کے الفاظ بھی ختم ہو جائیں، شاید ہمیں آنے والے دنوں میں ایمانداری، دیانت، خودداری، انعامت نفس، وقار، احساس، ہمدردی اور عقل جیسے الفاظ کی بھی ضرورت نہ رہے اور شاید آنے والے دنوں میں ہماری ہر ڈکشنری کا آغاز ضرورت سے ہو اور ہماری ہر لغت نظریہ ضرورت پر ختم ہو۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

لوڈ شیڈنگ

دنیا میں طوفانِ نوح سے پہلے عقاب زمین پر رہتے تھے یہ چھوٹی قامت کے پرندے تھے یہ درختوں پر مگھولے بناتے تھے مرغیوں کی طرح زمین پر چلتے تھے اور بلخوں کی طرح ”نوسے پانچ“ جیسی روٹیں لائف گزارتے تھے طوفان سے پہلے حضرت نوح نے عقابوں کو کشتی میں سوار ہونے کی دعوت دی لیکن عقابوں نے یہ پیش کش مسترد کر دی ان کہتا تھا دنیا میں کتنا برا طوفان آ جائے گا پانی زیادہ سے زیادہ سمندر سے باہر نکلے گا لوگوں کی فصلیں زیر آب آئیں گی اور بات ختم ہو جائے گی اور ہم اس دوران درختوں پر چڑھ جائیں گے حضرت نوح نے انہیں سمجھانے کی بڑی کوشش کی لیکن جب یہ نہ مانے تو انہوں نے عقابوں کے چند انڈے کشتی میں رکھے اور سفر پر روانہ ہو گئے طوفان کے بعد زندگی کا نیا سفر شروع ہو گیا انڈوں سے عقابوں کے بچے نکلے اور انہوں نے جب اپنے آباؤ اجداد کی بے وقوفی کا قصہ سنا تو انہوں نے ہجرت پکڑی اور پہاڑوں کو اپنا سیرا بنا لیا وہ دن ہے اور آج کا دن ہے عقاب بلندی پر اڑتے ہیں اور پہاڑوں پر رہتے ہیں برسوں پہلے کسی نے عقاب کو سمجھایا طوفان گزر چکا ہے اب یہ واقعہ دوبارہ پیش نہیں آئے گا لہذا تم واپس اپنی روٹیں کی طرف آ جاؤ عقاب نے یہ مشورہ سنا اور اسے بڑا دلچسپ جواب دیا اس نے کہا ”قدرت کسی کی پابند نہیں ہوتی اگر اللہ تعالیٰ نے کسی دن ”پلے بیک“ کا ارادہ کر لیا تو ہمارا کیا بنے گا“

ماہرینِ حیاتیات جانداروں کے حراج کی ان تہذیبوں کو ”فراسٹ“ کہتے ہیں ان کا خیال ہے قدرت کے اقدامات سے استفادہ نہ کرنے والے جاندار زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتے ماہرین کا کہنا ہے دنیا میں وہ قومیں اور وہ ملک بھی زوال پذیر ہو جاتے ہیں جو اپنے بحرانوں اور تجربوں سے سبق نہیں سیکھتے ماہرین اس سلسلے میں مصر سے موبخو داؤنک دنیا کی بے شمار قدیم تہذیبوں کی مثال دیتے ہیں وہ بتاتے ہیں ان تہذیبوں نے بھی عقابوں جیسی غلطیوں کی تھیں چنانچہ آج یہ مٹی کے ڈھیر بن کر رہ گئی ہیں ماہرین ہاکڑا کی تہذیب کی مثال دیتے ہیں یہ لوگ دریائے سرسوتی کے کنارے آباد تھے اور ان لوگوں نے آباد ہوتے وقت یہ فراموش کر دیا تھا اگر دریائے اپنا رخ پھیر لیا تو ان کا کیا بنے گا مصر کے لوگوں نے بھی یہ بھلا دیا تھا اگر ریت کا بہت بڑا طوفان آ گیا اور آن واحد میں کھربوں ٹن ریت ان کی بستیوں پر آ گری تو ان کا کیا بنے گا اسی طرح قدیم تہذیب کے لوگ یہ بھول گئے تھے اگر پہاڑوں کے گلیشیر پگھل گئے اور یہ گلیشیر ان کے شہروں پر آ گئے تو ان کا کیا بنے گا بائبل کے لوگوں نے بھی یہ

فراموش کر دیا تھا اگر حملہ آوروں نے شمال سے حملہ کر دیا تو وہ شہر کی حفاظت کیسے کریں گے اور قسطنطنیہ کے لوگوں نے بھی یہ نہیں سوچا تھا اگر کسی نے فنگلی پر جہاز چلا دیے تو ان کا کیا بنے گا ماہرین کا خیال ہے دنیا کی بے شمار قدیم تہذیبوں نے شہر آباد کرتے ہوئے قدرتی وسائل کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا انہوں نے قدرتی آفات کے امکانات کو بھی فراموش کر دیا اور انہوں نے انسانی مسائل اور وسائل میں بھی توازن برقرار نہیں رکھا تھا لہذا یہ ملک ٹوٹ گئے یا پھر فنا ہو گئے ماہرین نوآبادیاتی دور کی مثال بھی دیتے ہیں ماہرین کا کہنا ہے یورپی اقوام ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک پر قبضہ کرتے ہوئے یہ بھول گئی تھیں ہم اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ان ممالک کو سمندر پار سے کیسے کنٹرول کریں گی یورپی اقوام کی اس غلطی نے انہیں نہ صرف یورپ میں واپس دیکھل دیا بلکہ وہ اپنے اصل علاقوں سے بھی محروم ہو گئیں آج یہ اقوام ان لوگوں کے شدید دباؤ میں ہیں جن پر کبھی یہ لوگ حکومت کرتے تھے ماہرین کا کہنا ہے قدرت ہر انسان کو ایک یا دو بار اپنی غلطی کی اصلاح کا موقع دیتی ہے لیکن اللہ کسی قوم کو غلطیاں کرنے یا دہرانے کا چانس نہیں دیتا لہذا قوموں کی ایک آدھ غلطی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اقوام کی فہرست سے خارج کر دیتی ہے ماہرین کا خیال ہے قوموں کو ایک ایک قدم چھوٹ چھوٹ کر اٹھانا چاہیے انہیں ہزار سال تک کی منسو بہ بندی کرنی چاہیے اور انہیں اس منسو بہ بندی سے ایک لمحے کیلئے دائیں بائیں نہیں ہونا چاہیے۔

حیاتیات کا یہ فلسفہ سو فیصد درست ہے قوموں کے پاس غلطیوں کی گنجائش بھی نہیں ہوتی اور قوموں کی زندگیوں میں بہت کم ایسی غلطیاں ہوتی ہیں جن کی اصلاح ممکن ہوتی ہے تاریخ کے لگانے اکثر زخموں کو سینا ممکن نہیں ہوتا آپ مشرقی پاکستان کی مثال لیجئے ہم آج لاکھ کوشش کر لیں لیکن ہم بھگدیش کو دوبارہ مشرقی پاکستان نہیں بنا سکیں گے اسی طرح پوری اسلامی دنیا مل کر بھی خلافت کا دور واپس نہیں لاسکتی اور دنیا کی کوئی طاقت آج روس کو دوبارہ سوویت یونین نہیں بنا سکتی ہم لوگ یہ حقیقت جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم غلطی پر غلطی کرتے چلے جا رہے ہیں اور ہم کسی غلطی سے سبق نہیں سیکھتے آپ بجلی کے موجودہ بحران کو لیجئے پاکستان میں بجلی کا سب سے بڑا بحران 1994ء میں پیدا ہوا تھا اس دور میں حکومت نے بجلی پھانے کیلئے ٹیلی ویژن نشریات تک کی "لوڈ شیڈنگ" شروع کر دی تھی مجھے اچھی طرح یاد ہے اس دور میں "پیک آؤرز" میں ٹیلی ویژن کی نشریات دو گھنٹے کیلئے بند کر دی جاتی تھیں اس دور میں حکومت نے غیر ملکی کمپنیوں کو بجلی کی صنعت میں سرمایہ کاری کی دعوت بھی دی تھی حکومت نے سرمایہ کاری کے روزنرم کر دیئے جس کے نتیجے میں بے شمار چھوٹی بڑی کمپنیاں پاکستان آئیں اور انہوں نے بجلی کے بزنس میں سرمایہ کاری کی حکومت کی اس پالیسی کے باعث 1996ء تک نہ صرف بجلی کا یہ بحران ختم ہو گیا بلکہ پاکستان کے پاس بجلی زائد ہو گئی یہ بے نظیر بھنوں کی حکومت تھی اور آصف علی زرداری بدقسمتی سے اس اچھے کام میں فرنٹ پر تھے جب 1997ء میں نواز شریف کی حکومت آئی اور سیف الرحمن خان کو احتساب کی ذمہ داری سونپ دی گئی تو خان صاحب نے اپنے احتساب کا آغاز بجلی سے کیا وہ "آئی پی پی" کو ملک سے خداری ثابت کرنے میں جت گئے تھے انہوں نے تمام کمپنیوں کے نمائندوں کو بلایا اور انہیں نئے نرخ پر مجبور کر دیا اس دور میں قانونی بجلی بھارت کو فروخت کرنے کا فیصلہ بھی ہوا تھا یہ سلسلہ 2000ء تک جاری رہا تھا 2000ء میں حکومت

کواچانک محسوس ہوا پاکستان میں بجلی کی مانگ میں اضافہ ہو رہا ہے اور اگر پیداوار میں اس کے مطابق اضافہ نہ ہو تو مستقبل قریب میں ملک بجلی کے شدید بحران کا شکار ہو جائے گا چنانچہ حکومت نے 2002ء میں پاور پالیسی بنائی اور غیر ملکی کمپنیوں کو ایک بار پھر پاکستان میں قمرل پلانٹس لگانے کی دعوت دے دی یہ پالیسی تو بن گئی لیکن 2007ء تک اس پالیسی پر عملدرآمد نہ ہو سکا اس دوران گیارہ کمپنیوں نے پاور پلانٹس لگانے کی اجازت بھی لی لیکن اس اجازت اور عملدرآمد کے درمیان بیوروکریسی حائل ہو گئی اور 2007ء تک ایک بھی کمپنی پاکستان میں پاور پلانٹ نہ لگا سکی اس وقت صرف ایک کمپنی نے پاور پلانٹ کی تعمیر شروع کی ہے یہ پلانٹ لاہور کے مضافات میں لگ رہا ہے اور اس کی پیداوار بھی 2009ء میں شروع ہوگی حکومت جانتی تھی چھوٹے سائز کے ہائیڈرو پاور پلانٹ لگانے کیلئے پانچ سے چھ سال کا عرصہ چاہیے جبکہ قمرل پلانٹس کو تیسرے سے پیداوار کیلئے دو سے اڑھائی سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے حکومت کے نوٹس میں یہ حقیقت سائز سے سات برس پہلے آگئی تھی لیکن حکومت نے ان سائز سے سات برسوں میں بجلی کے شعبے میں ایک سی پی کی سرمایہ کاری نہیں کی 2007ء اپریل میں جب بجلی کا بحران شروع ہوا تو حکومت نے اس کے حل کیلئے روایتی طریقہ استعمال کرنا شروع کر دیا حکومت نے لوڈ شیڈنگ اور شام آٹھ بجے تمام دوکانیں اور شاپنگ سنٹر بند کرنے کا حکم دے دیا اس حکم سے بجلی تو بچ گئی لیکن معیشت کو دس کھرب روپے کا نقصان پہنچ گیا حکومت اب دن رات پاور پلانٹس لگانا شروع کر دے گی اور ان کے نتیجے میں دو تین برسوں میں ہماری ضرورت سے زائد بجلی پیدا ہونے لگے گی اور اس کے بعد یقیناً آنے والی حکومت آصف علی زرداری کی طرح جناب سلیمان شاہ کا احتساب بھی شروع کر دے گی لہذا وقت ثابت کرے گا ہم 2007ء میں ٹھیک تھے اور نہ ہی 2010ء میں ہمارا رویہ درست ہوگا۔

یہ بحران بھی ثابت کر رہا ہے ہم ایک عجیب قوم ہیں ہم گرمی میں پانی کی کمی کے باعث مرتے ہیں اور مون سون میں ہم سیلاب میں غرق ہو جاتے ہیں ہم نے آج تک نقطہ سے بچنے کی کوئی لائیک ٹرم پلانٹنگ کی اور نہ ہی ہم عوام کو سیلاب سے بچانے کا کوئی جامع منصوبہ تیار کر رہے ہیں ہم عجیب قوم ہیں ہم کبھی بھارت کو فالتو بجلی بیچتے ہیں اور کبھی لوڈ شیڈنگ پر مجبور ہو جاتے ہیں ہم کبھی قمرل پاور پلانٹس کو ملک سے غمداری قرار دیتے ہیں اور کبھی یہ ہماری سب سے بڑی ضرورت بن جاتے ہیں ہم کیسے لوگ ہیں ایسی قوموں کے بارے میں نوٹن بی نے کہا تھا "یہ برف پر کھڑی قومیں ہیں جن کی بنیادیں پگھل رہی ہیں" جوں جوں وقت گزر رہا جا رہا ہے ہم لوگ خود کو نالائق اور کوتاہ فہم ثابت کرتے جا رہے ہیں لہذا اگر دیکھا جائے تو ہم میں اور موجود ڈاؤ کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں وہ لوگ پانی کی کمی کے باعث مر گئے تھے اور ہم لوگ لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے دم توڑ رہے ہیں۔



منافقت

ان کی آواز میں تلخی تھی، میں نے عرض کیا، میں ڈرامائیجنگ کر رہا ہوں، آپ کا فون نہیں بن سکا اگر آپ کل فون کر لیں تو بہتر ہوگا لیکن انہیوں نے انکار کر دیا، میں نے گاڑی فوراً سائٹ پر کھڑی کر دی۔

مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے، ہم موبائل فون کے سلسلے میں انتہائی سفاک ہیں، ہم میں ابھی فون کی اخلاقیات پیدا نہیں ہوئیں، پوری دنیا میں موبائل کو "پرائیویٹ پراپرٹی" سمجھا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں لوگ وزینگ کارڈز پر موبائل فون کا نمبر درج نہیں کرتے وہاں اگر کوئی شخص کسی کو موبائل نمبر دے تو وہ اس سے یہ ضرور پوچھتا ہے، "کیا میں آپ کے موبائل پر فون کر سکتا ہوں" امریکہ میں لوگ پہلے گھریا دفتر کے نمبر پر فون کرتے ہیں اگر مطلوبہ شخص وہاں دستیاب نہ ہو تو وہ موبائل پر مختصر سی کال کرتے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں لوگ موبائل کو "پبلک پراپرٹی" سمجھتے ہیں، ہم لوگ کسی بھی وقت کسی کے موبائل پر کال کر دیتے ہیں اور اس کی مجبوری کا خیال کئے بغیر بلا ٹکانہ بولتے چلے جاتے ہیں۔ میں بھی موبائل فون کے متاثرین میں شامل ہوں، میں نے ایک دن اپنے موبائل کا پردھائل نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا مجھے سات گھنٹوں میں ایک سو نو کالیں آئی تھیں اور یہ تمام کالیں شکوؤں اور شکایتوں سے لبریز تھیں، میں نے اس دن اپنے لئے موبائل کی اخلاقیات وضع کیں اور ان پر سختی سے کاربند ہو گیا، میں نے کسی کے موبائل فون پر کال کرنی ہو تو میں پہلے "ایس ایم ایس" کرتا ہوں، اسے اپنا تعارف کراتا ہوں اور اس سے فون کرنے کی اجازت مانگتا ہوں، اگر اس کا مثبت جواب ملے تو میں اسے کال کر لیتا ہوں بصورت دیگر اس کے جواب کا انتظار کرتا ہوں۔ میں جب بھی کسی کے موبائل پر فون کرتا ہوں تو میں اس سے یہ ضرور پوچھتا ہوں "آپ مصروف تو نہیں ہیں؟ آپ ڈرامائیجنگ تو نہیں کر رہے؟ اور کیا میں آپ سے اتنے منٹ بات کر سکتا ہوں؟" میں ہمیشہ کوشش کرتا ہوں میں دوسروں کو ٹیلی فون پر بری خبر نہ سناؤں، اس کی وجہ میرے ایک دوست ہیں، میرے یہ دوست کہا کرتے ہیں "ہم نے نئی فون کو ڈیپریشن پھیلائے والا آلہ بنا دیا ہے" وہ کہتے ہیں "آپ دن میں پچاس بار فون اٹھائیں، آپ کو دوسری طرف سے ہمیشہ بری خبر ملے گی، کوئی نہ کوئی شخص آپ کی مینشن اور ڈیپریشن میں اضافہ کرے گا" میں اپنے دوست کی بات سے اتفاق کرتا ہوں، ہم لوگ حقیقتاً اچھا ڈیپریشن اپنی مینشن اور اپنی

فرسٹریشن فون کے ذریعے دوسروں تک منتقل کرتے رہتے ہیں، موبائل فون کا ایک مسئلہ ہماری آواز بھی ہے، ہم جب بھی فون کرتے ہیں تو ہم اپنی آواز میں دنیا جہاں کی بد قسمتی، کشتلی، تکبر اور غصہ بھر لیتے ہیں، ہم یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے دوسری طرف صدر بش جیٹھا ہے اور ہم نے ٹیلی فون کے ذریعے اس سے افغانستان اور عراق کے تمام شہداء کا بدلہ لینا ہے، لوگوں کی اس عادت کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہو چکا ہے، پچھلے دنوں بعض علماء کرام مجھ سے ناراض ہو گئے اور ان حضرات نے پاکستان کے طول و عرض پر پھیلے اپنے ہزاروں شاگردوں کو ٹیلی فون پر تعینات کر دیا، یہ مونیٹن مجھے فون کرتے اور میرے السلام علیکم کے جواب میں انتہائی غلیظ گالیاں دیتے، علماء دین کا یہ پہلو میری نظروں سے اوجھل تھا لہذا میں حیران رہ گیا، بعد ازاں پتہ چلا اس ٹیلی فونک کیمپین کے روح رواں میرے ایک سابق جاسوس دوست تھے، انہوں نے علماء دین کو بتایا تھا میرے عقائد میں ملاوٹ آگئی ہے اور جب تک میری ماں، بہن کو کھالی نہیں دی جائے گی میرا کٹری اور نظریاتی قبلہ درست نہیں ہوگا چنانچہ مہربانوں نے مجھے دس دن میں چار ہزار کالز کیں اور جب تک میں نے اپنے عقائد کی درستی کا اعتراف نہ کر لیا، ان لوگوں کا ٹیلی فونک جہاد جاری رہا لہذا کہنے کا مطلب ہے، ہم لوگوں نے موبائل کو اذیت رسائی کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔

میں ان صاحب کی طرف واپس آتا ہوں، میں نے گاڑی سائٹیز پر روک لی، وہ صاحب بڑے غصے سے فرما رہے تھے، آپ نے پچھلے دنوں پاکستان کے نشان کے بارے میں کالم لکھا تھا، آپ نے لکھا تھا 51 برس تک پاکستان کا سرکاری نشان "ایمان، اتحاد اور تقویٰ" کی بجائے "اتحاد، ایمان اور تقویٰ" رہا، میں نے فوراً اپنا جرم تسلیم کر لیا، وہ غصے سے بولے، "ہمارے سرکاری نشان میں ایمان پہلے نمبر پر آئے یا دوسرے درجے پر؟ آپ مجھے بتائیے اس ملک میں ایمان ہے کہاں؟" میں نے محذرت کی اور ان سے درخواست کی میں نے کسی جگہ پہنچنا ہے اور اگر وہ مجھے کل فون کر لیں تو میں زیادہ تفصیل سے گفتگو کر سکوں گا، انہوں نے غصے سے فون بند کر دیا، میں آگے چل پڑا لیکن ان کے بتائے نقطے پر سوچنا شروع کر دیا، ان کی بات درست تھی، ہمارا سرکاری نشان ایمان، اتحاد اور تقویٰ پر مشتمل ہے، ہماری تمام سرکاری دستاویزات پر یہ قومی کنشٹ ڈریج ہے، لیکن اس ملک میں ان تینوں چیزوں کا انتہائی فقدان ہے، ہم سب سے پہلے ایمان کی طرف آتے ہیں، ایمان کے تین درجے ہوتے ہیں، برائی کو قوت بازو سے روکنا، برائی کو زبان سے روکنا اور دل میں برائی کو برائی سمجھنا، ہم بد قسمتی سے ان میں سے کسی درجے میں نہیں آتے، ہم نے برائی کو نظریہ ضرورت کی شکل دے دی ہے۔ ہم برائی کو ذمہئی حقائق کہنے لگے ہیں، مسجد ایمان کا مرکز اور داؤمی اور نماز ایمان کا لباس ہوتے ہیں، لیکن ہماری مسجدیں نفاق اور فرقہ پرستی کا میدان بن چکی ہیں۔ ہماری مسجدوں میں فرقہ پرستی کا فساد کاشت ہوتا ہے، ہم خانہ خدا میں بیٹھ کر دوسرے مسلمانوں کو کافر ثابت کرتے ہیں، ہم پولیس کے بغیر اپنی مسجدوں میں نماز ادا نہیں کر سکتے اور ہم نے اس ملک میں اہل ایمان کو بدہشت گرد بنا دیا ہے، ہماری ایمانداری کا یہ حال ہے اس ملک میں دودھ، دوا اور پانی تک خالص نہیں ملتا، لوگ عمروں اور تھوڑے کے نام پر فراڈ کرتے ہیں اور گدھوں کی اون سے جائے نمازیں بناتے ہیں، لوگ جعلی رنگ اور گھٹیا کپڑا بیچنے کیلئے قسم اٹھا لیتے ہیں، لوگ قرآن

اشفا کر جھوٹی گواہیاں دیتے ہیں، ہمارے ڈاکٹر مریضوں کے گردے چوری کر لیتے ہیں اور ہمارے سیاستدان پارلیمنٹ میں حلف اٹھا کر لوٹے ہو جاتے ہیں اور ہمارے ایمان کی یہ حالت ہے ہم بٹش کو خوش کرنے کے لئے اپنے سینکڑوں ہزاروں لوگوں پر ہم برسا دیتے ہیں، ہم وانا میں تو ہیں گاڑ دیتے ہیں، ہماری دوسری کمنٹ اتحاد تھا۔ آپ کراچی سے لے کر لنڈی کوتل تک اتحاد کا مطالعہ کر لیجئے، ہم 60 برس بعد بھی پٹھان، بلوچی، سندھی اور پنجابی ہیں، ہم آج تک پاکستانی نہیں بن سکے، ہم آج تک کسی مسئلے پر ایک نہیں ہو سکے، ہم آج بھی ڈیم بنانے پر ایک دوسرے سے الجھ رہے ہیں، ہمارے بلوچ کو پنجابی نہیں آتی اور ہمارا پنجابی پشتو اور سندھی نہیں سمجھ سکتا۔ ہمارے اتحاد کا یہ عالم تھا، ہم نے 1971ء میں اپنا آدھا ملک کاٹ کر پھینک دیا تھا اور آج تک اس کا رونا ہے پر فخر کر رہے ہیں، ہماری اپوزیشن جماعتیں تک کسی مشترک ایجنڈے پر متفق نہیں ہو پاتیں۔ ہماری ایم ایم اے چار سال میں استغفوں پر اتفاق رائے قائم نہیں کر سکی اور ہماری ہر سیاسی جماعت کئی کئی بار سیورٹی رسک اور تدارق قرار دی جا چکی ہے اور ہماری تیسری کمنٹ لقمہ تھا، آپ اس ملک کی سڑکوں پر لقمہ وضبط کا مظاہرہ دیکھ لیجئے، اس ملک میں 81 برس بعد بھی قطار نہیں بن سکی، آج بھی لوگ ایک دوسرے کے کندھے پر چڑھ کر بجلی کا بل ادا کرتے ہیں، لوگ حج کے فارم کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان ہوتے ہیں اور افطاری کی کجھور کے لیے دوسرے کو کتینی مارتے ہیں، سڑکوں پر ہر گاڑی دوسری گاڑی سے آگے ٹکنا چاہتی ہے، ہر چوک پر درجنوں گاڑیاں سنگٹل توڑتی ہیں اور لوگ فائر بریگیڈ اور ایسپولیسوں کے راستے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہمارے ملک میں لقمہ وضبط کا یہ عالم ہے یہاں کوئی بھی شخص کسی بھی وقت، کسی بھی ادارے کا سربراہ بن سکتا ہے اور اسے کوئی چیٹینج نہیں کر سکتا۔

مجھے ان صاحب کی بات میں بڑا وزن محسوس ہوا، مجھے لگا ہم اخلاقی، سیاسی اور سماجی ہر شعبے میں منافقت کا شکار ہیں، ہم لوگ اپنے ہر شعبے میں منافقت کا بیج بوتے ہیں، اس بیج کو منافقت کا پانی اور کھاد دیتے ہیں اور اس کے بعد توقع کرتے ہیں اس پر ترقی اور خوشحالی کے پھل اور پھول لگیں گے، ہم اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیتے ہیں اور اس کے بعد اس سے کرم اور رحم کی دعائیں کرتے ہیں، ہم لوگ منافقت کے زمیندار ہیں، ہم بیروں پر سب اگانا چاہتے ہیں اور ہم بانسوں کے رس سے گڑ بنانا چاہتے ہیں۔



کیونیکیشن ایج

”یہ ہمارے دوست ہیں، طاقتور صاحب، آپ سے ملنے کیلئے امریکہ سے آئے ہیں“ اسد نے طاقتور صاحب کا تعارف کرایا اور میں نے ان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا، ابھی میرا ہاتھ ان کے ہاتھ تک نہیں پہنچا تھا کہ ان کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ طاقتور صاحب نے ایکسکلیوٹو زمی کہا، موبائل کی سکرین دیکھی اور ہیلو کانفرہ لگا کر موبائل کان سے لگا لیا، میں نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا، طاقتور صاحب بڑی دیر تک امریکہ کی لہجے میں گفتگو کرتے رہے اور ہم دونوں ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے رہے، فون بند ہوا تو انہوں نے صدر ریش کے سائل میں سواری کہا اور ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن ہاتھ کے ہاتھ تک پہنچنے سے پہلے میرا موبائل بج گیا۔ میں نے جلدی جلدی ہاتھ ملایا اور میز کی طرف بھاگ کھڑا ہوا، میرا فون مسلسل بج رہا تھا، فون پر جنرل صاحب کا نام چمک رہا تھا۔ میں جنرل صاحب کی کال ”انگور“ نہیں کر سکتا تھا لہذا میں نے فوراً فون اٹھایا اور اس کے بعد ہم دونوں صدام حسین کی پھانسی اور اس کے ما بعد اثرات پر گفتگو کرنے لگے۔ جنرل صاحب کو میرے نظریات اور خیالات سے شدید اختلاف تھا جبکہ میں انہیں قائل کرنے کے لیے ایزی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ ہماری گفتگو 15 منٹ تک جاری رہی۔ اس دوران اسد اور طاقتور صاحب کھڑے رہے اور میں کمرے میں ٹھیل ٹھیل کر فون سنتا رہا۔ جنرل صاحب نے تھک کر فون بند کیا تو میں دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔ طاقتور صاحب اس وقت موبائل پر کسی فیڈرل سیکرٹری سے لائرنی کے نمبر ڈسکس کر رہے تھے اور اسد دہلی دہلی آواز میں اپنی بیوی سے چھوٹی بیٹی کی طبیعت پوچھ رہا تھا۔ وہ دونوں کمرے کے مختلف کونوں میں موبائل کان سے لگائے کھڑے تھے اور میں کبھی ایک کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی دوسرے کی طرف، وہ دونوں بڑی بے چارگی سے میری طرف دیکھتے تھے لیکن دوسری طرف موجود لوگ ان کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اسد نے اپنی بیوی کو جھار پلائی، لہجے سے فون بند کیا اور میری طرف چل پڑا، وہ ابھی بمشکل میرے قریب پہنچا تھا کہ طاقتور صاحب نے موبائل مٹھی میں دبایا اور دہلی آواز میں کہا ”تم نے سیکرٹری صاحب سے بات کرنی تھی“ اسد نے فوراً اثبات میں گردن ہلاتی اور واپس پلٹ گیا، طاقتور صاحب نے سیکرٹری سے اسد کا تعارف کرایا اور فون اس کے ہاتھ میں دے کر میری طرف متوجہ ہو گئے، انہوں نے گرم جوش سے دوبارہ ہاتھ ملایا اور بولے ”میں آپ کا بہت بڑا فین ہوں“ میں نے خوش دلی سے انہیں ہتھی دیکھا تا شروع

کروں۔ ثاقب صاحب نے ابھی بے شکل میرے دانت دیکھے ہوں گے کہ میرا موبائل بج اٹھا، میں نے مسکین پر نظر ڈالی، یہ میری بیوی کا فون تھا، میں نے ایکسکس می زی کہا اور فون اٹھالیا، میں نے بیوی سے پانچ منٹ میں رنگ بیک کا وعدہ کیا لیکن بیوی نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور مجھے بتانا شروع کر دیا "ابا جی کی شوگر بہت بڑھ گئی ہے اور انہیں فوراً ہسپتال پہنچانا ہوگا" میں ہاں ہاں، اچھا اچھا اور ٹھیک ہے ٹھیک ہے قسم ہے جواب دینے لگا۔ اس دوران ثاقب صاحب مجھے بے چارگی سے دیکھتے رہے، میں نے اپنی بیوی سے بڑی مشکل سے دس منٹ مانگے، فون بند کیا اور ثاقب صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ثاقب صاحب نے جیب سے اپنا وزنگ کارڈ نکالا لیکن ابھی یہ کارڈ ان کے ہاتھوں ہی میں تھا کہ اسد نے زور سے سرگوشی کی "ثاقب سیکرٹری صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں" ثاقب صاحب کارڈ لے کر اسد کی طرف چلے گئے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کان جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور فوراً بیوی کو فون ملانے لگا، میری بیوی دس منٹ سے پہلے "رنگ بیک" وصول کر کے حیران رہ گئی اور اس نے ایک بار پھر ابا جی کی شوگر کی رام کہانی سنانا شروع کر دی۔ اس دوران ثاقب صاحب اور اسد نے فون بند کیا اور آکر میرے سر پر کھڑے ہو گئے، میں شرمندگی اور خفت کے طے چلے احساس سے انہیں دیکھنے لگا، وہ میری خفت پہچان گئے چنانچہ اسد نے فون پر دو بارہ بیٹی کا حال پوچھنا شروع کر دیا اور ثاقب صاحب "ایس ایم ایس" کرنے لگے۔ میری بیوی کی کہانی ختم ہوئی تو درمیان میں زیدی صاحب کا فون آ گیا، زیدی صاحب ایک مٹی پھسل کھینے کے "کنٹری ہیڈ" ہیں اور ہماری کھینے ان کے ساتھ بڑے لیول پر کام کرتی ہے چنانچہ میں ان کی کال بھی "آمنور" نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے شدید پریشانی میں ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ابھی تک اپنے اپنے فون کے ساتھ مگن تھے۔ میں نے فوراً فون اٹھالیا، زیدی صاحب میرے سٹاف کی کوتاہیوں کی طویل فہرست لے کر بیٹھے تھے، ہم نے ڈاکوسٹری پچھلے ہنسنے مکمل کرنی تھی لیکن وہ ابھی تک کراچی نہیں پہنچی تھی۔ ہم نے ان کے لیے چار سینما کر کے تھے اور ان سینما روم کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ میں نے زیدی صاحب سے دس منٹ کا وقت مانگا اور اس کے بعد لاہور اور کراچی میں رابطے شروع کر دیے، فلم مکتبہ کے لوگوں سے رابطہ کیا، ایونٹ مینجمنٹ کے لوگوں کو فون کیے اور ساری اپ ڈیٹ لے کر زیدی صاحب کو رپورٹ دے دی۔ میں اس کام سے فارغ ہوا تو اسد و اش روم جا چکا تھا جبکہ ثاقب صاحب لیپ ٹاپ کھول کر "ای میلز" کا جواب دے رہے تھے۔ مجھے واش روم سے اسد کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں، وہ پانی اور کوڑا کے شور کے ساتھ ساتھ موبائل پر کسی کے ساتھ جھگڑ رہا تھا۔ میں نے نککار کر گلہ صاف کیا اور ثاقب صاحب سے مخاطب ہوا "آپ امریکہ میں کیا کرتے ہیں؟" ثاقب صاحب نے چونک کر سر اٹھایا، مسکرا کر ہاتھ میں دبے کارڈ کی طرف دیکھا اور دوبارہ لیپ ٹاپ کی مسکین کی طرف مڑ کر بولے "آئی نیڈ اوٹی ون منٹ" میں مسکرا کر رہ گیا۔ ثاقب صاحب کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ سے کھیلنے لگیں۔ میں نے موبائل فون اٹھالیا، مجھے اس وقت تک 13 ایس ایم ایس مل چکی تھیں۔ میں نے ایس ایم ایس پڑھنا شروع کر دیں۔ اسد و اش روم سے نکلا تو وہ ایک ہاتھ سے جلیٹ ہانڈھنے کی کوشش کر رہا تھا اور

دوسرے ہاتھ سے اس نے موبائل کان کے ساتھ لگا رکھا تھا، اس کا جرس کتنا کسی آوارہ کتیا کے ساتھ بھاگ گیا تھا اور وہ موبائل پر اپنے ملازموں کو کتنا تلاش کرنے کی ہدایات دے رہا تھا۔ اس نے بشکل ہیٹ باندھی لیکن زپ بدستور کھلی رہی۔ میں دوبارہ ایس ایم ایس پڑھنے لگا، ثاقب صاحب ای میل کے جواب ایچے رہے اور اسد موبائل پر کتنا تلاش کرتا رہا، اس کھیل میں ایک گھنٹہ گزر گیا، میں نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا، شام کے چارج چکے تھے، اور یا مقبول جان کا جہاز لینڈ کر چکا تھا اور میں نے اسے ایئر پورٹ سے لینا تھا۔ میں نے اسد کو اشارہ کیا، اس نے فون ہولڈ کر لیا اور میرے منہ پر جھک گیا، میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا، اس نے مجھے اشارے سے جاننے کی اجازت دے دی۔ میں نے ثاقب اور اسد دونوں کی طرف ہاتھ ہلایا اور دفتر سے باہر آ گیا۔

گاڑی تک آتے آتے میرا فون مزید دوسرے جہاز چکا تھا۔ یہ دونوں کالز بھی تھیں اور جنٹ ہوں گی لیکن میرا گاڑی میں بیٹھنا زیادہ ضروری تھا لہذا میں نے کالز "انٹورڈ" کیں اور دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے چابی گھماتے گھماتے "سنڈ کالز" دیکھیں، اف خدا یا یہ دونوں کالز انتہائی اہم تھیں، میں نے ایک ہاتھ میں سٹیئرنگ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے فون ڈائل کرنے لگا۔ دونوں فون "بزی" مل رہے تھے، میں نے ٹھیک اس لمحے سوچا، کیونکہ میں نے اس زمانے نے دور بیٹھے لوگوں کے مابین فاصلے تو مٹا دیے ہیں لیکن اس نے سامنے موجود لوگوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے۔ اس کیونکہ میں اس کی وجہ سے سات برا عقلموں پر پھیلی دنیا ہماری ایک ہیلو کے فاصلے پر آگئی ہے لیکن ہمارے پاس سامنے بیٹھے شخص کے لیے وقت نہیں بچا اور ہم دوری اور نزدیکی کے ایک ایسے گورکھ دھندے میں بھٹس گئے ہیں جس میں دور رہنے والے ہمارے نزدیک آگئے ہیں لیکن نزدیک رہنے والے لوگ ہم سے بہت دور چلے گئے ہیں، ہم جب چاہیں پوری دنیا سے رابطہ کر سکتے ہیں لیکن ہمیں سامنے بیٹھے شخص کے سلام کا جواب دینے میں گھنٹہ لگ جاتا ہے میں نے سوچا کیونکہ میں اس کی یہ دنیا کیسا گلوبل ویلج ہے جس میں قطب شمالی کا باشندہ تو میرے کان کے ساتھ لگ رہا ہے لیکن میرے ہمسائے اور میری صحبت کے نیچے رہنے والے میرے بھائی کو میری "ہیلو" کیلئے سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔"



پروٹوکول

میرے آگے بیچھے دائیں بائیں سینکڑوں گاڑیاں تھیں، مہر سے مہر اور لائٹ سے لائٹ جڑی تھی، ہر طرف ہا ہا کارچی تھی ڈرائیور نے تھوڑی دیر انجن سٹارٹ رکھا پھر گاڑی بند کر کے نیچے اترا اور صورتحال جاننے کیلئے گاڑیوں کے ہجوم میں گم ہو گیا، میں نے شیشہ کھولا اور پریشانی میں آگے بیچھے دیکھنے لگا، ہر طرف دھواں ہی دھواں اور شور ہی شور تھا، ڈرائیور نے واپس آ کر اطلاع دی "روٹ لگا ہے کوئی وی آئی پی گزرنے والا ہے" میں نے بیچھے تک نگالی مجھے یقین تھا میں اب وقت پر ایئر پورٹ نہیں پہنچ سکوں گا، میرے آگے ایک پرانی فونکسی کھڑی تھی، گاڑی کی پچھلی سیٹ پر درمیانی عمر کی ایک خاتون بیٹھی تھی، میں نے اس خاتون کو بار بار بے چینی سے کروٹیں بدلتے دیکھا، وہ ششے سے باہر جھانکتی پہلو بدلتی آگے جھکتی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بزرگ کے کان میں کچھ کہتی، ساتھ بیٹھی بوڑھی خاتون سے مشورہ کرتی اور پھر بیچھے گر جاتی، پانچ سات منٹ کے وقفے سے وہ دوبارہ سیدھی ہوتی اور یہ سارا عمل دہرائی، اس کی بے چینی اتنی نمایاں تھی کہ تمام گاڑیوں میں بیٹھے لوگ اسے نوٹ کر رہے تھے، ذرا دیر بعد میں نے محسوس کیا وہ خاتون چنچ رہی ہے اور اس گاڑی میں بیٹھے لوگوں کے چہروں پر سراسیمگی پھیل رہی ہے، میرے ساتھ میری بیوی تھی، وہ بھی اس خاتون کی پریشانی نوٹ کر رہی تھی، اس نے میری طرف دیکھا، میں نے ہاں میں گردن ہلا دی، وہ نیچے اتری، اس گاڑی کا شیشہ بجایا، خاتون سے بات کی، اس کی والدہ اور خاتون کو نیچے اتارنا، ساتھ والی گاڑی میں بیٹھی تیسری عورت کے کان میں سرگوشی کی، وہ خاتون بھی نیچے اتری اور وہ چاروں عورتیں سڑک سے نیچے اترا کر اور درختوں میں گم ہو گئیں، تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئیں تو وہ خاتون کسی حد تک شانت تھی، میں نے بیوی سے مسئلہ پوچھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، اس نے بتایا، خاتون کو ہسپتال لے جایا رہا ہے، اس کے گردے خراب ہیں، اسے اس وقت ٹوائلٹ کی شدید ضرورت تھی، ہم تینوں عورتوں نے اپنی اپنی چادروں سے اس کیلئے عارضی ٹوائلٹ بنا دیا تھا، یہ اب ٹھیک ہے لیکن یہ افاقہ عارضی ہے، آدھ گھنٹے بعد اس کے گردوں میں دوبارہ درد اٹھے گا۔

میں نے اگلی گاڑی کی طرف دیکھا، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بزرگ آنکھوں پر رومال رکھ کر سٹیرنگ پر جھکے ہوئے تھے اور میرے نے سخت سے بچنے کیلئے چہرے پر چادرتان رکھی تھی، میں نے آگے بیچھے نظریں دوڑائیں، تمام گاڑیوں میں اس سے ملتی جلتی صورتحال تھی، اسکول سے واپس آنے والے بچوں کے ہونٹ خشک اور زبانیں ٹک رہی تھیں، عورتیں سراسیمگی کے عالم میں دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں، میری طرح وقت کے پابند لوگ بار بار

گھڑیاں دلیر رہے تھے اور پریشانی میں پیشانیوں پر دستک دے رہے تھے تمام لوگوں نے کانوں سے موبائل لگا رکھے تھے اور فون پر اپنے اپنے بیارہا کو اپنی مصیبت کی روداد سن رہے تھے میں نے گھڑی دیکھی جہاز چھوٹنے میں صرف پینتالیس منٹ باقی تھے مجھے یقین ہو گیا میں اتیر پورٹ نہیں تھی کس بجائے میں وہاں سے واپس بھی نہیں جاسکتا تھا لہذا میرے پاس ممبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا پورے 35 منٹ بعد "سائزن" کی آواز آئی پانچ منٹ تک پولیس اور پروٹوکول کی گاڑیاں گزرتی رہیں اور اس کے بعد ٹریفک ریگنٹا شروع ہوئی چند بے مبرے ڈرائیوروں نے مہارت کا مظاہرہ کیا اور ٹریفک پھس گئی گاڑیاں ڈیڑھ گھنٹے سے الجھ گئیں ٹریفک کانسٹیبلوں نے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی لیکن جب وہ ٹریفک کی الجھن دور یاں سلجھانے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے اپنے اپنے موٹرسائیکل کو کنگ ماری اور میدان چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ ہم سب لوگ پورا گھنٹہ ایک دوسرے کے ساتھ الجھتے رہے جب گاڑی کھلی سڑک تک پہنچی تو ایک گھنٹہ 45 منٹ ہو چکے تھے راستے میں میری بیوی نے مجھ سے پوچھا "ان لوگوں میں مریض بھی ہو گئے" میں نے جواب دیا "یقیناً" اس نے پوچھا "وہ مریض جو موت سے پانچ منٹ کے فاصلے پر ہوتے ہیں اگر وہ اس صورتحال کا شکار ہو جائیں تو ان کا کیا بننا ہوگا" میں نے اوپر کی طرف دیکھا اس نے پوچھا "استحان کیلئے جانے والے طالب علموں کی کیا حالت ہوتی ہوگی" میں نے کندھے اچکائے اور اس نے آخری سوال پوچھا "اگر کسی نے تمہاری طرح اتیر پورٹ جانا ہو تو وہ کیا کرنا ہوگا" میں نے فوراً جواب دیا "ایسے تمام لوگوں کو اپنی اپنی جہت پر دن دے دینا چاہیے۔"

یہ اسلام آباد کا روز کا معمول تھا میں دن میں بیسیوں مرتبہ یہ کھیل دیکھتا تھا اور سوچتا تھا "کیا حکمرانوں کے کانوں تک روٹ کے شکار ان لوگوں کی سسکیاں نہیں پہنچتیں" کیا ان لوگوں کو خبر نہیں ہوتی وہ جن سٹان سڑکوں سے گزر رہے ہیں ان کے دائیں بائیں سینکڑوں گاڑیاں کھڑی ہیں اور ان گاڑیوں میں اس وقت ہزاروں لوگ جمبولیاں پھیلا پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں" مجھے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا لیکن چند روز قبل میں نے اخبارات میں پڑھا صدر نے ایوان صدر میں اعلیٰ سطحی میٹنگ بلائی ہے اور سیکرٹری داخلہ کو روٹ کا وقت کم کرنے کا حکم دے دیا ہے مجھے یہ خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی مجھے محسوس ہوا اس حکم سے عام شخص کی زندگی میں تھوڑا بہت سکون آ جائے گا اسے اس سے ضرور ریلیف ملے گا اگلے دن خبر ملی صدر نے اس فیصلے پر عملدرآمد کا حکم بھی جاری کر دیا ہے میری خوشی دو چند ہوئی میں نے سوچا دیر سے سب مگر عام آدمی کی آواز بلا کر حکمرانوں کے کانوں تک پہنچ گئی ہے اور اب لوگوں کے مسائل حل ہو جائیں گے لیکن میں اس حکم کے اگلے دن کلب روڈ پر نکلا تو میں دو بارہ اس صورتحال میں پھنس گیا پتہ چلا صدر کا حکم محض کاغذی تھا اور یہ حکم پیدائش کے فوراً بعد فائلوں میں گم ہو گیا یہ انتہائی خوفناک بلکہ سنگدلانہ بات تھی پروٹوکول اور سیکورٹی پوری دنیا میں ہوتی ہے لیکن سیکورٹی اور پروٹوکول کے مورچے شہری زندگی پر نہیں کھودے جاتے اس کی عمارت عام آدمی کے معمول پر تیسر نہیں ہوتی لیکن ہمارے ملک میں سارے نظام الٹ ہیں یہاں حکومت اور حکمرانوں کی کوئی آسائش اس وقت تک مکمل نہیں بھی جاتی جب تک اس آسائش کو دو چار سو لوگوں کا لہو نہ پلایا جائے جب تک لوگوں کو اذیت نہ پہنچے ہمارے حکمرانوں کا پروٹوکول مکمل نہیں ہوتا ہمارے ملک میں حکمران خدمت کرنے کیلئے اقتدار میں نہیں آتے وہ عوام کو تکلیف اور اذیت دینے کیلئے مسند اقتدار پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔



کاشف انوار
Dec-2010

رن لاہور رن

اس نے میکینک لوگوں کے سائل میں سرکھانا شروع کر دیا، میں نے اس سے کہا "نام دیکھو ہم لوگ امریکہ سے زیادہ روشن خیال اور اعتدال پسند ہیں، ہم پچھلے دو برسوں سے میراتھن کر رہے ہیں، تم بتاؤ کیا امریکہ میں میراتھن ہوتی ہیں؟" اس نے نفی میں سر ہلا دیا، میں نے کہا "ہم نے نہ صرف میراتھن کرائی بلکہ ہماری ریس میں خواتین اور مرد دونوں نے حصہ لیا، یہ تمہارا دیکھنے کے لئے پورا لاہور سڑکوں کے کنارے کھڑا تھا اور باقی ملک ٹیلی ویژن کی سکرین پر یہ کھیل دیکھ رہا تھا، تم بتاؤ کیا تمہاری زندگی میں کبھی رن نیو یارک رن یا رن واشنگٹن رن یا رن شکاگو رن ہوا؟" اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا، میں نے کہا "امریکہ میں جب عوامی سطح پر کسی اقدام کی مخالفت ہوتی ہے تو گورنمنٹ اپنی پالیسی بدل لیتی ہے، وہاں ہمیشہ اکثریت کی رائے کو اقلیت پر فوقیت حاصل ہوتی ہے لیکن پاکستان میں حکومت روشن خیالی پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کر رہی، یہاں حکومت عوامی رد عمل پر کالا بارغ ڈیم جیسے ایٹو پر پیچھے ہٹ جاتی ہے لیکن جب روشن خیالی کی بات آتی ہے تو حکومت پوری قوت سے ڈٹ جاتی ہے، تم ہماری میراتھن ریس دیکھو، دونوں مرتبہ اپوزیشن جماعتوں نے احتجاج کیا، عوام کی اکثریت نے اس احتجاج کا ساتھ دیا لیکن اس احتجاج کے باوجود نہ صرف یہ ریس ہوئی بلکہ کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک بھی پہنچی، تم بتاؤ، کیا تمہارے ملک میں ایسا ہوتا ہے؟" اس نے نفی میں سر ہلا دیا، میں نے کہا "اب تم امریکہ سے باہر نکلو اور ذرا سوچ کر بتاؤ کیا برطانیہ، جرمنی، فرانس، اٹلی، چین، جاپان، روس، سوئیڈن اور آسٹریا میں بھی میراتھن ہوتی ہے؟ کیا جاپان، چین، فلپائن، تھائی لینڈ، ملائیشیا اور سنگاپور میں میراتھن ہوتی ہے؟ کیا روس، یوکرین، پولینڈ اور بوسنیا میں میراتھن ہوتی ہے؟ اور کیا آسٹریلیا، کینیڈا اور برازیل میں میراتھن ہوتی ہے؟" اس نے نفی میں سر ہلا دیا، میں نے کہا "لیکن اس کے باوجود تم ہمارے ملک ہمارے معاشرے کو پسماندہ، قدامت پسند اور ایکسٹریمٹ کہتے ہو؟" میں خاموش ہو گیا۔

نام نے دونوں ہاتھوں سے سر کھجایا، ایٹس ٹرے کے کونے پر رکھا سگریٹ اٹھایا، کش لیا اور ناک سے دھواں اگل کر بولا "میں جب بھارت میں تھا تو میں نے وہاں ایک بڑی دلچسپ فلم دیکھی تھی، اس فلم کا ایک سین میرے دماغ میں ریکارڈ ہو کر رہ گیا، میں جب بھی بھارت کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے فوراً وہ فلم اور اس فلم کا وہ سین یاد آ جاتا ہے، اس فلم کی ہیروئن فریب اور ہیرو امیر تھا، ہیرو اپنے والدین پر زور دے کر ہیروئن کے ساتھ

شادی کر لیتا ہے جس کے بعد بیرون کچے مکان سے محل میں آ جاتی ہے اس محل میں اسے ہر قسم کا آرام ملتا ہے لیکن اسے عزت اور خوشی نہیں ملتی وہ وہاں بے چین اور پریشان رہتی ہے ایک دن بیرون کا باپ اپنی بیٹی سے ملنے آتا ہے بیٹی اپنے باپ کو دیکھ کر بڑی خوش ہوتی ہے وہ اس کے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کرتی ہے لیکن باپ ان باتوں میں چھپا ہوا کرب محسوس کر لیتا ہے وہ اس سے پوچھتا ہے تم یہاں خوش تو ہو؟ بیٹی فوراً اٹھ کر ڈرائیونگ روم کے پردے کھینچ دیتی ہے اور کھڑکی سے باہر کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہے ڈیڑی یہاں سے باہر دیکھیں آپ کو پورا سمندر دکھائی دے گا باپ اس کی بات سنی ان کی کرتا ہے اور اس سے دو بارہ پوچھتا ہے تم یہاں خوش تو ہو وہ قہقہہ لگا کر جواب دیتی ہے میرا بیڈ روم سوئٹ لمبا اور سوئٹ چوڑا ہے اس میں وہ اٹریڈ ہے اس کی دیواروں کا رنگ ہلکا گلابی ہے اور اس کی کھڑکی باغ کی طرف کھلتی ہے باپ اس سے تیسری مرتبہ پوچھتا ہے بیٹی تم یہاں خوش تو ہو وہ پھر مسکرا کر جواب دیتی ہے اس گھر میں بھارت کا سب سے بڑا ریفریجریٹر سب سے بڑائی وی اور سب سے سبھی گاڑیاں ہیں جس کا لین پر آپ کھڑے ہیں اس کی قیمت تیس لاکھ روپے ہے اور یہ صوفے ان لوگوں نے اٹلی سے خریدے تھے باپ اسے کندھے سے پکڑ کر ہلاتا ہے اور سخت آواز میں کہتا ہے۔ میں تم سے پوچھ رہا ہوں تم یہاں خوش تو ہو وہ باپ کی طرف غور سے دیکھتی ہے۔ اس کے کندھے پر سر رکھتی ہے اور پھوٹ پھوٹ کر روناشروع کر دیتی ہے "تام خاموش ہو گیا۔"

ہمارے درمیان بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ اس وقت کے دوران سر کھجاتا رہا پھر سر گریٹ پیتا رہا جب وقت طویل ہو گیا تو میں نے اس سے پوچھا "تم کہنا کیا چاہتے ہو" وہ مسکرایا اس نے ناک سے دھواں اٹھا اور سونے ہوئے لہجے میں بولا "صرف ریس سے خوشحالی اور روشن خیالی نہیں آتی" صرف میرا تھن ترقی کا جواز نہیں ہوتی "معاشرہ کیلئے قانون انصاف، حقوق، تعلیم اور صحت بھی ضروری ہوتی ہے دن لاہور دن سے پہلے ہیلتھ لاہور، ہیلتھ کا مرحلہ آتا ہے اس کے بعد ایجوکیشن لاہور ایجوکیشن کی ریس ہوتی ہے اس کے بعد انٹرنیشنل لاہور انٹرنیشنل کی ڈوڑ ہوتی ہے اس کے بعد جسٹس لاہور جسٹس کی بازی لگتی ہے اس کے بعد پولیس لاہور پولیس کی میرا تھن ہوتی ہے اور اس کے بعد کہیں جا کر دن لاہور دن کی باری آتی ہے "میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا وہ بولا "کیا تم لوگوں کے پاس پینے کے لئے صاف پانی ہے؟" اس وقت پاکستان کے 80 فیصد عوام گندہ اور معترض پانی پی رہے ہیں کیا تمہارے عوام کو دوا، ہیلتھ کیئر اور ہسپتال مل رہے ہیں؟" تم لاہور کے کسی ہسپتال میں چلے جاؤ تمہیں باہر گیت تک مریض ہی مریض ملیں گے" میں نے اپنی آنکھوں سے ایک ایک بیڈ پر دو مریض دیکھے ہیں تمہارے ملک میں ایک ایک سرجن سو سو آپریشن کرتا ہے" نکام سے لے کر کیئر تک تمام بیماریوں کی دوائیں مریض کو اپنی جیب سے خریدنی پڑتی ہے اور لوگ ڈاکٹروں کے نسخے اٹھا کر مرزکوں پر بھیک مانگتے ہیں تم تعلیم کی حالت دیکھو تمہارے ملک کا ایک بھی تعلیمی ادارہ دنیا کے ہزار بڑے تعلیمی اداروں میں شامل نہیں تم لوگ اچھا ڈاکٹر اچھا انجینئر اچھا ٹیچر اور اچھا مسلمان کسے کہتے ہو؟ وہ شخص جو فارن کو الیغائیڈ ہو تمہارے ملک میں انسانی حقوق کی صورت حال بھی انتہائی خراب ہے تم لوگ سو نیا ناز اور عقار مانی جیسے واقعات کی وجہ سے پوری دنیا میں بدنام ہو رہے ہو تمہارے ملک میں چائلڈ لیبر ہے مزدوروں کی تنخواہیں کم ہیں تمہاری جیلوں میں مجرموں کے

ساتھ انتہائی اخلاق سوز سلوک ہوتا ہے اور تمہارے ملک میں کسی ملازم کو سوشل سکیورٹی حاصل نہیں، تم لوگ انصاف کی پانچویں فہرست میں آتے ہو، تمہاری عدالتوں میں لاکھوں مقدمات زیر التوا ہیں، تمہارے نظام عدل میں لوگوں کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں تیس تیس سال لگ جاتے ہیں، آج بھی سینکڑوں ہزاروں بے گناہ لوگ تمہاری جیلوں میں بے گناہی کی سزا بھگت رہے ہیں، تمہارے ملک میں ججوں کے کردار پر انگلی اٹھائی جاتی ہے، تمہارے ملک میں ایک کورٹ دوسری کورٹ پر کرپشن کا الزام لگاتی ہے، تمہارے ملک میں عدالتوں کے رجسٹرار جیلوں میں بند ہیں اور تمہارے ملک میں قانون نام کی کوئی چیز نہیں، تم لوگ قتلوں میں ساری دنیا سے آگے ہو، تمہارے ملک میں ڈکیٹیاں اور چوریاں معمول بن چکی ہیں، تمہارے ملک میں ہر گھر کے سامنے مسلح گارڈ کھڑے ہیں، تمہارے ملک میں کوئی امیر شخص گارڈز کے بغیر گھر سے نہیں نکلتا، تمہارے ملک کی پولیس غیر معیاری اور غیر انسانی ہے، تمہارے ملک میں بااختیار شخص کے لئے کوئی قانون نہیں اور تمہارے ملک میں مضبوط اور بااختیار شخص ٹریفک کے اشارے پر کرنا اپنی توہین سمجھتا ہے، میرا خیال ہے تم لوگوں کو میرا تھن ریس سے پہلے ایک سماجی میرا تھن کی ضرورت ہے، ایک قانونی، عدلی اور اخلاقی میرا تھن کی ضرورت ہے لیکن تم لوگ اس پر توجہ دینے کی بجائے دن لاہور دن جیسے کاموں میں مصروف ہو، وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے پوچھا، لیکن ہم روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی طرف بڑھ رہے ہیں، اس نے قہقہہ لگایا، جس ملک میں صحت، تعلیم، روزگار، انصاف، قانون اور انسانیت کا احترام نہ ہو، جس میں بڑے اور چھوٹے کے لئے الگ الگ معیار ہوں، جس میں انسانی حقوق نہ ہو، جس میں ٹریفک سگنل کا احترام نہ ہو اور جس میں خالص روایاں نہ ملتی ہوں، وہ معاشرہ صرف میرا تھن ریس سے روشن خیالی اور اعتدال پسندی نہیں ہو سکتا، اعتدال پسندی انصاف کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور وہ قانون کے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوتی ہے، اور تب کہیں جا کر روشن خیالی کی شکل اختیار کرتی ہے لیکن تم لوگ اس فلم کی ہیروئن کی طرف قالین کھڑکی، ہنڈرڈ ہائی ہنڈرڈ فٹ کے بیفٹڈم بڑے فرنیچ، بڑے ٹیلی ویژن اور سنڈر کے کنارے موجود کل کو روشن خیالی سمجھ رہے ہو، تم اسے اعتدال پسندی سمجھ رہے ہو، ہماری میرے جب تک لوگ دائیں ہاتھ سے دایاں کان اور بائیں ہاتھ سے بائیں کان نہیں پکڑیں گے وہ اعتدال پسندی نہیں ہوں گے، ڈائنگ ٹیبل اور چھری کانٹوں سے پہلے تمہارے پاس روٹی ہونی چاہیے، میرا تھن سے پہلے تمہارے پاس انصاف اور تعلیم ہونی چاہیے، تم لوگوں کے پاس جا کر تک تو ہیں نہیں اور تم دن لاہور دن کے نعرے لگاتے ہو، سڑک پر آگے ہونٹا ٹائپ آف کنٹری ایوا، ٹاٹ ٹائپ آف پیپل ایوا۔



ترجیحات

دوسری جنگ عظیم کے دوران جب نازی فوجیں یورپ کو تاراج کرتی ہوئی دنیا کے دوسرے کونے تک پہنچ چکی تھیں۔ اس دور میں ہٹلر نے چرچل کو چیلنج کی "اگر اتحادی فوج جرمنی کے دو بڑے تعلیمی اداروں ہائیڈل برگ اور گوٹن جن پر بم نہ گرانے کا وعدہ کرے تو نازی فوج برطانیہ کی دو یونیورسٹیوں آکسفورڈ اور کیمبرج پر بمباری نہیں کرے گی" چرچل نے یہ آفر قبول کر لی۔ اس دور میں برطانوی وزیر اعظم کے ایک ساتھی نے آفر قبول کرنے کی وجہ پوچھی تو چرچل نے مسکرا کر جواب دیا "اگر پورا برطانیہ تباہ ہو گیا لیکن آکسفورڈ اور کیمبرج بچ گئیں تو ہم سمجھیں گے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن اگر کیمبرج اور آکسفورڈ تباہ ہو گئیں اور برطانیہ بچ گیا تو جان لیں پورا برطانیہ تباہ ہو گیا" اس معاہدے کے بعد دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کے نوے فیصد بچوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں جنم لیا کیونکہ برطانوی والدین سمجھتے تھے ان کے بچوں کی پیدائش کیلئے اگر اس وقت اگر کہہ ارض پر کوئی محفوظ جگہ ہے تو وہ آکسفورڈ اور کیمبرج ہیں بالکل اسی طرح اس دور میں پیدا ہونے والے زیادہ تر جرمن بچوں کی پیدائش کے خانے میں بھی ہائیڈل برگ اور گوٹن جن لکھا گیا۔

نازیوں اور اتحادیوں کا یہ معاہدہ بنیادی طور پر تعلیم اور تعلیمی اداروں کی اقامت کا اعتراف تھا۔ یہ معاہدہ ثابت کرتا تھا دنیا کا کوئی ملک اور کوئی قوم تعلیم اور وہ بھی جدید تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی اور یہ بھی حقیقت ہے جب تک کسی قوم کی یونیورسٹیاں کالج اور سکول آباد رہتے ہیں ان کے ٹیچر ہالوں میں علم اور ادب پر گفتگو جاری رہتی ہے اس وقت تک اس قوم پر زوال نہیں آتا۔ آج سے پانچ ہزار سال پہلے کا دور ہوا آج سے ڈیڑھ دو سو برس بعد کا زمانہ تو موسیٰ کے عروج و زوال کی داستان کلاس روموں میں لکھی جاتی رہی اور کلاس روموں ہی میں لکھی جائے گی اس سلسلے میں مصر کی مثال بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ 1952ء میں جب مصر میں انقلاب آیا اور انقلابیوں نے شاہ فاروق کو ملک بدر کر دیا تو ملک میں شاہ کے 70 بلین پاؤنڈ کے اثاثے تھے۔ انقلابیوں نے یہ اثاثے اور بدتماش جاگیرداروں کی جاگیریں سچ کر سکول بنانے شروع کر دیئے۔ اس دور میں مصر میں دو دو نوں میں تین تین سکول کھولے گئے تاریخ بتاتی ہے مصر کے اندر صرف چھ ماہ میں اتنے سکول بنے جتنے 50 برسوں میں تعمیر نہیں ہوئے تھے۔ اس حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا آج جوئی کے عالمی اداروں میں کام کرنے والے مسلم ماہرین میں مصریوں کا حصہ 70 فیصد ہے۔ ایک طرف تو یہ صورتحال ہے اور دوسری طرف پاکستان کے 70 فیصد ماہرین سکول میں

آج بھی ٹوالٹ نہیں ہیں۔ پاکستان میں ایسے 65 ہزار سکول ہیں جن میں طالب علم اپنے ٹاٹ اپنے گھروں سے لاتے ہیں۔ صرف سندھ میں ایسے گیارہ ہزار سکول ہیں جو اسٹانڈرٹ ہونے کے باعث بند پڑے ہیں۔ پاکستان دنیا کے ان ممالک میں شمار ہوتا ہے جن کے ساتھ کا آئی کیو لیول اور تعلیمی معیار پست ترین ہے۔ پاکستان ایشیا کا وہ ملک بھی ہے جو تعلیم پر سب سے کم خرچ کرتا ہے اور جس میں اسٹادی ٹیخواؤ ٹیکسٹری میں کام کرنے والے مزدور سے کم ہے جس کی سب سے بڑی یونیورسٹی ایک سال میں ایشیا کی یونیورسٹیوں میں 39 ویں درجے سے 61 ویں گریڈ پر آ کر گر گئی ہے اور جسے دنیا تعلیم کے شعبے میں سب سے کم سرمایہ کاری کرنے والا ملک ڈیکلینر کرنے کی تیاری کر رہی ہے لیکن ہمارا اکمال دیکھئے ہم اس صورتحال کے باوجود دنیا فتح کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں ہم اسرائیل سے لبنان پر بمباری کا بدلہ لینے کے منصوبے بنا رہے ہیں ہم لال قلعے پر جھنڈا لہرانے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور ہم جاپان بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں ذرا سوچئے ایک ایسا ملک جس میں کل 60 یونیورسٹیاں ہوں وہ اس جاپان کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے جس کے صرف ایک شہر ٹوکیو میں ایک ہزار یونیورسٹیاں ہیں۔

ہم جاپان بن سکتے ہیں اگر ہماری حکومت اپنا ایجنڈا مختصر کر کے صرف تعلیم اور تعلیمی اداروں کو اپنا ٹو کس بنا لے۔ ملک میں جدید ترین تعلیمی اداروں کا جال پھیلا دے ٹیکنالوجی کی پچاس ساٹھ نئی یونیورسٹیاں بنائے شہروں، قصبوں اور دیہات سے جن جن کر ٹیلنٹ جمع کرے اور انہیں مفت تعلیم دے ہماری معاوضے پر باہر سے پاکستانی ماہرین منگوائے انہیں تعلیمی اداروں میں نوکریاں دے اور ایک ایسی نئی پود پیدا کرے جو علم ہنر اور صلاحیت میں کسی سے کم نہ ہو حکومت یہ کام بڑی آسانی سے کر سکتی ہے احتساب بیورو نے ڈیٹا لٹروں اور لٹیروں سے 200 ارب روپے برآمد کئے تھے یہ وہ رقم ہے جس کی ریکوری کا کوئی امکان نہیں تھا حکومت یہ سمجھے یہ رقم لٹیروں سے واپس نہیں کی اور وہ مصر کی تقلید کرتے ہوئے اس رقم سے پاکستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں ایسے سکول کالج اور یونیورسٹیاں کھول دے جن میں صرف سائنس کی تعلیم دی جائے تو مجھے یقین ہے اس سے ملک میں انقلاب آ جائے گا مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نے پاکستان کو پینشنش کی ہے اگر حکومت تعلیم اور صحت کا بجٹ بڑھا دے تو یہ ادارے اس اضافی بجٹ کے برابر پاکستان کا سود معاف کر دیں گے حکومت اس آفر کا فائدہ بھی اٹھا سکتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ بنیادی سوال وہیں کھڑا ہے کہ یہ سب کچھ کون کرے گا اور کیوں کرے گا؟ ہمارے حکمرانوں کی ترجیحات میں صرف وہ ایشیا اور وہ کام شامل ہیں جن میں انہیں ذاتی فوائد نظر آتے ہیں لہذا یہ لوگ کسی ایسے منصوبے کسی ایسی پالیسی کو جگہ نہیں دیتے جس سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچ سکے جس سے قوم کا مقدر بدل جائے۔ حکومت نے اگر لوہا اکبر خان کپٹی کو موت کے گھاٹ اتارنا ہو یا تحفظ حقوق نسواں کا بل پیش کرنا ہو تو وہ دونوں لگاتی ہے لیکن اگر تعلیم روزگار صحت اور عوامی بہبود کا کوئی منصوبہ ہو تو وہ دو سال تک فائل ہی جتم نہیں لیتی لہذا جس ملک جس معاشرے میں حکومت کی ترجیحات کا یہ عالم ہو اس میں روشنی کی کرن کہاں سے چمکے گی اس میں لوگوں کے حالات کیسے بدلیں گے؟ لہذا ہم لوگ کوئے کے انڈوں سے منس نکلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔



کشکول

”یہ بادشاہ اور درویش کی کہانی ہے“ وہ میری طرف دیکھ رہے تھے، ان کے چہرے پر شہد میں بیگی مسکراہٹ تھی ”بادشاہ نے درویش سے کہا مانگو کیا مانگتے ہو؟ درویش نے اپنا کشکول آگے کر دیا اور عاجزی سے بولا ”حضور صرف میرا کشکول بھر دیں“ بادشاہ نے فوراً اپنے گلے کے ہار اتارے، انگوٹھیاں اتاریں، جیب سے سونے چاندی کی اشرفیاں نکالیں اور درویش کے کشکول میں ڈال دیں لیکن کشکول بڑا تھا اور مال و متاع کم، بادشاہ نے فوراً خزانے کے انچارج کو بلا یا، انچارج بہرے جواہرات کی پوری لے کر حاضر ہو گیا، بادشاہ نے پوری کشکول میں الٹ دی تھیں، جوں جوں جواہرات کشکول میں گرتے گئے کشکول بڑا ہوتا گیا یہاں تک کہ تمام جواہرات غائب ہو گئے، بادشاہ کو اپنی بے عزتی کا احساس ہوا اور اس نے خزانے کا منہ کھولنے کا حکم دے دیا، مزدور خزانے میں جاتے سونے، چاندی اور جواہرات کی پوریاں اٹھاتے اور لا کر کشکول میں ڈال دیتے لیکن کشکول بھرنے کا کام نہیں لے رہا تھا، خزانے کے بعد وزراء اور درباریوں کی باری آئی، ساری کا بینے نے اپنی جیبیں اپنی ججوریاں اور اپنے بیگ بیلیں کشکول میں ڈال دیئے لیکن یہ سارا مال و متاع بھی کشکول کے پینڈے میں غائب ہو گیا اور کشکول خالی کا خالی رہا، اس کے بعد شہر کی باری آئی، بادشاہ نے فکڑ کو اشارہ کیا، فوج شہر میں داخل ہوئی، اس نے پورے شہر کی دولت جمع کی اور لا کر کشکول میں ڈال دی لیکن نتیجہ پچھلے نتیجے سے مختلف نہیں تھا، بادشاہ نے محل کی طرف دیکھا، لوگوں نے بادشاہ کا محل اٹھا کر کشکول میں ڈال دیا، اس کے بعد منتر کالونی، وزیر اعظم ہاؤس اور پارلیمنٹ کی باری آئی، یہ سارے ہاؤس بھی کشکول میں ڈال دیئے گئے، شہر کے سارے کارنر پلاٹ، سارے کمرشل ایریا، سارے ٹھیکے، سارے پرمٹ، ساری امدادی رقوم، سارے چیک، سارے پلازے اور ساری ہاؤسنگ سکیس کشکول میں ڈال دی گئیں لیکن کشکول خالی رہا، بادشاہ نے رعایا کی طرف دیکھا، انتظامیہ نے ایک ایک کر کے لوگوں کو بھی کشکول میں پھینکنا شروع کر دیا یہاں تک کہ سارا شہر خالی ہو گیا لیکن کشکول خالی رہا، آخر میں بادشاہ ہار گیا اور درویش جیت گیا، درویش نے کشکول بادشاہ کے سامنے الٹا، مسکرایا، سلام کیا اور واپس مز گیا، بادشاہ درویش کے پیچھے بھاگا اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا ”حضور مجھے صرف اتنا بتا دیں یہ کشکول کس چیز کا بنا ہے!“ درویش مسکرایا

”اے نادان بادشاہ یہ خواہشات سے بنا ہوا کنگول ہے اسے صرف قبر کی مٹی بھر سکتی ہے۔“
 وہ خاموش ہو گئے، میں نے عرض کیا ”جناب میں اس کہانی کا مقصد نہیں سمجھا“ وہ مسکرائے ”دنیا اور دنیا
 داری درویش کے کنگول کی طرح ہوتی ہے آپ اس کنگولا، میں جو چاہے بھتا چاہے ڈال دیں یہ ہمیشہ خالی رہے
 گا، انسان کا چھوٹی گاڑی سے بڑی گاڑی تک کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا، ہماری زندگی میں ایک کرے کی خواہش
 پھیلنے پھیلنے کوئی بنتی ہے اور اس کے بعد یہ خواہش پوری دنیا کے جزیروں اور ملکوں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے،
 ایک دفتر، ایک شینو اور ایک چپراسی کی خواہش پھیلتے پھیلتے ایوان صدر بن جاتی ہے، ایک دن کا اقتدار حشر تک پھیل
 جاتا ہے اور ایک دستخط کا اختیار سکندر اعظم بن کر دنیا سے رخصت ہوتا ہے، ایک لقمہ دسترخوان بنتا ہے اور دسترخوان
 چالیس ایکڑ کے ڈاسٹنگ ہالوں میں تبدیل ہو جاتا ہے، ایک کسر، ایک تصویر اور ٹیلی ویژن سکرین پر اپنی ایک
 جھلک پھیلتے پھیلتے پوری دنیا کے ٹیلی ویژنوں اور پوری دنیا کے اخباروں تک پہنچ جاتی ہے، ایک خوبصورت، توانا اور
 گرم جوش عورت کی خواہش چند ماہ میں حرم بن جاتی ہے اور چند ڈالر دیکھتے ہی دیکھتے بلین اور ٹریلیں بن جاتے
 ہیں اور اس کے بعد انسان دنیا کے تمام ٹوٹوں پر اپنی تصویر چھپوانے کی خواہش میں مبتلا ہو جاتا ہے، کسی ایک گستاخ
 کو گستاخی کی سزا سنانے کی خواہش پھیلتے پھیلتے پھانسی گھاٹ بن جاتی ہے اور انسان پورے ملک کو پھانسی لگا کر بھی
 مطمئن نہیں ہوتا، انسان صرف ہال بنانے یا شیو کرنے کے لئے شیشے کے سامنے کھڑا ہوتا ہے، پین پھر خود کو دیکھنے کی
 خواہش پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے، انسان مایک پر ایک پھوک مارتا ہے اور اس کے بعد بولنے کی خواہش کا
 غلام بن جاتا ہے وہ پوری زندگی مایک سے چپک کر گزار دیتا ہے اور انسان چار دن کے لئے اقتدار میں آتا ہے
 لیکن وہ باہر ہو یا اور تک زبیر آخری سانس تک اقتدار سے لٹکا رہتا ہے چنانچہ خواہش ایک ایسا کنگول ہے جو کبھی
 نہیں بھرتا ہے، جو کبھی لبالب نہیں ہوتا، دور رک گئے۔“

میں نے ہنس کر عرض کیا ”حضور خواہش دنیا کی سب سے بڑی طاقت بھی ہے، اگر انسان کے باطن میں
 خواہشیں جنم نہ لیں تو شاید دنیا میں کوئی نقص آگے نہ بڑھتا، ایک غلام صدیوں تک غلام، ایک جاہل صدیوں تک
 جاہل اور ایک مظلوم صدیوں تک مظلوم رہتا، یہ خواہش ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہم سوچتے ہیں، اگر ایڈی بن بلب بنا
 سکتا ہے تو میں کیوں نہیں بنا سکتا، اگر رامت برادر زہرا بنا سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں بنا سکتا اور اگر بل گیش دس بائی
 بارہ فٹ کے ایک کرے کی کہنی کو دنیا کی امیر ترین کارپوریشن بنا سکتا ہے تو میں مائیکروسافٹ کیوں نہیں بنا سکتا،
 حضور یہ ہمارے سارے ”کیوں“ ہماری خواہش کی جڑوں میں جنم لیتے ہیں اور یہ آنے والی زندگی میں ایسی
 ڈرامائی ٹنگ فورس بن جاتے ہیں جو شروع میں انسان کو آگے لے جاتی ہے اور اس کے بعد پورے معاشرے کو ترقی
 اور خوشحالی کی شکل دے دیتی ہے، اگر انسان خواہشوں کو گناہ سمجھتا تو آج دنیا میں بلب ہوتا اور نہ ہی ریل گاڑی، اگر
 انسان قناعت کو زندگی کا مقصد بنا لیتا تو ہم آج تک غار میں ہوتے اور جم پر پتے بانٹ کر زندگی گزارتے، وہ
 خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے، میں نے عرض کیا ”حضور، آج ہمارے ہاں وہ لوگ جو کہ...“

خوشبوئیں نظر آتی ہیں یہ سب انسانی خواہشوں کی پیداوار ہیں اور آج ہمیں دنیا میں جتنی آزادی اور جتنے حقوق نظر آتے ہیں ان سب نے خواہشوں کی کوکھ سے جنم لیا تھا! اگر انسان اپنی غربت اور اپنی بیماری کو اپنا مقدر سمجھ لے اور خواہش کو زندگی سے خارج کر دے تو آپ یقین کیجئے وہ زندگی میں کبھی صحت مند اور خوشحال نہ ہو سکے! ایک غلام غلامی میں زندگی گزار دے اور ایک مزدور اینٹیں ڈھونڈتا ہوا فوت ہو جائے یہ خواہش ہوتی ہے جو مزدور کو ٹھیکیدار اور غلام کو آزاد بناتی ہے! وہ خاموشی سے سنتے رہے! میں نے عرض کیا "امید ہمیشہ خواہش کے وجود سے جنم لیتی ہے! اگر خواہش نہ ہو تو دنیا سے امید ختم ہو جائے! میں نے عرض کیا دنیا میں دو قسم کی خواہشیں ہوتی ہیں! نیک خواہشیں اور بد خواہشیں! نیک خواہشوں اور بد خواہشوں میں صرف نیت کا فرق ہوتا ہے! مثلاً "دولت کی خواہش قارون میں بھی تھی اور حضرت رابعہ بھری بھی اللہ تعالیٰ سے خزانے طلب کرتی تھیں لیکن ان دونوں کی خواہش میں فرق تھا۔ قارون دنیا کا امیر ترین شخص کہلانے کے لئے دولت جمع کر رہا تھا جبکہ حضرت رابعہ بھری دنیا کے تمام غریبوں کو غربت سے نکالنے کے لئے دولت مانگ رہی تھیں لہذا ایک کی خواہش کھٹول بن گئی اور دوسرے کی خواہش اسے قطب کے درجے تک لے گئی! یہ صرف نیت کا فرق تھا جس نے قارون کو قارون اور رابعہ بھری کو رابعہ بھری بنایا! دنیا میں معمولی پھیلا نا معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن جب مر سید احمد خان نے علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے بازار حسن میں معمولی پھیلائی تو وہ معزز شخص کہلانے! اسی طرح آج جب عبدالستار راہی می کراچی کی گلیوں میں معمولی پھیلاتا ہے تو لوگ آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ چومتے ہیں! یہ کیا ہے! یہ خواہش کی نیت کا فرق ہے! میں رکا اور ان سے عرض کیا "خواہشیں بری نہیں ہوتیں! خواہشوں کی نیتیں اچھی اور بری ہوتی ہیں! یہ ہماری نیت ہے جو ہماری خواہش کو کھٹول کی شکل دیتی یا اسے عبادت بنا دیتی ہے!"

میں نے ان سے عرض کیا "خواہش امید ہوتی ہے اور امید دنیا کی سب سے بڑی عبادت ہوتی ہے۔"



ہم سب نمکین ہو جائیں

رانا اکرام ربانی صاحب پرانے سیاستدان ہیں وہ پنجاب میں وزیر رہے۔ انہوں نے 2002ء میں الیکشن لڑا، وہ یہ الیکشن جیت سکتے تھے لیکن اپنی انا کے ہاتھوں ہار گئے وہ آج کل فراغت کے دن گزار رہے ہیں چند ماہ پہلے شادی کی ایک تقریب میں میری ان کے ساتھ ملاقات ہو گئی، میزبان نے تعارف کی کوشش کی مگر میں نے آگے بڑھ کر رانا صاحب کا ہاتھ تھام لیا اور عرض کیا 'میں رانا صاحب کو نہ صرف جانتا ہوں بلکہ دل سے ان کی قدر بھی کرتا ہوں۔ ان کا تعلق ان چند سیاستدانوں سے ہے جنہوں نے اصول پر کھوٹ نہیں کیا، جنہوں نے ہمیشہ ایمانداری، خلوص اور نیک نیتی کو ذرا راہ بنائے رکھا، جنہوں نے ہر دور میں سیاست کو کچھ نہ کچھ دیا اس سے کبھی وصولی کی کوشش نہیں کی۔ رانا صاحب نے میرا شکر یہ ادا کیا اور ہم دونوں ایک کونے میں بیٹھ گئے، رانا صاحب اپنا سیاسی اتار چڑھاؤ بتانے لگے۔ انہوں نے بتایا انہوں نے سیاست کیسے شروع کی، الیکشن کیسے لڑے، کیسے وزیر بنے، رشوت اور لوٹ کھسوٹ سے بچنے کے لئے انہیں کون کون سے پاپڑ بیٹھے پڑے، انہیں الیکشن میں کیسے ہرایا گیا اور آخر میں انہوں نے پارٹی کیسے چھوڑی وغیرہ۔ میں نے ایک بار پھر ان کی ایمانداری کی تعریف کی، انہوں نے تڑپ کر میری طرف دیکھا اور ٹھنڈے شمار لہجے میں بولے "میں آج اپنی اس ایمانداری، اس اصول پسندی اور اس سیاسی اخلاص پر شرمندہ ہوں" میں نے انہیں حیرت سے دیکھا، وہ گویا ہوئے "تجربے اور وقت نے ثابت کیا اس ملک میں جن لوگوں نے کچھ کالیا وہی صحیح رہے اور جنہوں نے یہ موقع کھو دیا وہ بچھتاتے رہے، مجھے دکھ لو، مجھے اس ایمانداری کا کیا صلہ ملا آج میرے ہاتھ میں سیاست ہے اور نہ ہی مال۔" ہم دیر تک اس شرمندگی، اس بچھتاؤ سے پر گفتگو کرتے رہے، رانا صاحب نے بیسیوں مثالیں دیں، انہوں نے مجھے ایسے بیسیوں لوگوں کی مثال دی جو خالی ہاتھ سیاست میں آئے تھے لیکن انہوں نے وقت اور موقع سے فائدہ اٹھایا، وہ فرش سے عرش پر جا پہنچے اور آج ہمیشہ کر رہے ہیں۔ احتساب کے درجنوں ٹکے بنے، ان کے خلاف کیس اور ریفرنس بھی دائر ہوئے لیکن ان لوگوں کو کوئی فرق نہ پڑا۔ ان میں سے کچھ نے دے دلا کر جان چھڑائی، چند ایک حضرات قانون کے مورچے میں پناہ گزین ہو گئے اور جو باقی بیچ گئے انہوں نے وفاداریاں بدل کر جان اور مال دونوں بچائے، پیچھے رہ گئے رانا صاحب جیسے

"بے وقوف" تو ان کا دامن خالی تھا اور خالی ہے وہ گھاٹ کے رہے اور نہ ہی انہیں گھر نصیب ہوا۔ رانا صاحب تو وہاں سے اٹھ کر چلے گئے لیکن اپنے پیچھے سوچ کی ایک سنگتی ہوئی لمبی ٹیکر چھوڑ گئے اور میں ویر تک ان کے تھیس پر غور کرتا رہا۔ مجھے خواجہ صاحب یاد آ گئے 'خواجہ صاحب ایک ریٹائرڈ بیوروکریٹ تھے وہ پاکستان کے تمام کلیدی عہدوں پر فائز رہے تھے لیکن انہوں نے ایمان اور ایمانداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا لہذا جب ریٹائر ہوئے تو ان کے پاس سر چھپانے کے لئے چھت تک نہیں تھی جو بس انداز کیا تھا وہ کوآپریٹو بینک لے ازا لہذا انہوں نے باقی زندگی پنشن اور دکھ میں گزار دی، روز صبح ان کی آنکھ بیوی کے طعنوں اور اولاد کے شکوؤں سے کھلتی تھی اور حالات کے بوجھ اور ضروریات کی گرانی تلے بند ہوتی تھی 'خواجہ صاحب نے بھی آخری زندگی بچھتاوے میں گزار دی، وہ بھی کہا کرتے تھے "نیکی بندے کو وہاں کرنی چاہئے جہاں نیکی کی کوئی قدرت ہو" جس معاشرے میں ایمانداری کا دوسرا نام بے وقوفی ہو وہاں ایمانداری سے پرہیز لازم ہے۔" یہ رانا صاحب ہوں یا خواجہ صاحب ہمارے معاشرے میں ایسے سیکنگلوں کو رو کر نکھرے پڑے ہیں۔ ہم سب کی زندگی میں کوئی نہ کوئی خواجہ صاحب، کوئی نہ کوئی رانا صاحب موجود ہیں۔ یہ لوگ پہلے اکثریت میں ہوتے تھے لیکن اب اقلیت کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں ہمارا ہر آنے والا دن ایسے لوگوں کی نعشوں پر طلوع ہو رہا ہے جو کبھی خمیر کو عدالت سمجھتے تھے جو یہ سوچتے تھے دنیا عارضی کھیل ہے اور اس کھیل میں سب کچھ ہار دینا بے وقوفی ہوگا اور جو یہ کہتے تھے "اٹھینان سے بڑی کوئی دولت اور چٹائی سے بڑی کوئی طاقت نہیں" انہوں نے وہ لوگ آج اس معاشرے سے سنہلے جا رہے ہیں۔ یہ معاشرہ یہ ملک ان لوگوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے، میں سوچتا ہوں زندہ ملک اور تازہ معاشرے ایسے لوگوں کی حفاظت کے لئے کتنے جتن کرتے ہیں لیکن ہماری نظروں کے سامنے ایسے لوگ معدوم ہوتے جا رہے ہیں مگر ہم خاموشی سے تماشا دیکھ رہے ہیں۔

مجھے جاپان یاد آ گیا۔ جاپان میں زمین نہیں ہے لہذا وہاں سبزہ اور ہریالی بھی نہیں لیکن جاپانیوں نے ایک عجیب عادت پال رکھی ہے انہیں گھر، دکان یا دفتر کا جو کونا خالی ملتا ہے وہ اس میں بیج بو دیتے ہیں وہاں پودا لگا دیتے ہیں لہذا جاپان دنیا کا واحد ملک ہے جس میں آپ کو گھلوں میں سبزی ملتی ہے، میں نے ایک جاپانی سے جب دریافت کی تو اس نے ہنس کر جواب دیا "ہم جانتے ہیں ہمارے ملک میں ہریالی کم ہے لہذا ہم ہریالی بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں ہم سبزیاں درآمد کرتے ہیں لہذا ہم کوشش کرتے ہیں ہم ایک ٹماٹر ایک آلو اور مٹر کی چند پھلیاں ہی سہی لیکن کچھ تو اپنا لگائیں، کچھ تو اپنا کھائیں۔" میں نے سوچا ہمارے ملک میں بھی ایمانداری، خلوص اور وفاداری کم ہے لہذا ہمیں بھی جاپانیوں کی طرح گھروں، دکانوں اور دفاتروں میں اس کے بیج بونے چاہئیں۔ ہمیں بھی گھلوں میں اس کی خیریاں لگانا چاہئیں ش۔ ہمارے سامنے جو لوگ بچھتاوے کی سڑک پر قدم رکھ رہے ہیں ہم کم از کم ان کا حوصلہ تو بڑھا سکتے ہیں، ہم ان کو عزت تو دے سکتے ہیں ہم ان کی نیکی، ان کی ایمانداری کا اعتراف تو کر سکتے ہیں۔ لوگ بچھتے چراغوں کی پڑ پڑاتی لو بیجانے کے لئے اسے ہاتھ جلا بیٹھتے ہیں

نہیں۔ ہم کیسے لوگ ہیں ہمارے سامنے زندگی کے مہانہز میں برف کاشت ہو رہی ہے لیکن ہم خاموشی سے قماشاد کچھ رہے ہیں۔

کوئی شخص درخت کاٹ رہا تھا کسی راہ گیر نے احتجاج کیا تو درخت کاٹنے والے نے کلبھاڑی کندھے پر رکھ کر پوچھا ”یہ سڑک یہ درخت تمہارا ہے“ راہ گیر نے جواب دیا ”نہیں لیکن میں یہاں سے روز گزارتا ہوں، مجھے معلوم ہے دس سال بعد میرا بیٹا بھی یہاں سے گزرے گا۔ اگر آج میں احتجاج نہیں کروں گا“ اگر میں آج اس درخت کو کٹنے سے نہیں بچاؤں گا تو کل میرے بیٹے کو تکلیف ہوگی یہ سڑک اس کے لئے جہنم بن جائے گی۔“ یقین کیجئے اگر ہم نے بھی ایمان اور نیکی کے ان چراغوں کی حفاظت نہ کی تو ہماری اولاد نیکی اور ایمان کے لفظ تک بھول جائے گی اور یہ ملک ”کاسیاب“ لوگوں کا ملک اور یہ معاشرہ موقع سے فائدہ اٹھانے والے لوگوں کا معاشرہ بن کر رہ جائے گا میرے پاس چند روز پہلے کراچی کے سابق ناظم نعمت اللہ خان صاحب تشریف لائے تھے انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا ”ہم لوگ ایماندار لوگوں کو کیسے بچا سکتے ہیں“ میں نے جواب دیا ”حوصلہ افزائی“ وہ بولے ”وہ کیسے“ میں نے عرض کیا ”ہم لوگ اپنے ایماندار لوگوں سے ملیں، ان کی تعریف کریں، انہیں تقریبات میں خصوصی جگہ دیں اور لوگوں سے ان کا اچھا تعارف کرائیں، ان کی آل اولاد کی حوصلہ افزائی کریں اور اگر یہ لوگ معاشی ضروریات سے مجبور ہو کر کوئی کاروبار کریں تو ہم ان سے سودا خریدیں، ہماری یہ حوصلہ افزائی نہ صرف ان لوگوں کے ارادے کو مضبوط بنائے گی بلکہ ان کی عزت افزائی کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کو بھی حوصلہ ہوگا اور وہ بھی ایماندار ہونے کی کوشش کریں گے یوں معاشرے میں نیکی قائم رہے گی“ خان صاحب نے تائید فرمائی، میں نے ان سے عرض کیا ”فضلوں کو بچانے کیلئے کہیتوں کے گرد باز لگانا پڑتی ہے، ہماری حوصلہ افزائی برائی اور اچھائی کے درمیان باز ہوتی ہے اگر ہم آج یہ باز نہیں لگائیں گے تو کل کو ویرانے اور کہیت میں کوئی فرق نہیں رہے گا، کل کو کان کانک بیٹھے پانیوں کو بھی کھا رہا ہوتا ہے گا اور ہم سب نمکین ہو جائیں گے۔“



غلاموں کے غلام

گاؤ قادر اول دنیا کا پہلا شخص تھا جس نے جرائم کو سائنسی بنیادیں فراہم کیں، وہ ریاست کے اندر ریاست اور انڈر ورلڈ جیسی اصطلاحوں کا بھی بانی تھا، اس نے باقاعدہ ایسے ادارے بنائے جن میں مجرموں کو جرائم کی تربیت دی جاتی تھی، اس نے مجرموں کا ایک بین الاقوامی نیٹ ورک بھی تشکیل دیا، اس کے بارے میں کہا جاتا تھا وہ ٹیلی فون کی تھکنی بیچنے سے پہلے دنیا کے ہر کونے میں پہنچ جاتا تھا، اس نے نشیاتِ اسلحہ اور جعلی دستاویزات کی تیاری کیلئے باقاعدہ لیبارٹریاں بنائیں اور ان لیبارٹریز کو جرائم کے نئے نئے طریقے دریافت کرنے پر لگا دیا، اس نے قاتلانہ حملوں کے چار عالمی سکواڈ بنائے اور ان سکواڈز میں ایسے ایسے سنگدل اور خوفناک لوگ بھرتی کیے گئے جو لوگوں کو قتل کرنے کے بعد ان کے خون سے ہاتھ اور منہ دھوتے تھے چنانچہ دنیا میں ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب دنیا کے بڑے بڑے حکمران گاؤ قادر کے نام سے گھبراتے تھے اور گاؤ قادر ایک ہوا خوف کی ایک آمدنی اور لوگوں کے اندر اتر جانے والا ایک ڈر بن گیا۔

گاؤ قادر کی شروعات بہت دلچسپ تھی، وہ ایک چھوٹا سا مجرم تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے قیادت کی بے تہا شہ صلاحیتوں سے نوازا رکھا تھا، وہ گروپ اور ریگٹ بنانے کا ماہر تھا، وہ ڈز نری انسان تھا لہذا وہ ہمیشہ دس بیس برس آگے کی بات سوچتا تھا، اس نے 1934ء میں ایک دلچسپ منصوبہ بنایا، اس نے چند یونیورسٹی پروفیسرز اور ریٹائر سیاستدان کی خدمات حاصل کیں، پروفیسروں نے اٹلی کی تمام مختلف یونیورسٹیوں کا دورہ کیا اور گاؤ قادر کو تمام باصلاحیت طالب علموں کی فہرستیں بنا دیں اور بزرگ سیاستدان نے اسے ان تمام لوگوں کے نام اور پتے فراہم کر دیے جو مستقبل قریب میں بڑے سیاستدان ثابت ہو سکتے تھے، گاؤ قادر نے ان تمام طالب علموں اور سیاستدانوں کی مالی اور سماجی معاونت شروع کر دی، اس نے ان تمام طالب علموں کو وظائف دیئے اور انہیں امریکہ اور برطانیہ کی اعلیٰ یونیورسٹیوں میں تعلیم دلوائی اور اس کے بعد انہیں اٹلی کے بڑے بڑے سرکاری انیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں بھرتی کر دیا، اس نے چھوٹے چھوٹے سیاستدانوں کی پشت پناہی کی اور انہیں سیاست کے مرکزی و حارے میں داخل کر دیا، اس نے قانون دان جمع کیے اور ان میں سے بے شمار وکیلوں کو بیچا دیا، اس نے اپنے

بکٹ کے لوگوں کو سفیر مشیر اور وزیر بنوایا اس نے اپنے لوگوں کو صنعت کار، تاجر اور بروکر بنوایا اور اس نے اپنے لوگوں کو بینکار اور ماہر معیشت بنوایا یہ تمام لوگ ابتدا میں اٹلی اور اس کے بعد پورے یورپ میں پھیل گئے اور انہوں نے آگے چل کر بے شمار ملکوں کی معیشت اور سیاست اپنے ہاتھ میں لے لی گاڈ فادر دوم نے اپنے والد کے سلسلے کو امریکہ، لاطینی امریکہ اور مغربی یورپ تک پھیلا دیا اور اس نے آدھی دنیا کو اپنے دائرے میں لے لیا ایک وقت ایسا تھا جب گاڈ فادر کے حکم سے پورے یورپ کے قوانین بدل جاتے تھے اور وہ شخص حقیقتاً دنیا پر حکومت کرتا تھا اور دنیا میں جس شخص نے گاڈ فادر کے خلاف رپٹ لکھنی ہوتی تھی وہ گاڈ فادر کا ہر کارہ لکھتا تھا جس نے اس رپٹ پر دستخط کرنے ہوتے تھے جس نے مہر لگانی ہوتی تھی جس نے اس کی گرفتاری کا حکم جاری کرنا ہوتا تھا جس نے چھاپہ مارنا ہوتا تھا جس نے اسے عدالت میں پیش کرنا ہوتا تھا جس وکیل نے اس کے خلاف الزامات لگانے ہوتے تھے جس سیاست دان نے اس کے خلاف قانون بنانا ہوتا تھا اور جس وزیر جس وزیر اعظم نے اس کے خلاف پریس کانفرنس کرنی ہوتی تھی وہ بھی اس کے "پے رول" پر ہوتا تھا وہ بھی اپنی ہر صبح کا آغاز گاڈ فادر کے پاؤں چھو کر کرتا تھا چنانچہ وہ دنیا کے اختیار اور اقتدار کی نسوں میں اتر گیا تھا اور وہ دنیا کا حقیقی بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔

1973ء میں امریکہ نے گاڈ فادر کے اس سسٹم کو "اون" کر لیا اور اسے اپنی خارجہ پالیسی بنا لیا۔ گاڈ فادر کا سسٹم امریکہ تک کیسے پہنچا اس کیلئے بیس دیتام جنگ کا مطالعہ کرنا پڑے گا 6 مارچ 1965ء میں دیتام کی سرزمین پر امریکہ کا پہلا فوجی اتر آیا یہ جنگ 8 برس جاری رہی اس جنگ میں امریکہ نے شدید مالی سیاسی اور فوجی نقصان اٹھایا اور 29 مارچ 1973ء کو امریکہ کا آخری فوجی ہسپا ہو کر دیتام سے نکلا امریکہ یہ جنگ ہار گیا لیکن جنگ نے اسے گاڈ فادر بنا دیا امریکہ نے پہلی بار محسوس کیا وہ اسٹے اور فوج کے ذریعے پوری دنیا پر حکومت نہیں کر سکتا لہذا اگر اس نے دنیا کی واحد سپر پاور بننا ہے تو اسے گاڈ فادر کے فارمولے پر عمل کرنا ہوگا اسے تیسری دنیا میں یونیورسٹی کے استاد سے لے کر وزیر اعظم تک ہر عہدے پر اپنے لوگ بٹھانا ہوں گے اسے بیورو کرسی 'فوج' عدلیہ پولیس اور سیاست دنیا کا ہر بڑا شعبہ اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا امریکہ نے سوچا اور اس کے بعد اس پر عملدرآمد شروع کر دیا اس نے تیسری دنیا کے اچھے طالب علم اٹھائے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے دھنیے دیئے انہیں یورپ اور امریکہ کی بہترین یونیورسٹیوں میں تعلیم دلائی اور اس کے بعد انہیں ان کے ممالک میں حساس عہدوں پر بٹھا دیا امریکہ نے نوجوان بیوروکریٹس کو اپنے ملک میں کورس کرائے اور ان کو سز کے دوران ان کی برین واشنگ کر دی اس نے فوجی افسروں کو اپنی عسکری اکیڈمیوں میں ٹریننگ دی اور انہیں امریکی بنا کر واپس بھجوا دیا اس نے قانون دانوں کو امریکی فلسفے کی ٹریننگ دے کر جج بنوایا اس نے ٹیکس کے شعبوں میں اپنے بندے بھرتی کرادیئے اس نے انڈسٹری اور بزنس میں اپنے لوگ ڈال دیئے اور اس نے سیاست میں اپنے حامیوں کو پہلی صف میں کھڑا کر دیا یوں صرف بیس برس میں امریکہ پوری تھرڈ ورلڈ اور آدھی سے زیادہ سیکنڈ اور فرسٹ ورلڈ کا گاڈ فادر بن گیا وہ دنیا کا حقیقی بادشاہ بن گیا اس نے نیویارک اور واشنگٹن میں وزراء اعظم کی جینٹری لگائی اور دھڑا دھڑا وزیر اعظم بنا

کرتیسری دنیا ایکسپورٹ کرنا شروع کر دیئے یہ وزیراعظم چہرے مہرے حرکات و سکنات اور زبان و بیان میں مقامی لوگوں جیسے ہوتے ہیں لیکن یہ انداز سے پورے امریکہ ہوتے ہیں اور یہ مقامی ملکوں میں رہ کر امریکہ کی مفادات کی حفاظت کرتے ہیں امریکہ تیسری دنیا کو دافر مقدار میں وزراہ خزانہ وزراہ تجارت اور ٹیکس کے مشیر بھی فراہم کرتا ہے وہ مقامی تاجروں صنعت کاروں اور ریٹیل سٹیٹ ٹیکنیکوز کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور ان لوگوں کی مدد سے تیسری دنیا کی معیشت سے کھیلتا ہے وہ میڈیا کو بھی اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور اس کے ذریعے ملکوں کی ثقافت بدل دیتا ہے وہ تیسری دنیا کے 103 ممالک کا بجٹ بھی تیار کرتا ہے اور وہ سات سمندر پار بیٹھ کر تیسری دنیا کیلئے دالوں چینی گھی اور پٹرول کے نرخ بھی طے کرتا ہے۔ وہ پوری تیسری دنیا سے کھیلتا ہے۔

آپ پاکستان کی مثال لیجئے اس وقت پاکستان میں تین بڑی سیاسی جماعتیں ہیں ان تینوں جماعتوں کے "وزراہ خزانہ" ورلڈ بینک کے باقاعدہ ملازم ہیں آپ کو آج بتا سکتا ہوں اگر ملک میں پیپلز پارٹی کی حکومت آئی تو اس کا وزیر خزانہ کون ہوگا اور مسلم لیگ ن اور ایم ایم اے برسر اقتدار آئی تو ان کا وزیر خزانہ کون ہوگا؟ یہ تمام وزراہ خزانہ ماشاء اللہ عالمی بینک اور آئی ایم ایف کے ملازم ہیں اور آج مختلف سیاسی جماعتوں کے پلیٹ فارم سے قومی اسمبلی اور سینٹ میں بیٹھے ہیں آپ سی بی آر کا جائزہ لے لیں آپ انکا مک کوآرڈینیشن کمیٹی وزارت خزانہ وزیراعظم کے مشیروں اور صوبائی حکومتوں کے وزراہ خزانہ کا پروفائل نکال کر دیکھ لیں یہ کون لوگ ہیں؟ یہ سب ما شاہ اللہ گاڈ فادر کے ہر کار سے ہیں اور ان سب لوگوں کا فلسفہ اور ایجنڈا ایک ہے آپ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر اب سٹاک ایکسچینج کے موجودہ بحران کا جائزہ لیں صرف ایک ہفتے میں پاکستان کی سٹاک ایکسچینج میں 10 کھرب کا گھپلا ہوا یہ دس کھرب دس دن میں دس لاکھ لوگوں کی جیب سے نکل کر دس تاجروں کی جیب میں چلے گئے کیوں؟ یہ گاڈ فادر کی مرضی تھی دوسرا سوال سٹاک ایکسچینج کا یہ بحران پچھلے ماہ سے متوقع تھا اس بحران کی طرف بار بار وزیراعظم کی توجہ مبذول کرائی گئی لیکن انہوں نے فنانس کمیٹی کا اجلاس نہیں ہونے دیا کیوں؟ کیونکہ گاڈ فادر کی مرضی تھی یہ مینٹنگ نہ ہو اور گاڈ فادر اس بحران کے ذریعے کچھ لوگوں کو نوکری سے فارغ کرنا چاہتا تھا اور کچھ نئے لوگوں کو سامنے لانا اور حکومت کو مزید سال چھ مہینے فراہم کرنا چاہتا تھا گاڈ فادر اس بحران کے ذریعے چند "فریب" لوگوں کو امیر بنا اور کچھ لوگوں کی اقتصادی ہوا نکالنا چاہتا تھا چنانچہ یہ بحران پیدا ہوا اور اگلے چند دنوں میں مزید آگے بڑھے گا پاکستان کی معیشت کو اگلے چھ ماہ تک اس قسم کے مزید جھٹکے کھٹے رہیں گے۔

یہ گاڈ فادر کی مرضی ہے اور ہم سب اس کے غلاموں کے غلام ہیں۔



کاش ہم تتلیاں ہوتے

سڑک پر درگوں کا دریا بہ رہا تھا ہزاروں لوگ قطار میں کھڑے ہو کر دیکھ رہے تھے اور ان کے چہروں پر سیاحوں کی حیرت اور بچوں جیسا اشتیاق تھا یہ دنیا کا انوکھا ترین نظارہ تھا پر پل رنگ کی لاکھوں تتلیاں زمین سے پانچ فٹ اوپر تیر رہی تھیں انہوں نے قطاریں بنا رکھی تھیں اور وہ ایک ترتیب سے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں میں نے ٹیلی ویژن کا سوچ بند کر دیا سکرین بے رنگ ہو گئی۔

یہ تائیوان کا منظر تھا تائیوان میں ملک ویڈ (Milk Weed) نام کی تتلیاں پائی جاتی ہیں یہ تتلیاں سردیاں تائیوان کی جنوبی وادیوں میں گزارتی ہیں لیکن جونہی بہار کا آغاز ہوتا ہے یہ تتلیاں لاکھوں کی تعداد میں جنوب سے شمال کی طرف سفر شروع کر دیتی ہیں یہ دنیا میں تتلیوں کی دوسری بڑی ہجرت ہوتی ہے اس قسم کی ایک نقل مکانی سردیوں کے شروع میں شمالی امریکہ اور کینیڈا سے میکسیکو کی طرف ہوتی ہے کینیڈا سے میکسیکو جانے والی تتلیوں کا نام ”مونارچ“ ہے اور یہ بھی لاکھوں کے گروپ میں سفر کرتی ہیں تائیوان کی ملک ویڈ تتلیوں کے سفر کی تین بڑی خصوصیات ہوتی ہیں اول دس لاکھ تتلیاں روزانہ جنوب سے شمال کی طرف سفر کرتی ہیں دوم یہ قطار میں گروہوں کی شکل میں اترتی ہیں اور سوم ان کا یہ سفر صدیوں سے جاری ہے تتلیوں کی یہ ہجرت معمول کے مطابق چل رہی تھی لیکن تائیوان کی حکومت نے 1970ء میں فری وے انجینئرنگ بیورو بنائی اور اس بیورو نے ملک کے شمالی حصے کو جنوب سے ملانے کیلئے ایک بڑی شاہراہ کی تعمیر شروع کر دی یہ شاہراہ 131 اکتوبر 1978ء کو مکمل ہو گئی لیکن جب 1979ء کا اپریل آیا تو معلوم ہوا غلطی سے ”فری وے“ کی تین نمبر سڑک تتلیوں کے روٹ پر بنادی گئی اور اس سال جب تتلیوں نے سفر شروع کیا تو وہ دھڑا دھڑا ٹریفک حادثوں کا شکار ہونے لگیں تتلیاں اپنے نرم پروں اور کمزور سانس کی وجہ سے زیادہ بلندی پر نہیں اڑ سکتیں لہذا ان کی پرواز اور گاڑیوں کی اونچائی میں زیادہ فرق نہیں ہوتا لہذا تتلیاں جب سفر پر روانہ ہوتی ہیں تو یہ گاڑیوں سے ٹکرانے لگتی ہیں اور موقع پر ہلاک ہو جاتی ہیں چنانچہ اس سال لاکھوں تتلیاں راستے میں مر گئیں اور اس کے بعد یہ معمول بن گیا جونہی اپریل شروع ہوتا تتلیاں سفر کیلئے نکلتیں اور مرتی چلی جاتیں 2005ء میں تائیوان کی ایک این جی او نے نیشنل جیوگرافک مجیکل کے ساتھ مل

کمرسروے کیا تو پتہ چلا ایک منٹ میں گیارہ ہزار پانچ سو تھپتھپائیاں اس سڑک پر سفر کرتی ہیں جبکہ پورے دن میں ایک ملین تھپتھپائیاں اس سڑک پر پہنچتی ہیں لیکن ان میں سے صرف ایک لاکھ تھپتھپائیاں شمالی وادیوں میں پہنچ پاتی ہیں 9 لاکھ تھپتھپائیاں راستے ہی میں دم توڑ جاتی ہیں 'تائیوان کے لوگوں' حکومت اور غیر سرکاری تنظیموں کیلئے یہ اعداد و شمار انتہائی اہمیت رکھتے تھے چنانچہ حکومت نے 2006ء میں اس کا بڑا دلچسپ حل نکالا اس نے فری وے کی لین نمبر تین پر سیلوں لگا کر جال لگا دیا یہ جال سڑک کے شروع میں نیچے اور آگے چل کر نسبتاً اونچا تھا جال لگانے کا مقصد یہ تھا کہ جب تھپتھپائیاں سفر پر روانہ ہوں تو وہ جال کے اوپر چلی جائیں اور حادثے سے بچ جائیں یہ تکنیک بڑی حد تک کامیاب ہوئی اور 2006ء میں تھپتھپائیوں کی ہلاکت میں کمی واقع ہوئی لیکن اس کے باوجود ہزاروں تھپتھپائیاں جال کے اندر آ جاتی تھیں اور سامنے سے آنے والی ٹریفک کا شکار ہو جاتی تھیں 2007ء میں حکومت نے دو کام کئے اس نے جال بھی لگا دیا اور فری وے کی لین نمبر 3 ٹریفک کیلئے بھی بند کر دی یہ لین نمبر 3 اپریل سے 29 اپریل تک بند رہی چنانچہ پچھلے 25 برسوں میں پہلی بار تھپتھپائیوں نے ہر قسم کے خطرے سے آزاد ہو کر سفر کیا یہ منظر دیکھنے کیلئے روزانہ ہزاروں لوگ فری وے پر جمع ہو گئے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے زمین سے پانچ فٹ اوپر رنگوں کا دریا بہتا ہوا دیکھا میں نے یہ منظر تائیوان کے ایک ٹیلی ویژن چینل پر دیکھا ٹیلی ویژن کا بھر کبہ رہا تھا "یہ تھپتھپائیاں اتنی ہی شہری ہیں جتنے تائیوان کے دوسرے لوگ اگر ہمیں اس معاشرے میں پورے حقوق کے ساتھ زندہ رہنے کا حق ہے تو ان تھپتھپائیوں کو بھی اتنے ہی حقوق حاصل ہیں" مبصر نے مزید کہا انسان کو دوسری مخلوقات کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق رکھنا چاہیے خواہ یہ مخلوق تھپتھپائیاں ہی کیوں نہ ہوں"

میں نے تائیوان کی "ملک وید" تھپتھپائیوں کی داستان سنی تو مجھے محسوس ہوا ایک طرف تائیوان کے لوگ ہیں جو تھپتھپائیوں کیلئے بھی انسانوں سے براہ کمر سوچتے ہیں جبکہ دوسری طرف ہم لوگ ہیں جن کے پاس انسانوں کیلئے سوچنے کا وقت نہیں میں نے سوچا چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کا کیا قصور تھا؟ کیا وہ قانون کے دائرے میں رہ کر کام نہیں کر رہے تھے چیف جسٹس کا کام لوگوں کو انصاف دینا ہوتا ہے اور یہ شخص کسی سوسائٹیاکشن اور کسی جمہوریتوں کے ذریعے لوگوں کو انصاف دے رہا تھا صدر نے اس کے خلاف اپنا آئینی اختیار استعمال کیا تو یہ شخص اپنی صفائی کیلئے سپریم کورٹ جانے لگا کیا اس ملک میں کسی شخص کو اپنی صفائی پیش کرنے کا حق نہیں؟ یہ شخص جب انصاف کیلئے نکلا تو سب سے پہلے دکھلا اس کے گرد جمع ہوئے حکومت کو دکھلا کی یہ جرأت پسند نہ آئی سوال یہ ہے کیا وہ کیلوں کو کسی شخص کا ساتھ دینے کا حق حاصل نہیں؟ یہ شخص دوروں پر روانہ ہوا تو لوگ دیوانہ وار سڑکوں پر نکل آئے لوگوں نے اس کے ہاتھ اس کی گاڑی اور اس کے کپڑے چومنا شروع کر دیئے کیا اس ملک کے لوگوں کو کسی شخص کے حق میں نعرے لگانے اس کیلئے سڑکوں پر نکلنے اور کسی شخص کے ہاتھ چومنے کا حق حاصل نہیں اور پھر اس شخص نے 12 مئی 2007ء کو کراچی بار سے خطاب کا اعلان کیا تو کراچی شہر کو ایک دن کیلئے غنڈوں بد معاشوں اور قاتلوں کے حوالے کر دیا گیا یہ لوگ دن بھر رنجرز کی گاڑیوں کے پیچھے پناہ لے کر گولی چلاتے رہے اور اس

فائرنگ کے نتیجے میں 34 معصوم انسان جاں بحق اور ڈیڑھ سو زخمی ہو گئے اس دن صورتحال یہ تھی نفیس سڑکوں پر پڑی تھیں اور انہیں اٹھانے والا کوئی نہیں تھا سوال یہ ہے کراچی کے لوگوں کو کس جرم کی سزا دی گئی؟ کیا اس ملک میں چیف جسٹس کا استقبال کرنا جرم ہے؟ کیا وہ تمام لوگ مجرم ہیں جو چیف جسٹس کو مظلوم اور بے گناہ سمجھتے ہیں اور ان کی بحالی کے خواہاں ہیں؟ لوگوں نے ایم کیو ایم کو اس قتل و غارت گری کا ذمہ دار قرار دیا اخبارات کے فونو گرافروں اور ٹیلی ویژن چینلوں کے کمرہ بینوں کے پاس فائرنگ کرنے والوں کی تصاویر موجود تھیں ہزاروں لاکھوں لوگوں نے اپنی نظروں سے ٹہلی وچرن سکریں پر ان لوگوں کو گولی چلاتے ہوئے بھی دیکھا لیکن حکومت نے ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی کی اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی پرچہ درج ہوا سوال یہ ہے اگر کوئی شخص حکومت کی "محبت" میں بے گناہ لوگوں کو قتل کر دے تو کیا یہ جرم جرم نہیں رہتا!! لوگوں نے جب با آواز بلند ایم کیو ایم کے خلاف احتساب کے مطالبے کیے تو صدر صاحب نے ایم کیو ایم ہماری اتحادی اور محبت وطن ہے کا دعویٰ فرما کر یہ مطالبے مسترد کر دیئے سوال یہ ہے کیا اتحادیوں کیلئے اس ملک میں کوئی قانون کوئی ضابطہ اخلاق نہیں اور آخر میں میڈیا کی باری آتی ہے میڈیا نے 12 مئی کو بڑی جرأت اور پروہیشنل ازم کا مظاہرہ کیا میرے دوست طلعت حسین نے جان پر کھیل کر ساری صورتحال عوام کے سامنے رکھ دی ان پر گولیاں برستی رہیں لیکن وہ کبھی بیچہ کر اور کبھی لیٹ کر کوریج کرتے رہے لیکن حکومت نے اس پروہیشنل ازم کو تخریب کاری قرار دیا صدر صاحب نے فرمایا "اگر میڈیا نے اپنی منفی سرگرمیاں بند نہ کیں تو میں سختی کروں گا" سوال پیدا ہوتا ہے کیا اصلی خبر لوگوں تک پہنچانا منفی سرگرمی ہے اور کیا اس ملک میں پروہیشنل ازم جرم ہے؟ ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے 12 مئی اس ملک کے ہاشور لوگوں کیلئے بے شمار سوال چھوڑ گیا ہے اور ان تمام سوالوں کا صرف ایک ہی جواب ہے "طاقت" اس ملک میں قانون ضابطہ اور اخلاقیات صرف محروم اور کمزور لوگوں کیلئے ہے جبکہ اس ملک کا ہر طاقتور شخص اور اس طاقتور شخص کے دوست 'خواری اور اتحادی ہر قسم کے قانون اور ضابطے سے مبرا ہیں ان لوگوں کا اس ملک میں کوئی خدا نہیں۔

میں نے تائیوان کی تیلیوں کا تقابل پاکستان کے لوگوں سے کیا تو میرے دل سے آہ نکلی اور میں نے سوچا کاش ہم سولہ کروڑ لوگ تائیوان کی تیلیاں ہوتے کاش ہم لوگ حشرات الارض ہوتے اور کسی غیر اسلامی ملک کی زمین پر ریگ رہے ہوتے تو آج دنیا میں ہمارے حقوق بھی ہوتے ہمیں بھی زندہ رہنے سانس لینے اور نعرہ لگانے کی آزادی ہوتی آج ہم لوگ یوں حکومت کے اتحادیوں کے ہاتھوں سڑکوں پر نہ مارے جاتے۔



صرف حاضری لگوانے کے لیے

”مرزا صاحب ادھر کھڑے ہیں، میں حاضری لگوا کر آتا ہوں“ میرا دوست مرزا صاحب کی طرف چل پڑا اور میں گروپ پیش کا جائزہ لینے لگا، قبرستان میں ڈیڑھ دو ہزار لوگ تھے، میت قبر کے سرہانے پڑی تھی، مولوی صاحب تہ فین کیلئے ہدایات دے رہے تھے اور لوگ مختلف ٹولیوں میں کھڑے ہو کر سگڑت پی رہے تھے، جمائیاں لے رہے تھے یا پھر مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے، مرزا صاحب کے گرد سب سے زیادہ رش تھا، لوگ ان کے پاس جاتے تھے، ان سے ہاتھ ملاتے تھے ”بہت افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کو مہربان دے“ جیسا روایتی فقرہ بولتے تھے اور آگے نکل جاتے تھے، میں تمام ٹولیوں کا جائزہ لینے لگا، زیادہ تر لوگ غیر فعال چیف جسٹس، پانوں کی قیمتوں اور بینظیر بھٹو کی ذیل پر گفتگو کر رہے تھے، ایک دو حضرات مرزا صاحب کی غیبت میں بھی مصروف تھے جبکہ چند لوگ پاکستانی قبرستانوں کا یورپی قبرستانوں سے تقابل کر رہے تھے، وہ یورپی قبرستانوں کی صفائی، خوبصورتی اور ترتیب کی تعریف کرتے تھے اور حسرت سے کہتے تھے کاش مرحوم کا نام ہنری یا قلب ہوتا اور اس کا انتقال یورپ میں ہوتا تو وہ آج آسودہ حال مرد ہوتا، کچھ لوگ آگے پیچھے دیکھ کر تہقیر لگا رہے تھے، چند زندہ دل ایک دوسرے کو تازہ ترین لینے سنا رہے تھے جبکہ نوے فیصد لوگوں کے موبائل بج رہے تھے۔ مرزا صاحب سوگواروں کے اس ہجوم میں گھرے تھے اور وقتے وقتے سے اپنے مرحوم بھائی کی خوبیاں گنوارہے تھے۔ لوگ ان کی ہر بات پر ہاں میں گردن ہلا دیتے تھے، ہجوم کے درمیان چار فونو گرافر بھی گھوم رہے تھے، یہ فونو گرافروں کا موجود ہر نامور، مشہور اور اہم شخصیت کی تصویر کھینچ رہے تھے، بعض لوگ فونو گرافروں سے اہم لوگوں کے ساتھ تصویر کھینچانے کی فرمائش کرتے تھے وہ اپنی ڈائری میں اس کا ایڈریس اور ٹیلی فون لکھتے تھے اور اسے اہم شخصیت کے ساتھ کھڑا کر کے تصویر کھینچ دیتے تھے۔ قبرستان سے ذرا فاصلے پر شامیانے لگے تھے، باوردی ویٹر شامیانے میں کھانا لگا رہے تھے۔ کھانے کا انتظام شہر کی مشہور کینٹرنگ کمپنی نے کیا تھا جبکہ دوسرے شامیانے میں دو مدرسوں کے چار سو بچے قرآن خوانی میں مصروف تھے، قبرستان میں دعا کیلئے ساؤنڈ سسٹم لگ رہا تھا، کمپنی کے باوردی ورکر قبرستان کے چار کونوں میں سپیکر لگا رہے تھے جبکہ مرزا صاحب کے ملازموں نے قبرستان کے درمیان میں لکڑی کا ایک تخت بچھا دیا تھا، مولوی صاحب نے اس تخت پر کھڑے ہو کر دعا کرانی تھی، میں اس سارے انتظام کا جائزہ لے رہا تھا۔

میرا دوست واپس آ گیا، وہ بہت خوش تھا، مرزا صاحب کے سامنے اس کی حاضری لگ گئی تھی، مرزا صاحب اس کے والد کے جنازے میں شریک ہوئے تھے لہذا اس نے ان کے بھائی کی تدفین میں شریک ہو کر بدلا اتار دیا تھا، وہ بار بار ہاتھ ملتا تھا اور مسکرا کر کہتا تھا ”مرزا صاحب ایک عظیم انسان ہیں، بھائی کے انتقال کے باوجود انہیں میرا کام یاد تھا انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا آپ نگر نہ کریں قتل کے بعد آپ کا کام ہو جائے گا“ میرا دوست خوشی سے بار بار ہاتھ رگڑتا تھا، قبرستان کا چکر لگا تا تھا اور واپس آ کر مرزا صاحب کی یادداشت اور وسعت قلبی کی تعریف کرتا تھا، وہ خوشی میں اوپر تلے تین چار سگریٹ بھی پھونک گیا، اس نے قبرستان کا چوتھا چکر لگایا اور واپس آ کر خردی ”تدفین میں مزید آدھ گھنٹہ لگ جائے گا، مولوی صاحب کو قبر کے رخ پر اعتراض ہے وہ اب قبر کی چھائی کر رہے ہیں لہذا ہمیں کھسک جانا چاہیے“ میں نے آہستہ آواز میں کہا ”لوگوں کے درمیان سے ٹکنا اچھا نہیں لگتا“ اس نے آگے پیچھے دیکھا اور دہلی آواز میں بولا ”مرزا صاحب کے سامنے حاضری لگ چکی ہے اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں، ہم قبرستان کی دیوار کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے نکل جاتے ہیں، کسی کو پتہ نہیں چلے گا، لوگ کلب میں میرا انتظار کر رہے ہیں“ میں اس دوست کے اصرار پر وہاں آیا تھا اور میں نے اس کی گاڑی میں واپس جانا تھا چنانچہ میرے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی، ہم دونوں قبرستان کی دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے، وہاں ہمارے جیسے میں پچیس مزید سمجھدار لوگ بھی موجود تھے وہ بھی ”حاضری“ لگوا چکے تھے اور انہیں بھی سردے میں اب کوئی دلچسپی نہیں تھی ہم بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر قبرستان سے باہر نکل گئے، ہماری گاڑی ذرا فاصلے پر کھڑی تھی ہم نوٹے ٹیوں سے ہوتے ہوئے گاڑی کی طرف چل پڑے میرا دوست اس دوران دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ کرنے لگا ”اس کا کہنا تھا“ ہمارے دلوں سے خوف خدا ختم ہو چکا ہے ہم لوگ موت پر بھی ویسے جتنا کھانا پکاتے ہیں تم مرزا صاحب کو دیکھو انہوں نے قبرستان میں کیرنگ کا بندوبست کر دکھا تھا“ میرے دوست کو قبرستان میں موجود فوٹو گرافروں پر بھی اعتراض تھا، اس کا کہنا تھا چند برس پہلے تک صرف شادی بیاہ کی تصویریں شائع ہوتی تھیں لیکن اب اخبارات میں جنازے، قتل اور چالیسیوں کی تصویریں بھی چھپتی ہیں، کل تک صرف شادی بیاہ کے چیف گیسٹ ہوتے تھے لیکن اب جنازوں کیلئے بھی چیف گیسٹ کا بندوبست کیا جاتا ہے اس کا کہنا تھا ہمارے ملک میں اب کسی شخص کے والد بھائی یا بھتیجے کے جنازے میں جتنے وزیر، مشیر، سفیر اور کاروباری لوگ شریک ہوتے ہیں وہ شخص اتنا ہی معتبر اور با اثر سمجھا جاتا ہے میرے دوست کا کہنا تھا لوگ کل تک اپنے بچوں اور بہن بھائیوں کی شادیوں پر لوگوں کو مدعو کیا کرتے تھے لیکن اب لوگوں نے سوگواروں اور جنازے پڑھنے والوں کی فہرٹیں بھی بنا رکھی ہیں جوں ہی ان کا کوئی عزیز فوت ہوتا ہے ان کا سیکرٹری یا پی اے لوگوں کو ٹیلی فون کرنا شروع کر دیتا ہے سیکرٹری صاحب یا پی اے جنازے سے ایک آدھ گھنٹے پہلے شرکاء کو ”ری کنفرم“ بھی کرتے ہیں جبکہ اس جنازے میں اگر کسی وی وی آئی بی نے شرکت کرنی ہو تو جنازے کا وقت اس شخصیت کی مصروفیات کے مطابق ”ایڈجسٹ“ کر لیا جاتا ہے میرے دوست نے پنجاب کے ایک سیاسی خاندان کی مثال دی، ان لوگوں کا والد فوت ہو گیا تھا، اس وقت چیف منسٹر غیر ملکی دورے پر تھے چنانچہ انہوں نے والد کا جنازہ چیف منسٹر کی واپسی

تک سوخا کر دیا، وزیر اعلیٰ واپس آئے تو چیف منسٹر ہاؤس سے باقاعدہ وقت لیا گیا، جنازہ گاہ کے ساتھ ٹیلی پینڈ بنایا گیا، چیف منسٹر صاحب جنازے سے لیٹ ہو گئے تو ان لوگوں نے شرکاء کو جنازہ گاہ میں دو گھنٹے انتظار کرایا، چیف منسٹر آئے، جنازہ پڑھایا گیا اور اس کے بعد ان لوگوں نے میت اپنے ملازموں کے حوالے کی اور خود چیف منسٹر کے ساتھ جیلے میں چلے گئے۔

میرے دوست نے ایک اور سیاسی شخصیت کی مثال بھی دی، یہ صاحب جب کسی جنازے میں شریک ہوتے ہیں تو فوٹو گرافر اور کمرہ بین ساتھ لے کر جاتے ہیں، یہ صاحب تعزیت اور مردے کیلئے دعا کرتے ہوئے ہمیشہ اپنی تصویر بھی اترواتے ہیں اور فلم بھی بنواتے ہیں اور بعد ازاں یہ فلم ٹیلی ویژن پر چلائی جاتی ہے اور تصویریں اخبارات میں شائع ہوتی ہیں، میرے دوست کا کہنا تھا دعا کے لئے اب صدر وزیر اعظم، وزراء اعلیٰ اور وزراء کو بلوانا فیشن ہو چکا ہے، لوگ اب کسی کی سماجی حیثیت اور شیئس کا اندازہ اس کے گھر دعا کیلئے آنے والی شخصیات سے کرتے ہیں، اگر ان کے گھر صدر یا وزیر اعظم آجائے اور ان کی آمد کی تصویر اخبارات اور ٹیلی ویژن جوتنر پر آجائے تو لوگوں پر اس کے تعلقات کی دھاک بندھ جاتی ہے اور لوگ بڑی مدت تک تذکرہ کرتے رہتے ہیں، فلاں کے والد کے انتقال پر صدر صاحب آئے تھے اور فلاں کے گھر وزیر اعظم آیا تھا، میرے دوست کا کہنا تھا لوگ اب یہ بھی مانیٹر کرتے ہیں کسی شخص کے گھر کوئی شخصیت کتنی دیر میں آئی تھی، اگر صدر یا وزیر اعظم انتقال کے فوراً بعد اس شخص کے گھر پہنچ جائیں تو وہ انتہائی اہم شخص سمجھا جاتا ہے، اگر یہ حضرات دوسرے دن جائیں تو یہ لوگ کم اہم سمجھے جاتے ہیں اور اگر ایک آدھ ماہ گزرے جائے تو وہ اہم شخصیات کی فہرست میں تیسرے درجے کا اہم شخص ہوتا ہے، میرے دوست کا کہنا تھا لوگ اب صدر اور وزیر اعظم کو دعا کیلئے گھر بلانے کے لئے باقاعدہ "لائگ" کرتے ہیں، وہ مقتدر شخصیات پر دباؤ ڈالنے کے لئے گرو پنک تک کرتے ہیں، وہ صدر صاحب کو بتاتے ہیں آپ نے فلاں شخص کی تعزیت کر کے ہماری ناک کاٹ دی تھی اور اگر آپ ہمارے گھر نہ آئے تو ہمارے لئے ووٹ لینا مشکل ہو جائے گا، یہ لوگ صدر وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ سے بیٹھی وعدہ بھی لے لیتے ہیں چنانچہ یہ لوگ اس وعدے کے بعد بڑی شدت سے اپنے کسی قریبی عزیز کے انتقال کا انتظار کرتے ہیں۔ میرے دوست نے نفرت، افسوس اور بیزارگی سے سر مارا اور آخر میں تاسف سے بولا "پتہ نہیں زمانے کو کیا ہو گیا ہے لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف ہی نہیں رہا۔"

میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا، وہ اچانک میری طرف مڑا اور اس نے مجھ سے پوچھا "لوگ اس طرح کیوں کرتے ہیں؟" لوگوں کو قبرستانوں، مردوں اور جنازوں میں کھڑے ہو کر بھی اللہ کا خوف کیوں نہیں آتا؟" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے جواب دیا "لوگ آج کل قبرستانوں میں مردوں کیلئے نہیں جاتے، یہ جنازہ پڑھنے اور دعا کیلئے بھی نہیں جاتے، یہ فقط حاضری لگوانے اور تصویر کھینچانے کیلئے آتے ہیں، یہ دوسروں کے دلوں میں اپنے تعلقات کی دھاک بٹھانے کیلئے آتے ہیں، میں رکا اور دوبارہ عرض کیا "آج کل لوگ مردوں کیلئے نہیں بلکہ زندوں کیلئے قبرستان جاتے ہیں لہذا ان کے دل خدا کے خوف سے خالی ہیں"



ہمارے پاس بنیاد ہی نہیں

خاتون نے عجیب سوال پوچھا، اس نے پوچھا، "پاکستان کے سینئر صحافی اور کالم نگار حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں، اخبارات میں حکومت کی کرپشن، بے حسی، اختیارات سے تجاوز اور اقرباء پروری کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن حکومت کے کان پر جوں تک نہیں ریگتی، حکومت ان کالموں اور ان خبروں کی تردید تک گوارا نہیں کرتی، کیوں؟" میں نے تھوڑی دیر سوچا اور اس کے بعد ان سے عرض کیا، "حکومت کے تمام اہم ستونوں نے آنے والی زندگی میں دوٹ مارتے ہیں اور نئی الیکشن لڑنے میں چنانچہ لوگ حکومت کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، وہ حکمرانوں کو کس نظر، کس زاویے سے دیکھتے ہیں حکومت کو اس سے کوئی غرض نہیں، میں نے عرض کیا، "حکمرانوں اور عوام کے درمیان سب سے بڑا رشتہ ووٹ اور الیکشن ہوتے ہیں، جو سیاستدان بیٹل باکس سے ہو کر حکومت تک پہنچتے ہیں وہ اپنے امیج، وہ اپنے تاثر کے بارے میں بہت محتاط ہوتے ہیں، انہیں معلوم ہوتا ہے وہ عوام کے کندھے پر بیٹھ کر ایوان تک پہنچتے ہیں اور جب تک انہیں عوامی مقبولیت حاصل رہے گی ان کے اقتدار کا سورج چمکنا رہے گا چنانچہ یہ لوگ نہ صرف خبروں اور کالموں کے معاملے میں سنجیدہ ہوتے ہیں بلکہ ان کے کانوں پر جوں بھی ریگتی ہے لیکن جو لوگ بھٹی گلی سے ہو کر اقتدار تک پہنچتے ہیں اور جنہوں نے سامنے والے دروازے سے نکل کر امریکہ واپس لوٹ جانا ہوتا ہے انہیں عوام، اخبارات اور عوامی رائے کی کوئی پروا نہیں ہوتی، وہ عوام کے غم، غصے اور نفرت کو جوتے کی ٹوک پر رکھتے ہیں اور ہماری حکومت بد قسمتی سے دوسرے گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔"

میں نے خاتون سے عرض کیا، "آپ کی بات سو فیصد درست نہیں، اس حکومت میں بھی بے شمار ایسے لوگ ہیں جو اپنے امیج کے بارے میں فکر مند ہیں، جو تردید بھی کرتے ہیں، کالم نگاروں کو خائف بھی بتاتے ہیں اور اپنی غلطیوں کی معافی بھی مانگتے ہیں، خاتون نے حیران ہو کر پوچھا، "یہ کون لوگ ہیں؟" میں نے عرض کیا، "یہ وہ لوگ ہیں جو 2002ء کے الیکشنوں میں باقاعدہ جیت کر اسمبلی تک پہنچے تھے اور جنہوں نے 2007ء کے الیکشنوں میں ایک بار پھر عوام کے پاس جانا ہے، خاتون نے فرمایا، "آپ اپنے تھیس کی وضاحت کریں،" میں نے عرض کیا، "آپ حکمران جماعت کے ایم این ایز اور سینئروں کے رویے کا تجزیہ کر لیجئے، مسلم لیگ ق کے ایم این ایز ہر عوام

دشمن بل پر پس و پیش سے کام لیتے رہے ہیں جبکہ سینئرز کو کسی قسم کی پروا نہیں، آپ تحفظ حقوق نسواں بل کو لے لیجئے، مسلم لیگ (ق) کے ایم این ایز کے دل میں اس بل کے بارے میں تحفظات پائے جاتے تھے یہ لوگ اس بل کی پیدائش سے لے کر منظوری تک اپنی گردن بچانے کی کوشش کرتے رہے، یہ لوگ "بیک ڈور ڈپلومیسی" کے ذریعے مسلم لیگ (ن) اور ایم ایم اے کو اس بل کی مخالفت پر اکساتے رہے تھے، انہوں نے اس بل کے خلاف اخبارات کو بھی استعمال کیا لیکن جب حکومت نے ان ایم این ایز کو ڈنڈا دکھانا شروع کر دیا تو یہ لوگ اس ڈنڈے کے خوف سے بل منظور کرنے پر مجبور ہو گئے، چودھری شجاعت حسین حکمران جماعت کے صدر ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس بل کے معاملے میں اپنے ایجنٹ کے بارے میں متشکر ہیں، وہ بل منظور ہونے کے بعد بھی نہ صرف علماء کرام سے رائے لے رہے ہیں بلکہ وہ اپنے ملاقاتیوں سے بھی بہانے بہانے سے اپنے اور اپنی پارٹی کے ایجنٹ کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس آپ مسلم لیگ (ق) کے سینئرز کو لے لیجئے، یہ لوگ شروع دن سے اس بل کی حمایت کر رہے تھے، ان لوگوں نے آگے بڑھ بڑھ کر اس کی حمایت میں تقریریں بھی کیں اور بیانات بھی جاری کئے، اس بل کی منظوری کے بعد وزیراعظم شوکت عزیز اور ہمارے وزیر اطلاعات و نشریات جناب محمد علی درانی بل کے سب سے بڑے وکیل ہیں، آپ ان دونوں کا پس منظر بھی ملاحظہ کیجئے، یہ دونوں ایک سیاسی شارٹ کٹ کے ذریعے اقتدار تک پہنچے ہیں لہذا انہیں بھی اپنے عوامی ایجنٹ کی کوئی پروا نہیں۔"

میں نے عرض کیا "ایک ڈیموکریٹک اور ایک ڈیکٹیٹر حکومت میں یہی فرق ہوتا ہے، ڈیموکریٹک حکومت اپنے ایجنٹ کے بارے میں بہت حساس ہوتی ہے جبکہ غیر جمہوری اور کسی جمہوری حکومتوں کو ایجنٹ کی کوئی پروا نہیں ہوتی، آپ نیوز کانفرنس کی مثال لیجئے، اس وقت ریگا میں نیوز کانفرنس ہو رہی ہے، اس کانفرنس کا پس منظر بہت دلچسپ ہے، کینیڈا کے اڑھائی ہزار فوجی نیوز کے پلیٹ فارم پر جنوبی افغانستان میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں، پچھلے دنوں طالبان کے ساتھ لڑائی میں کینیڈا کے 44 فوجی ہلاک ہو گئے، ان فوجیوں کے تابوت جب کینیڈا پہنچے تو عوام احتجاج کرنے لگے، اس احتجاج کے رد عمل میں کینیڈا کی حکومت اپنے فوجی واپس بلانے پر غور کرنے لگی لیکن امریکہ اور برطانیہ نے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا جس سے متاثر ہو کر کینیڈا افغانستان میں اپنے فوجیوں کے قیام میں 2009ء تک توسیع پر مجبور ہو گیا، اس توسیع پر کینیڈا میں شدید احتجاج شروع ہو گیا، صدر بش اور ٹونی بلینئر نے کینیڈا کی حکومت کو دباؤ سے نکالنے کے لئے نیوز کے رکن ممالک سے جنوبی افغانستان میں فوجی بھجوانے کی درخواست کر دی لیکن جرمنی، فرانس، اٹلی اور چین کی جمہوری حکومتوں نے صاف انکار کر دیا چنانچہ صدر بش نیوز کانفرنس بلانے پر مجبور ہو گئے، اب اگر آپ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر پاکستان کو دیکھتے تو آپ کو ایک جمہوری اور ایک غیر جمہوری حکومت کا فرق معلوم ہو جائے گا، ہم نے 2001ء میں افغانستان پر یوٹرن لیا تھا، ہم نے اس یوٹرن کے نتیجے میں کیا کیا نقصان اٹھایا، ذرا سوچئے، پاکستان میں کتنے بم دھماکے ہوئے؟ پاکستان میں کتنے خودکش حملے ہوئے؟ ہم نے لب تک نعشوں کے کتنے تابوت وصول کئے اور ہمارے باجوڑ اور دورگئی میں کتنے لوگ شہید

ہوئے؟ ہمارے شمالی اور جنوبی وزیرستان کے حالات کہاں جا پہنچے، بلوچستان کس حد تک آتش فشاں کی شکل اختیار کر گیا اور ہمارا پورا ملک کس قدر خوف اور دہشت گردی کا شکار ہوا؟ آپ 2001ء سے پہلے اور 2001ء کے بعد کے پاکستان کا جائزہ لیجئے، آج حالت یہ ہے ہمارا کوئی وزیر یک سیوری کور کے بغیر اپنے دفتر سے باہر نہیں نکل سکتا، ہماری مسجدیں تک غیر محفوظ ہیں اور ہر نماز کے وقت مسجدوں کے سامنے پولیس کھڑی ہوتی ہے، ہمارے عوام حکومت کی روشن خیالی اور مجاہد دشمن پالیسیوں کے دل سے خلاف ہیں اور ہر صاحب دل اور صاحب ایمان شخص حکومت کو برا بھلا کہہ رہا ہے، ملک میں مہنگائی ہے اور لوگ پیٹ پر روٹی باندھ کر ٹرین کے سامنے لیٹ رہے ہیں لیکن ہماری حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رہے، کیوں؟ کیونکہ حکومت عوامی ایجنج سے بالاتر ہے، اس کی بلا سے اس ملک کے سارے لوگ بھوکے مر جائیں، اسے کوئی فرق نہیں پڑتا لہذا میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ نینڈا نے پچھلے چھ برس میں جتنے تابت وصول کئے تھے اگر اتنے تابت روزانہ اسلام آباد کراچی اور لاہور میں آنا شروع ہو جائیں تو بھی ہماری حکومت کے پر تیلے نہیں ہوں گے، ہماری حکومت پریشان نہیں ہوگی، کیوں؟ کیونکہ اس حکومت نے بیلٹ ہاکس سے جرم نہیں لیا، یہ عوامی رائے کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوئی لہذا یہ عوام کے ایجنج اور رائے سے متاثر نہیں ہوتی، میں نے خاتون سے عرض کیا، ”جمہوریت، ووٹ اور بیلٹ ہاکس وہ بنیادی ”کیوں“ ہوتے ہیں جن سے قوموں کا مستقبل طے ہوتا ہے لیکن بد قسمتی سے ہمارے ملک کے پاس یہ بنیاد ہی نہیں“

Kashif Azad @ OneUrdu.com



دس لوگ

میں نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور گاڑی سے فوراً باہر آ گیا، عابد ڈرائیور کے پاس رک گیا، وہ پہلے گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا اور اس کے بعد دونوں باہر آ کر کھڑے ہو گئے، یہ میرے لئے انتہائی مشکل وقت تھا، فلائیب جھوٹے میں تھوڑی سی دیر باقی تھی لیکن عابد ڈرائیور کے ساتھ مذاکرات میں مصروف ہو چکا تھا، مجھے معلوم تھا یہ مذاکرات شام تک جاری رہیں گے، عابد انسانوں کے اس گروپ سے تعلق رکھتا ہے جو بولنے پر آتے ہیں تو اس وقت تک گفتگو جاری رکھتے ہیں جب تک دوسرا ان سے اتفاق نہیں کر لیتا یا پھر انہیں سلام کر کے دائیں بائیں نہیں ہو جاتا، میں عابد جیسے لوگوں کو "سیلز مین" کہتا ہوں، آپ ان لوگوں کو ہمیں کے سامنے کھڑا کر دیں تو یہ اسے رنگ گورا کرنے کی کریم پینٹا شروع کر دیں گے لیکن ہمارا ایک تیسرا دوست اس سے اتفاق نہیں کرتا، اس کا خیال ہے یہ لوگ پیداؤشی خوشامدی ہوتے ہیں، یہ بلا مقصد بلا فائدہ دوسروں کی خوشامدی کرتے رہتے ہیں، ان کے سامنے اگر شیطان بھی آ بیٹھے تو یہ اس کے حسن، اس کی ذہانت اور اس کے اخلاق کی تعریف شروع کر دیں گے، مجھے نہیں معلوم میری رائے درست ہے یا ہمارے اس تیسرے دوست کی لیکن یہ حقیقت ہے عابد موقع اور وقت دیکھے بغیر غیر متعلقہ لوگوں کے ساتھ گفتگو میں الجھ پڑتا ہے، وہ اس وقت بھی اپنی عادت بھارا ہوا تھا، میں کراچی انٹرنیٹ کے برآمدے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا اور وہ ہنس ہنس کر ڈرائیور سے گپ شپ کر رہا تھا، میں نے انگلی سے ہوا میں گھڑی بنائی اور اسے جلدی آنے کا اشارہ کیا، اس نے انگشت شہادت سے ایک منٹ مانگا، ڈرائیور کے ساتھ دو باتیں کیں، ڈرائیور نے قہقہہ لگایا، اس کے ساتھ بغل گیر ہوا، آکھیں پوچھیں، دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر سلام کیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا، عابد بھانگتا ہوا میرے پاس آ گیا، ہم ڈیپارچر لاؤنج کی طرف دوڑ پڑے۔

میں غصے سے اٹل رہا تھا، میں بورڈنگ پاس لینے تک خاموش رہا، ہم لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے تو وہ مسکرایا اور مجھے خوشامدی نظروں سے دیکھنے لگا، یہ اس کی عادت تھی، وہ ہمیشہ دوسروں کی تعریف کرنے سے پہلے ایسا کرتا تھا، وہ نرم اور مٹھی آواز میں بولا، "ڈرائیور شدید ٹینشن میں تھا، گاڑی کے مالک نے اسے گالیاں دی تھیں اور وہ طیش کے عالم میں گاڑی لے کر باہر آ گیا تھا شاید اسی وجہ سے وہ غیر محتاط ڈرائیور بن گیا تھا" میں نے گرم لہجے میں

جواب دیا "تم نے دیکھا نہیں اس نے راستے میں کتنے سنگل توڑے" اس نے ٹرار کے ساتھ ریس لگائی اس نے راستے میں کتنے لوگوں سے بدتمیزی کی اور وہ ہمارے ساتھ کس لہجے میں بات کر رہا تھا لیکن تم نے اس کے ساتھ رشتے داری نکالی تم بنیادی طور پر ایک گھنٹیا تم کے خوشامدی ہو تم خوشامد میں معیار تک کا خیال نہیں رکھتے" اس نے قبہ لگایا اور مجھے تو صلی نظروں سے دیکھ کر بولا "میں نے ڈرائیور کی فینشن بھانپ لی تھی لہذا میں نے اس کی فینشن کو دو منٹ دینے کا فیصلہ کیا تم گاڑی سے اترے تو میں نے اس کی ڈرائیونگ کی تعریف کی میں نے اس سے کہا میں نے پوری زندگی تم جیسا کوئی دوسرا ڈرائیور نہیں دیکھا تم نے انتہائی تیز رفتاری کے باوجود گاڑی کا توازن برقرار رکھا اور تم کراچی کے تمام "شارٹ کس" سے واقف ہو چھیں راستے میں جہاں بھی ٹریفک جام ملی تم فوراً کسی گلی میں گھس گئے اور چند منٹ میں کسی اچھی سڑک پر نکل آئے" میرے غصے میں اضافہ ہوا "میں نے نفرت اور بے بسی کے طے جلے احساس کے ساتھ اس کی طرف دیکھا "تم اس واہیات انسان کی ڈرائیونگ کو بہترین قرار دے رہے تھے" اس نے ایک بار پھر قبہ لگایا "میں اسے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اچھا ڈرائیور سمجھتا ہوں، اس نے غیر محتاط ڈرائیونگ کے باوجود گاڑی کو کسی سے ٹکرانے نہیں دیا، اس نے سارے سنگل توڑے لیکن کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ تم یقین کرو اس کی بے احتیاطی میں بھی ایک احتیاط تھی" میں نے غصے میں پہلو بدل لیا لیکن وہ بولتا چلا گیا "میری ہمدردی نے ڈرائیور کی فینشن کو آسروں کی شکل دے دی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ یہاں تک کہ اس کا سارا غصہ اس کی ساری نفرت ٹشو پیر میں منتقل ہو گئی۔ وہ ہلکا ہلکا ہو گیا، میں نیچے اترا، اسے بھی باہر نکالا، اس نے تازہ ہوا کے چند لمبے سانس لیے۔ میرے ساتھ کسی مذاق کی باتیں کیں اور چلا گیا۔" وہ چپ ہو گیا۔

میں نے گرم لہجے میں پوچھا "لیکن تمہیں مدد دینا بن کر کیا فائدہ ہوا؟" اس نے قبہ لگایا اور انکار میں سر ہلا کر بولا "میں نے کراچی جیسے اعلیٰ، پچھلے شہر کو اس اور سکون کا متحدہ دے دیا" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرایا "نفرت اور محبت کے جذبے متعدی امراض کی طرح ہوتے ہیں، یہ ہمیشہ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے آٹھویں دسویں شخص کو متاثر کرتے ہیں، غصے اور فینشن کا شکار شخص دو گھنٹوں میں پانچ سو لوگوں کا سوڈ خراب کر دیتا ہے اور یہ پانچ سو لوگ شام تک پورے شہر کو بیمار کر دیتے ہیں۔ ہماری نفرت کی ایک نظر، ہماری ایک گالی اور ہمارا پانچ سینکڑ کا غصہ "ملٹی پلانی" ہوتا ہے اور یہ شام تک پورے شہر کو شدت اور غصے میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح ایک تھینک بو، ایک شکر یہ، مہربانی کا ایک لفظ، ایک تھینک، واہ واہ کا ایک سینکڑ، شفقت کا ایک ہاتھ، ایک مسکراہٹ اور محبت کی ایک نظر بھی "ملٹی پلانی" ہوتی ہے اور شام تک پورے شہر کو خوبصورت بنا دیتی ہے" میں دلچسپی سے اس کی بات سننے لگا، وہ بولا "انسان جذبات کا ایگزاسٹ فین ہوتا ہے، ہم اپنے جذبات اپنی ذات تک محدود نہیں رکھ سکتے، ہم ہمیشہ دوسروں کو اپنی نفرت اور اپنی محبت میں شریک کرتے ہیں، برے لوگ ہمیشہ دوسروں کو برا بناتے ہیں اور اچھے اور نیک لوگ ہمیشہ دوسروں کو اچھائی کی تبلیغ کرتے ہیں، ہم اگر فینشن لے کر گھر سے نکلیں تو ہم یہ فینشن راستے میں ملنے والے لوگوں میں تقسیم کرتے جاتے ہیں، ہم اپنی فینشن رکشے والے، ٹیکسی والے، پٹرول

پپ کے چھوٹے، دفتر کے چیراسی، اپنے بی اے اور اپنے فٹرک کے حوالے کرتے جاتے ہیں اور یہ لوگ اس ٹینشن کو آگے منتقل کرتے رہتے ہیں۔ یوں ٹینشن اور نفرت کا یہ سلسلہ پورے شہر میں پھیل جاتا ہے، اسی طرح جب کوئی شخص اپنے گھر سے خوش حال ہے تو وہ اپنی یہ خوشی بھی راستے میں بانٹتا جاتا ہے۔ "وہ رکا اور دوبارہ بولا" میں نے محسوس کیا یہ ڈرامیور ٹینشن کا شکار ہے لہذا وہ کراچی کی سڑکوں پر ٹینشن کا چھڑکاؤ کر رہا ہے چنانچہ میں نے اس کا تہہ پاتی آپریشن کیا اور اس کا غصہ نکال کر ڈس بین میں پھینک دیا جس کے بعد وہ پرسکون ہو گیا تم ذرا تصور کرو اب وہ جس راستے سے گزر رہا ہوگا، وہ جس جس شخص سے مل رہا ہوگا وہ اسے سکون، اطمینان، ہمدردی اور محبت کا تھنڈے رہا ہوگا۔ وہ لوگوں میں امن اور محبت تقسیم کر رہا ہوگا "عابد خاموش ہو گیا، میرے پاس اس کی بات جھٹلانے کیلئے کوئی دلیل، کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ بولا "میرا دعویٰ ہے اگر صرف دس لوگ یہ نیت لے کر گھر سے نکلیں کہ ہم نے لوگوں کی ٹینشن اور نفرت کو ہمدردی اور محبت میں تبدیل کرنا ہے اگر یہ لوگ شام تک گلیوں، بازاروں، بسوں، ویکوں اور رشتوں میں لوگوں کے غصے کی آگ بجھاتے رہیں تو پاکستان کے تمام شہروں کے مزاج بدل جائیں۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ لڑنا، بھڑانا بند کریں اور لوگوں میں فساد کی خوار و اختلاف کی عادت ختم ہو جائے" وہ رکا، اس نے ایک لمحہ غور کیا اور مسکرا کر بولا "ہمارے ہر شہر کو ایسے دس رضا کاروں کی ضرورت ہے جو محبت کے ڈسٹری بیوٹرز بن جائیں، جو ٹشو پیپر بن کر سارے شہر کی تخی چوس لیں اور جو شہروں میں مسکراہٹوں کی دکانیں کھول لیں، تم یقین کرو، یہ ملک بدل جائے گا"



جہاں زیادہ محنت وہاں زیادہ ٹیلنٹ

لو جو ان نے پانی کا گلاس چڑھایا ایک لمبی آہ بھری اور کرسی سے ٹیک لگا دی "سر میں ناکامیوں کا مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتا لہذا میں مرجانا چاہتا ہوں سر میں خودکشی کر لوں گا" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پیار سے پوچھا "تم ضرور خودکشی کر لیتا یہ آپشن دنیا کے تمام جانداروں کیلئے ہر وقت کھلا رہتا ہے" اس نے آنکھیں پونچھیں اور مضطرب لہجے میں بولا "سر میں ایک ناکام طالب علم ہوں میں نے تین بار بی اے کے پرچے دیئے مگر میں ٹل ہو گیا" میں نے چار سال تو کیری تلاش کی کئی کئی بار میں نے پچھلے تین برسوں میں آٹھ قسم کے کاروبار کئے وہ سارے کاروبار ناکام ہوئے اور میرے گھر کے برتن تک بک گئے لہذا میرے لئے اب زندگی میں کوئی دلچسپی کوئی خوبصورتی نہیں میں مرجانا چاہتا ہوں" میں نے جملہ لگا دیا وہ مجھے نفرت سے دیکھنے لگا "میں نے کہا" تو تم جدوجہد کو شش اور محنت سے گھبرائے ہوئے ہو" اس نے پہلو بدل کر کہا "نہیں سر میں ناکامیوں سے گھبرایا ہوا ہوں" میں نے اس سے پوچھا "تم زندگی میں کتنی بار ناکام ہوئے ہو" اس نے تھوڑی دیر گنا اور پھر بے یقینی کے عالم میں بولا "بارہ تیرہ مرتبہ" میں نے اوپر بلب کی طرف اشارہ کیا "تم جانتے ہو یہ بلب کس نے ایجاد کیا تھا؟" "لو جو ان نے فوراً جواب دیا "ایڈیسن نے" میں نے کہا "ایڈیسن نے یہ بلب بنانے کیلئے 2 ہزار کوششیں کی تھیں اور اس کی ہر کوشش ناکام رہی تھی وہ دو ہزار کوششوں کے بعد کامیاب ہوا تو کسی نے اس سے پوچھا "تھیں 2 ہزار مرتبہ ناکام ہونا کیسا لگا" اس نے مسکرا کر جواب دیا "میں اپنی ناکامیوں کو ناکامیاں نہیں سمجھتا میں اپنی کامیابی کی سبز حیاں سمجھتا ہوں اور مرطے سمجھتا ہوں میں سمجھتا ہوں میں نے بلب کی منزل تک پہنچنے کیلئے وہ ہزار مرطے طے کئے تھے"

میں نے انگلی نیچے کی اور اس کی طرف دیکھ کر کہا "تم بتاؤ تیرہ ناکامیاں زیادہ ہیں یا دو ہزار ناکامیاں" وہ خاموش رہا میں نے کہا "بیٹا تم نے کبھی تپلی کی پیدائش کا عمل دیکھا ہے؟" اس نے انکار میں سر جھکا دیا میں نے کہا "قدرت تپلی کو ایک "کوکون" میں پیدا کرتی ہے جب اس کا جسم مکمل ہو جاتا ہے تو قدرت اس "کوکون" میں ایک باریک سا سوراخ کھداتی ہے اور تپلی کو اپنے پورے جسم کا زور لگا کر اس سوراخ سے باہر آنا پڑتا ہے سوراخ چھوٹا اور تپلی کا جسم بڑا ہوتا ہے لہذا وہ کوکون سے باہر آنے میں کئی کئی دن لگا دیتی ہے یہ کوشش یہ محنت اور یہ چھوٹا سا سوراخ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت ہے ہات دراصل یہ ہے جب تپلی کے جسم میں جان ڈالی جاتی ہے تو اس کے پر بے جان ہوتے ہیں جب وہ سوراخ سے باہر نکلنے کیلئے زور لگاتی ہے تو اس کے جسم سے ایک مواد نکل کر پروں کی رگوں میں چھپتا ہے یہ مواد پروں کو زندگی دیتا ہے تپلی "کوکون" میں جتنا زور لگاتی ہے اتنا ہی مواد اس کے پروں

میں پہنچتا ہے اور اس کے پر اتنے ہی خوبصورت اور اتنے ہی طاقتور ہو جاتے ہیں اگر یہ سوراخ تنگ نہ ہو اور اگر تنگی اس سوراخ سے باہر آنے کیلئے زور نہ لگائے تو وہ کبھی اڑنے کے قابل نہ ہو اور اس میں اور عام کیڑے مکوڑوں میں کوئی فرق نہ رہے یہ قدرت کا انتہائی دلچسپ نظام ہے تم اس نظام کو سامنے رکھ کر دیکھو تو تمہیں محسوس ہوگا قدرت جس شخص کو زیادہ ٹیلنٹ دیتی ہے اس شخص کو زندگی میں دوسروں کی نسبت زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے وہ عام لوگوں کی نسبت زیادہ ناکام ہوتا ہے "نوجوان نے حیرت سے میری طرف دیکھا میں نے مسکرا کر کہا "دیکھو تم انسانی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو میں تمہیں قریب ترین تاریخ کی مثالیں دیتا ہوں جیتھون مغربی موسیقی کا سب سے بڑا نام ہے اس کی سمٹیوں نے پوری دنیا میں آگ لگا دی تھی اس کا شمار تاریخ کے چار چہلڑ موسیقاروں میں ہوتا ہے لیکن یہ شخص اپنی موسیقی خود نہیں سن سکتا تھا یہ بہرہ تھا لہذا یہ سازوں کی حرکت اور سننے والوں کی کیفیت سے اپنے فن کا اندازہ لگاتا تھا جارج واشنگٹن امریکہ کا کامیاب ترین صدر تھا امریکہ کا دار الحکومت واشنگٹن اس کے نام سے منسوب ہوا وہ شخص چین میں فورگ کی وادی میں پھنس گیا تھا یہ وادی برف سے اٹی ہوئی تھی اور وہاں سے اس کے بچنے کے امکانات صفر تھے یہ اس کی زندگی کا ناقابل فراموش اور ناقابل یقین لمحہ تھا ابراہام لنکن کی زندگی انتہائی عسرت اور غربت میں گزری وہ جنگل سے نکل آیاں کات کلاتا تھا البرٹ آئین سٹائن کو دنیا کا سب سے بڑا دامغ کہا جاتا ہے لیکن وہ چین میں ایک ناکام اور تالائق طالب علم تھا اس کے استادوں کا کہنا تھا آئین سٹائن کبھی کالج کے درجے تک نہیں پہنچ سکے گا کہ سنوکرولبس نے امریکہ کی تلاش میں جنسی مشکلات برداشت کیں اس نے جتنے دیکھے کھائے تم اس کا تصور نہیں کر سکتے بھنو اول جوزو دنیا کا مشہور ترین اداکار ہے وہ طالب علمی کے زمانے میں بول نہیں سکتا تھا وہ طویل عرصے تک اپنے اساتذہ اور ہم جماعتوں سے لکھ کر بات کرتا تھا دنیا میں آنرک پرل مین سے اچھا دانشور آج تک کسی شخص نے نہیں بجایا یہ شخص نازی کیمپ میں پیدا ہوا اور چار سال کی عمر میں اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا اس نے پوری زندگی ویل چیئر پر بیٹھ کر واکمن بجایا اور جوسٹر کارل سن نے 40ء کی دہائی میں ایک سسٹم "ELECTROSTATIC PAPER-COPYING PROCESS" بنایا وہ سات برس تک یہ سسٹم اٹھا کر پھرتا رہا لیکن اسے ہر روز اڑے سے دھکارا دیا گیا یہاں تک کہ نیو یارک کی ایک چھوٹی سی کمپنی ہیلوئڈ (HALOID) نے یہ سسٹم خرید لیا اور اس کے بعد اس سسٹم کی بنا پر یہ کمپنی زیرویکس کے نام سے ملٹی نیشنل بن گئی ایسی بے شمار کہانیاں ہیں روز ویٹس امریکہ کا چار بار صدر منتخب ہوا اسے 39 سال کی عمر میں پولیو ہوا اور اس نے باقی زندگی تکلیف اور پریشانی میں گزاری وہ اسی عالم میں صدر بنا فاتح جاپان جنرل میک آرٹھر "دست پوائنٹ" کے داغ نمیت میں دو بار قتل ہوا تھا مشہور ایکٹرو لوسل بال کوڈرامہ سکول کے ہیڈ ماسٹر نے پیشہ بدلنے کا مشورہ دیا تھا اور اکیڈمی ایوارڈ یافتہ رائٹر پروڈیوسر اور ڈائریکٹر روڈی ایلن موٹن کیچر پروڈکشن میں مل گیا تھا لہذا میرے بیچ یہ مصیبتیں یہ ناکامیاں اور یہ کوششیں تو آپ کو طاقت دیتی ہیں یہ تو آپ کو آپ کے بڑھتے ترقی کرنے کا حوصلہ دیتی ہیں اور یہ قدرت کی طرف سے اعلان ہوتی ہیں اللہ نے آپ کو تنگی کی طرح زیادہ رنگوں سے نواز رکھا ہے لہذا آپ کو یہ رنگ دکھانے کیلئے زیادہ زور لگانا پڑے گا اور آپ کو اپنے پر پھیلانے کیلئے زندگی کے چھوٹے سوراخ سے گزرنے ہوں گے" میں خاموش ہو گیا نوجوان کا چہرہ جذبات سے دکھ رہا تھا وہ اٹھا اس نے مجھے سلام کیا اور نئے جذبے کے ساتھ زندگی کے دھارے میں شامل ہو گیا۔



ایک زبان دوکان

ہل میٹرٹ امریکہ کے ایک نامور بزنس مین ہیں یہ ہوٹلز کی دنیا کی سب سے بڑی "چین" میٹرٹ کے چیئرمین اور چیف ایگزیکٹو افسر ہیں دنیا کے 151 ممالک میں اس چین کے ہوٹل ہیں اس چین کی کامیابی کے پیچھے ہل میٹرٹ کی ان تھک محنت اور حیران کن ذہنی استطاعت ہے پچھلے سال کسی صحافی نے ہل میٹرٹ سے ان کی اس کامیابی کی وجہ دریافت کی "ہل میٹرٹ نے بڑا ٹوکھا جواب دیا اس کا کہنا تھا "میں لوگوں کی بات بڑے غور سے سنتا ہوں" پوچھنے والے نے حیرت کا اظہار کیا تو ہل میٹرٹ نے وضاحت کی "میں جب جوان تھا تو میرے والد نے مجھے ٹریننگ کیلئے نیوی میں بھرتی کر دیا ان دنوں آئرن ہاور امریکہ کے صدر تھے صدر میرے والد کے بہت اچھے دوست تھے ایک کمرس پر صدر ہمارے گھر تشریف لائے اس دن شدید سردی تھی اور باہر برف باری ہو رہی تھی میرے والد اور صدر دونوں برف میں نشانہ بازی کرنا چاہتے تھے صدر اندر بیٹھ گئے تو میرے والد نے مجھے حکم دیا "ہل تم جاؤ اور صدر سے کہو اس موسم میں نشانہ بازی واقعی ایک دلچسپ اور مزیدار کام ہوگا آپ پہلے آتش دان کے پاس بیٹھیں گے یا پھر فوراً نشانہ بازی پسند کریں گے" میں نے والد کی بات سنی لیکن کبھی نہیں "میں فوراً صدر کے پاس گیا اور ان سے عرض کیا "میرا باہر بہت سردی ہے اس سردی میں نشانہ بازی اچھی نہیں رہے گی آپ کیلئے بہتر ہے آپ آتش دان کے پاس بیٹھ جائیں" صدر نے تھینک یو کہا اور آتش دان کے قریب بیٹھ گئے جب صدر چلے گئے تو میرے والد نے مجھے بلایا اور سنجیدگی سے بولے "ہل ایک بات کان کھول کر سن لو جب بھی کوئی شخص بات کرے وہ بات غور سے سنو اور سننے کے ساتھ ساتھ اسے سمجھو اور جب تک تم سے تمہاری رائے نہ پوچھی جائے تم اپنی رائے نہ دو تم زندگی میں کبھی ناکام نہیں ہو گے" میں نے اپنے والد کی بات پلے باندھ لی لہذا اس کے بعد میں نے پوری زندگی فیصلے کرنے سے پہلے دوسرے لوگوں کی بات غور سے سنی اسے سمجھا اور پھر آرڈر جاری کیا یہ میری زندگی کی کامیابی کی واحد وجہ ہے۔"

ہل میٹرٹ کا یہ نظریہ بہت دلچسپ ہے لیکن یہ نیا نہیں امریکہ میں ایک ادارہ ہے "انٹرنیشنل سٹنگ ایوسی ایشن" یہ ادارہ لوگوں کو سننے کا فن سکھاتا ہے اس ادارے کا دعویٰ ہے "ہم لوگ روزانہ 45 فیصد وقت سننے میں

گزارتے ہیں لیکن ہم لوگ اپنی سنی ہوئی پچاس فیصد باتیں بھول جاتے ہیں ان کا کہنا ہے انسان زندگی میں جو کچھ سیکھتا ہے اس کے 75 فیصد حصے کی بنیاد سننے کی حس ہوتی ہے اگر انسان کی یہ حس چھن جائے یا معطل ہو جائے تو اس کی صلاحیتیں 75 فیصد کم ہو جاتی ہیں اور وہ 75 فیصد چیزیں سیکھنے کا اہل نہیں رہتا ان کا کہنا ہے ہم لوگ جو کچھ سنتے ہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں سے صرف 20 فیصد باتیں ہمارے ذہن میں رہ جاتی ہیں باقی 80 فیصد اطلاعات، علم اور باتیں ہمارے ذہن سے محو ہو جاتی ہیں لیکن کامیاب لوگ اس استطاعت کو بڑھا لیتے ہیں وہ میں فیصد سے زیادہ باتیں یاد رکھتے ہیں ان کے کان ان کے دماغ کے ان حصوں سے جڑے رہتے ہیں جو تمام سنی ہوئی باتیں ریکارڈ کر لیتے ہیں اس ادارے کا دعویٰ ہے انسان ایک منٹ میں 125 سے لے کر 250 لفظ تک سنتا ہے مگر یہ الفاظ دماغ میں پہنچ کر ذہن کو ایک ہزار سے 3 ہزار الفاظ سوچنے کی تحریک دیتے ہیں یہ تحریک بنیادی طور پر اس شخص کو عمل پر ابھارتی ہے اور جو شخص اس تحریک پر عمل کر لیتا ہے وہ زندگی میں کامیاب ہو جاتا ہے اس ادارے نے آج تک 35 ہزار سے زائد کے سروے کرائے یہ سروے دنیا کی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو افسر، جی جی ایم، صدر اور ڈائریکٹرز کے سروے کرتے ہیں ان سروے کے دوران معلوم ہوا دنیا میں ترقی کرنے والے تمام لوگ سننے کے فن سے واقف ہیں وہ اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ لوگوں کی باتیں سننے میں صرف کرتے ہیں وہ اپنے دونوں کان کھول کر بیٹھے ہیں اور وہ کہنے والوں کو پوری توجہ پوری سیکھتی دیتے ہیں سروے میں پتہ چلا جس کمپنی میں سننے والے لوگ زیادہ ہیں اس کمپنی نے دوسری کمپنیوں کی نسبت زیادہ تیزی سے ترقی کی۔ وہ کمپنی بہت جلد بڑی کمپنی بن گئی اس ادارے نے ناکام بزنس مینوں اور دیوالیہ کمپنیوں کے سروے بھی کئے اس سروے میں معلوم ہوا دیوالیہ ہونے والی کمپنیاں ایسے لوگ چلا رہے تھے جو سننے کی بجائے بولنے پر یقین رکھتے تھے جو کسی سے دوسرے شخص کی بات نہیں سن سکتے تھے یہ ادارہ امریکہ کی اعلیٰ کاروباری شخصیات، نوجوان بزنس مینوں اور بلیک ڈیلنگ کا کام کرنے والے لوگوں کو سننے کی ٹریننگ بھی دیتا ہے یہ انہیں بتاتا ہے اگر وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ مخاطب کی بات سننے میں صرف کریں گے اگر ان باتوں کو ذہن نشین کریں گے اگر ان کا تجزیہ کریں گے اور اس تجزیے کی بنیاد پر اپنی ذمہ داریاں نبھائیں گے تو ان کی کامیابی کا گراف بہت جلد اوپر چلا جائے گا۔

میں نے جب اس ادارے کی تحقیق کے بارے میں پڑھا تو مجھے اپنے ایک دوست یاد آگئے ان کا تعلق چینیٹی فیلٹی سے تھا اور کراچی میں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا ان کے ایک ملازم کا نام "نورا" تھا یہ نورا چالیس برس تک ان کے ساتھ رہا شیخ صاحب دنیا کے جس کونے میں جاتے تھے نورا ان کے ساتھ رہتا تھا وہ کار میں بیٹھیں جہاز میں ہوں ملک کے اندر ہوں باہر ہوں، فیکٹری جا رہے ہوں یا بیڈروم میں نورا سانسے کی طرح ان کے ساتھ رہتا تھا شیخ صاحب کے بیڈروم کے ساتھ نورا کے ایک چھوٹا سا بیڈروم تھا میں نے ایسی انوکھی دماغی دنیا میں کسی جگہ نہیں دیکھی تھی لہذا میں نے ایک بار شیخ صاحب سے اس "نورے بیڈروم" کے بارے میں پوچھا لیا شیخ صاحب نے اس کی ایک حیران کن وجہ بتائی انہوں نے بتایا نورا میرے ہونٹوں کی حرکت سے اندازہ لگا لیتا ہے میں کیا کہہ رہا ہوں

اور میں کیا چاہتا ہوں؟ میں اسے آج کہوں تم نے ٹھیک دس سال بعد مجھے یہ بات یاد کرائی ہے تو یہ ٹھیک دس برس بعد میرے کان پر جھکے گا اور آہستہ آواز میں کہے گا ”بھانجی آپ نے فلاں وقت یہ کہا تھا“ مجھے اس کی اس عادت اس صلاحیت سے پیار ہے، میں اگر بات بھول جاؤں تو میں فوراً نورے سے پوچھتا ہوں ”نورے تم بتاؤ میں نے فلاں جگہ یہ بات کہی تھی“ نورا فوراً لفظ بہ لفظ وہ بات دہرا دیتا ہے، میں شیخ صاحب کا جواب سن کر حیران رہ گیا، مجھے اس کردار سے معلوم ہوا سننا اور سننے ہونے کو یاد رکھنا کتنا بڑا فن ہے۔

میں واپس مل میٹریٹ کی طرف آتا ہوں، اس نے کہا تھا ”اگر لوگ اپنی زبان کی بجائے کانوں پر انحصار کریں تو دس ہزار گنا زیادہ کامیابی حاصل کریں میرے والد نے کہا تھا اللہ نے انسان کو زبان ایک جبکہ کان دو دیئے ہیں۔ لہذا انسان کو چاہئے وہ جتنا کام زبان سے لیتا ہے اس سے دو گنا کام کانوں سے لے“



Kashif Azad @ OneUrdu.com

سیلف ریٹائرمنٹ

ہم بارگاہ کی پہاڑی کے دامن میں پہنچے تو شیخ صاحب ٹھنک کر رک گئے۔ یہ ایک خوبصورت ادا تھا۔ اسلام آباد سنہری دھوپ میں نہایا ہوا تھا، ہم دونوں واک کیلئے پہاڑ پر گئے تھے شیخ صاحب ایک بیچ پر بیٹھ کر ہانپنے لگے، میں نے ان سے اوپر جانے کیلئے کہا تو وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولے ”میں ایک بوڑھا شخص ہوں تم چلے جاؤ“ میں یہاں رک کر تمہارا انتظار کرتا ہوں“ میں نے اصرار کرنے کا سوچا لیکن پھر ان کی حالت دیکھ کر چپ ہو گیا ان کے ہاتھ پر پیسے کے قطرے چمک رہے تھے اور سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی میں انہیں وہیں چھوڑ کر ٹریک کی طرف چل پڑا۔

شیخ صاحب میرے بزرگ دوست ہیں ان کی عمر بمشکل ساٹھ برس ہے لیکن اگر ان کا حلیہ ان کی سوچ اور سستی دیکھی جائے تو وہ اپنی عمر سے کہیں بوڑھے نظر آتے ہیں۔ وہ بات بے بات بڑھاپے کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس بڑھاپے کا پورا پورا کریڈٹ حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مثلاً وہ بس میں چڑھیں گے تو ساتھ ہی کسی نوجوان سے کہیں گے ”چل کا کاٹھ بوڑھے کو جگہ دو“ اور نوجوان کو اٹھا کر اس کی جگہ پر قابض ہو جائیں گے۔ مل جج کرانے جائیں گے تو تظار میں سب سے آگے موجود شخص کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے اور اس سے کہیں گے ”چل بھئی باؤ بوڑھے کو بھی مل جج کرانے دو“ اور جہاں بھی ڈرامی مشق کا مرحلہ آئے گا تو وہ اپنے بڑھاپے کا اعلان کر کے ایک سائینڈ پر کھڑے ہو جائیں گے میں ان کے اس رویے کا ہمیشہ شاک رہا ہوں میں ان سے اکثر کہتا ہوں ”شیخ صاحب آپ کہاں سے بوڑھے ہیں آپ کی عمر میں تو یورپ میں لوگ اخلاقی جرائم میں پکڑے جاتے ہیں“ لیکن وہ اپنی گردن کی لٹکی ہوئی جلد اور پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر ہانپنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں ان سے اکثر لڑنے کا پروگرام بناتا ہوں لیکن پھر یہ سوچ کر رہ جاتا ہوں کہ شیخ صاحب پاکستان میں اکیسے نہیں ہیں یہ ایک سوچ ہے جو پاکستان کی ایک سرحد سے دوسری سرحد تک پھیلی ہوئی ہے۔ پاکستان کا ہر وہ شخص جس کی عمر چالیس سال کی لیکر کو چھو جاتی ہے وہ بڑھاپے کا اعلان کرتا ہے اور زندگی کے دائرے سے نکل کر ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ ان تمام چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے دیتا ہے جسے مذہب، معاشرہ

اور اخلاقیات موت تک حلال کہتی ہیں۔ آپ پاکستان کے کسی شہر قصبے یا گاؤں کی کسی گلی بازار یا محلے میں کھڑے ہو جائیں آپ کو وہاں ایسے ہزاروں لاکھوں بزرگ ملیں گے جو سارا سارا دن کھیاں مارتے ہیں اور جن کی زندگی کا صرف ایک مشغلہ ہوتا ہے الف سے لے کر ی تک اخبار پڑھنا اپنے سنہری دلوں کو یاد کرنا موجودہ زمانے کو گالیاں دینا پورے محلے کی غیبت کرنا اور اپنے بچوں اور بہوؤں کو برا بھلا کہنا اس وقت پاکستان میں ایسے لوگوں کی تعداد کروڑوں سے کم نہیں ہوگی یہ لوگ مکمل طور پر بے کار ہیں اور یہ ایک "سیلف ریٹائرمنٹ" کے شکار ہیں جبکہ ہم جب یورپ اور امریکہ کا دورہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے وہاں لوگوں کی اصل زندگی شروع ہی ساٹھ برس سے ہوتی ہے۔

امریکہ میں پچھلے دنوں انکشاف ہوا بوزھے لوگ جوانوں سے بہتر پرفارمنس دیتے ہیں یہ انکشاف برگر بنانے والی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی میکڈونلڈ نے کیا تھا۔ جم کاناٹو یو ایس کمپنی کا چیف ایگزیکٹو تھا اس کی عمر 60 برس تھی پچھلے برس اپریل 2004ء میں اسے ہارٹ ایک ہوا اور وہ فوت ہو گیا اس کے انتقال کے بعد کمپنی نے سوچا ہمیں کسی جوان اور صحت مند شخص کو چیف ایگزیکٹو بنانا چاہئے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے بے شمار لوگوں کے انٹرویوز کئے ان میں سے چارلس تیل کو منتخب کر لیا گیا چارلس تیل 44 برس کا ایک صحت مند اور چست شخص تھا اس نے کمپنی جو ان کر لی لیکن اسے ابھی دفتر میں بیٹھے ایک ہی ماہ گزارا تھا کہ اسے کینسر ہو گیا اور وہ 2004ء کے آخر میں انتقال کر گیا۔ کمپنی کیلئے چارلس تیل کی موت ایک پریشان کن صورت حال تھی انہوں نے ماہرین سے رابطہ کیا ماہرین نے امریکی میڈیا کو لکھا جس کے بعد امریکہ میں یہ دلچسپ بحث چھڑ گئی کہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا چیف ایگزیکٹو کس عمر کا شخص ہونا چاہئے اعداد و شمار جمع کئے گئے معلوم ہوا امریکہ کی ایک ہزار بڑی کمپنیوں میں سے 627 کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو 70 برس اور 70 برس سے زیادہ عمر کے لوگ ہیں۔ ان اعداد و شمار کے تجزیے کے بعد معلوم ہوا بزرگ چیف ایگزیکٹو کی مالک کمپنیاں جوان تنظیمیں والی کمپنیوں کے مقابلے میں زیادہ برنس کر رہی ہیں۔ اس نئی سنڈی کے بعد اس کمپنی نے 60 سال کے ایک بزرگ جیمز سنکر کو چیف ایگزیکٹو بنا دیا تاہم ترین اعداد و شمار کے مطابق یہ میکڈونلڈ اب چارلس تیل کے دور سے کہیں بہتر برنس کر رہی ہے۔

یہ تو تھی برنس کی صورت حال اب آتے ہیں کھیلوں کی طرف ہاروے سکنے (HARVEY MACKAY) امریکہ کے ایک معروف کالم نگار ہیں۔ ان کا کالم بیک وقت 52 امریکی اخبارات میں شائع ہوتا ہے وہ "سکنے انوالوپ کارپوریشن" کے چیف ایگزیکٹو بھی ہیں وہ کھیلوں کے شائق ہیں وہ اب تک پانچ اولپکس دیکھ چکے ہیں پچھلے سال جب یونان میں اولپکس ہوئیں تو وہ اپنے شہر گئے وہاں انہوں نے ایک عجیب بات نوٹ کی انہوں نے محسوس کیا 2004ء کی اولپکس میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والے کھلاڑی 2000ء میں طلائی تمبے جیتنے والے کھلاڑیوں سے "بوزھے" تھے انہوں نے اسی وقت انٹرنیشنل اولپک کمیٹی سے رابطہ کیا اور ان سے 2000ء اور 2004ء کے اولپکس کے پروفائل حاصل کرنے پر وفاق کے مطالبے سے معلوم ہوا 2004ء میں بیس بال کے مقابلوں میں کامیاب ہونے والے کھلاڑی 2000ء میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والوں سے

ڈیڑھ سے دو سال بڑے تھے کشتی رانی اور فٹ بال کے کھلاڑی پچھلے کھلاڑیوں کی نسبت عمر میں 3 سال بڑے تھے اور گھڑ سواری کے کھلاڑیوں کی عمروں میں 9 سال کا فرق تھا ان اعداد و شمار نے کھیل کے دس ہزار سالہ تصورات تبدیل کر دیے۔ آج تک دنیا یہ سمجھتی آئی تھی جوں جوں انسان کی عمر بڑھتی ہے اس کے کھیلنے اور کودنے کی صلاحیتیں کم ہو جاتی ہیں لیکن کئے کی سٹڈی نے دنیا کو حیران کر دیا اس نے ثابت کر دیا کھیل اور کامیابی کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ایک بوزھا شخص چاہے تو وہ کھیل بھی سکتا ہے اور ایوارڈ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ کئے کے اس انکشاف کے بعد سپورٹس کی درجنوں امریکی تنظیموں نے سٹڈی کی اور انہوں نے تسلیم کیا جو کھلاڑی مسلسل پریکٹس کرتے رہتے ہیں اور جواپنے آپ کو توانا اور جوان سمجھتے ہیں وہ 60 برس تک نئے اور جوان کھلاڑیوں سے اچھی پرفارمنس دیتے ہیں اور وہ زیادہ اچھے اور شاندار کھلاڑی ثابت ہوتے ہیں چنانچہ میکڈونلڈ اور ہاروے کئے کے ہمیشہ باقات نے بڑھاپے کے سارے تصورات تبدیل کر دیئے نئی تھیوری ثابت کرتی ہے عمر آپ کو کمزور بنا چار اور کامل نہیں بناتی بلکہ وہ آپ کی صلاحیتوں، سلیمنے اور تجربے میں اضافہ کرتی ہے اور یہ ہم لوگ ہیں جو اپنے آپ کو کامل بنا چار کمزور اور بوڑھا بنانے کا تمام تر کارنامہ سرانجام دیتے ہیں ہم خود ہی اپنے آپ کو زندگی کے دائرے سے باہر نکال لیتے ہیں ہاروے کئے کی سٹڈی سے معلوم ہوا قدرت ہمیں رہنا نہیں کرتی یہ ہم لوگ ہیں جو قدرت کی منشا اور رضا مندی کے خلاف خود ہی ریٹائرمنٹ لے لیتے ہیں ہم قدرت سے "گولڈن فیک پیئڈ" کر لیتے ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ کے بخشے باقی نہیں تیس برس خود تری اور خود جی میں گزار دیتے ہیں اور ہم گیموں میں کھڑے ہو کر موت کا انتظار کرتے ہیں ہم ملک الموت کو بلاتے رہتے ہیں ہم بہت ناشکرے اور تموز دے لے ہیں۔

ہم نے اور ہمارے بزرگوں نے کبھی اس موضوع پر سوچا۔



استقامت کے دس دن

میرے ایک دوست سرکاری ملازم ہیں وہ اسلام آباد کے ایک درمیانے درجے کے سیکٹر میں رہتے ہیں ان کی گلی خراب تھی وہ ایک دن میرے پاس تشریف لائے اور فرمانے لگے "اگر تم ہماری گلی پر کالم لکھ دو تو یہ ٹھیک ہو سکتی ہے" میں نے ان سے پوچھا "کالم سے گلی کیسے ٹھیک ہو سکتی ہے؟" انہوں نے فرمایا "تم کالم لکھو گے" یہ کالم کسی صاحب اقتدار کی نظر سے گزرے گا وہ چیئر مین سی ڈی اے کو حکم دے گا اور ایک ہی دن میں ہماری گلی مرمت ہو جائے گی" میں نے تہہ لگایا اور ان سے پوچھا "اگر یہ کالم کسی صاحب اقتدار کی نظر سے نہ گزرا تو؟" انہوں نے غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھا اور سنجیدگی سے بولے "یہ کیسے ممکن ہے تم لوگوں کے کالم نیچے سے لے کر اوپر تک پڑھے جاتے ہیں اور حکمران ان پر عملدرآمد بھی کرتے ہیں" میں نے مسکرا کر جواب دیا "سر داد صاحب جو لوگ قرآن مجید پر عمل نہیں کرتے وہ کالم پر کیا خاک توجہ دیں گے" وہ خاموش رہے میں نے عرض کیا "میں آپ کو گلی ٹھیک کرانے کا ایک تہہ بھد لکھتا ہوں اس نسخے کے ذریعے دنیا کا بوسے بڑا مسئلہ ہو سکتا ہے" وہ فوراً میری طرف دیکھنے لگے میں نے عرض کیا "آپ دفتر کیلئے گھر سے کب نکلتے ہیں" وہ بولے "سازمے آٹھ بجے" میں نے عرض کیا "آپ کل آٹھ بجے نکلیں راستے میں سی ڈی اے کے دفتر رکھیں متعلقہ ڈپٹی ڈائریکٹر اور ڈائریکٹر کو تلاش کریں ان کے دفتر میں جائیں اور نہایت شائستگی سے ان سے عرض کریں جناب میں فلاں سیکٹر کا رہنے والا ہوں ہماری گلی اتنے عرصے سے خراب ہے آپ مہربانی فرما کر گلی ٹھیک کرا دیں" ان سے اتنا عرض کریں اور اٹھ کر آ جائیں" وہ میری طرف حیرت سے دیکھ کر بولے "کیا وہ لوگ گلی ٹھیک کرا دیں گے" میں نے فوراً نئی میں سر ہلایا "وہ نہیں کرائیں گے" آپ دوسرے دن دوبارہ ان کے دفتر جائیں ان سے ملیں اور اسی شائستگی کے ساتھ اپنی عرض دہرائیں اور اپنے دفتر چلیں جائیں" تیسرے دن ایک بار پھر جائیں عرض کریں اور دفتر چلے جائیں اور اس کے بعد اسے اپنا معمول بنالیں روز دس منٹ کیلئے سی ڈی اے کے دفتر رکھیں ان لوگوں سے عرض کریں سلام کریں اور واپس آ جائیں مجھے یقین ہے دس بندرہ دن بعد وہ لوگ آپ کی بات پر سنجیدہ ہو جائیں گے اور آپ کی گلی پر کالم شروع ہو جائے گا" وہ مسکرائے اور شرارتی لہجے میں بولے "اگر اس کے باوجود کام نہ ہوا تو؟" میں نے تہہ لگایا "پھر آپ اپنے ساتھ دو مہسایوں کو شامل کر لیجئے گا" آپ آٹھ بجے سی ڈی اے جائیں آپ کے بعد

دوسرا ہمسایہ چلا جائے وہ مسکرا کر سلام کرے اور آپ جیسی شائستگی کے ساتھ مطالبہ دوہرا دے دوہرخصت ہو تو تیسرا ہمسایہ ڈائریکٹر کے دفتر میں داخل ہو جائے اور نہایت عاجزی کے ساتھ اپنی گلی کا مسئلہ بیان کر دے میں دعوے سے کہتا ہوں یہ نسخہ ضرور کامیاب ہوگا" میرے دوست نے قہقہہ لگایا اور رخصت ہو گیا۔

میرے وہ دوست دس دن بعد تشریف لائے تو ان کا چہرہ خوشی سے تسمتا رہا تھا وہ میرے گلے لگے اور ہنس کر بولے "آج ہماری گلی کی تعمیر شروع ہو گئی ہے" میں نے قہقہہ لگایا اور ان سے عرض کیا "یہ انسانی نفسیات ہے دنیا کا کوئی شخص کسی کی بیس دن سے زیادہ درخواست رد نہیں کر سکتا لیکن اس کے لئے ضروری ہے درخواست کرتے ہوئے آپ کا لہجہ نہایت شائستہ اور عاجز ہو اس عمل کے دوران صاحب اختیار شخص تیسرے یا چوتھے دن چڑ جاتا ہے وہ آپ کو لعن طعن کرتا ہے وہ آپ کو جھڑ پلاتا ہے اور وہ بعض اوقات آپ کو گالی بھی دے دیتا ہے لیکن آپ نے اس کے رد عمل میں چڑنا نہیں آپ نے گالی کا جواب گالی اور نفرت کا جواب نفرت سے نہیں دینا" آپ نے اپنے مطالبے کو اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش بھی نہیں کرنی آپ نے اس کی جھڑپ کا جواب میں بس اتنا عرض کرنا "جب آپ کی بہت مہربانی ہوگی آپ بس ایک بار جا کر ہماری گلی دیکھ لیں ہم آٹھ دس ہزار لوگ آپ کے کمون ہوں گے اور دوسرے دن دوبارہ اسی شائستگی اور محبت کے ساتھ اس کے دفتر چلے جائیں" میرا دعویٰ ہے پتھر سے پتھر اور جال سے جال ترین شخص بھی دس سے پندرہ دن میں کھل جائے گا اور آپ کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا" اگر اس سارے عمل کے دوران کسی دن آپ پُراسٹ لوڈ کر گئے آپ نے اس افسر پر چڑھائی کر دی، آپ نے اسے ڈانٹ پلا دی یا آپ نے گلی کو اپنا قانونی اور شہری حق ثابت کرنے کی کوشش کی تو آپ یہ جنگ ہار جائیں گے، وہ افسر آپ کو بدتمیز، بے وقوف اور مغرور کہے گا اور سبز ٹھونک کر آپ کے سامنے کھڑا ہو جائے گا یوں یہ ایک جائز مسئلہ دو اشخاص کی انا کی جنگ بن جائے گا"

میرے دوست نے قہقہہ لگایا اور ہنس کر بولا "تم نے یہ فارمولا کہاں سے سیکھا" میں نے بھی قہقہہ لگایا "میں نے یہ فارمولا انٹرنس ایجنٹوں اور تبلیغی جماعت سے سیکھا، یہ دونوں "شیخے" اس فارمولے پر عمل کرتے ہیں، انٹرنس ایجنٹ ایک بار آپ کے پاس آتا ہے، آپ معذرت کر لیتے ہیں لیکن وہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ سما کر دوسرے دن پھر حاضر ہو جاتا ہے، آپ انکار کرتے ہیں لیکن وہ اپنا برادر شرمیز پر رکھ جاتا ہے، تیسرے اور چوتھے دن اس کا ٹیلی فون آ جاتا ہے اور اس کے بعد اس وقت تک اس کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ہے جب تک آپ اس کے سامنے "سرینڈر" نہیں کرتے۔ تبلیغی جماعت کے لوگ بھی اسی سپرٹ سے کام کرتے ہیں، یہ السلام علیکم کہتے ہیں اور آپ کو نماز کی دعوت دیتے ہیں، آپ نفرت سے دروازہ بند کر دیتے ہیں لیکن یہ اگلے روز آپ کو دوبارہ "گھیر" لیتے ہیں، آپ ان سے بھاگتے ہیں لیکن یہ لوگ کبھی آپ کی دکان پر پہنچ جاتے ہیں اور کبھی آپ کے گھر اور آپ کے کھیل کے میدان میں، آپ ان سے معذرت کرتے ہیں، آپ ان کے ساتھ بدتمیزی کرتے ہیں، انہیں جھڑ پلاتے ہیں اور بعض اوقات ان کے ساتھ دست و گریبان تک ہو جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کے ماتھے پر شکن نہیں آتی، یہ اسی شائستگی اور محبت سے آپ کے ساتھ مخاطب ہوتے ہیں آپ کو دعوت دیتے رہتے ہیں یہاں تک

1

کہ ایک دن آپ بھی اپنا بستر باندھتے ہیں، اپنا لوٹا اٹھاتے ہیں اور ان کے ساتھ تبلیغ کیلئے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس صرف چار ہتھیار ہوتے ہیں، نیک مقصد، مقصد کے ساتھ اخلاص، شائستگی اور تسلسل لہذا میں نے یہ فارمولہ ان لوگوں سے سیکھا، اگر آپ ان کے فارمولے کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں شامل کر لیں تو آپ اپنی گلی سے لے کر عدالت تک اپنے سارے مسئلے حل کر سکتے ہیں، آپ اپنے سارے نظام ٹھیک کر سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کے قہانے کا ایس ایچ اور شوٹ لیتا ہے تو آپ دفتر جانے سے پہلے روز اس کے دفتر رکیں اور نہایت شائستگی سے عرض کریں ”سر لوگ آپ کے بارے میں بڑے پریشان ہیں، مہربانی فرما کر اپنے پبلک ایجنج پر توجہ دیں“ اور وہاں سے آ جائیں، دوسرے دن، تیسرے دن، چھ یقین ہے وہ جب چوتھے دن رشوت لینے لگے گا تو اس کا ہاتھ کاٹنے گا، وہ گھبرا کر دائیں بائیں ضرور دیکھے گا، اسی طرح اگر آپ کسی ایجنج سے مطمئن نہیں ہیں تو آپ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے دفتر جائیں، چیف جسٹس سے ملاقات کی درخواست کریں۔ شروع شروع میں پی اے انکار کرے گا، آپ اصرار کیے بغیر واپس آ جائیں، دوسرے دن دوبارہ طے جائیں، اس کے بعد تیسرے دن چوتھے دن اور پانچویں دن بالآخر کسی دن آپ کی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ آپ ان سے اپنا مسئلہ بیان کر دیں، وہ ہمدردانہ غور کا وعدہ کریں گے، آپ شکر یہ ادا کر کے واپس آ جائیں۔ اس کے بعد آپ اگلے دن دوبارہ جائیں اور اپنی اسے سے درخواست کریں وہ چیف صاحب کو آپ کا کام یاد کر اویں، آپ اتنا کہہ کر واپس آ جائیں، اگلے دن، اس سے اگلے دن اور اس سے اگلے دن آپ پی اے کے پاس جاتے رہیں اور انہیں یاد کراتے رہیں، اس دوران اگر آپ چند خرید لوگوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیں تو پی اے اور چیف جسٹس کیلئے یہ نفسیاتی دباؤ برداشت کرنا ممکن نہیں رہے گا یوں آپ کا کام ہو جائے گا۔ میرے دوست نے مسکرا کر کہا ”لیکن یہ کھیل خطرناک بھی ہو سکتا ہے“ میں نے تہقہ لگایا ”نگلی کا ہر کھیل خطرناک ہوتا ہے، اگر تہدیلی آسان ہوتی تو دنیا کا کوئی نبی ہجرت کرنا اور نہ ہی عسرت کی زندگی گزارتا، دنیا میں نیکی اور تہدیلی تسلسل بھی مانگتی ہے اور شائستگی بھی، یہ نبیوں کا کام ہے لہذا اس کے لیے نبیوں جیسی استقامت، اولیاء کرام جیسی نیک نیتی اور قلمبوں جیسی شائستگی درکار ہوتی ہے اور یقین کیجئے اگر آپ ایک بار اس راستے پر چل پڑے تو کامیابی ضرور آپ کا مقدر بنتی ہے۔ یہ اللہ کا انسان سے وعدہ ہے اگر وہ نیک نیتی سے کسی بھلائی کے کام میں شامل ہو اور اس میں استقامت کا مظاہرہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے لہذا جس طرح آپ نے دس دن میں اپنی گلی بخالی بالکل اسی طرح آپ جیسے چند سو لوگ دس دس پندرہ پندرہ دن میں اس ملک کے سارے مسائل حل کر سکتے ہیں، بس اس کے لئے استقامت کے دس دن چاہئیں۔“



قربانی فنڈ

یہ تیسرا ہاسٹل اور چوتھی بیٹی تھی، میں حاجی صاحب کے ساتھ چل چل کر تھک گیا لیکن حاجی صاحب کا دم پھولا تھا اور نہ ہی ان کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے وہ مسلسل چل رہے تھے، ہم ہاسٹل میں داخل ہو گئے، عید کی چھٹیوں کے بعد ہاسٹل آہستہ آہستہ باد ہو رہا تھا، بیچیاں بکسوں، اٹیچی کیسوں اور بیگوں کے ساتھ جیکبوں سے اتر رہی تھیں، ہاسٹل کے ویٹنگ روم میں مختلف بچیوں کے والدین بیٹھے تھے، ہم دونوں بھی ایک کونے میں سکر کر بیٹھ گئے، حاجی صاحب نے ہاسٹل کی مانی کو چٹ پر بیٹی کا نام لکھ کر دیا اور ہم انتظار کرنے لگے، تھوڑی دیر بعد ایک دھان پان سی بیٹی آئی، اس نے ہمیں سلام کیا، حاجی صاحب نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، فائل سے ”دو چھ“ نکالا، بیٹی کو پکڑ لیا، سلام کیا اور ہم باہر آ گئے، ہم اب ہولی فمیلی اسپتال کی طرف چل پڑے، حاجی صاحب راستے میں ایک میڈیکل سٹور پر گئے، سٹور کا مالک حاجی صاحب کو دیکھ کر کاؤنٹر سے باہر آیا اور عقیدت سے ان کے ہاتھ چومنے لگا، حاجی صاحب اسے کونے میں لے گئے، وہ دونوں چند لمحوں تک سرگوشیاں کرتے رہے، اس کے بعد حاجی صاحب نے جیب سے نوٹوں کا بٹل نکالا اور سٹور کے مالک کے حوالے کر دیا، مالک نے ایک بار پھر حاجی صاحب کے ہاتھ پر بوسا دیا اور ہم باہر آ گئے۔

میں بری طرح تھک چکا تھا، مجھے اب ”بریک“ چاہیے تھی، میں نے حاجی صاحب سے چائے کی فرمائش کر دی، حاجی صاحب مجھے ہسپتال کی کینٹین پر لے گئے، ہم دونوں دھوپ میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے، میں نے حاجی صاحب سے اس سارے گورکھ دھندے کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا، حاجی صاحب مسکرائے اور شرمیلے شرمیلے لہجے میں بولے ”میں قربانی فنڈ تقسیم کر رہا ہوں“ میں نے حیرت سے پوچھا ”یہ قربانی فنڈ کس بلا کا نام ہے“ حاجی صاحب مسکرائے ”میں نے تین سال پہلے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر سوچا تھا، ہم لوگ ہر سال عید الاضحیٰ پر پانچ جانوروں کی قربانی دیتے ہیں، ہم بکرے، بیل اور اونٹ ذبح کرتے ہیں، ان کا گوشت کھاتے ہیں اور لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں، ہماری اس قربانی سے معاشرے کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟ پتہ چلا یہ قربانیاں خالصتاً ہماری ذات تک محدود ہیں، ہم میں سے بے شمار لوگ قربانی کو عبادت کی بجائے اپنی امارت کا اظہار سمجھتے ہیں، ہم بڑے فخر سے لوگوں کو بتاتے ہیں، ہم نے قربانی کے لئے اسنے لاکھ لاکھ کا اونٹ خریدا، ہم پانچ پانچ لاکھ روپے کا بیل خریدا ہے

ہیں اور اخبارات میں اس کی تصویریں چھپواتے ہیں اور ہم منڈی کا سب سے مہنگا اور اچھا بکر خرید کر گلی میں ہانڈھ دیتے ہیں، ہمیں اس غور و خوض کے دوران محسوس ہوا ہمارے معاشرے میں قربانی قربانی نہیں رہی وہ نمائش بن گئی ہے اور یہ اسلام کی روح کے منافی ہے، ہم نے یہ بھی محسوس کیا ہمارا معاشرہ غربت، بے بسی اور بیماری کی اس سلسلے تک پہنچ چکا ہے جہاں پانچ پانچ جانوروں کی قربانی عبادت کی بجائے ظلم اور زیادتی محسوس ہوتی ہیں، تم خود سوچو ہمارے مسائے میں مریض دوا کی ایک گولی کو ترس رہا ہے، ایم اے کے طالب علم کے پاس فیس کے لئے پیسے نہیں ہیں، لوگوں کے گھروں میں چار چار بچیاں ہاتھ پیلے ہونے کا انتظار کر رہی ہیں، لوگوں کے دلوں کو روگ لگے ہوئے ہیں، لوگوں کے گردے نفل ہو رہے ہیں اور ہزاروں لاکھوں بچے خون کی ناقابل علاج بیماریوں کا شکار ہیں اور ہم پانچ پانچ لاکھ روپے کا تیل خرید رہے ہیں اور عید کے دن اس کی قربانی کا جشن منا رہے ہیں، کیا یہ بات اسلامی اور اخلاقی نقطہ نظر سے درست ہوگی؟ وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے، میں نے نرم آواز میں جواب دیا، "قربانی مسلمان پر واجب ہے" حاجی صاحب نے قہقہہ لگایا اور ہنس کر بولے، "میں دہشت گردوں سے انکار نہیں کر رہا لیکن اسلام نے قربانی دینے کا حکم دیا ہے، اس نے پانچ لاکھ کا تیل زبح کرنے یا جانور کی نمائش کا حکم نہیں دیا، تم دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دو جن معاشروں میں مائیں اپنی بیٹیوں کو غربت کے ہاتھوں سچ دیں اور لوگ دل کے علاج کے لئے گروہ فروخت کر دیں کیا ان معاشروں میں قربانی کو نمائش کی شکل دے دینا زیادتی نہیں؟ وہ ایک لمحے کے لئے رکے اور ذرا سا ٹھہر کر بولے، "تم بتاؤ اگر تمہارے سامنے کوئی شخص جل کر مر رہا ہو اور تم نماز کی نیت کر کے کھڑے ہو جاؤ تو اسلام میں تمہاری اس نماز کی کیا حیثیت ہوگی؟" میں خاموش رہا، "حاجی صاحب جوش میں بولے، "دین کے ہر فرض کی قضاء موجود ہے لیکن دنیا کے کسی فرض اور کسی ذمہ داری کی کوئی قضا ہے اور نہ ہی معافی، اگر ہماری ذرا سی غفلت، ذرا سی کوتاہی اور ذرا سی بے حسی سے فرات کے کنارے کوئی کتا بھوکا مر جائے تو حضرت عمر فاروق جیسے جلیل القدر خلیفہ تک خود کو اس کا ذمہ دار سمجھتے ہیں، وہ تک اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہ ہوں گے"

حاجی صاحب ٹریک سے ہٹنے لگے لہذا میں انہیں فوراً واپس قربانی فنڈ کی طرف لے آیا، وہ چمکے اور دوبارہ بولے، "ہم دوستوں نے سوچا، ہماری قربانی قربانی کم اور نمائش زیادہ ہے لہذا ہم نے فیصلہ کیا ہم لوگ آئندہ صرف ایک ایک جانور کی قربانی دیں گے اور یہ جانور بھی تین ہزار سے مہنگا نہیں ہوگا اور ہم لوگ قربانی کے پیسے جمع کریں گے اور یہ رقم ضرورت مند طالب علموں اور مریضوں میں تقسیم کر دیں گے۔ اس سال ہمارے پاس دو لاکھ روپے جمع ہوئے تھے، ہم نے چار طالب علم بچیاں تلاش کیں، ان بچیوں کے والدین انتہائی غریب ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بچیاں ایم اے اور ایم ایس ہی کر رہی ہیں، میں نے ان بچیوں کی فیس کے دو چلے، بیٹیکوں میں ان کی فیس جمع کرانی اور آج میں انہیں رسیدیں دینے نکلا ہوں، اسی طرح ہم نے اس میڈیکل سٹور کے مالک کے ساتھ ایک "ارٹھنٹ" کر رکھا ہے، اس کے ورکرز ہسپتال میں پھرتے رہتے ہیں، انہیں جوں ہی کوئی ضرورت مند مریض ملتا ہے، یہ ہمارے کھاتے سے اس مریض کو مفت ادویات دے دیتا ہے" حاجی صاحب خاموش ہو

مگے۔ میں نے ان سے پوچھا ”کیا آپ نے اس معاملے میں کسی عالم دین سے فتویٰ لیا تھا“ حاجی صاحب مسکرائے ”عبادت اللہ اور بندے کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے، ہم نے سوچا ہمیں اس ذاتی معاملے میں کسی تیسرے کو شریک نہیں کرنا چاہیے لہذا ہم لوگ چپ چاپ یہ کام کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے درخواست کر رہے ہیں یا باری تعالیٰ اگر یہ غلط ہے تو ہمیں معاف فرما دے اور اگر ہم صحیح کر رہے ہیں تو ہماری اس چھوٹی سی قربانی کو قبول فرمائے“ حاجی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، انہوں نے رومال سے آنکھیں پونچھیں اور نرم آواز میں بولے ”ہم اپنے عمل کی مذہبی اور اسلامی پوزیشن سے ناواقف ہیں لیکن ہم اتنا جانتے ہیں تازہ ترین عید الاضحیٰ پر پاکستان کے شہریوں نے 70 لاکھ جانوروں کی قربانی دی، لاہور شہر میں 70 ہزار جبکہ راولپنڈی اور فیصل آباد میں پچیس پچیس ہزار بڑے جانور ذبح کیے گئے اور اس سال پاکستان میں ایک لاکھ اونٹ ذبح ہوئے۔ اگر ہم ان جانوروں کی مالیت نکالیں تو یہ 90 ارب روپے بنتے ہیں۔ تم اس رقم کو طبی، تعلیمی اور سماجی شعبے میں بھینا کر دیکھو اور فیصلہ کرو، اس رقم سے کتنے لوگوں کی زندگیاں بدل سکتی تھیں۔ کتنے مریضوں کے دکھ درد اور تکلیفیں ختم ہو سکتی تھیں اور کتنے طالب علم اپنی تعلیم مکمل کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں پانچ لاکھ روپے میں ایک ڈاکٹر بنتا ہے اور یہ ڈاکٹر زندگی میں اوسطاً ایک لاکھ لوگوں کا علاج کرتا ہے، فرض کرو اگر ہم یہ رقم ایف ایس سی کے طالب علموں کو دے دیتے تو ملک کو لاکھوں نئے ڈاکٹر مل جاتے اور یہ ڈاکٹر ہر سال کروڑوں مریضوں کو فیض پہنچاتے اس وقت شوکت خانم، ایچی فاؤنڈیشن اور سہارا جیسے سینکڑوں ادارے قربانی کی کھالوں پر چل رہے ہیں۔ تم ڈرا تصور کرو اگر ان اداروں کو کھالوں کی جگہ جانوروں کی قیمت مل جائے، لوگ انہیں بکروں، گائیوں، بیلوں اور اونٹوں کی قیمت دے دیں تو کتنے مریضوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اسی طرح اگر ہم پاکستان کے سات بڑے شہروں میں انتہائی جدید یونیورسٹیاں بنائیں اور ان شہروں کے لوگ ہر سال ان یونیورسٹیوں میں قربانی کے پیسے جمع کرادیں تو تم سوچو ملک میں کتنا بڑا انقلاب آ جائے گا، ہم اگر پاکستان کے تمام بڑے چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہات میں ہسپتال اور یہ ڈسپنسریاں بنائیں اور ڈسپنسریاں اور ہسپتال قربانی کے پیسوں سے چلیں تو تم خود سوچو کیا پاکستان میں صحت کا مسئلہ رہے گا؟“ دور کے اور دو بارہ بولے ”اگر ہم نے قربانی پر اجتہاد نہ کیا، اگر ہم نے شہر شہر میں قربانی فنڈ قائم نہ کئے تو یقین کرو قدرت اس معاشرے کو قربان گھاٹ تک لے جائے گی اور ہم سب کی گردن پر چھری پھر جائے گی“ وہ اٹھے انہوں نے آنکھوں پر رومال رکھا اور آہستہ آہستہ لہجے میں بولے ”میں سمجھتا ہوں پاکستان میں تین ہزار روپے سے پہلے اور دوسرے جانور کی قربانی پر پابندی ہونی چاہیے“



اللہ کے نام پر

ان کی بات حیران کن تھی۔ میں نے انہیں ہمیشہ خیر کے کاموں سے دور دیکھا تھا، ان میں وہ تمام عیب موجود تھے جنہیں شریعت عیب سمجھتی ہے، ان کے محلے کے کسی شخص نے انہیں کبھی نماز پڑھنے نہیں دیکھا تھا، وہ سال میں پانچ بار تھائی لینڈ جاتے تھے، کرکٹ کے سیزن میں جوا کھیلتے اور کھلاتے تھے اور شراب ان کیلئے پانی کی حیثیت رکھتی تھی، ان کے تمام احباب انہیں ”پریکٹیکل“ کہتے تھے، وہ زندگی کے تمام معاملات میں عملیت پسند انسان تھے وہ افسروں، سیاستدانوں اور ماتحتوں کے ساتھ براہ راست سودے بازی کرتے تھے اور ان کا کہنا تھا ”جب تک کوئی افسر رشوت نہ لے اس وقت تک آپ اس کے وعدے پر یقین نہ کریں“ وہ ہمیشہ حکومتی پارٹی میں شامل رہے ہیں، بے نظیر بننے کے دور میں وہ چھوٹا پارٹی میں تھے، نواز شریف کے دور میں وہ بچے مسلم لیگ تھے، 12 اکتوبر کے بعد وہ نون کے ڈپٹی اور محبت الوطنی کے گن گاتے تھے 2002ء کے بعد وہ ق لیگ کے سرگرم رکن بن گئے اور آج کل وہ ایک بار پھر چھوٹا پارٹی کی تعریف کر رہے ہیں، ہم سب دوست انہیں ”وقت کی آواز“ کہتے ہیں لیکن کل انہوں نے ایک ایسی بات کہی جس نے میرے جسم کی آخری رگیں تک ہلا دیں، وہ گزشتہ روز میرے پاس تشریف لائے اور انہوں نے سرگوشی میں کہا ”میرے پاس ایک لاکھ روپے ہیں، اگر تمہاری نظر میں کوئی مستحق قبلی ہو تو میں یہ رقم اسے دینا چاہتا ہوں“ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا، وہ مسکرائے اور سر جھکا کر بولے ”میں نے جوانی میں محنت کر کے ایک دکان خریدی تھی، یہ دکان میری حق حلال کی کمائی تھی، میں نے یہ دکان کرائے پر چھوڑ رکھی ہے، میں اس کا کرایہ جمع کرتا رہتا ہوں اور رمضان میں یہ رقم ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتا ہوں“ میری حیرت میں اضافہ ہو گیا، وہ مزید بولے ”میری باقی دولت مشکوک ہے، میں دل سے اسے پاک رزق نہیں سمجھتا لہذا میں اسے نیکی کے کاموں میں خرچ کرتے ہوئے ڈرتا ہوں لیکن میری یہ جائیداد وسیع حلال اور پاک ہے چنانچہ میں نے اسے اللہ کے بندوں کیلئے وقف کر رکھا ہے، تم مہربانی فرما کر مجھے چند ضرورت مند تلاش کرو۔“

وہ چلے گئے لیکن اپنے پیچھے سوچ کی ایک لمبی کبیر چھوڑ گئے، میں نے سوچا ہمارے ملک کے لوگوں میں خدا ترسی، انسانیت اور اللہ تعالیٰ کا خوف موجود ہے ہم میں سے ہر شخص اپنی ہمت کے مطابق اللہ کی راہ میں خرچ

کرتا رہتا ہے یہ اس معاشرے کا ایک دوسرا پہلو ہے، پچھلے دنوں میری ملاقات ڈاکٹر امجد ثاقب سے ہوئی، ڈاکٹر امجد ثاقب آب زم زم کی طرح اُچلے اور آسینے کی طرح شفاف انسان ہیں، وہ سول سروس میں تھے، ڈی ایم جی گروپ میں تھے، جب شہباز شریف پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے تو وہ ان کے سیکرٹری تھے، سول سروس سے وہ پنجاب رورل سپورٹ پروگرام میں گئے اور وہاں انہوں نے "اخوت" کے نام سے ایک معجزاتی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم کا آغاز ایک دلچسپ واقعہ تھا، ڈاکٹر صاحب کے ایک دوست سلیم راجھانے انہیں دس ہزار روپے دیئے، ڈاکٹر صاحب نے یہ دس ہزار روپے لاہور کی ایک خاتون کو بطور قرض دے دیئے، اس قرض سے پاکستان کی پہلی مائیکرو فنانس تحریک کا آغاز ہوا، ڈاکٹر صاحب کی تنظیم لاہور اور اب راولپنڈی میں انتہائی ضرورت مند لوگوں کو بلاسود قرضے دیتی ہے، قرضہ لینے والی خواتین اور حضرات اس رقم سے کاروبار کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی قسطوں میں یہ قرضہ واپس کرتے ہیں، اس تنظیم نے لاہور اور راولپنڈی میں کمال کر دیا، اس وقت 12 ہزار سے زائد لوگ اس تنظیم سے مستفید ہو چکے ہیں جبکہ اخوت لوگوں کو 14 کروڑ روپے سے زائد رقم بطور قرض دے چکی ہے، یہ 14 کروڑ روپے اہل ثروت نے اخوت کو دیئے تھے ڈاکٹر صاحب پاکستان میں ڈاکٹر یونس بن کراچمر ہے ہیں جبکہ اخوت "گراٹین بینک" کی طرح معاشرے کی جڑوں تک پہنچ رہی ہے، میں داپس ڈاکٹر امجد ثاقب کی طرف آتا ہوں۔ میری ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے عجیب بات بتائی، انہوں نے بتایا پاکستان کا شمار خیرات کرنے والے پانچ بڑے ممالک میں ہوتا ہے اس وقت دنیا کے 140 ممالک میں خیرات کا سسٹم موجود ہے جن میں پاکستانی فی کس آمدنی کے لحاظ سے دنیا میں خیرات کرنے والے لوگوں میں پانچویں نمبر پر آتے ہیں، پاکستان میں 1998ء میں 70 ارب روپے خیرات کئے جاتے تھے جبکہ آج 2006ء میں یہ رقم 150 ارب روپے تک پہنچ چکی ہے، ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا لوگوں کا یہ جذبہ حیران کن بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ میں ان کی بات پر بھی حیران ہو گیا۔

ڈاکٹر امجد ثاقب نے مجھے پاکستانی معاشرے کا ایک نیا پہلو دکھایا، ہم روزانہ اس معاشرے کا سیاقا کرتے رہتے ہیں، ہمیں اس ملک اس معاشرے میں ہزار ہزار کینز نظر آتے ہیں لیکن ہم نے کبھی اس معاشرے کے ان چھتروں کے پیچھے جھانک کر نہیں دیکھا، ہم نے کبھی اس معاشرہ کا صاف، شفاف اور معطر جسم نہیں دیکھا، یہ ملک تضادات کا عجیب مجموعہ ہے۔ اس ملک میں جہاں کرپشن، لاقانونیت، ہیرا پھیری اور زبردستی ہے، اس ملک میں جہاں فوج سپریم پاور ہے اس میں جہاں ق لیگ جیسی سیاسی سوچ کی بہتات ہے اس میں جہاں "یونٹن" سب سے بڑی سفارتکاری ہے اور اس میں جہاں رچرڈ آر میچ جیسے لوگ حکومت کر رہے ہیں وہاں اس ملک میں خداتری، درم، خدمت اور محبت کا ایک نہ نظر آنے والا نظام بھی موجود ہے، اس ملک میں اس وقت 8100 چھوٹے بڑے دربار ہیں اور ان درباروں پر چوبیس کھنڈے لنگر چلتا ہے اور ہزاروں لاکھوں لوگ ان لنگروں سے مفت کھانا کھاتے ہیں، یہ لنگر کیسے چل رہے ہیں، ان کیلئے آٹا، دالیں، چاول، گھی، چینی اور گوشت کہاں سے آتا ہے، آج تک کسی

یہ سمجھ نہیں آسکا، ہمارے ملک میں دنیا کی سب سے بڑی "پاورٹی لائن" ہے، پاکستان میں اس وقت سات کروڑ لوگ خطا فریب سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں، یہ لوگ کیسے زندہ ہیں؟ دنیا کے بڑے بڑے ماہرین آج تک اس کا اندازہ نہیں لگا سکے، یہ سات کروڑ لوگ اہل خیر اور اہل ثروت کی خداترسی سے زندہ ہیں، اس ملک میں ایسے لاکھوں ہاتھ ہیں جو رات کے اندھیرے میں آگے بڑھتے ہیں اور لاکھوں ضرورت مندوں کی مدد کر کے واپس چلے جاتے ہیں اور دوسرے ہاتھ تک کو اس کی خبر نہیں ہوتی، اس ملک میں ایسے سینکڑوں ہزاروں ہسپتال، سکول، مدرسے، مساجد اور یتیم خانے ہیں جو صاحبان ثروت کی امداد سے چل رہے ہیں اور اس ملک میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو بھوکا سوتا ہو اور شاید ہی کوئی ایسا مریض ہو جسے دو اتلی ہو اور اس ملک میں شاید ہی کوئی ایسا ضرورت مند ہو جس تک اللہ تعالیٰ کا فیہی ہاتھ نہ پہنچتا ہو۔

اس ملک میں کوئی ایسا خفیہ نظام موجود ہے جو لوگوں کی امید کا دھاگر نہیں ٹوٹنے دیتا، جوان کی زندگی کو گھوکوز دیتا رہتا ہے، ہم لوگ کتنے بد قسمت ہیں ہمیں اس ملک کو توڑنے، لوٹنے اور خراب کرنے والے تو نظر آتے ہیں لیکن اس ملک اور اس ملک کے لوگوں کو سہارا دینے اور خدمت کرنے والے دکھائی نہیں دیتے، ہم جیتڑوں میں لپٹے ہوئے لعل نہیں دیکھ سکتے۔ میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں "جب تک ہمارے ملک میں داتا صاحب اور حضرت بری امام کے لنگر چل رہے ہیں جب تک ہم لوگ اللہ کے نام پر اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے رہیں گے اس وقت تک یہ یہ ملک قائم رہے گا"



عصر کی قسم

میں نے عرض کیا ”خوبصاحب سائنس نے کمال کر دیا ہے، قدرتی آفتیں اور بیماریاں انسان کے دو بڑے مسئلے ہیں، سائنس ان دونوں کے حل کے قریب پہنچ چکی ہے، اب وہ وقت دور نہیں جب انسان آفتوں اور غذاؤں کے ہاتھ سے نکل آئے گا“ وہ مسکرا کر میری طرف دیکھتے رہے، وہ نرم آواز میں بولے ”مثلاً سائنس نے کیا کر دیا ہے“ میں نے عرض کیا ”سرزلے، آتش فشاں، آندھیاں، طوفان اور سیلاب پانچ بڑی آفتیں ہیں، سائنس نے ان آفتوں کی پیش گوئی کا سسٹم بنا لیا ہے، سائنس دانوں نے ایک ایسا کیسہ بنا دیا ہے جو آتش فشاں کے پینڈے میں چلا جاتا ہے اور وہاں آنے والی تبدیلیاں نوٹ کر لیتا ہے، ماہرین یہ تبدیلیاں دیکھ کر پیش گوئی کر سکیں گے، فٹاں آتش فشاں فٹاں دن اور فٹاں وقت اٹل پڑے گا، اس سسٹم کے بعد آتش فشاں کے قریب آباد لوگ وہاں سے بروقت نقل مکانی کر سکیں، یوں بے شمار لوگوں کی جانیں اور املاک بچ جائیں گی“ خوبصاحب سکون سے سنتے رہے، میں نے عرض کیا ”زلزلے کے ماہرین نے ایک ایسی سلاخ بنائی ہے جو زمین کی تہ میں پچاس ساڑھ کلومیٹر نیچے چلی جائے گی، یہ زمین کے اندر موجود پلٹینوں کی حرکت نوٹ کرے گی، اب جو نیکی کسی پلٹ میں کسی قسم کی حرکت ہوگی، ماہرین زلزلے سے کہیں پہلے زلزلے کی شدت، اس کے مرکز اور اس سے متاثر ہونے والے علاقے کا تخمینہ لگا لیں گے، جس کے بعد ماہرین اس علاقے کے لوگوں کو بروقت مطلع کر دیں گے، لہذا وہ لوگ زلزلے سے پہلے گھروں اور دفاتروں سے باہر آ جائیں گے، یوں ہزاروں لاکھوں زندگیاں بچ جائیں گی، ماہرین نے عمارتوں کے ایسے ڈھانچے بھی بنا لئے ہیں جو ساڑھے نو درجے کی شدت سے آنے والے زلزلے میں بھی عمارت کو نقصان نہیں پہنچتے، دیں گے چنانچہ وہ وقت دور نہیں جب زلزلے آئیں گے، لیکن لوگ اطمینان سے اپنے معمول کے کام کرتے رہیں گے“ خوبصاحب بڑی توجہ سے میری بات سنتے رہے، میں نے عرض کیا ”بیماریاں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہیں، سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے ہمارے جسم میں ساڑھے چار ہزار بیماریاں ہوتی ہیں اور ہر بیماری کا ایک انگ جین ہوتا ہے، سائنس دانوں نے اڑھائی ہزار مملک بیماریوں کے جینز تلاش کر لئے ہیں، لہذا اب وہ وقت دور نہیں جب سائنس دان تکلیف شروع ہونے سے پہلے کسی شخص کا معائنہ کریں گے، اس میں پروان چڑھنے والے جینز

بکھیر گئے، ان چیز کو صحت مند چیز کے ساتھ بدل دیں گے اور مریض مرض کے حملے سے پہلے ہی صحت مند ہو جائے گا، انسانی کلوننگ کا عمل بھی شروع ہونے والا ہے، اگلے دس دس برس میں انسان مرنے سے پہلے دو بارہ جنم لینا شروع کر دے گا،" خواجہ صاحب نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا، میں نے عرض کیا، "اس طرح سائنس دانوں نے آنندھیوں، طوفانوں اور سیلابوں کی پیدائش کے مراکز بھی تلاش کر لئے ہیں، ماہرین کا کہنا ہے اگر ان آفتوں کے مراکز تباہ کر دیئے جائیں تو یہ آفتیں پیدا نہیں ہوئیں گی، سائنس دان ایسے آلے بنا رہے ہیں جو ان ہواؤں، ان پانیوں اور ان موجوں کو اکٹھا نہیں ہونے دیں گے جو اکٹھی ہو کر آندھی، سیلاب اور طوفان بنتی ہیں چنانچہ اگلے بارہ برسوں میں انسان ان تینوں آفتوں پر بھی قابو پالے گا لہذا خواجہ صاحب نے آنندھیوں اور طوفانوں کے لئے بڑا آئیڈیل ہوگا، دنیا میں انسان کے لئے کوئی چیز نہیں ہوگا، لوگ مطمئن آرام دہ اور سکمی زندگی گزاریں گے"

خواجہ صاحب نے قہقہہ لگایا اور مجھے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ کر بولے، "تم بڑے بے وقوف ہو، یہ قدرتی آفتیں اتنی بڑی دشمن نہیں ہیں جتنا بڑا انسان، انسان کا دشمن ہے۔ آج تک انسان نے انسان کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا نقصان پچھلے دس ہزار سال میں قدرتی آفتیں مل کر نہیں پہنچا سکیں، تم یہ دیکھ لو 18 اکتوبر کے زلزلے میں جتنے لوگ مارے گئے تھے اس سے پانچ گنا زیادہ لوگ ہماری سرکوں پر پچھلے ساٹھ برسوں میں حادثوں میں مارے گئے ہیں، ہر سال ہسپتالوں کے ہاتھوں جتنے مسائے قتل ہوتے ہیں، جتنے بیٹے اپنے باپ قتل کرتے ہیں، آٹھائیس کے ہاتھوں جتنے خاندان مارے جاتے ہیں، جتنے خاندان اپنی بیویوں کو قتل کرتے ہیں، ڈاکوؤں کے ہاتھوں جتنے راگبیر مارے جاتے ہیں اور جتنے دوست ہر سال دوستوں کو قتل کرتے ہیں، یہ ساری ہلاکتیں قدرتی آفتوں سے مرنے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہیں، بیش جیسے لوگ اپنی انا کی تسکین کے لئے جتنے لوگ مار دیتے ہیں، دہشت گردوں کے ہاتھوں جتنے لوگ مارے جاتے ہیں، کشمیر، فلسطین، افغانستان، سری لنکا، عراق اور چین میں انسانوں کے ہاتھوں جتنے انسان مارے جاتے ہیں، گورے کے ہاتھوں جتنے کالے مارے جاتے ہیں اور سرخ رومانسان جتنے پیلے انسانوں کو قتل کرتے ہیں، یہ تعداد قدرتی آفتوں کا لقمہ بننے والے انسانوں سے کہیں زیادہ ہے، ناگاساکی پر بم کس نے پھینکا تھا، ایک انسان نے، اس کا نشانہ کون بنے دوسرے انسان، دوسری اور پہلی جنگ عظیم کس نے شروع کی تھی، ایک انسان نے، اس جنگ کا لقمہ کون بنے دوسرے انسان، گوریا کی جنگ کس نے چھیڑی تھی، ویتنام پر حملہ کس نے کیا تھا، روس افغانستان جنگ کس نے شروع کی تھی، افغانستان اور عراق پر حملہ کس نے کیا تھا؟ انسان نے، اور ان جنگوں سے کس کو نقصان پہنچا، انسان کو؟ بارہ اکتوبر کا واقعہ کس کا کمال تھا؟ انسان کا اور اس کا نقصان کس کو پہنچا؟ انسان کو؟ اس دنیا میں بھائی کے ہاتھوں بھائی اور دوست کے ہاتھوں دوست مارا جاتا ہے لہذا انسان کا سیلابوں، طوفانوں اور بیماریوں سے مقابلہ نہیں، انسان کا انسان سے مقابلہ ہے اور جب تک انسان کی شہرت میں تبدیلی نہیں آتی، یہ دنیا دارمن نہیں بن سکتی، اس زمین پر تخریب کا عمل جاری رہے گا"

میں خواجہ صاحب کی بات غور سے سنتا رہا، انہوں نے فرمایا، "انسان، انسان سے خائف ہے، وہ جب بھی

ذرا سا خوشحال ہوتا ہے، اسے جب بھی ذرا سا اقتدار یا اختیار ملتا ہے، وہ جب بھی ذرا سی کامیابی پاتا ہے تو وہ دوسرے انسان کو تکلیف دینا شروع کر دیتا ہے، وہ آگ کھا کر گھٹلیاں بھسائے کے گھر پھینک دے گا، وہ دولا کھ کا کتا خریدے گا اور یہ کتا دوسرے کے دروازے پر باندھ دے گا، وہ اسٹیم بم بنا کر چاہے گا ساری دنیا اس کے قدموں میں جھک جائے، وہ بادشاہ کا مصاحب بن کر چاہے گا سب لوگ اسے سلام کریں، سب لوگ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں، اب دوسری طرف بھی انسان ہوتا ہے، اس کے اندر بھی وہی خون، وہی اتا اور وہی ہٹ دھرمی ہوتی ہے، لہذا انسان انسان کے ساتھ ٹکرا جاتا ہے اور آخر میں دونوں فنا ہو جاتے ہیں، انسان کی انسان کے ساتھ جگ میں پورس بھی مارا جاتا ہے اور سکندر بھی، دونوں خسارے میں رہتے ہیں، یہ اس زمین کا قانون ہے لہذا انسان جب تک مقدونیہ، سمرقند اور واشنگٹن کے اقتدار تک محدود نہیں رہتا، وہ جب تک دوسرے انسان پر حکمرانی کی خواہش ختم نہیں کرتا اور وہ جب تک دوسرے لوگوں سے چھیڑ چھاڑ بند نہیں کرتا اس وقت تک انسان کے ہاتھوں انسان مارا جاتا رہے گا، اس وقت تک اس زمین پر امن نہیں ہوگا، میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا، انہوں نے فرمایا، "سائنس دانوں کو قدرتی آفتوں کی بجائے انسانی شرمت کا کوئی علاج دریافت کرنا چاہئے، انہیں کوئی ایسی دوا ایجاد کرنی چاہئے جسے کھانے کے بعد صدر بٹش اور صدام حسین کی اتا پر سکون ہو جائے اور دونوں ایک دوسرے سے ٹکراتا بند کر دیں، جسے کھانے سے صدر پرویز مشرف اور لواز شریف کے اختلافات ختم ہو جائیں اور دونوں خود کو کمزور اور چند سانسوں کے مہمان انسان سمجھ لیں، جسے کھانے سے طالبان اور امریکہ ایک دوسرے کو تسلیم کر لیں، جسے کھانے سے ایران اور امریکہ ایک دوسرے کی آزادی اور زندہ رہنے کا حق مان لیں، جسے کھانے سے انسان انسان کو معاف کر دے اور جسے کھانے سے انسان انسان سے ٹکراتا بند کر دے"

میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا، انہوں نے فرمایا، "یقین کرو ایک جنگل میں دو شیر سکون اور آرام سے رہ سکتے ہیں لیکن ایک چھت کے نیچے دو انسان لڑے، ٹکرائے اور مرے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے، شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا عصر کی قسم انسان خسارے میں ہے"



گھاٹے کے سوداگر

ہنری کا تعلق امریکہ کے شہر سیائل سے تھا، وہ مائیکروسافٹ میں ایگزیکٹو مینجر تھا، اس نے 1980ء میں جارج واشنگٹن یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر کیا اور اس کے بعد مختلف کمپنیوں سے ہوتا ہوا مائیکروسافٹ پہنچ گیا، مائیکروسافٹ اس کے کیریئر میں ”ہیلی ہیڈ“ ثابت ہوئی اور وہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا گیا، وہ 1995ء میں کمپنی میں بھاری معاوضہ لینے والے لوگوں میں شمار ہوتا تھا اور اس کے بارے میں کہا جاتا تھا جب تک ہنری کسی سافٹ ویئر کو مسکرا کر نہ دیکھ لے مائیکروسافٹ اس وقت تک اسے مارکیٹ نہیں کرتی، ہنری نے کمپنی میں یہ پوزیشن بڑی محنت اور جدوجہد سے حاصل کی تھی، وہ دفتر میں روزانہ 16 گھنٹے کام کرتا تھا، وہ صبح 8 بجے دفتر آتا تھا اور رات بارہ بجے گھر جاتا تھا، ہنری کا ایک ہی بیٹا تھا، ہنری دفتر میں مصروفیات کے باعث اپنے بیٹے کو زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا، وہ جب صبح اٹھتا تھا تو اس کا بیٹا سکول جا چکا ہوتا تھا اور وہ جب دفتر سے لوٹتا تھا تو بیٹا سو رہا ہوتا تھا، چھٹی کے دن اس کا بیٹا کھیلنے کے لئے نکل جاتا تھا جبکہ ہنری سارا دن سوتا رہتا تھا۔ 1998ء میں سیائل کے ایک ٹیلی ویژن چینل نے ہنری کا انٹرویو نشر کیا، اس انٹرویو میں ٹیلی ویژن کے میزبان نے اعلان کیا ”آج ہمارے ساتھ سیائل میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی شخصیت بیٹھی ہے“ کیمرہ میزبان سے ہنری پر گیا اور ہنری نے فخر سے مسکرا کر دیکھا، اس کے بعد انٹرویو شروع ہو گیا، اس انٹرویو میں ہنری نے انکشاف کیا وہ مائیکروسافٹ سے 500 ڈالر فی گھنٹہ لیتا ہے۔

یہ انٹرویو ہنری کا بیٹا اور بیوی بھی دیکھ رہی تھی، انٹرویو ختم ہوا تو ہنری کا بیٹا اٹھا، اس نے اپنا ”مٹی باکس“ کھولا، اس میں سے تمام نوٹ اور سکہ نکالے اور گنتا شروع کر دیئے، یہ ساڑھے چار سو ڈالر تھے، ہنری کے بیٹے نے یہ رقم جیب میں ڈال لی، اس رات جب ہنری گھر واپس آیا تو اس کا بیٹا جاگ رہا تھا، بیٹے نے آگے بڑھ کر باپ کا ہیک اٹھایا، ہنری نے جھک کر بیٹے کو پیار کیا، بیٹے نے باپ کو صوفے پر بٹھایا اور بڑی عاجزی کے ساتھ عرض کیا ”ڈیڈی کیا آپ مجھے پچاس ڈالر ادا کر دے سکتے ہیں“ باپ مسکرایا اور جیب سے پچاس ڈالر نکال کر بولا ”کیوں نہیں میں اپنے بیٹے کو اپنی ساری دولت دے سکتا ہوں“ بیٹے نے پچاس ڈالر کا نوٹ پکڑا، جیب سے ریڑ گاری اور

نوٹ نکالنے پچاس کانوٹ ان کے اوپر رکھا اور یہ ساری رقم باپ کے ہاتھ پر رکھ دی ہنری حیرت سے بیٹے کو دیکھنے لگا۔ بیٹے نے باپ کی آنکھ میں آنکھ ڈالی اور مسکرا کر بولا "یہ پانچ سو ڈالر ہیں" میں ان پانچ سو ڈالروں سے سیال کے سب سے امیر درکر سے ایک گھنٹہ خریدنا چاہتا ہوں" ہنری خاموشی سے بیٹے کی طرف دیکھتا رہا "بیٹا بولا" میں اپنے باپ سے صرف ایک گھنٹہ چاہتا ہوں" میں اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں" میں اسے چھوٹا چاہتا ہوں" میں اسے پیار کرنا چاہتا ہوں" میں اس کی آواز سننا چاہتا ہوں" میں اس کے ساتھ ہنسنا، کھیلنا اور بولنا چاہتا ہوں" ڈیڑی کیا آپ مجھے ایک گھنٹے دے دیں گے" میں آپ کو اس کا پورا معاوضہ دے رہا ہوں" ہنری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے" اس نے بیٹے کو گلے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ ہنری نے 1999ء میں "فیلی لائف" کے نام سے ایک آرٹیکل لکھا تھا، مجھے یہ مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا، اس مضمون میں اس نے انکشاف کیا دنیا میں سب سے قیمتی چیز خاندان ہوتا ہے، دنیا میں سب سے بڑی خوشی اور سب سے بڑا اطمینان ہماری بیوی اور بچے ہوتے ہیں لیکن بد قسمتی سے ہم لوگ انہیں سب سے کم وقت دیتے ہیں، ہنری کا کہنا تھا دنیا میں سب سے بڑی بے وقاف چیز ہماری نوکری، ہمارا پیشہ اور ہمارا کاروبار ہوتا ہے، ہم آج بیمار ہو جائیں یا آج ہمارا ایکسیڈنٹ ہو جائے تو ہمارا ادارہ شام سے پہلے ہماری کرسی کسی دوسرے شخص کے حوالے کر دے گا، ہم آج اپنی دکان بند کر دیں تو کل ہمارے گاہک کسی دوسرے مشورے خریداری کر لیں گے اور آج ہمارا انتقال ہو جائے تو کل ہمارا شعبہ ہمارا پیشہ ہمیں فراموش کر دے گا لیکن بد قسمتی سے ہم لوگ دنیا کی سب سے بڑی بے وقاف چیز کو زندگی کا سب سے قیمتی وقت دے دیتے ہیں، ہم اپنی بہترین توانائیاں اس بے وقاف دنیا میں صرف کر دیتے ہیں جبکہ وہ لوگ جو ہمارے دکھ درد کے ساتھی ہیں جن سے ہماری خوشیاں اور ہماری سرتمیں وابستہ ہیں اور جو ہمارے ساتھ انتہائی وقفا دار ہوتے ہیں ہم انہیں فراموش کر دیتے ہیں، ہم انہیں اپنی زندگی کا انتہائی کم وقت دیتے ہیں۔"

ہنری کی کہانی نے مجھے زندگی کا ایک دوسرا پہلو دکھایا، مجھے محسوس ہوا ہماری زندگی میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ لوگ جن کے لئے ہمارا وجود معمول کی چیز ہوتا ہے، یہ لوگ ہمیں مشین کی طرح سمجھتے ہیں، ان کی نظر میں ہم محض ایک کارکن ہیں اور یہ لوگ ہمیں میز، کرسی، ٹیبل، لیپ، گاڑی، قلم، کاغذ، نشوونچہ، کھڑکی اور دروازے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور یہ ہمارے بارے میں کہتے ہیں "استعمال کرو پھینکو اور بھول جاؤ" جبکہ دوسری قسم کے لوگ ہمیں اپنے وجود، اپنی دھڑکنوں اور اپنی سانسوں کا حصہ سمجھتے ہیں، یہ ہمارے لئے تکلیف برداشت کرتے ہیں، یہ ہمارے لئے غم سہتے ہیں، یہ راتوں کو جاگ کر ہمارا انتظار کرتے ہیں، یہ ہمارے دھردوں کو آسہلی تحریر سمجھتے ہیں اور ان کی نظر میں ہمارا ایک ایک لفظ مقدس اور پاک ہوتا ہے اور یہ ہمارے اصل ساتھی ہوتے ہیں، میں نے سوچا بد قسمتی سے ہم لوگ پہلی قسم کے لوگوں کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی حصہ دیتے ہیں جبکہ ہم لوگ زندگی بھر دوسری قسم کے لوگوں کو فراموش کر کے پہلی قسم کے لوگوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں، ہم بے وقاف لوگوں سے وقفا داری سمجھاتے رہتے ہیں اور وقفا داروں سے بے وقفائی کرتے ہیں، میں نے کسی جگہ امریکہ کے ایک ریٹائر

سرکاری افسر کے بارے میں ایک واقعہ پڑھا تھا اس افسر کو وائٹ ہاؤس سے فون آیا کہ فلاں دن صدر آپ سے ملنا چاہتے ہیں اس افسر نے فوراً معذرت کرنی فون کرنے والے نے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا "میں اس دن اپنی پوتی کے ساتھ چڑیا گھر جا رہا ہوں" یہ جواب سن کر فون کرنے والے نے ترش لہجے میں کہا "آپ چڑیا گھر کو صدر پر فوقیت دے رہے ہیں" ریٹائر افسر نے نرمی سے جواب دیا "نہیں میں اپنی پوتی کی خوشی کو صدر پر فوقیت دے رہا ہوں" فون کرنے والے نے وضاحت چاہی تو ریٹائر افسر نے کہا "مجھے یقین ہے میں جوں ہی وائٹ ہاؤس سے باہر نکلوں گا تو صدر میرا نام اور میری شکل تک بھول جائیں گے جبکہ میری پوتی اس سیر کو پوری زندگی یاد رکھے گی لہذا میں گھانے کا سودا کیوں کروں؟ میں یہ وقت اس پوتی کو کیوں نہ دوں جو اس دن اس وقت میری شکل اور میرے نام کو پوری زندگی یاد رکھے گی جو مجھ سے محبت کرتی ہے اور جو اس دن کیلئے گھڑیاں گن رہی ہے" میں نے جب یہ واقعہ پڑھا تو میں نے کرسی کے ساتھ ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر کے دیر تک سوچتا رہا "ہم میں سے 99 فیصد لوگ زندگی بھر گھانے کا سودا کرتے ہیں ہم لوگ ہمیشہ ان لوگوں کو اپنی زندگی کے قیمتی ترین لمحات دے دیتے ہیں جن کی نظر میں ہماری کوئی اوقات ہماری کوئی اہمیت نہیں ہوتی جن کیلئے ہم ہوں یا نہ ہوں کوئی فرق نہیں پڑتا اور جو ہماری غیر موجودگی میں ہمارے جیسے کسی دوسرے شخص سے کام چلا لیتے ہیں میں نے سوچا ہم اپنے سنگدل ہاں کو ہمیشہ اپنی اس بیوی پر فوقیت دیتے ہیں اور جو ہمارے لئے دروازہ کھولنے ہمیں گرم گھانا کھلانے کے لئے دوڑے دوڑے چکے جاگتی رہتی ہے ہم اپنے بے وفا پیٹھے کو اپنے ان بچوں پر فوقیت دیتے ہیں جو ہمیں نہ ہمیں ہمارے بس ہماری شفقت اور ہماری آواز کو ترستے رہے ہیں جو ہمیں صرف البسوں اور تصویروں میں دیکھتے ہیں جو ہمیں یاد کرتے کرتے بڑے ہو جاتے ہیں اور جو ہمارا انتقال کرتے کرتے جو ان ہو جاتے ہیں لیکن انہیں ہمارا قرب نصیب نہیں ہوتا ہم زندگی بھر انہیں ان کا جائز وقت نہیں دے پاتے میں نے سوچا ہم سب گھانے کے سوداگر ہیں۔



Do Not Wish For Less Problems

خوبصاحب نے فرمایا ”یہ دعائیں کی لحاظ سے غلط ہے لہذا میں اس معاملے میں آپ لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتا“ سب لوگوں کے چہرے دھواں ہو گئے، کمرے میں بڑی دیر تک خاموشی رہی، میں ان تمام لوگوں میں نسبتاً منہ پھٹ تھا لہذا میں نے عرض کیا ”حضور دعا تو دھا ہوتی ہے اس میں تکنیک کہاں سے آگئی“ خوبصاحب مسکرائے ”ہاں تمہاری بات درست ہے لیکن اگر تم کسی شخص کو ایک ہزار سال تک زندہ رہنے کی دعا دو، اگر تم یہ دعا کرو اللہ تعالیٰ تمہارے کسی دوست کو پر لگا دے اور وہ اڑ کر لندن پہنچ جائے یا تم یہ دعا کرو تمہارے دادا دوبارہ زندہ ہو جائیں اور وہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے لگیں تو ان دعاؤں کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہ دعائیں ٹیکنیکی غلط ہیں، گو اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے وہ اگر چاہے تو پوری دنیا کے لوگوں کی عمریں ہزار سال ہو جائیں، تمام انسانوں کے جسم پر انگلی نکل آئیں اور پوری دنیا کے مرحوم ”دادا“ دوبارہ زندہ ہو جائیں لیکن اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا، یہ ساری باتیں اس کی ترجیحات میں شامل نہیں ہیں، اس نے ایک سسٹم بنا دیا ہے اور وہ عموماً اس سسٹم میں کوئی تبدیلی نہیں لاتا“ وہ خاموش ہو گئے، ہمارے ایک ساتھی نے پوچھا ”لیکن اگر کوئی بندہ اللہ سے یہ درخواست کرے یا یاری تعالیٰ میرے مسائل اور مصائب میں کمی کر دے تو اس دعا میں کیا خرابی ہے؟ یہ دعائیں کی لحاظ سے کیسے غلط ہوگی“ خوبصاحب مسکرائے ”آپ کے دوست نے فرمایا تھا آپ میرے مسائل اور مصائب کے خاتمے کیلئے دعا کریں جبکہ میں نے عرض کیا یہ خواہش ٹیکنیکی غلط ہے، میں نے یہ دعویٰ نئی رسالت کی حیات طیبہ کی بنیاد پر ہی کیا تھا، حضور کا فرمان ہے دنیا مصائب کا گھر ہے، اب تم خود بتاؤ اگر یہ دنیا مصائب کا گھر ہے تو کیا اس دنیا میں وہ کرمصائب سے چھٹکارہ ممکن ہے؟ نہیں ممکن لہذا ہم اگر مسائل اور مصائب سے چھٹکارے کی دعا کریں گے تو وہ سیدھی سادی موت کی دعا ہوگی“ وہ خاموش ہو گئے، ہم سب پریشان ہو گئے۔

یہ ایک نیا زاویہ نظر اور زندگی کا ایک نیا پہلو تھا، ہم نے خوبصاحب سے پوچھا ”اصل دعا کیا ہے؟“ انہوں نے منٹھی منٹھی نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور بولے ”میرے بچو اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ دعا کرنی چاہیے وہ ہمیں زندگی کے مسائل اور مصائب سے بچنے کی ہمت دے، وہ ہمیں پریشانیوں کا سامنا کرنے، مشکلات کا مقابلہ کرنے اور ان پریشانیوں، ان مصائب اور ان مشکلات کو شکست دینے کی استطاعت دے اور وہ ہمارے اندر

جرات، ہمت اور طاقت پیدا کر دے۔" خوبصورت صاحبہ کے ذرا سا توقف کیا اور پھر اسی شیریں لہجے میں بولے "دنیا کے تمام کامیاب لوگوں کے پاس یہی طاقت، ہمت اور جرات ہوتی ہے ان کے پاس یہی استطاعت ہوتی ہے جس کے باعث یہ لوگ کامیابی پر کامیابی حاصل کرتے جاتے ہیں تم نبیاء کی حیات پر غور ادا یاہ کرام کی زندگیوں کا احوال دیکھو تم دنیا کے تمام بڑے فلسفیوں، سائنس دانوں، لیڈروں اور رہنماؤں کی بانیو گرافیاں پڑھو تمہیں ان سب کی زندگیوں میں ان گنت مسائل اور مصائب ملیں گے لیکن ان میں سے کسی شخص نے کبھی ان مصائب اور مسائل کے خاتمے کی دعا نہیں کی انہوں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ان مشکلوں سے نپٹنے کی ہمت مانگی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی انہیں استطاعت اور طاقت عطا کی اور یوں یہ لوگ کامیاب ہو گئے حضرت آدم سے لے کر نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ تک تم سب نبیاء کے احوال دیکھو تم سترطاً سے لے کر نعل گیش تک دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی زندگی کا تجزیہ کرو تمہیں ان سب میں دو چیزیں مشترک نظر آئیں گی مسائل اور ہمت یہ لوگ مسائل کے سامنے ڈٹے رہے انہیں ان کے گھروالوں نے فراموش کر دیا انہیں ان کے قبیلے نے دھکے دیئے انہیں ان کی قوم نے نکال دیا یہ کبھی مکہ کے ریگزاروں میں مارے مارے پھرتے رہے اور کبھی شعب ابی طالب میں خشک چرواہا ل کر کھاتے رہے ان میں سے بے شمار لوگوں کو زمین کی گولائی مارنے کے جرم میں مراد کی گئی لوگوں نے کئے مار کر ان کے کان پھاڑ دیئے ان سے ان کے بچے چھین لئے گئے یہ لوگ کوڑھی بن کر غلامت میں پڑے رہے یہ لوگ چالیس چالیس برس تک چھلی کے پیٹ میں رہے انہیں مصر سے نقل مکانی کرنی پڑی یہ لوگ ہزاروں میں موت کی آبی کے عوض گئے انہیں جج بولنے کے جرم میں قید خانوں میں ڈالا گیا انہیں زہر کے پیالے پینے پر مجبور کیا گیا انہیں دھوپ میں کھڑا کر کے کوڑے مارے گئے اور ان کی کھالیں کھینچی گئیں لیکن ان لوگوں نے پسپائی اختیار نہ کی یہ لوگ مسائل، مشکلات اور مصائب سے نہ گھبرائے یہ لوگ ڈٹے رہے لہذا آخری فتح ان ہی کے حصے آئی یہی وہ لوگ تھے جو کامیاب ٹھہرے۔" وہ خاموش ہو گئے۔

ہم سب حیرت اور سرشاری کے عالم میں ان کا چہرہ دیکھتے رہے انہوں نے آنکھیں بند کیں ذرا دیر کے اور پھر دوبارہ بولے "مجھے یہ نقطہ ایک امریکی دانشور جم رون نے سمجھا تھا، جم رون امریکہ میں کامیابی پر لکھتے رہے وہ لوگوں کو بتاتا ہے آپ لوگ کامیاب کیسے ہو سکتے ہیں آپ ٹوٹ خوشی تک کیسے پہنچ سکتے ہیں اور آپ لوگ ایک پرسرت اور مطمئن زندگی کیسے گزار سکتے ہیں مجھے جم رون کی ایک سی ڈی سننے کا اتفاق ہوا تھا یہ کامیابی پر اس کا ایک لکچر تھا اس لکچر کے دوران اس بد بخت نے ایک ایسا فقرہ کہہ دیا جس نے میری زندگی کا نقطہ نظر ہی تبدیل کر دیا جس نے مجھے دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی کامیابی کا اصل گر سمجھا دیا میں چاہتا ہوں آپ سب لوگ یہ فقرہ لکھ کر اپنی میز پر لگا لو اس نے کہا تھا

"Do Not Wish For Less Problems, Always Wish For More Skills"

وہ دے اور مسکرا کر بولے "اگر تم لوگ کامیاب ہونا چاہتے ہو تو اس فقرے کو اپنا حیرمان لو اسے اپنا رہنما بنا لو تم زندگی میں کبھی ناکام نہیں ہو گے"



وائے می

”سر میرا کیا تصور ہے“ وائے می سر نے اس نے منہ پر ہاتھ رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ کمرے کی فضا سوگوار ہو گئی، میں خاموش ہو گیا، اس کی کہانی میں دکھ اور ملال تھا، وہ مظفر آباد شہر کا رہنے والا تھا، وہ لوگ پچھلی تین نسلوں سے ریخس تھے، والد کپڑے کا کاروبار کرتے تھے، وہ تین بہنیں اور چار بھائی تھے، 18 اکتوبر کو زلزلہ آیا اور اس کا سارا خاندان اس زلزلے کی نذر ہو گیا، والدین، بہن بھائی، سبھی اور بھانجیاں سب فوت ہو گئے، دکائیں اور گھر لے جانے کا ڈھیر بن گئے، صرف وہ زندہ بچا۔ وہ پچھلے دو ماہ سے ایک امدادی کیمپ میں پڑا تھا، اس نے اپنی کہانی سنائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اس کا کہنا تھا، ”سر میرا کیا تصور ہے“ وائے می“

میں نے اس سے کہا، ”بخت زمان، تم نے آرتھراش کا نامنا ہے“ اس نے آنکھیں پونچھیں اور انکار میں سر ہلا دیا، ”آرتھراش ایک وقت میں دنیا کا سب سے بڑا ٹینس پلیئر تھا، وہ ورجینیا کے مشہور قصبے ریمونڈ میں پیدا ہوا، وہ افریقی امریکن تھا، اس کی ماں اس کا باپ دونوں کالے تھے، اس نے بچپن میں اٹھلیٹ بننے کی کوشش کی لیکن جسمانی کمزوری کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا، چھ سال کی عمر میں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا، وہ اکیلا رہ گیا، جب تمہاری ستانے لگی تو اس نے فیصلہ کیا وہ دنیا میں کوئی ایسا کام کرے گا جو اس سے پہلے کسی کالے نے نہ کیا ہو، اس نے ٹینس کھیلنا شروع کر دی، وہ کورٹ میں داخل ہوا تو اس نے کمال کر دیا، وہ 1963ء میں امریکہ کا سب سے بڑا ٹینس پلیئر تھا، حکومت نے اسے ڈیوٹس کپ کی ٹیم میں شامل کر لیا، وہ امریکہ کی قومی ٹیم کا پہلا کالا کھلاڑی تھا، وہ ڈیوٹس کپ جیت گیا، یہ ایک حیران کن کامیابی تھی۔ 60ء کی دہائی میں امریکہ کے اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینلوں نے اسے اتنی کوریج دی کہ وہ 1969ء میں امریکہ کا سب سے زیادہ مشہور شخص تھا، میں چند لمحوں کے لئے رک گیا۔ اس نے نشوونما سے منہ صاف کیا اور بڑے جوش سے بولا، ”ویل ڈن سر یہ تو بڑی دلچسپ کہانی ہے“ میں مسکرایا، ”ہنہیں اصل کہانی آگے آئے گی“ اس نے سر ہلا دیا، میں نے گھٹکوا کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا، 1969ء میں جنوبی افریقہ میں ٹینس کا بیج تھا، آتش نے ساتھ افریقہ کے دیزے کے لئے درخواست دی، اس کی درخواست مسترد کر دی گئی، اس وقت جنوبی افریقہ میں گورنر کی حکومت تھی اور وہ کسی کالے کو ویزہ جاری نہیں کرتے تھے، آرتھراش کے لئے یہ زندگی کا دوسرا بڑا چیلنج تھا، اس نے ٹینس چھوڑ دی اور امریکہ میں کالوں کے حقوق کی جنگ شروع کر دی،

مشہور آدمی تھا میڈیا اور عوام اس کے ساتھ تھے اس نے اپنے چاہنے والوں کو اپنی فوج بنا لیا یہاں تک کہ امریکہ اور اس کی حلیف طاقتیں کالوں کے حقوق تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئیں ساؤتھ افریقہ کے سفارتخانے نے اسے ویزہ جاری کر دیا یہ اس کی بہت بڑی کامیابی تھی "میں سانس لینے کے لئے رکا، نوجوان ہلکا سا مسکرایا اور پر جوش آواز میں بولا "سرکمال ہے یہ تو بہت بڑا شخص تھا" میں نے ہنس کر کہا "نہیں اصل کہانی ابھی آگے آئے گی" وہ بہتر ن کوش ہو گیا میں نے کہا "جب وہ ساؤتھ افریقہ کا ویزہ لے کر نکلا تو کسی نے کہا آتش نے ویزہ تو حاصل کر لیا لیکن وہ اب ٹینس نہیں کھیل سکے گا اس شخص کا خیال تھا جو شخص اتنے سال ٹینس کوٹ سے باہر رہا وہ اس کیلئے دوبارہ ٹینس چھیننے بنا آسان نہیں ہوگا اس شخص کی بات ٹھیک تھی لیکن آتش ایک بار پھر کوٹ میں داخل ہوا اس نے کھیلنا شروع کیا اور 1975ء میں اس نے ٹینس کی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز ویمنز سینگل کپ جیت لیا وہ یہ کپ لے کر باہر نکلا تو وہ ورلڈ شار تھا "میں رکا میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا اس نے کسمسا کر پہلو بدلا اور پھر ہموار آواز میں بولا "ویل ڈن سردہ تو کمال شخص تھا" میں مسکرایا "نہیں اصل کہانی ابھی آگے آئے گی" وہ پوری طرح متوجہ ہو گیا "1980ء میں اسے دل کا دورہ پڑا اسے ہارٹ سرجری کے لئے ہسپتال لے جایا گیا وہاں اسے خون دیا گیا اس خون میں ایچ آئی وی تھا آتش ہسپتال سے نکلا تو وہ ایڈز کا مریض بن چکا تھا ہیریز بریڈ ہو گیا "وہ 1993ء تک پورے 13 سال اس مرض سے لڑتا رہا دنیا کے 34 کاروباری اداروں 55 بڑے ہسپتالوں اور دنیا کے 4 ہزار ڈاکٹروں نے اس کی جان بچانے کی کوشش کی لیکن دنیا کا ہر شار 6 فروری 1993ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا "میں خاموش ہو گیا نوجوان ایک بار پھر اس ہو گیا اور اس نے دیکھی لہجے میں کہا "سوسائڈ" مر یہ بڑی دگھی کہانی ہے "میں نے فوراً عرض کیا "نہیں اصل کہانی آگے آئے گی" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے عرض کیا "تم نے سوچا یہ کہانی یہاں ختم ہوگی لیکن اصل کہانی ابھی باقی ہے جب آتش ہسپتال میں آخری سانس لے رہا تھا تو اس کے ایک فنن نے اسے ایک خط لکھا تھا اس خط میں اس نے آتش سے ایک عجیب سوال کیا اس نے پوچھا "اس وقت دنیا میں 5 ارب لوگ ہیں قدرت نے ان 5 ارب لوگوں میں سے صرف تمہیں اس موذی مرض کیلئے کیوں منتخب کیا؟" اس نے اسے اس کا جواب دیا یہ جواب ایک پورا فلسفہ ہے۔ میں زندگی میں جب بھی مایوس ہوتا ہوں میں جب بھی خود کو بد نصیب محسوس کرتا ہوں تو میں آتش کی وہ چند لائنیں نکال کر پڑھ لیتا ہوں یقین کر دو میں ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں میں خود کو دنیا کا خوش نصیب ترین شخص سمجھنے لگتا ہوں آتش نے اسے جواب دیا تھا دنیا میں ہر سال 50 کروڑ بچے ٹینس کھیلنا شروع کرتے ہیں ان میں سے صرف 5 کروڑ بچے یہ کھیل سیکھ پاتے ہیں ان 5 کروڑ بچوں میں سے صرف 5 لاکھ نوجوان پروفیشنل ٹینس پلیئر بنتے ہیں ان پانچ لاکھ نوجوانوں میں سے صرف 50 ہزار کھیل کے سرکٹ میں داخل ہوتے ہیں ان 50 ہزار میں سے صرف پانچ ہزار گرینڈ سلام تک پہنچتے ہیں ان پانچ ہزار کھلاڑیوں میں سے صرف 50 ویمنز سینگل کپ جیتنے آتے ہیں ان پچاس میں سے صرف 4 سکی فائنل تک پہنچتے ہیں ان چار میں سے صرف

دو فائل کھیلنے ہیں اور ان دو میں سے صرف ایک شخص کو وہ ملے گا۔ کپ ملتا ہے اور میں دنیا کے ان 5 ارب لوگوں میں سے ایک ہوں جسے وہ ملے گا۔ کپ ملتا تھا میں دنیا کے ان 50 کروڑ کھلاڑیوں میں سے واحد شخص ہوں جس نے ٹینس کھیلنا شروع کیا اور وہ وہ ملے گا۔ تک پہنچ گیا میں نے زندگی میں ٹینس کے 800 بڑے اعزاز حاصل کئے یہ ریکارڈ تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے میں جب بھی ٹرافی کپ یا ایوارڈ لینے جاتا تھا تو میں خود کو اس اعزاز کا حق دار سمجھتا تھا میں نے کبھی اپنے اللہ سے یہ نہیں پوچھا تھا اے اللہ تعالیٰ تم نے پوری دنیا میں صرف مجھے ہی اس اعزاز کے لئے کیوں منتخب کیا وائے آج میں تکلیف میں ہوں مجھے جب درد ہوتا ہے اور میں اللہ سے یہ پوچھنے لگتا ہوں وائے کی تو مجھے اپنے وہ تمام اعزاز یاد آجاتے ہیں اور میں سوچتا ہوں جب میں نے اپنی کامیابیوں پر اللہ تعالیٰ سے یہ نہیں پوچھا تھا "کاڈوائے کی" تو آج مجھے اپنی تکلیف میں بھی اس سے یہ سوال پوچھنے کا کوئی حق حاصل نہیں جب میں مصلحتی کامیابیوں پر بھی اس کا شکر ادا نہیں کیا تو آج مجھے اپنی ناکامی پر اس سے کوئی شکوہ نہیں کرنا چاہیے میں خاموش ہو گیا تو جوان کی آنکھوں میں روشنی اتر آئی وہ بولا "مروا قتی یہ زندگی کا ایک نیا زاویہ ہے میں نے کبھی زندگی کو اس پہلو سے نہیں دیکھا تھا" میں نے تہقہہ لگایا "نہیں ابھی اصل کہانی آگے ہے آرتھر آتش نے مرنے سے چند لمحے پہلے کہا تھا "اے دنیا کے لوگو! اللہ کو کبھی یہ نہ بتاؤ تمہاری مصیبت کتنی بڑی ہے تم ہمیں اپنی مصیبت کو یہ بتاؤ تمہارا اللہ کتنا بڑا ہے تم دکھ اور تکلیف سے رہائی پا جاؤ گے" میں رکا اور دوبارہ بولا "آرتھر آتش نے کہا تھا جس شخص نے کامیابیوں پر شکر ادا نہیں کیا اسے ناکامیوں پر شکوہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور جو شخص اپنی مصیبت کو اپنے رب سے بڑا سمجھتا ہے اسے اللہ کا بندہ نہیں کہلانا چاہیے"

